الکوثر

فی تفسیر القرآن

محسن علی نجفی

مصباح القرآن
ٹرسٹ لاہور

الكوثر

في تفسير القرآن

خالی

الکوثر
فی تفسیر القرآن

جلد چہارم

محسن علی نجفی

مِصْباحُ القُرآن ٹرسٹ۔لاہور

تفسیر

یونس۔ ہود۔ یوسف۔ الرعد۔ ابراھیم۔ الحجر۔ النحل۔ الاسراء

نام کتاب: الکوثر فی تفسیر القرآن (جلد چہارم)
مفسر: محسن علی نجفی
کمپوزنگ و فارمٹنگ: خادم حسین
انتظامی امور: علی حیدری
تعداد: ایک ہزار
باراول: ذی القعدہ ۱۴۳۴ھ/ستمبر ۲۰۱۳
مطبع: شوکت پریس۔ لاہور
پیشکش: جامعۃ الکوثر۔ اسلام آباد
ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور
فون: 0321 448 1214
ای میل: info@misbahulqurantrust.com
ویب: www.misbahulaqurantrust.com

اس کتاب میں نقل شدہ اکثر روایات کے متن اور حوالوں کی اصلاح و تطبیق، کتب احادیث پر مبنی سافٹ ویئر ”جامع الاحادیث“ تیار کردہ کمپیوٹر ریسرچ سینٹر آف اسلامک سائنسز اور المحدث سے کی گئی ہے۔
نہج البلاغۃ کے اکثر اقتباسات کا ترجمہ نہج البلاغۃ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ مطبوعہ امامیہ کتب خانہ لاہور سے نقل کیا گیا ہے۔
تشریح کلمات مفردات القرآن راغب اصفہانی، ترجمہ مولانا محمد عبدہ فیروز پوری سے ماخوذ ہے۔

ملنے کا پتہ: محمد علی بک ایجنسی۔ کراچی کمپنی۔ اسلام آباد
معراج کمپنی۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

قارئین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! مصباح القرآن ٹرسٹ عہد حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے امت مسلمہ کے لیے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ ادارہ ہذا کی یہ شہرت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمر ہے۔

خالقِ کائنات نے ''انسان'' کو روح و بدن سے مرکب، عقلِ سلیم اور قوتِ گویائی کی نعمات سے مالا مال فرما کر موجوداتِ عالم میں منفرد و ممتاز مقام عطا فرمایا ہے۔ جس طرح بدن کو اپنے ہی اعضا کی تقویت و ارتقا کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کی بلندی اور تازگی کے لیے زہد و تقویٰ سے ملبوس ہو کر علمی تفکر کے میدان میں اترنا پڑتا ہے۔ روحانی تسکین اور معرفت کی بلندیوں سے فیض یاب ہونے کے لیے آیاتِ قرآن پر غور و فکر کرنا، اس کے رموز و حقائق کو سمجھنا اور فرمودات الٰہی پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی گزارنا آخرت کی کامیابی کا باعث ہے۔

بلاشبہ قرآنِ مجید دین اسلام کا حقیقی آئین و دستور ہے۔ دنیا کے ہر طبقہ اور ہر نسل کو اپنی استعداد کے مطابق اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا: کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کو جس قدر بیان اور نشر کیا جاتا ہے اسی قدر اس میں مزید تازگی آ جاتی ہے؟ جواب میں امام علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نہ ایک زمانے کے ساتھ مخصوص فرمایا، نہ کچھ لوگوں کے ساتھ، بلکہ یہ ہر دور میں جدت اور ہر قوم کے لیے قیامت تک تازگی رکھتا ہے۔''

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے دنیا کے ہر شخص کے لیے قرآنی آیات کے مفہوم اور تفاسیر کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر علمائے اسلام نے عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں قرآن مجید کی بہت سی تفاسیر اور تراجم مرتب فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے اہل تشیع و اہل

سنت علما نے بھی اردو زبان میں قرآن کریم کے متعدد تراجم وتفاسیر پیش کیے ہیں۔ پاکستان میں اردو زبان میں طبع شدہ اکثر تراجم وتفاسیر انڈیا (لکھنؤ) کے مترجمین ومفسرین کی محنت کا نتیجہ ہیں۔لکھنؤ کی اُردو پاکستان کی موجودہ اردو سے ذرامختلف ہے۔

چونکہ دنیا کا ہر شخص دوسری زبانوں کے علاوہ اپنی قومی زبان بلکہ اپنے خطے کی زبان سے زیادہ مانوس ہوتا ہے لہٰذا خطے کی موجود ہ اردو زبان کے پیش نظر اور قرآنی تصریحات کے بارے میں نئی نسل کی طرف سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات اور جدید معاندانہ تحریروں اور الزام تراشیوں کے مقابلے میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کا موقف بیان کرنے کے لیے ۱۰ جلدوں پر مشتمل زیر نظر تفسیر قرآن '' الکوثر فی تفسیر القرآن'' کی جلد چہارم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ یہ تفسیری مجموعہ حجۃ الاسلام والمسلمین الشیخ محسن علی نجفی مدظلہ العالی کی غیر معمولی مساعی اور شبانہ روز محنت کا ثمر ہے۔ خداوندعالم اُن کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے اورانہیں طاقت وصحت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

اراکین مصباح القرآن ٹرسٹ قبلہ موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ادارہ ہذا کو یہ تفسیری مجموعہ پرنٹ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ:

www.misbahulqurantrust.com

کے ذریعے گھر بیٹھے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق مصباح القرآن ٹرسٹ کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے اور ادارے کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور۔

پاکستان

سُورۃ یُونُس

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اور مضمون سورہ سے عندیہ ملتا ہے کہ یہ مکی زندگی کے اواخر میں نازل ہوا ہو گا جب مسلمانوں پر سختیوں میں اور اضافہ ہوا ہے، جس کی بنا پر مسلمانوں کو فتح و نصرت کی نوید دی جاتی تھی:

وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ...[1]	ان کے چہروں پر نہ سیاہ دھبہ ہوگا اور نہ ذلت (کے آثار).

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ اس سورہ سے پہلے قرآن کا ایک معتد بہ حصہ نازل ہو چکا تھا۔ چنانچہ منکرین کا یہ مطالبہ اسی سورہ میں ہے:

ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ ...[2]	اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لے آ ؤیا اس کو بدل دو۔

اور اسی سورہ میں قرآن کا وہ چیلنج بھی ہے جو منکرین کے سامنے رکھ دیا گیا۔

مضامین

اس سورہ میں باقی سورہ ہائے مکی کی طرح اصول عقائد کے بارے میں مباحث ملتے ہیں۔ توحید، نبوت، حیات اخروی، ان پر منکرین کی طرف سے عائد کردہ شہادت کا جواب اور انبیاء علیہم السلام کی تاریخ ساز تحریک توحید اور ان کے مقابلے میں آنے والے منکرین کا ذکر۔

---

[1] ۱۰ یونس: ۲۶	[2] ۱۰ یونس: ۱۵

خالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۱﴾ اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی رَجُلٍ مِّنۡہُمۡ اَنۡ اَنۡذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنَّ لَہُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ اِنَّ ہٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲﴾

بنام خدائے رحمن رحیم

۱۔ الف لام را۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو حکمت والی ہے۔

۲۔ کیا لوگوں کے لیے یہ تعجب کی بات ہے کہ ہم نے خود انہیں میں سے ایک شخص کی طرف وحی بھیجی کہ لوگوں کو تنبیہ کرے اور جو ایمان لائیں انہیں بشارت دے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچا مقام ہے، (اس پر) کافروں نے کہا: یہ شخص تو بلاشبہ صریح جادوگر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَکَانَ لِلنَّاسِ: معاندین اور منکرین کے خیالات کے برخلاف یہ کتاب حکمت آمیز باتوں سے پر ہے۔ نہ شاعرانہ تخیلات کا مجموعہ ہے، نہ زبانی جادوگری ہے بلکہ یہ قرآن حکیمانہ باتوں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کراتا ہے۔ لوگوں کو فکر و نظر کی دعوت دیتا ہے۔ عقل و استدلال اور منطق کو قیمت دیتا ہے۔ لوگوں کے باطل رجحانات کو فروغ دے کر ان کا استحصال نہیں کرتا بلکہ باطل نظریات کا مقابلہ کر کے لوگوں کی حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

۲۔ تقریباً تمام انبیاء کے خلاف لوگوں نے ایک سوال اٹھایا ہے:

اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا ...[1] کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟

اَبَشَرٌ یَّہۡدُوۡنَنَا ...[2] کیا بشر ہماری ہدایت کرتے ہیں؟

یہ لوگ نہ وحی کو سمجھ سکے، نہ انسانی مقام و منزلت کو، وہ اپنے خیال میں انسان کو اس بات کا اہل

نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اللہ کا نمائندہ بنے اور اگر وہ کسی انسان کو اس بات کا اہل سمجھتے بھی تو وہ اپنے جاہلی معیار کے انسان کو یہ اہلیت دینے کے لیے آمادہ تھے:

وَقَالُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡیَتَیۡنِ عَظِیۡمٍ ۝ [۳] — اور کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟

اور کہتے تھے کہ اللہ کو اپنا نمائندہ اور رسول بنانے کے لیے ابو طالب کے یتیم کے علاوہ کوئی نہیں ملا۔[۴]

وحی کی حقیت اگرچہ بعض حضرات نے سائنس کے دائرے میں سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بات تمام محققین کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ تجرباتی علوم کو ان چیزوں کے بارے میں نفیاً و اثباتاً نظریہ قائم کرنے کا حق پہنچتا ہے جو اس کے دائرہ کار میں ہیں اور ان کے تجرباتی ذرائع و وسائل کے لیے مسخر ہیں اور جو چیزیں سائنس کے لیے مسخر نہیں ہیں، ان میں وہ نہ اثبات میں کوئی نظریہ قائم کر سکتے ہیں، نہ نفی میں۔ اگر وہ اس میں کوئی نظریہ، خواہ وہ اثبات میں ہو یا نفی میں، قائم کریں تو ان کی یہ بات غیر تجرباتی ہوگی۔

۳۔ اِلٰی رَجُلٍ: انہیں ایک فرد کی طرف وحی بھیجنے پر تعجب ہے حالانکہ یہ رَجُلٍ ان کے درد، دکھ، بھوک، پیاس میں شریک ہو کر ان کو الٰہی قدروں سے روشناس کراتا، ان قدروں کے ماننے والوں کو بشارت اور منکرین کی تنبیہ کرتا ہے۔ یہ رَجُلٍ ضرور ہے مگر یہ ملکوتی رجل ہے۔ وہ نور مجسم ہے جس پر رجولیت کو فخر ہے۔

۴۔ اَنَّ لَهُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ: قَدَمَ سے مراد مقام و منزلت ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ محاورہ میں جس کا کردار تابناک ہو، اس کے بارے میں لفظ قَدم استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں له قدم فی الخیر۔ اگر کردار تابناک نہ ہو تو له قدم فی السوء نہیں کہتے قدم کے ساتھ صدق کے اضافے سے یہ مقام اور اونچا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۵۔ پوری تاریخ میں منکرین نے ہمیشہ انبیاء کو ساحر کہا ہے۔ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی انہی باتوں کا سامنا کرنا پڑا جو تمام انبیاء کو پیش آتی رہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ منکرین کی طرف سے جادوگر ہونے کے الزام میں اس بات کا اعتراف ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات عام بشری سطح سے بالا تر ہے اور جو قرآن آپ نے پیش کیا ہے وہ بھی ایک مافوق العادہ امر ہے۔ البتہ اس کو جادو کہنا ایک بے جا بہتان ہے اور رسالت کے انکار کے لیے ان کا ایک بہانہ ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَقُّ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ وَّاِنَّا بِهٖ کٰفِرُوۡنَ ۝ [۵] — اور جب حق ان کے پاس آیا تو کہنے لگے: یہ تو جادو ہے، ہم اسے نہیں مانتے۔

۱؎ ۱۷ بنی اسرائیل: ۹۴ ۲؎ ۶۴ تغابن: ۶ ۳؎ ۴۳ زخرف: ۳۱
۴؎ اس آیت کی شان نزول میں حضرت ابن عباس کی روایت کے یہ الفاظ ہیں۔ قرطبی ۸: ۳۰۶ ۵؎ ۴۳ زخرف: ۳۰

اہم نکات

۱۔ روحانیت سے عاری مادی ذہن میں وحی کا مفہوم ٹھہر نہیں سکتا۔ اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی رَجُلٍ مِّنۡہُمۡ ....

۲۔ مؤمن کے لیے ثواب آخرت کی ضمانت دی جاتی ہے۔ اَنَّ لَہُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ ....

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ؕ مَا مِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡہُ ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۳﴾

۳۔ یقیناً تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر اس نے عرش پر اقتدار قائم کیا، وہ تمام امور کی تدبیر فرماتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے، یہی اللہ تو تمہارا رب ہے پس اس کی عبادت کرو، کیا تم نصیحت نہیں لیتے؟

تفسیر آیات

۱۔ کائنات کو چھ مختلف مرحلوں میں پیدا کرنے کے بعد وہ عرش سلطنت پر متمکن ہوا۔ کوئی چیز اس کے قبضہ اقتدار اور تدبیر سے خارج نہیں ہے اور اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ کے تحت ہو رہا ہے۔ اس کے حکم و تدبیر یا اس کے اذن سے ہو رہا ہے اور اس کائنات کی تدبیر و تنظیم کا وہی منتہی ہے۔ اگر کوئی کام اس کے اذن سے ہوتا ہے مثلاً شفاعت تو بھی مرکز و مصدر، تنظیم و تدبیر وہی ذات ہے۔

۲۔ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ: یہ جملہ حالیہ ہے۔ کائنات کے جملہ امور کی تدبیر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش اللہ تعالیٰ کے مقام مدّبریت کا نام ہے۔ چونکہ کائنات وجوداً و بقاءً اللہ کی محتاج ہے۔

۳۔ مَا مِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ: مشرکین کے معبودوں کی شفاعت کی نفی ہے کہ شفاعت صرف وہ کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن حاصل ہو۔ کوئی از خود شفاعت نہیں کر سکتا۔ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ سے ان ہستیوں کی شفاعت کی طرف اشارہ ہے جو باذن خدا شفاعت کر سکتی ہیں۔

۴۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ: یہی تو تمہارا رب ہے، خالق ارض و سماء۔ عرش پر اقتدار قائم کرنے والا، الۡاَمۡرَ کی تدبیر کرنے والا ہی تمہارا رب ہے۔ اس آیت اور اس قسم کی دیگر متعدد آیات میں قرآن واضح

اور غیر مبہم لفظوں میں رب کی تعریف بیان فرماتا ہے۔

۵۔ فَاعۡبُدُوۡہُ: پس اسی رب کی عبادت کرو۔ عبادت کی تعریف یہی ہے کہ کسی ذات کو رب اور خالق سمجھ کر اس کی تعظیم کی جائے۔ مشرکین جو اپنے بتوں کے سامنے تعظیم کرتے تھے، اس لیے مشرک ہیں کہ وہ ان بتوں کو رب سمجھ کر ان کی تعظیم کرتے تھے۔

کائنات کو چھ دنوں میں پیدا کرنے، عرش اور مستوی کی مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ اعراف: ۵۴۔

اہم نکات

۱۔ شفیع وہ ہے جس پر اللہ کی نظر انتخاب ہو۔ مَا مِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ ....

۲۔ بندگی اس رب کی ہونی چاہیے جس کے ہاتھ میں تدبیر و اذن ہے۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡہُ ...

۳۔ اللہ کی ماذون ہستیوں کی طرف رجوع کرنا اذن الٰہی پر عمل ہے، شرک نہیں۔

اِلَیۡہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا ؕ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقًّا ؕ اِنَّہٗ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ لِیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالۡقِسۡطِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَہُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِیۡمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِیۡمٌۢ بِمَا کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ ۞۴

۴۔ تم سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے، اللہ کا وعدہ حق پر مبنی ہے، وہی خلقت کی ابتدا کرتا ہے پھر وہی اسے دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے انہیں انصاف کے ساتھ جزا دے اور جو کافر ہوئے انہیں اپنے کفر کی پاداش میں کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا اور انہیں دردناک عذاب (بھی) بھگتنا ہوگا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِلَیۡہِ مَرۡجِعُکُمۡ: انسانی خلقت میں یہ بات ودیعت ہے کہ اس کو اللہ کی بارگاہ تک جانا ہے۔ لہٰذا اپنی جائے بازگشت سے پہلے جن تکاملی و ارتقائی مراحل سے گزرنا ہے، ان میں انسان کو لاکھ نعمت و آسائش میسر آئے اس کو نہ صرف قرار نہیں آتا بلکہ مزید بے چین ہو جاتا ہے کیونکہ اس کو اس دنیا کے لیے خلق نہیں کیا گیا ہے۔

۲۔ اِنَّہٗ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ: جو اس انسان کو عدم سے وجود میں لایا ہے وہی اسے دوبار پیدا کرے گا۔

اگر دوبارہ پیدا کرنا نہ ہوتا تو ابتدا میں بھی پیدا نہ کرتا کیونکہ اس صورت میں خلقت عبث ہوتی۔ مزید تشریح کے لیے سورۃ الاعراف آیت ۲۹ ملاحظہ فرمائیں۔

۳۔ لِيَجْزِيَ: اس دنیا میں سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ مؤمن اور نیک لوگ ہوتے ہیں اور کچھ کافر اور بدکردار ہوتے ہیں۔ یہ عدل الٰہی کے منافی ہے کہ نیک اور بد لوگ ایک جیسے ہوں۔ لہٰذا عدل و انصاف کے تحت دوسری زندگی ضروری ہے کہ نیک لوگوں کو جزا اور بد لوگوں کو سزا دی جائے۔

اہم نکات

۱۔ دنیا کی ناز نعمت کی فراوانی میں بے چینی اور محرومیت میں سکون ملنا دلیل ہے کہ انسان ایک بازگشت کی طرف جانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اِلَيۡهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا ...۔

۲۔ قیامت، ارتقائی سفر کا منتائے مقصد ہے۔ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ لِيَجۡزِيَ ....۔

هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِيَآءً وَّ الۡقَمَرَ نُوۡرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِيۡنَ وَ الۡحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالۡحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۝

۵۔ وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن کیا اور چاند کو چمک دی اور اس کی منزلیں بنائیں تاکہ تم برسوں کی تعداد اور حساب معلوم کر سکو، اللہ نے یہ سب کچھ صرف حق کی بنیاد پر خلق کیا ہے، وہ صاحبان علم کے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے۔

تفسیر آیات

سورج اور چاند اہل ارض کے لیے قدرت کے دو حسین و جمیل مناظر اور اجرام ساوی میں ہمارے لیے دو نمایاں نشانیاں ہیں جن کا ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں اور مدتوں سے ہم ان دونوں سے مانوس ہیں۔ لہٰذا یہ دونوں ہمارے لیے ایک معمول بن گئے ہیں۔ اس لیے ہم ان دونوں کی اہمیت اور ان دونوں کے پیچھے ایک باشعور ذہن کے کارفرما ہونے کی علامت ہونے سے غافل ہو جاتے ہیں ورنہ یہ دونوں اللہ کی ربوبیت اور مدبریت کی اہم ترین دلیل ہیں۔ ان دونوں میں سورج ہمارے لیے منبع حیات ہے اور اسی کی ضیا پاشیوں سے زمین پر زندگی کا قافلہ رواں دواں ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ اعراف آیت ۵۴۔

چاند رات کی تاریکی میں چراغ کا کام دینے کے ساتھ ایک قدرتی تنظیم و تقویم بھی ہے جسے شہری، دیہاتی، خواندہ، ناخواندہ ہر شخص استفادہ کر سکتا ہے اور مہینے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے پندرہ دنوں میں

چاند بڑھتا رہتا ہے اور دوسرے پندرہ دنوں میں گھٹتا رہتا ہے۔ اس طرح حساب ماہ کو اور آسان اور سادہ بنا دیا ہے۔ صفحۂ آسمان پر آفتاب اور ماہتاب کی تقویم نہ ہوتی تو دنیا ایک زندان کی مانند ہو جاتی اور امور زندگی کو منظم کرنے کے لیے کوئی ایسا طریقہ موجود نہ ہوتا جو ہر شخص کے دست رسی میں ہوتا۔ مزید تشریح سورۂ بقرۃ آیت ۱۸۹ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ کہتے ہیں: ضیاء اور نور میں وہی فرق ہے جو سراج اور نور میں ہے۔ ضیاء اور سراج ذاتی جب کہ نور ذاتی بھی ہوتا ہے اور اکتسابی بھی لیکن ایسا نہیں لگتا کہ آیت کی نظر روشنی کی نوعیت پر ہے۔

۲۔ وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ: چاند کی منزلیں بنائیں قَدَّرَهٗ میں ضمیر قمر کی طرف ہے۔ جیسے وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ ...[1] میں فرمایا۔ منازل کا تعلق قمر سے ہے۔ چنانچہ قمر ہر شب ایک منزل پر ہوتا ہے۔ اس طرح قمر کی اٹھائیس منزلیں ہیں جن میں چاند سب کو نظر آتا ہے۔ اس کے بعد دو دن یا ایک دن چاند دکھائی نہیں دیتا۔ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ سے معلوم ہوتا ہے منازل وہی ہیں جن سے سالوں کی تعداد اور حساب معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ: سورج سر چشمہ حیات ہے اور قمر نظام زندگی کو مربوط رکھنے کے لیے ایک قدرتی تقویم پیش کرتا ہے، ان کو اللہ نے بے مقصد خلق نہیں کیا۔ ایک حکمت اور حقیقت کے مطابق خلق کیا ہے۔ ان مخلوقات میں اللہ کی مدبریت پر نشانیاں ہیں، ان کے لیے جن کے پاس ان حقائق کا علم ہوگا: لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔

اہم نکات

۱۔ قرآن کی حقانیت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن کی توقعات علم والوں سے وابستہ ہیں: لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝

۶۔ بے شک رات اور دن کی آمد و رفت میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو (ہلاکت سے) بچنا چاہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ: گردش لیل و نہار ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے زمین پر زندگی کو بقاء

---

[1] ۳۶ یس: ۳۹

کی ضمانت فراہم کی ہے ورنہ ہمیشہ شب یا ہمیشہ دن ہونے کی صورت میں یہاں زندگی کا وجود و بقا ناممکن ہوتا۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۶۴ میں گردش لیل ونہار کو لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ صاحبان عقل کے لیے نشانیاں قرار دیا۔ سورہ آل عمران آیت ۱۹۰ میں اس گردش کو لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ صاحبان عقل کے لیے اور سورۃ الجاثیۃ آیت ۵ میں اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ فرمایا۔ چنانچہ قرآن وجدان، عقل اور قلب سے سروکار رکھتا ہے، جدال و مناظرہ سے نہیں لیکن آیۂ شریفہ میں صاحبان تقویٰ کو یہ دعوت مل گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل و خرد والوں کو ہی خطرے کا احساس ہوتا ہے اور خطرے کا احساس ہونے پر بچنے کا اہتمام کیا جاتا ہے لہٰذا چونکہ تقویٰ عقل و خرد کا لازمہ ہے اس لیے اہل تقویٰ کے لیے دعوت فکر دے دی گئی ہے۔

اہم نکات

۱۔ تقویٰ آیات الٰہی کے ادراک کا ذریعہ ہے۔

۲۔ مخلوقات سماویہ و ارضیہ کا مطالعہ بعنوان آیات الٰہی تقویٰ کی علامت ہے: لِّقَوۡمٍ یَّتَّقُوۡنَ....

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ اطۡمَاَنُّوۡا بِہَا وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۙ﴿۷﴾	۷۔ بے شک جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیاوی زندگی ہی پر راضی ہیں اور اسی میں اطمینان محسوس کرتے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں،
اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۸﴾	۸۔ان کا ٹھکانا جہنم ہے ان اعمال کی پاداش میں جن کا یہ ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا: جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حاضر ہونے کی توقع نہیں رکھتے، اس کے دو اسباب بیان ہوئے ہیں:

i۔ وَ رَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا: ایک سبب تو یہ ہے کہ وہ اس دنیوی زندگی پر راضی ہیں۔ اسی کو مقصد حیات تصور کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ زندگی عارضی ہے، انسان کے لیے معراج نہیں ہے۔

ii۔ وَ اطۡمَاَنُّوۡا بِہَا: دوسرا سبب اس زندگی پر اطمینان اور سکون ہے۔ دل میں آخرت کا تصور نہیں، کوئی تردد نہیں۔ آخرت نہ ہونے اور زندگی، اس دنیا کی زندگی میں منحصر ہونے پر اطمینان ہے۔ یہ کاذب

اطمینان ان کو تصور آخرت کے نزدیک آنے نہیں دیتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے: جو لوگ قیامت کی توقع نہیں رکھتے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس دنیا پر راضی اور مطمئن رہتے ہیں۔

۳۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ: منکرین معاد کا دوسرا گروہ غفلت کا شکار لوگ ہیں۔ وہ دنیا اور آخرت کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ ایک لا پرواہی کی دنیا میں گم رہتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو ہم نے دیکھا ہے جو ایک پسماندہ گاؤں میں کسی سردار کی زمین پر کام کرتے ہیں، وہ سوچتے ہی نہیں۔ ایک واہی چیز کو ذہن میں رکھتے ہیں اور بس۔ آخرت پر ایمان، دین کا بنیادی عقیدہ ہے۔ اس عقیدے کی نفی کی صورت میں نہ کسی شریعت کے لیے گنجائش باقی رہتی ہے، نہ نبوت و رسالت کے لیے بلکہ سرے سے دین کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

اہم نکات

۱۔ جو لوگ اللہ کی بارگاہ میں جانے کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ دنیاوی زندگی کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

۲۔ دنیوی زندگی کو منتہائے مقصد بنانے والے بدنصیب ہوتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝	۹۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجا لائے بے شک ان کا رب ان کے ایمان کے سبب انہیں نعمتوں والی جنتوں کی راہ دکھائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔
دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	۱۰۔ جہاں ان کی صدا سبحانك اللّٰھم (اے اللہ تیری ذات پاک ہے) اور وہاں ان کی تحیت سلام ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ الحمد للّٰہ رب العالمین ہوگا۔

تفسیر آیات

۱۔ دوسری طرف جنات نعیم تک راہنمائی کے لیے بنیاد ایمان ہے۔ جس طرح کفر انسان کو جہنم تک پہنچاتا ہے، اسی طرح ایمان انسان کو جنت نعیم تک پہنچا دیتا ہے اور عمل اس بنیاد کے لیے معاون کی حیثیت

رکھتا ہے۔ لہٰذا ایمان انسان کو ارتقائی مراحل سے گزار کر منتہائے مقصود، اللہ تک پہنچانے کا ضامن ہے:

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَہٰی ۝[1]	اور یہ کہ (منتہائے مقصود) آپ کے رب کے پاس پہنچنا ہے۔

۲۔ دَعۡوٰىہُمۡ فِیۡہَا: یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ جنت تقرب الٰہی کی ایک تعبیر ہے۔ اصل نعمت جو قیامت کے دن مؤمن کو ملے گی وہ قرب الٰہی ہے۔ اس قرب الٰہی کی فضا میں اہل جنت کے لیے سب سے زیادہ محبوب مشغلہ وہی تسبیح ہو گی۔ جس تسبیح سے وہ اس دنیاوی زندگی میں مانوس رہ چکے ہیں اسی نغمہ میں جنت میں جب وہ تسبیح کر رہے ہوں گے تو ان کو جو لطف اور لذت اس تسبیح سے حاصل ہو گی وہ ناقابل وصف و بیان ہے کیونکہ یہ مؤمن دنیا میں اسی تسبیح وحمد سے کیف و سرور میں آتا تھا۔ اس کا ضمیر اور اس کا وجدان کیف محسوس کرتا تھا۔ وہ اس دنیا میں اپنے رب پر ایمان بالغیب رکھتا تھا لیکن آخرت میں وہ شہود کے مرحلہ میں ہوگا۔ پردے اٹھ گئے ہوں گے۔ اللہ کے جوار میں مقام قربت پر فائز ہوگا۔ اس وقت اللہ کی عظمت، اس کی بے پایاں رحمتوں کا قریب سے مشاہدہ کر رہا ہوگا۔ ایسے ماحول میں سُبۡحٰنَکَ اللّٰہُمَّ کا ورد کس قدر لذت بخش ہو گا، اس کا اندازہ ہم اس مادی زندگی میں نہیں کر سکتے۔ دعوی اگرچہ اکثر ادعا کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن آیت میں دعا کے معنوں میں ہے۔

۳۔ وَتَحِیَّتُہُمۡ فِیۡہَا سَلٰمٌ: اسی طرح اللہ کے جوار میں امن و سلامتی کا جو عالم ہو گا اور سلام علیکم کا جو مفہوم وہاں ہو گا اس کا بھی ہم اس ناسوتی زندگی میں اندازہ نہیں لگا سکتے۔

علامہ طباطبائیؒ اپنی تفسیر میں متعدد آیات سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اللہ دنیا میں صرف اپنے خاص بندوں یعنی انبیاءؑ کی حمد کا ذکر کرتا ہے اور آخرت میں اہل جنت کی حمد کا ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اہل جنت کو اللہ اپنے عباد مخلصین میں شامل فرماتا ہے۔ اور یہ سب سے بڑی نعمت ہو گی۔

۴۔ وَاٰخِرُ دَعۡوٰىہُمۡ: اہل جنت جب اللہ کی حمد اور تسبیح بجالاتے ہیں تو اس کو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ پر ختم کرتے ہیں جس طرح ہم دنیا میں برحمتك یا ارحم الراحمين پر ختم کرتے ہیں۔ شاید یہ فرق ہو کہ ہم دنیا میں طلب رحمت کرتے ہیں تو ارحم الراحمين کو دعا کا خاتمہ قرار دیتے ہیں، اہل جنت، رحمت حاصل ہونے کی وجہ سے اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کہتے ہیں۔ چنانچہ دنیا میں بھی مؤمن کو جب کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کہتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان، ارتقا کا واحد زینہ ہے۔ یَہۡدِیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ بِاِیۡمَانِہِمۡ ....

۲۔ حمد تسبیح ہی جنت کی نعمت ہے مؤمن کو اس سے مانوس رہنا چاہیے۔ دَعۡوٰىہُمۡ فِیۡہَا سُبۡحٰنَکَ ....

---

[1] ۵۳ نجم: ۴۲

وَ لَوۡ یُعَجِّلُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسۡتِعۡجَالَہُمۡ بِالۡخَیۡرِ لَقُضِیَ اِلَیۡہِمۡ اَجَلُہُمۡ ؕ فَنَذَرُ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ﴿۱۱﴾

۱۱۔اور اگر اللہ لوگوں کے ساتھ (ان کی بداعمالیوں کی سزا میں) برا معاملہ کرنے میں اسی طرح عجلت سے کام لیتا جس طرح وہ لوگ (دنیا کی) بھلائی کی طلب میں جلد بازی کرتے ہیں تو ان کی مہلت کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی لیکن جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہم انہیں مہلت دیے رکھتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

تفسیر آیات

آخرت اور نبوت کے منکرین کی طرف سے قائم کردہ ایک شبہ کا جواب:

جوشبہ وہ ہمیشہ شد و مد کے ساتھ قائم کرتے رہے ہیں، یہ ہے کہ اگر آپؐ اللہ کی طرف سے رسول ہیں اور آپؐ کی دعوت کا انکار موجب عقاب ہے تو وہ عذاب لے آئیں تو ہم مانیں:

وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿﴾[1] — اور وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بیان فرما رہا ہے کہ اگر اللہ ان منکرین کو سزا دینے میں وہی عجلت اختیار کرے جو ان پر رحم وکرم کرنے میں اختیار فرماتا ہے تو ان منکرین کی مہلت کا وقت ختم ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ نہیں ہے کہ عذاب کا مستحق ہوتے ہی ان پر عذاب نازل کرے بلکہ ان کو مہلت دی جاتی ہے تاکہ یہ زندگی کے کسی مرحلہ میں اسلام کے دائرے میں داخل ہو جائیں۔ یہ خود نہیں تو ان کی نسلوں میں مؤمن پیدا ہونے والے ہیں۔ بصورت دیگر کہ خود مہلت دینا ان کے لیے عذاب ہے کیونکہ وہ اس مہلت میں مزید طغیان اور سرکشی میں مگن ہو جاتے ہیں جس سے ان کے عذاب میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب لوگ مصیبت کے موقع پر اللہ کو پکارتے ہیں تو اللہ سریع الاجابت ہے لیکن اگر وہ جرم کا ارتکاب کرتے ہیں یا عذاب کا مطالبہ بھی کرتے ہیں تو اللہ اپنی حکمت و رأفت کی بنیاد پر عذاب نازل کرنے میں عجلت نہیں فرماتا۔ اس مطلب کو دوسری جگہ واضح لفظوں میں ارشاد فرمایا:

وَ لَوۡ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِظُلۡمِہِمۡ مَّا تَرَکَ عَلَیۡہَا مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ لٰکِنۡ یُّؤَخِّرُہُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ...[2] — اور اگر لوگوں کے ظلم کی وجہ سے اللہ ان کا مؤاخذہ کرتا تو روئے زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا لیکن اللہ انہیں ایک مقررہ وقت تک مہلت دیتا ہے۔

----

[1] ۱۶نحل: ۶۱

اہم نکات

۱۔ اللہ جو مہلت دیتا ہے وہ مؤمن کے لیے رحمت اور منکر کے لیے موجب عذاب بنتی ہے۔

۲۔ اللہ عطائے خیر کے لیے عجلت اور سزائے گناہ کے لیے تاخیر فرماتا ہے۔

وَ اِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنۡۢبِہٖۤ اَوۡ قَاعِدًا اَوۡ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا کَشَفۡنَا عَنۡہُ ضُرَّہٗ مَرَّ کَاَنۡ لَّمۡ یَدۡعُنَاۤ اِلٰی ضُرٍّ مَّسَّہٗ ؕ کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلۡمُسۡرِفِیۡنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لیٹے بیٹھے اور کھڑے ہمیں پکارتا ہے پھر جب ہم اس سے تکلیف دور کر دیتے ہیں تو ایسا چل دیتا ہے گویا اس نے کسی تکلیف پر جو اسے پہنچی ہمیں پکارا ہی نہیں، حد سے تجاوز کرنے والوں کے لیے ان کے اعمال اسی طرح خوشنما بنا دیے گئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو حالت امن و سکون میں بھی اللہ کو پکارتے ہوں۔ ورنہ عام طور پر انسان صرف مصیبت کے موقع پر سہارا ڈھونڈتا ہے۔ اس وقت انسان کو پتہ چلتا ہے کہ میں اپنی زندگی کو خود نہیں چلا رہا ہوں۔ اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اللہ کی ذات ہی واحد سہارا ہے۔ لہٰذا وہ اسی کے در پر دستک دیتا ہے لیکن جب اس سے تکلیف دور کر دی جاتی ہے، جسم صحت مند دولت فروان حالات ساز گار اور لوگوں میں باوقار ہو جاتا ہے تو اس در کے نزدیک نہیں بھٹکتا بلکہ وہاں سے ایسے چل دیتا ہے جیسے اس در کے ساتھ کبھی واسطہ پڑا ہی نہیں تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان فطرۃً خدا پرست ہے۔ منفی تربیت، مفادات اور خواہشات کی وجہ سے وہ خدا سے دور ہو جاتا ہے۔ جب مصیبت میں یہ عوامل دور ہو جاتے ہیں تو فطرت پھر اپنے خدا کو پکارتی ہے۔

۲۔ کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلۡمُسۡرِفِیۡنَ: ایسے لوگوں کو اسراف کنندہ اس لیے کہا ہے کہ ان لوگوں نے اپنا سرمایہ، متاع، زندگی، عمر کو بیہودگیوں میں خرچ کیا۔ لہٰذا یہ لوگ اپنی زندگی کے ساتھ اسراف کر رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مصائب میں مبتلا ہونے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے: دَعَانَا لِجَنۡۢبِہٖۤ ....

۲۔ مصیبتوں میں قبولیت دعا کا زیادہ امکان ہوتا ہے: فَلَمَّا کَشَفۡنَا عَنۡہُ ...۔

۳۔ اسراف پسند خود پسند ہوتے ہیں: زُیِّنَ لِلۡمُسۡرِفِیۡنَ ....

۴۔ مؤمن امن و سکون کے وقت بھی اللہ کو ایسے پکارتا ہے جیسے مصیبت کے موقع پر پکارتا ہے۔

وَ لَقَدۡ اَہۡلَکۡنَا الۡقُرُوۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا ۙ وَ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ مَا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡا ؕ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور بتحقیق تم سے پہلی قوموں کو بھی ہم نے اس وقت ہلاک کیا جب وہ ظلم کے مرتکب ہوئے اور ان کے رسول واضح دلائل لے کر ان کے پاس آئے مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے، ہم مجرموں کو ایسے ہی سزا دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَہۡلَکۡنَا الۡقُرُوۡنَ: گزشتہ قوموں کی عبرتناک تاریخ کی طرف توجہ مبذول کرائی جا رہی ہے کہ ان کو ظلم و اسراف نے کس بھیانک نتیجہ تک پہنچایا۔ اس کے آثار خود ان مشرکین کے ملک و دیار میں عاد و ثمود اور قوم لوط کے عبرتناک انجام کی شکل میں موجود ہیں اور مجرم قوموں کو ایسے انجام سے دوچار کرنا اللہ کی سنت ہے۔

یہ بات گزشتہ اقوام کے ساتھ مخصوص نہیں۔ دیکھو ان کے بعد تم کیا کرتے ہو۔ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِیۡنَ۔ یہ سنت جاریہ ہر اس قوم کے لیے ہے جو لَمَّا ظَلَمُوۡا کی مصداق بنے اور واضح دلیل کے ساتھ انبیاء کے ذریعے ان پر حجت قائم ہو جائے اور وَمَا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡا کے تحت ایمان لانے والی بھی نہ ہو۔

اہم نکات

۱۔ ان اقوام کو اس لیے ہلاکت میں ڈالا کہ وہ ایمان لانے والی ہی نہ تھیں: وَمَا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡا ....

۲۔ مجرم قوموں کا برا انجام ہلاکت ہے۔

ثُمَّ جَعَلۡنٰکُمۡ خَلٰٓئِفَ فِی الۡاَرۡضِ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ لِنَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ پھر ان کے بعد ہم نے زمین میں تمہیں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

تفسیر آیات

مخاطب قوم کو ان کی موقعیت کا احساس دلایا جا رہا ہے کہ تم گزشتہ قوموں کی جانشین ہو اور اسی سنت الٰہی کی زد میں ہو جس کے تحت قوموں کی سرنوشت اور ان کے انجام کا تعین ہوتا ہے۔

اللہ اقوام کی ہدایت کے لیے انبیاء بھیجتا ہے۔ ان کے ساتھ ایسے دلائل و براہین بھی بھیجتا ہے جن سے ان کے سارے عذر پورے ہو جاتے ہیں اور ان پر نصیحت تمام ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کو مہلت دی جاتی ہے۔ اس مہلت کے بعد اگر ان میں سے کچھ نے یا ان کی نسلوں نے ایمان لانا ہے تو بھی ان پر عذاب نازل نہیں ہوتا اور اگر ایسی کوئی امید نہیں ہے تو ان کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

اب تم ایسی قوموں کی جگہ بیٹھے ہو، جن باتوں میں وہ مبتلا تھے تم بھی مبتلا ہو۔ جن آزمائشوں سے وہ گزرے ہیں بالکل اسی امتحان کے میدان میں تم بھی کھڑے ہو اور قدرت کی طرف سے یہ آواز تمہارے کانوں تک پہنچ رہی ہے، تم کو یہ میدان اس لیے دیا: لِنَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

اہم نکات

۱۔ اسلاف کی جانشین قوم کو تاریخ سے عبرت لینی چاہیے۔

۲۔ ظلم، قوموں کی ہلاکت کا باعث ہے۔

وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَیۡرِ ہٰذَاۤ اَوۡ بَدِّلۡہُ ؕ قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اور جب انہیں ہماری آیات کھول کر سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں: اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لے آؤ یا اسے بدل دو، کہد یجیے: مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اپنی طرف سے اسے بدل دوں، میں تو اس وحی کا تابع ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے، میں اپنے رب کی نافرمانی کی صورت میں بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا تُتۡلٰی: عرب جاہلیت کے لیے قرآن عقیدۃً و عملاً قابل قبول نہ تھا۔ عقیدۃً قرآن توحید کی دعوت دیتا ہے اور اللہ کی ذات کے سوا تمام لات وعزیٰ کی نفی کرتا ہے۔ یہاں شرک و بت پرستی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عملاً قرآن نے جو انسانیت ساز دستور زندگی پیش کیا ہے وہ سراسر ان کے مفادات اور خواہشات کے خلاف تھا، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ یہ نیا دین ان کے عقائد اور مفادات کو تحفظ دے۔ دوسرے لفظوں میں وہ چاہتے تھے یہ دین ان کی خواہشات کی پیروی کرے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے یا تو اس

قرآن کو چھوڑ کر ایک اور قرآن ایسا بنا لائے جو ہمارے نظریات و خواہشات کے مطابق ہو یا اسی قرآن میں ترمیم کر کے ان مواد کو نکال دیں جو ہمیں پسند نہیں ہیں۔

۲۔ قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ: اس آیۂ شریفہ میں حکم ملا: جواب میں یہ کہہ دیجیے: یہ قرآن میری تصنیف نہیں ہے کہ میں اس میں لچک پیدا کروں۔ میں صرف وحی کا تابع ہوں۔ تم یا تو اس پورے دین کو مان لو یا پورے کو مسترد کرو، اس میں مصالحت کے لیے گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ اِنِّیۡۤ اَخَافُ: قرآن میں مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ اپنی طرف سے تبدیلی لانا، ادائے رسالت میں خیانت ہے۔ اس صورت میں تم تو خوش ہو جاؤ گے مگر میں قیامت کے دن کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں اس رسالت کا امین ہوں۔ ایسی خیانت کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔

اہم نکات

۱۔ مفاد پرست لوگ ہمیشہ دین کو اپنی خواہشات کے مطابق بنانا چاہتے ہیں۔ کبھی اجتہاد کے نام سے اور کبھی جدید تقاضوں کے عنوان سے۔

۲۔ محکم موقف رکھنے والے مصلحتوں کے شکار نہیں ہوتے

قُلۡ لَّوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَا تَلَوۡتُہٗ عَلَیۡکُمۡ وَ لَاۤ اَدۡرٰىکُمۡ بِہٖ ۫ۖ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِیۡکُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِہٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ کہد یجیے: اگر اللہ چاہتا تو میں یہ قرآن تمہیں پڑھ کر نہ سناتا اور نہ ہی اللہ تمہیں اس سے آگاہ کرتا، اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

تفسیر آیات

جواب کا سلسلہ جاری ہے۔ کہہ دیجیے کہ یہ قرآن مشیت الٰہی کے تابع ہے۔ اگر وہ چاہتا تو اس قرآن کو پیش نہ کرتا جب کہ میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں۔ اس مدت میں کوئی قرآن پیش نہیں کیا اور جس شخص نے اپنی چالیس سالہ زندگی کے کسی حصہ میں خیانت نہ کی ہو اور جو شخص جعل، فریب اور جھوٹ سے آشنا ہی نہ ہو وہ اچانک اتنی بڑی فریب کاری کرنا شروع کر دے، ایک پوری کتاب، ایک دین اور ایک نظام گھڑ کر اللہ کی طرف نسبت دینا شروع کر دے، ممکن نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضورؐ چالیس سال کی زندگی ان کلام شناس اور فصاحت و بلاغت کے مالک عربوں کے درمیان گزار چکے ہیں۔ انہیں حضور کے طرز کلام، انداز بیان، اسلوب سخن کا علم تھا۔ کیا قرآن اسی

انداز و اسلوب کا مظہر ہے؟ اگر ایسے ہے تو اس شک کے لیے گنجائش ہے کہ یہ محمدؐ کی اپنی تصنیف ہے اور اگر ان دونوں اسلوبوں میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے تو یہ ان کی اپنی تصنیف کیسے ہو سکتی ہے؟

تیسری بات یہ ہے حضورؐ نے چالیس سال کی زندگی ان لوگوں کے سامنے گزاری اس مدت میں نہ کسی معلم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، نہ کسی سے کتاب پڑھی، نہ کسی قانون کا مطالعہ کیا، نہ کسی دستور زندگی اور نظام حیات سے واسطہ پڑا، نہ شعر و خطابت میں حصہ لیا، آج ایک ایسا کلام پیش کرتے ہیں جس کا اسلوب و ترکیب میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور ایک صحیح نظام حیات لے کر آتے ہیں جو قیامت تک کے لیے قابل عمل ہے۔ لہٰذا یہ کلام کسی انسان کی تصنیف نہیں ہو سکتا بلکہ یہ کلام الٰہی ہے۔

اہم نکات

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی خود آپؐ کی صداقت کی دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ لَبِثۡتُ فِیۡکُمۡ عُمُرًا ....

فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوۡ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ ؕ اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ پس اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اس کی آیات کی تکذیب کرے؟ مجرم لوگ یقیناً فلاح نہیں پائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَمَنۡ اَظۡلَمُ: اگر میں اللہ پر بہتان باندھتا ہوں تو مجھ سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہے اور اگر یہ اللہ کا کلام ہے اور تم اس کی تکذیب کر رہے ہو تو تم سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں۔ رہا یہ سوال کہ کس طرح معلوم ہو سکے گا کہ ان دونوں میں سے ظالم کون ہے؟ جواب میں فرمایا: جو مجرم ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان دونوں میں جو فریق ناکام اور رسوا ہو گا وہی سب سے بڑھ کر ظالم ہو گا اور جو کامیاب ہو گا وہ سچا ہو گا۔ البتہ کامیابی اور رسوائی کا الٰہی معیار، بنیاد ہے۔

۲۔ اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ: مجرم اپنے جرم کو کامیابی سے جاری نہیں رکھ سکے گا۔ اگر ہم مجرم ہیں تو اس پیغام توحید کو جاری رکھنے میں ناکام ہوں گے اور اگر تم مجرم ہو تو تم ناکام ہو گے۔

اہم نکات

۱۔ جرم کبھی بھی کامیابی کا زینہ نہیں بن سکتا۔

وَ یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّہُمۡ وَ لَا یَنۡفَعُہُمۡ وَ یَقُوۡلُوۡنَ ہٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ قُلۡ اَتُنَبِّـُٔوۡنَ اللّٰہَ بِمَا لَا یَعۡلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انہیں ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ انہیں کوئی فائدہ دے سکتے ہیں اور (پھر بھی) کہتے ہیں: یہ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرنے والے ہیں، کہد یجیے: کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جو اللہ کو نہ آسمانوں میں معلوم ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک و بالاتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَعۡبُدُوۡنَ: مشرکین بتوں کی پوجا اس لیے کرتے تھے تا کہ ان بتوں کے وسیلے سے اپنے ارباب کا تقرب حاصل کریں۔ چونکہ یہ بت ان کے ارباب کی شبیہ ہیں۔ وہ شبیہ کی پوجا کرتے تھے تا کہ وہ رب، جس کی یہ شبیہ ہے اور وہ ارباب جن کے سپرد تدبیر امور ہے، راضی ہو جائیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق اللہ سے ان کی سفارش کرائیں۔ وہ اپنے ارباب کو شفیع اور بتوں کو شفیع تک رسائی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔

وہ ذات جو کل کائنات کی خالق ہے اور اس کائنات میں اس کے علم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا، اس کے علم میں ایسا کوئی شفاعت کنندہ موجود نہیں ہے۔ بھلا وہ چیز جو اپنی ذات کا شعور بھی نہیں رکھتی اور اپنی ذات کے لیے بھی نفع و ضرر کی مالک نہیں ہے وہ دوسروں کی شفاعت کیسے کرے؟

وَ مَا کَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخۡتَلَفُوۡا ؕ وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّکَ لَقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ فِیۡمَا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اور سب انسان ایک ہی امت تھے پھر اختلاف رونما ہوا اور اگر آپ کا پروردگار پہلے طے نہ کر چکا ہوتا تو ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کر دیا جاتا جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَا کَانَ النَّاسُ: اس آیت کے ذیل میں المیزان میں آیا ہے:

لوگوں کے درمیان دو قسم کے اختلافات ہیں۔ ایک اختلاف زندگی کے معاملات کے بارے میں رونما ہوتا ہے اور دعوے داریوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں۔ کچھ مدعی اور

کچھ مدعا علیہ بنتے ہیں۔ کچھ ظالم اور کچھ مظلوم بنتے ہیں۔ کچھ تجاوز کار اور کچھ تجاوز سے متاثر ہوتے ہیں۔ کچھ دوسرے کا حق حاصل کرتے ہیں، کچھ کا حق ضائع ہوتا ہے۔ اس اختلاف کو اللہ نے دین اور انبیاء کے ذریعے اور آسمانی کتب نازل کر کے رفع کیا۔

دوسرا اختلاف خود دین کے بارے میں ہے۔ یہ اختلاف علم حاصل ہونے کے بعد اہل علم نے بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے کیا ہے۔ یہ طبعی نہیں ہے۔ اس دوسرے اختلاف سے ہدایت اور ضلالت کے دو راستے وجود میں آ گئے۔

۲۔ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ: اگر گمراہ لوگوں کو مہلت دینے کا ایک اٹل فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا مگر اللہ ایک مدت تک ان کو مہلت دیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ امت واحدہ میں ''اختلاف'' رحمت نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اختلاف امتی رحمۃ کی حدیث اس آیت اور دیگر متعدد آیات سے متصادم ہے مگر یہ کہ اختلاف سے رفت و آمد مراد لیا جائے۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اور کہتے ہیں: اس (نبی) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی؟ پس کہہ دیجیے: غیب تو صرف اللہ کے ساتھ مختص ہے پس تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

قرآن کی متعدد آیات میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ لوگ حضورؐ سے ایسے محسوس معجزے کا مطالبہ کرتے تھے جیسے سابقہ انبیاء علیہم السلام نے دکھائے ہیں۔ قرآن کو معجزہ تسلیم نہیں کرتے تھے اور ساتھ قرآن کے چیلنج کا جواب بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اس مطالبے کا اس آیت میں یہ جواب دیا گیا ہے: غیب تو صرف اللہ کے ساتھ مختص ہے۔ تم انتظار کرو۔

معجزہ چونکہ ایک امر غیبی ہے جو صرف اللہ کے پاس ہے۔ وہ مصلحت کے مطابق اس معجزے کو نازل فرماتا ہے۔ انسان ابھی طفولیت کی منزل میں تھا، صرف محسوسات کے سمجھنے کی اہلیت رکھتا اور اللہ کو بھی بتوں کی شکل میں لا کر محسوس بناتا اور پھر اس کی پوجا کرتا تھا، اس لیے ان امتوں کو محسوس معجزہ دیا گیا۔ اللہ کے غیبی علم میں یہ بات تھی کہ انسان کا عہد طفولیت ختم ہونے والا ہے، انسان رشد کو پہنچنے والا ہے اور معقولیت کی منزل پر آنے والا ہے اس لیے اس معجزے کو عقل اور شعور کی بنیادوں پر پیش کیا جانا چاہیے کہ انسان جس

قدر عقل و شعور کے مراحل طے کرتا جائے قرآن کا اعجاز اور نمایاں ہوتا جائے۔ شاید آنے والی نسلوں کے لیے قرآن کے بہت سے پوشیدہ اعجازی پہلو سامنے آئیں۔ مزید انتظار کرنا ہوگا تاہم اس آیت سے یہ استدلال درست نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے سوا کوئی معجزہ پیش نہیں کیا کیونکہ معجزے سے مراد مطلق معجزہ نہیں، فرمائشی معجزہ ہے۔ فرمائشی معجزے کے بعد اگر ایمان نہ لائیں تو مہلت نہیں دی جاتی۔ فوراً عذاب نازل ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن ایک وقتی اور محدود معجزہ نہیں، دائمی معجزہ ہے۔

وَ اِذَاۤ اَذَقۡنَا النَّاسَ رَحۡمَۃً مِّنۡۢ بَعۡدِ ضَرَّآءَ مَسَّتۡہُمۡ اِذَا لَہُمۡ مَّکۡرٌ فِیۡۤ اٰیَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰہُ اَسۡرَعُ مَکۡرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا یَکۡتُبُوۡنَ مَا تَمۡکُرُوۡنَ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور جب انہیں پہنچنے والے مصائب کے بعد ہم لوگوں کو اپنی رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ ہماری آیات کے بارے میں حیلے بازیاں شروع کر دیتے ہیں، کہدیجیے: اللہ کا حیلہ تم سے زیادہ تیز ہے، بیشک ہمارے فرشتے تمہاری حیلے بازیاں لکھ رہے ہیں۔

تفسیر آیات

جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے وہ اللہ کی نعمتوں پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ اللہ نے اگر انہیں کسی مصیبت سے نجات دلا دی تو وہ اس کی دوسری توجیہیں کرتے ہیں۔ اس میں اللہ کی مشیت و ارادے کی نفی کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ [۱] اس قسم کی تنگی اور راحت سے تو ہمارے باپ دادا بھی دوچار رہے ہیں۔ یہ طبیعت کا کھیل ہے قدرت کا کرشمہ نہیں۔ جو لوگ اللہ کی رحمتوں کو تسلیم کرنے کی جگہ اس کی مادی توجیہ کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے سامنے معجزہ رکھا جائے تو بھی وہ اس کی کوئی اور توجیہ کریں گے۔ جیسا کہ آج کل کے مغرب زدہ اور شکست خوردہ ذہنوں نے معجزات انبیاءؑ کی مادی توجیہ کرنا شروع کر دی ہے۔

منکرین کی حیلہ بازیوں کے مقابلے میں اللہ کی تدبیر پر تو وقت بھی صرف نہیں ہوتا۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ اللہ کے فرشتے ان کی حیلہ بازیوں کو صفحہ کائنات پر ضبط تحریر لا رہے ہیں اور ان کے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا گیا۔

۱؎ ۷ اعراف: ۹۵

اہم نکات

۱۔ تعیش سے انسان کا روحانی پہلو کمزور اور مادی پہلو غالب آ جاتا ہے: اِذَا لَهُمۡ مَّكۡرٌ فِیۡۤ اٰیَاتِنَا ....

۲۔ ایمان باللہ کا لازمہ اللہ کی رحمتوں کا اقرار ہے۔

هُوَ الَّذِیۡ یُسَیِّرُكُمۡ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنۡتُمۡ فِی الۡفُلۡكِ ۚ وَ جَرَیۡنَ بِهِمۡ بِرِیۡحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوۡا بِهَا جَآءَتۡهَا رِیۡحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الۡمَوۡجُ مِنۡ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ اُحِیۡطَ بِهِمۡ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ ۬ۚ لَئِنۡ اَنۡجَیۡتَنَا مِنۡ هٰذِهٖ لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ وہی تو ہے جو تمہیں خشکی اور سمندر میں چلاتا ہے، چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو اور وہ لوگوں کو لے کر باد موافق کی مدد سے چلتی ہیں اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اتنے میں کشتی کو مخالف تیز ہوا کا تھپیڑا لگتا ہے اور ہر طرف سے موجیں ان کی طرف آنے لگتی ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ (طوفان میں) گھر گئے ہیں تو اس وقت وہ اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا کرتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس مصیبت سے بچایا تو ہم ضرور بالضرور شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔

تفسیر آیات

یہ ان دلائل میں سے ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی وحدانیت اور اس کا تصور ہر انسان کے نفس اور اس کی فطرت میں ودیعت ہے لیکن جب بیرونی رکاوٹیں اس فطرت سلیمہ کے تقاضوں کے خلاف ہوتی ہیں پھر انسان فطری راہوں سے منحرف ہو جاتا ہے۔ مثلاً علم دوستی بھی انسانی فطرت میں ودیعت ہے لیکن منفی تربیت، رکاوٹوں کی وجہ سے فطری تقاضے جامہ عمل نہیں پہن سکتے۔ جب بیرونی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں، جن ظاہری اسباب کے دھوکے میں یہ گم تھا، وہ سب ٹوٹ جاتے ہیں، اس وقت فطرت سلیمہ کو اپنا تقاضا پورا کرنے کا موقع ملتا ہے اور بے ساختہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس جگہ اس انسان کو کسی نبی، عالم یا ناصح نے نہیں، صرف اس کی فطرت سلیمہ نے اس کو اللہ یا دلایا تو یہ مان گیا۔ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ پھر اسی کو پکارا۔

اہم نکات

۱۔ اضطراری حالت کا ایمان آخرت کے لیے باعث نجات نہیں بن سکتا۔ ممکن ہے اسی اضطرار

سے بچنے کا باعث بن جائے۔

۲۔ مشروط ایمان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی: لَئِنۡ اَنۡجَیۡتَنَا ....۔

فَلَمَّاۤ اَنۡجٰہُمۡ اِذَا ہُمۡ یَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغۡیُکُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ ۙ مَّتَاعَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۫ ثُمَّ اِلَیۡنَا مَرۡجِعُکُمۡ فَنُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ پھر جب خدا نے انہیں بچا لیا تو یہ لوگ زمین میں ناحق بغاوت کرنے لگے، اے لوگو تمہاری یہ بغاوت خود تمہارے خلاف ہے، دنیا کے چند روزہ مزے لے لو پھر تمہیں ہماری طرف پلٹ کر آنا ہے پھر اس وقت ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

تفسیر آیات

مشروط ایمان کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ حالت اضطرار سے نکلنے کے بعد پھر کفر و انکار اور بغاوت پر اتر آتا ہے کیونکہ اس کو اللہ کی بارگاہ میں معرفت نے نہیں، اضطرار نے پہنچایا تھا۔ اضطرار ختم ہونے پر وہ اللہ کی طرف رخ نہیں کرتا۔

اس کے بعد انسانی ضمیر اور وجدان سے خطاب کر کے فرمایا: لوگو! اس بغاوت سے اللہ کی سلطنت و حکومت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ دنیا کے چند دنوں کے عوض آخرت کی ابدی زندگی تباہ کر کے خود تم اپنے خلاف قدم اٹھا رہے ہو۔ اس کا علم تمہیں اس وقت ہو گا جب تم ہماری بارگاہ میں پہنچ جاؤ۔ حدیث میں آیا ہے:

الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا۔[1] لوگ خواب غفلت میں ہوتے ہیں جب مر جاتے ہیں تو بیدار ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ کسی مصیبت سے نجات ملنے پر اللہ کے اس احسان کو فراموش کرنے والے بھی اس آیت کے مصداق ہیں۔

---

[1] بحار الانوار ۴: ۴۳ باب ۵ نفی الرؤیۃ و تاویل الآیات ....۔

اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا کَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰہُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِہٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ مِمَّا یَاۡکُلُ النَّاسُ وَ الۡاَنۡعَامُ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَہَا وَ ازَّیَّنَتۡ وَ ظَنَّ اَہۡلُہَاۤ اَنَّہُمۡ قٰدِرُوۡنَ عَلَیۡہَاۤ ۙ اَتٰہَاۤ اَمۡرُنَا لَیۡلًا اَوۡ نَہَارًا فَجَعَلۡنٰہَا حَصِیۡدًا کَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ دنیاوی زندگی کی مثال یقیناً اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے برسایا جس سے زمین کی نباتات گھنی ہو گئیں جن میں سے انسان اور جانور سب کھاتے ہیں پھر جب زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہوگئی اور زمین کے مالک یہ خیال کرنے لگے کہ اب وہ اس پر قابو پا چکے ہیں تو (ناگہاں) رات کے وقت یا دن کے وقت اس پر ہمارا حکم آپڑا تو ہم نے اسے کاٹ کر ایسا صاف کر ڈالا کہ گویا کل وہاں کچھ بھی موجود نہ تھا، غور و فکر سے کام لینے والوں کے لیے ہم اپنی نشانیاں اس طرح کھول کر بیان کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

حَصِیۡدًا: (ح ص د) الحصد والحصاد کے معنی کھیتی کاٹنے کے ہیں۔ اگرچہ یہ لفظ اس کھیتی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو صحیح وقت میں کاٹی گئی ہو لیکن اس آیت میں اس کھیتی کے لیے استعمال ہوا ہے جو تباہی کی غرض سے بے وقت کاٹی گئی ہو۔ جیسا کہ کہتے ہیں: حصدھم السیف تلوار نے انہیں تباہ کر دیا۔

تَغۡنَ: (غ ف ی) کسی جگہ ایک مدت تک اقامت کرنے کے معنوں میں ہے۔ گویا وہ دوسری جگہوں سے بے نیاز ہے۔ کان لم یغنوا فیھا گویا کہ وہ ان میں کبھی آباد ہی نہیں ہوئے۔

اختلط: (خ ل ن) مختلف نباتات کا آپس میں مل کر گھنا ہونا۔

تفسیر آیات

۱۔ پانی جب زمین پر گرتا ہے تو زمین کی روئیدگی بیدار اور سرسبز ہو جاتی ہے اور مِمَّا یَاۡکُلُ النَّاسُ وَ الۡاَنۡعَامُ جس سے انسانوں کے لیے کھانے کی چیزیں اور جانوروں کے لیے چارے نکل آتے ہیں۔

۲۔ زُخۡرُفَہَا: جب زمین نے سطح زمین پر سبز مخملی فرش بچھایا تو اس کا حسن دوبالا ہو گیا اور اپنی پوری رعنائی دکھانا شروع کی۔

۳۔ وَ ظَنَّ اَہۡلُہَاۤ اَنَّہُمۡ قٰدِرُوۡنَ: اور مالک زمین یہ منظر دیکھ کر کیف و سرور میں آتا ہے۔ ان

سب کو اپنی محنت و مہارت کا مرہون منت سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اب یہ فصل میرے ہاتھ آ گئی ہے، اسے مجھ سے کون چھین سکتا ہے۔

۴۔ اَتٰىهَاۤ اَمۡرُنَا: عین اس وقت ہمارا حکم آتا ہے اور اس کی فصل ایسے تباہ اور نابود ہو جاتی ہے گویا یہاں کوئی سبزہ تھا ہی نہیں۔

۵۔ یہ دنیا کی زیب و زینت، یہاں کے کیف و سرور کی بے ثباتی کی ایک مثال ہے کہ انسان خواہ اس محدود زندگی کو کتنا ہی آراستہ وخوشنما بنائے، بالآخر ایک مختصر مدت کے بعد اس زندگی نے ساتھ چھوڑنا ہے وہ بھی عین اس عالم میں کہ انسان یہاں کی رعنائیوں سے خوب لطف اندوز ہو رہا ہو، یہاں کی نعمتوں پر نازاں اور دیر تک زندہ رہنے کے آرزو میں مگن ہو۔ عین اس عالم میں اللہ کا حکم آ جاتا ہے اور روئے زمین سے اس کا وجود ایسے ناپید کر دیا جاتا ہے کہ گویا وہ کل یہاں تھا ہی نہیں۔

۶۔ لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ: کیا انسان ایسی ناپائیدار زندگی کے لیے آخرت کی ابدی زندگی کو تباہ کرتا ہے؟ غور فکر کا مقام ہے۔ اسی لیے آیت کے مخاطب صاحبان غور وفکر ہیں۔

اہم نکات

۱۔ عاقبت اندیش انسان مستقبل کی آسودگی کے لیے حال میں صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔

وَ اللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ اللہ (تمہیں) سلامت کدے کی طرف بلاتا ہے اور جسے وہ چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت فرماتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ صاحبان فکر اس بات پر غور کریں کہ کہاں یہ دار فنا جس میں ہر چیز ناپائیدار، ہر وقت موت کا خطرہ اور کہاں وہ گھر جس میں دائمی امن و سلامتی ہے۔ اللہ بندوں کو اس سلامت کدے کی طرف بلاتا ہے اور انسان اس پر آشوب زندگی میں مگن ہے۔ مقام تعجب ہے کہ مالک، بندے کو اپنی رحمتوں اور امن و سلامتی کی طرف بلاتا ہے اور اسے اس دعوت کو قبول کرنے میں تأمل ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔ اللہ کی چاہت اور مشیت، عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ وہ فاسق، کافر، ظالم اور اسراف کنندہ و کذاب کی ہدایت نہیں کرتا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ مُسۡرِفٌ کَذَّابٌ ○ [1]

اللہ یقیناً تجاوز کرنے والے جھوٹے کو ہدایت نہیں دیتا۔

اِنَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ یَہۡدِیۡ لِلَّتِیۡ ہِیَ اَقۡوَمُ ....[2]

یہ قرآن یقیناً اس راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔

اہم نکات

۱۔ جنت کے دار السلام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں ہر قسم کی مکروہات سے امن ہے اور ہر خواہش پوری ہو گی۔

۲۔ دنیا کا امن و سلامتی نسبی ہے اور آخرت کا امن و سلامتی مطلق ہے کیونکہ آیت میں السلام مطلق ہے کسی چیز کے ساتھ مقید نہیں کہ مثلاً السلام من المرض یا السلام من الخوف۔

لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰی وَ زِیَادَۃٌ ؕ وَ لَا یَرۡہَقُ وُجُوۡہَہُمۡ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّۃٌ ؕ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ جنہوں نے نیکی کی ہے ان کے لیے نیکی ہے اور مزید بھی، ان کے چہروں پر نہ سیاہ دھبہ ہو گا اور نہ ذلت (کے آثار)، یہ جنت والے ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تشریح کلمات

رھق: (ر ہ ق) کسی معاملہ نے اسے بزور جبر دبا لیا۔

قَتَرٌ: (ق ت ر) اصل میں قتار و قَتَر کے معنی اس دھوئیں کے ہیں جو کسی چیز کے بھوننے یا لکڑی کے جلنے سے اٹھتا ہے اور یہ سیاہی کی طرف اشارہ ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ نے ہر نیکی کا اجر و ثواب دینا، نیکی کرنے والے کے لیے حق قرار دیا ہے۔ یہ خود اپنی جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل و کرم ہے کہ وہ ایک حقیر عمل کے لیے ثواب عنایت فرماتا ہے اور اس کے باوجود اللہ اسے کئی گنا کر دیتا ہے۔

۱۔ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰی: الحسنی، حسنۃ سے صیغۂ مبالغہ ہے۔ یعنی جنہوں نے نیکی کی ہے

---

[1] ۴۰ غافر: ۲۸ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۹

ان کے لیے صرف حسنۃ نہیں ہے، حُسنیٰ ہے، بہتر حسنۃ ہے۔ اس بہتری کا ذکر اس آیت میں آیا ہے:

مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِہَا ...[1]	جو (اللہ کے پاس) ایک نیکی لے کر آئے گا اسے دس گنا (اجر) ملے گا ...

یہ عام حالات میں ہے۔ اگر یہ نیکی مالی انفاق سے مربوط ہے تو سورہ بقرہ آیت ۲۶۱ کے تحت ایک کا سات سو ہے اور وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ اگر اللہ کی مشیت میں آ گیا تو اس سات سو کو دوگنا یا کئی گنا کر دے گا، یہ ہوا کم سے کم چودہ سو۔ لہٰذا چودہ سو تک کی حسنیٰ (بہتر حسنۃ) میں گنجائش ہے۔

۲۔ وَزِیَادَۃٌ: حسنیٰ سے زیادہ۔ یعنی دس گنا یا بعض حالات میں سات سو گنا اور کبھی چودہ سو گنا سے بھی زیادہ۔ دوسری جگہ فرمایا:

لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ فِیۡہَا وَلَدَیۡنَا مَزِیۡدٌ ○[2]	وہاں ان کے لیے جو وہ چاہیں گے حاضر ہے اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔

اس جنت میں وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہتے ہیں اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔ انسانی خواہشات سے بھی زیادہ۔ تیسری جگہ فرمایا:

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ وَیَزِیۡدُہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ...[3]	پھر ایمان لانے والوں اور نیک اعمال بجا لانے والوں کو اللہ ان کا پورا اجر دے گا اور انہیں اپنے فضل سے مزید عطا کرے گا ...

نیز فرمایا:

لِیَجۡزِیَہُمُ اللّٰہُ اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا وَیَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ...[4]	تاکہ اللہ انہیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دے اور اپنے فضل سے انہیں مزید بھی عطا کرے ...

سورہ فاطر آیت ۳۰ میں فرمایا:

لِیُوَفِّیَہُمۡ اُجُوۡرَہُمۡ وَیَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ...	تاکہ اللہ ان کا پورا اجر انہیں دے بلکہ اپنے فضل سے مزید بھی عطا فرمائے ...

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مَا مِنْ شَیْءٍ اِلَّا وَ لَہٗ کَیْلٌ وَ وَزْنٌ اِلَّا الدُّمُوعُ فَاِنَّ الْقَطْرَۃَ تُطْفِیءُ بِحَاراً مِنْ نَارٍ فَاِذَا اغْرَوْرَقَتِ الْعَیْنُ بِمَائِہَا لَمْ یَرْہَقْ وَجْہًا قَتَرٌ وَ لَا ذِلَّۃٌ فَاِذَا	ہر چیز کا وزن ہوتا ہے سوائے آنسو کے چونکہ آنسو کا ایک قطرہ آتش کے ایک سمندر کو بجھا دیتا ہے۔ اگر آنکھ پرنم ہو جائے تو کوئی چہرہ سیاہ ہو گا، نہ ذلیل، اگر آنسو بہہ گئے تو اس پر آتش حرام ہو جائے گی،

[1] ۶ انعام: ۱۶۰　[2] ۵۰ ق: ۳۵　[3] ۴ النساء: ۱۷۳　[4] ۲۴ النور: ۳۸

فَاضَتْ حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ وَ لَو اَنَّ بَاكِياً بَكَى فِى اُمَّةٍ لَرُحِمُوا ۔[1] اگر ایک قوم میں ایک شخص گریہ کرتا ہے تو سب پر رحم کیا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ جنت کی نعمتیں دنیاوی فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔ وَ زِیَادَۃٌ ....

۲۔ انسانی خواہشات جنت کی نعمتوں کے مقابلے میں بہت محدود ہیں۔

وَ الَّذِیۡنَ کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَۃٍۭ بِمِثۡلِہَا ۙ وَ تَرۡہَقُہُمۡ ذِلَّۃٌ ؕ مَا لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ کَاَنَّمَاۤ اُغۡشِیَتۡ وُجُوۡہُہُمۡ قِطَعًا مِّنَ الَّیۡلِ مُظۡلِمًا ؕ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے تو بدی کی سزا بھی ویسی ہی (بدی) ہے اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا گویا ان کے چہرے پر تاریک رات کے سیاہ (پردوں کے) ٹکڑے پڑے ہوئے ہوں یہ جہنم والے ہیں اس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ نیکی کا بدلہ تو دس گنا اور اس سے بھی زیادہ ملے گا جب کہ برائی کا بدلہ صرف اسی برائی کے برابر ہوگا اس سے زیادہ نہیں۔ جتنی برائی ہے اتنی سزا دی جائے گی۔

۲۔ مَا لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ: اس سزا سے کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔ اگر یہ برائی شرک ہے تو کوئی شفاعت کرنے والا بھی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ جن کی یہ پوجا کرتے رہے ہیں وہ انہیں نہیں بچا سکیں گے۔

۳۔ کَاَنَّمَاۤ اُغۡشِیَتۡ: ان کے چہرے ایسے سیاہ ہوں گے کہ گویا ان کے چہروں پر رات کی سیاہ تاریکی کے ٹکڑے لگے ہوئے ہوں۔ اصل میں ان کے چہروں کی سیاہی کی صورت حال بتانا مقصود ہے۔

اہم نکات

۱۔ افسوس ہے اس ناشکرے انسان پر جس کا ایک، دس پر غالب آجائے۔ یعنی ایک گناہ کا ایک عذاب ایک نیکی کا دس گنا ثواب۔ (اقتباس از حدیث)

۲۔ گناہ گار گناہ کا بوجھ اٹھائے اللہ کی بارگاہ میں ذلیل و خوار ہو کر جائے گا۔ وَ تَرۡہَقُہُمۡ ذِلَّۃٌ ....

---

[1] الکافی ۲: ۴۸۱

وَ یَوۡمَ نَحۡشُرُہُمۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ نَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا مَکَانَکُمۡ اَنۡتُمۡ وَ شُرَکَآؤُکُمۡ ۚ فَزَیَّلۡنَا بَیۡنَہُمۡ وَ قَالَ شُرَکَآؤُہُمۡ مَّا کُنۡتُمۡ اِیَّانَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور جس دن ہم ان سب کو (اپنی عدالت میں) جمع کریں گے پھر ہم مشرکوں سے کہیں گے: تم اور تمہارے شریک اپنی اپنی جگہ ٹھہر جاؤ، پھر ہم ان میں جدائی ڈال دیں گے تو ان کے شریک کہیں گے: تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔

فَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًۢا بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اِنۡ کُنَّا عَنۡ عِبَادَتِکُمۡ لَغٰفِلِیۡنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ پس ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے، تمہاری اس عبادت سے ہم بالکل بے خبر تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ مشرکین جن شریکوں کی عبادت کرتے رہے ہیں، کل بروز قیامت وہ شریک اس بات کا انکار کریں گے اور کہیں گے تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ اس انکار کی وجہ یہ ہے کہ عبادت تو صرف اس ذات کی ہوتی ہے جو معبود حقیقی ہے اور جو حقیقی معبود نہیں ہے اس کی عبادت ہوتی ہی نہیں ہے۔ ان مشرکوں نے حقیقی معبود کی عبادت کی نہیں اور جن کی عبادت کی تھی وہ معبود تھے نہیں، لہٰذا ان کی یہ عبادت رائگاں گئی۔ مثلاً ایک شخص ایک انسان کو معبود سمجھ کر اس کی عبادت کرتا رہے اور کل اس انسان سے سوال ہو تو وہ انکار کرے گا کہ میری کسی نے عبادت کی ہے کیونکہ اس نے نہ کسی کی دعا سنی ہے، نہ اس تک کوئی پکار پہنچی ہے، نہ سجدہ وخشوع کا اسے علم ہے۔ اس طرح اس کی یہ عبادت نہ صرف رایگاں گئی بلکہ شرک ہونے کی وجہ سے وبال جان بن گئی۔

۲۔ فَکَفٰی بِاللّٰہِ: اس بات پر اللہ گواہ ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے بے خبر ہیں۔ اگر ان لوگوں نے فرشتوں کو معبود بنا کر ان کی پرستش کی ہے تو فرشتے انکار کریں گے کہ ان کی عبادت ان تک نہیں پہنچی اور اگر اصنام ہیں تو وہ بے حس و بے شعور ہیں۔

اہم نکات

۱۔ معبود اگر حقیقی ہے تو عبادت واقع ہوئی ہے، ورنہ رائگاں جاتی ہے۔

۲۔ اہل شرک کو یہ بڑا عذاب ہوگا کہ خود ان کا موہومی معبود ان سے بیزار ہے۔

هُنَالِكَ تَبۡلُوۡا كُلُّ نَفۡسٍ مَّاۤ اَسۡلَفَتۡ وَ رُدُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ مَوۡلٰىهُمُ الۡحَقِّ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اس مقام پر ہر کوئی اپنے اس عمل کو جانچ لے گا جو وہ آگے بھیج چکا ہو گا اور پھر وہ اپنے مالک حقیقی اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جو بہتان وہ باندھا کرتے تھے ان سے ناپید ہو جائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ هُنَالِكَ: دنیا میں انسان اپنے اعمال کے بارے میں غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے لیکن قیامت کے دن وہ اپنے اعمال کا جب مشاہدہ کرے گا تو وہ اپنے واقعی خد و خال میں نظر آئیں گے اور حقیقت حال کھل کر سامنے آ جائے گی۔ نہ کوئی حجت چلے گی، نہ عذر۔ نیک اعمال بجا لانے والوں اور بد اعمالی میں مبتلا رہنے والوں کا اپنا اپنا عمل اس کی واقعی شکل میں سامنے آئے گا۔ خیر، خیر کی شکل میں اور برائی برائی کی شکل میں۔

۲۔ وَرُدُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ: اس کے بعد ہر شخص کو اپنے عمل کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں حساب دینے کے لیے حاضر ہونا ہو گا۔ اس وقت اپنے حقیقی مالک کے سامنے جوابدہی کے لیے کھڑا ہونا ہو گا۔ وہاں نہ کوئی دیوتا ملے گا، نہ خود ساختہ شفاعت کنندگان نظر آئیں گے۔ مشرکین کے بلند بانگ دعوے باطل ثابت ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن ہر شخص کا عمل اپنے اصلی روپ میں سامنے آئے گا۔

قُلۡ مَنۡ يَّرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اَمَّنۡ يَّمۡلِكُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَمَنۡ يُّخۡرِجُ الۡحَىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَيُخۡرِجُ الۡمَيِّتَ مِنَ الۡحَىِّ وَمَنۡ يُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ؕ فَسَيَقُوۡلُوۡنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ کہد یجیے: تمہیں آسمان اور زمین سے رزق کون دیتا ہے؟ سماعت اور بصارت کا مالک کون ہے؟ اور کون ہے جو بے جان سے جاندار کو پیدا کرتا ہے اور جاندار سے بے جان کو پیدا کرتا ہے؟ اور کون امور (عالم) کی تدبیر کر رہا ہے؟ پس وہ کہیں گے: اللہ، پس کہد یجیے: تو پھر تم بچتے کیوں نہیں ہو؟

تفسیر آیات

مشرکین کے اپنے مسلمات کے ساتھ استدلال ہے کہ تم خود قبول کرتے ہو:

۱۔ آسمان اور زمین سے رزق دینے والا اللہ ہے۔ آسمان کا ذکر پہلے آیا ہے۔ شاید اس لحاظ سے کہ انسانی ضروریات اور روزی کا اکثر حصہ آسمان کی طرف سے ہے پھر زمین کا نمبر آتا ہے اور تم خود مانتے ہو کہ کون تمہارے سمع و بصر کا مالک ہے۔ آج کی جاہلیت کو بہتر پتہ چلا ہے کہ سمع و بصر کی خلقت ایسی نہیں ہے کہ ایک چیز سے دوسری چیز اتفاقاً جڑ گئی تو سماعت اور بصارت کی قوت وجود میں آ گئی بلکہ ان کی خلقت کے اندر تہ بہ تہ پیچیدگیوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی خلقت کے پیچھے ایک باشعور ذات کا ارادہ کارفرما ہے۔

۲۔ وَمَنۡ یُّخۡرِجُ الۡحَیَّ: آیت کے مخاطب مشرکین ہیں جو اس بات کو مانتے تھے کہ اللہ ہی بے جان سے جاندار اور جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے۔ جدید جاہلیت کو تو بہتر علم ہے کہ مردہ مادہ سے حیات پیدا کرنا اللہ ہی کا کام ہو سکتا ہے کیونکہ آج تک اس کی کوئی دوسری توجیہ سامنے نہیں آئی۔ اگر کوئی دوسری توجیہ سامنے آتی بھی ہے تو وہ اس راز کا انکشاف ہو گا کہ اللہ کس طرح مردہ مادہ سے حیات پیدا کرتا ہے اور حیات سے مردہ مواد پیدا کرنا بھی اسی کا کام ہے۔

۳۔ وَمَنۡ یُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ: کائنات کے تمام امور کی تدبیر کون کرتا ہے؟

۴۔ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ اللّٰہُ: مشرکین اس کے جواب میں کہیں گے: اللہ ان امور کی تدبیر کرتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کو رازق اور مدبر سمجھتے ہیں۔ وہ جواب میں کیسے کہتے ہیں: اللہ رازق اور مدبر ہے؟

اس کی ایک توجیہ یہ ہے کہ مشرکین بھی منتہائے تدبیر اللہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اپنے معبودوں کی پوجا اللہ سے تقرب حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں:

مَا نَعۡبُدُہُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلۡفٰی ۔[1] ہم انہیں صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں۔

دوسری توجیہ شیخ طوسیؒ کی عبارت میں ہے:

و لیس جواب ذلك لمن انصف ولم یکابر الا ان یقول: اللّه الفاعل لجمیع ذلك۔[2] انصاف کرنے اور زور گوئی نہ کرنے والوں کا جواب یہی ہے: اللہ ہی ان امور کا انجام دینے والا ہے۔

ما ذلك انی اعترف بانی لھم افھم الایة حق الفھم۔

---

[1] ۳۹ زمر: ۳ [2] التبیان۔ ذیل آیہ

اہم نکات

۱۔ اللہ کے رازق، مالک، محی اور مدبر ہونے پر ایمان کا لازمہ خوف خدا ہے: اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ...

۲۔ انسانی ادراکات بھی اللہ کی ملکیت ہیں: اَمَّنۡ یَّمۡلِکُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ ...

فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمُ الۡحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعۡدَ الۡحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰی تُصۡرَفُوۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ پس یہی اللہ تمہارا برحق پروردگار ہے، پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا رہ گیا؟ پھر تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ: اگر تم مانتے ہو اللہ ہی رازق، مالک حیات دینے والا اور مدبر ہے تو یہی اللہ تمہارا برحق رب ہے اور برحق رب ہی معبود ہوتا ہے لہٰذا اللہ ہی تمہارا معبود برحق ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ معبود کوئی ہو اور رب کوئی اور ہو۔

۲۔ فَمَاذَا بَعۡدَ الۡحَقِّ: جب بات واضح ہو گئی کہ اللہ رب ہے اور معبود بھی ہے تو حق اور باطل کے درمیان کوئی تیسری بات ہے نہیں لہٰذا جو بھی اس حق کے خلاف ہو گا وہ باطل ہی ہو گا اور جس کی تم پوجا کرتے ہو، وہ نہ رازق ہے، نہ مالک ہے، نہ حیات دہندہ ہے، نہ امور جہاں کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے تو وہ تمہاری عبادت کا حقدار کیسے بن گیا۔ اس واضح منطق کے خلاف تم بتوں کی پرستش کیسے کرتے ہو اور کون سی طاقت ہے جو تم کو راہ حق سے پھراتی ہے۔ تم اس طاقت کے پیچھے کیوں جا رہے ہو اور اپنی عقل و جدان سے ان گمراہ کنندگان کا چہرہ بے نقاب کیوں نہیں کرتے؟

اہم نکات

۱۔ جہاں حق نہیں ہو گا وہاں ضلالت ہو گی۔ تیسری صورت نہیں ہے: فَمَاذَا بَعۡدَ الۡحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ....

۲۔ توحید عبادت، توحید ربوبیت کا لازمہ ہے اگر معبود ایک ہے تو رب بھی ایک ہے: فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمُ الۡحَقُّ ....

کَذٰلِکَ حَقَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیۡنَ فَسَقُوۡۤا اَنَّہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اس طرح (ان فاسقوں کے بارے میں) آپ کے پروردگار کی بات ثابت ہو گئی کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

تفسیر آیت

اس طرح اللہ نے ان فاسقین کے بارے میں اپنا حتمی فیصلہ کر دیا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں: اَنَّهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ۔ وہ بات پوری ہو گئی اور ان لوگوں نے ایمان قبول نہ کیا۔ لہٰذا ان کے بارے میں اللہ کا فیصلہ درست نکلا اور کسی پر ظلم و زیادتی لازم نہیں آئی۔ یعنی ان مشرکین کا ایمان نہ لانا قدیم سے اللہ کے علم میں تھا، تاہم اس علم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا، ان کو ایمان کی دعوت دی ان پر حجت پوری کی، پھر بھی وہ ایمان نہیں لے آئے تو اللہ کا فیصلہ حتمی ہو گیا:

وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِي الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ؀[1]	اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

اہم نکات

۱۔ فسق ایمان لانے کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے۔

قُلۡ هَلۡ مِنۡ شُرَكَآئِكُمۡ مَّنۡ يَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ فَاَنّٰى تُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ کہد یجیے: کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہو پھر اسے دوبارہ بھی پیدا کرے؟ کہد یجیے: اللہ تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے پھر اسے دوبارہ بھی پیدا کرے گا، پھر تم کدھر الٹے جا رہے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ هَلۡ مِنۡ شُرَكَآئِكُمۡ مَّنۡ يَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ: ابتدائے خلقت سے اعادہ خلقت کی طرف توجہ دلانا اس مقصد کے لیے ہے کہ عبادت اس ذات کی ہونی چاہیے جس کے ہاتھ میں جیسے ابتدائی خلقت ہے، اعادۂ خلقت بھی ہے۔

۲۔ قُلِ اللّٰهُ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ: مشرکین چونکہ اعادۂ خلقت اور معاد کو نہیں مانتے تھے اس لیے جواب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دینے کا حکم دیا: کہہ دیجیے: اللہ ہی خلقت کی ابتداء کرتا ہے اور اعادہ بھی کرتا ہے۔ لہٰذا مشرکین جو ابتدائے خلقت کو مانتے ہیں کہ یہ فعل خدا ہے، اعادہ خلقت کو بھی ماننا پڑے گا کہ اللہ اس پر قادر ہے۔ صرف ابتدائے خلقت سے خلقت کی حکمت پوری نہیں ہوتی بلکہ یہ کسی معقولیت کے بغیر اسے ادھورا چھوڑنے کے مترادف ہو گا اور یہ عدل الٰہی کے منافی ہے کہ اس حیات ارضی کے ساتھ زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

----

[1] المائدۃ: ۱۰۸

اہم نکات

۱۔ انسان کی ابتدا و انتہا اللہ کے ہاتھ میں ہے تو درمیان میں کوئی شریک کیسے دخیل ہو سکتا ہے۔

قُلۡ هَلۡ مِنۡ شُرَكَآئِكُمۡ مَّنۡ يَّهۡدِيۡۤ اِلَى الۡحَـقِّ‌ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهۡدِىۡ لِلۡحَـقِّ‌ ؕ اَفَمَنۡ يَّهۡدِىۡۤ اِلَى الۡحَـقِّ اَحَقُّ اَنۡ يُّتَّبَعَ اَمَّنۡ لَّا يَهِدِّىۡۤ اِلَّاۤ اَنۡ يُّهۡدٰى‌ ۚ فَمَا لَـكُمۡ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ‏ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ کہد یجیے: کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو حق کی طرف ہدایت کرے؟ کہد یجیے: حق کی طرف صرف اللہ ہدایت کرتا ہے تو پھر (بتاؤ کہ) جو حق کی راہ دکھاتا ہے وہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود اپنی راہ نہیں پاتا جب تک اس کی رہنمائی نہ کی جائے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسے فیصلے کر رہے ہو؟

تفسیر آیات

وحدت ربوبیت و عبادت پر ایک اور بین دلیل ہدایت ہے۔ معبود وہ ہوتا ہے جس کے قبضہ قدرت میں ہدایت ہو۔ مشرکین اللہ کے مقام خالقیت کو مانتے تھے۔ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہدایت، خلقت کا لازمہ ہے۔ ہدایت کے بغیر غرض تخلیق پوری نہیں ہوتی بلکہ ہدایت کے بغیر تخلیق عبث ہو جاتی ہے۔ لہٰذا خلقت اور ہدایت، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿﴾[1] — ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت دی۔

چنانچہ ہر مخلوق کی زندگی کی ضروریات اور طریقہ حیات و تولید نسل کی ہدایات اس کی فطرت میں ودیعت کر دی ہیں۔

انسان کی ہدایت کا انتظام تو خالق نے اس کی تخلیق سے پہلے فرمایا۔ چنانچہ احادیث: اول ما خلق اللّٰہ نوری۔[2] اور لو لاك لما خلقت الافلاك.[3] شاہد ہیں اور اس روئے زمین پر کسی امت کے بسانے سے پہلے ایک نبی، حضرت آدم (ع) کو بسایا۔

تمام عقلاء کے نزدیک یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ حق (جو امر واقع کو کہتے ہیں) کی اتباع کرنی چاہیے۔ حق کیا ہے؟ اس میں لوگوں میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن حق کی اتباع ضروری ہونے میں کوئی اختلاف

---

[1] ۲۰ طٰہٰ: ۵۰ [2] عوالی اللالی ۴: ۹۹ [3] بحار الانوار ۱۶: ۴۰۵

نہیں ہے۔ اس آیت میں حسب ذیل حقائق بیان کیے گئے ہیں:

i۔ مشرکین کے بنائے ہوئے شریک، حق کی راہنمائی نہیں کرتے۔ کبھی ان شریکوں نے انسان کی ہدایت کے لیے کوئی نبی بھیجا ہے اور نہ کوئی کتاب نازل کی ہے، نہ کوئی شریعت بیان کی ہے

ii۔ اللہ حق کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

iii۔ جو حق کی راہنمائی کرتا ہے اس کی اتباع ضروری ہے۔ اس کی اتباع نہیں جو خود راہنمائی کا محتاج ہے۔ یہاں تقابل، ہدایت کرنے والے اور نہ کرنے والے میں نہیں ہے بلکہ ہدایت کرنے والے اور ہدایت کا محتاج ہونے والے میں تقابل ہے۔ دوسرے لفظوں میں خود منبع ہدایت اور محتاج ہدایت کے درمیان تقابل ہے۔ اس تقابل کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ اتباع کیا اس ذات کی ہونی چاہیے جو منبع ہدایت ہے یا اس کی جس کے پاس بذات خود ہدایت نہیں ہے۔ اگر اس کے پاس کوئی ہدایت آ بھی جائے تو وہ بھی اسی منبع ہدایت سے آئی ہو گی۔

لہٰذا اگر ہدایت کا سلسلہ، منبع ہدایت تک پہنچ جائے تو حق تک رسائی ہو گی۔ جیسے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی طرف سے جو ہدایت ملتی ہے وہ اللہ کی ذات پر منتہی ہوتی ہے اور اگر ایسا نہ ہوا بلکہ منبع ہدات کے مقابلے میں ایک اور سلسلہ قائم کیا جسے شرک کہتے ہیں تو یہ کبھی بھی حق تک رسائی کا ذریعہ نہیں بنے گا۔ اسی طرح وہ ہدایت جس میں یہ سلسلہ، انحراف اور ذاتی اجتہاد کی وجہ سے کٹ گیا ہو

قرآن کی یہ آواز کہ سرچشمۂ ہدایت صرف اللہ کی ذات ہے آج بھی فضائے عالم میں گونج رہی ہے اور قرآن کا یہ دائمی چیلنج ہے کہ اللہ کے سوا کوئی شخص، ادارہ یا جماعت انسان کو حق کی پرسکون آغوش میں نہیں بٹھا سکتی۔ کیا انسان کا ساختہ و بافتہ حقوق انسانی کا چارٹر یا دنیا بھر کے دانشور اور کئی نسلوں پر محیط طویل تجربہ رکھنے والے مفکرین انسان کو حق سے روشناس کرا سکتے ہیں جس سے انسان کو دنیا میں امن و سکون اور آخرت میں نجات مل جائے؟ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۔

اہم نکات

۱۔ حقیقی ہدایت وہ ہے جس کا سرا اللہ کی ذات سے ملتا ہو۔

۲۔ خلقت، عبادت اور ہدایت میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ ان میں سے اکثر محض ظن کی پیروی کرتے ہیں جب کہ ظن انسان کو حق (کی ضرورت) سے ذرہ برابر بے نیاز نہیں کرتا، اللہ ان کے اعمال سے خوب آگاہی رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

مشرکین اپنے مشرکانہ نظریات پر کوئی دلیل بھی تو نہیں رکھتے۔ ان کا عقیدہ صرف ظن وتخمین پر مبنی ہے کہ اللہ کے ساتھ شریک ہیں۔ اس بات پر وہ عقلی استدلال اور منطق سے دلیل بھی نہیں ڈھونڈتے۔ صرف اس گمان پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہمارے آباء و اجداد نے جو کچھ کہا اور کیا وہ درست ہی ہوگا۔ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ محمد پر وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ ایسا کیوں ممکن نہیں؟ اس پر دلیل نہیں سوچتے۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ یہ قرآن خود محمد (ص) کی اپنی تصنیف ہے، اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ وہ اس پر بھی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے حالانکہ وہ خود اس قرآن کی نظیر پیش کرنے سے عاجز رہ چکے ہیں۔ بعد کے جملے میں ایک کلی حکم بیان فرمایا: ظن انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا۔

واضح رہے کہ شرعی دلیل صرف علم و یقین پر مبنی ہے۔ خود دلیل سے علم حاصل ہونا چاہیے یا اس کے دلیل ہونے پر علم ہونا چاہیے۔ اگر کسی دلیل سے علم ویقین حاصل نہیں ہوتا یا اس کے دلیل ہونے پر علم نہیں ہے جیسے قیاس تو اس کو دلیل تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اہم نکات

۱۔ نص کے مقابلہ میں کوئی اجتہاد درست نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس قرآن کو اللہ کے سوا کوئی اور اپنی طرف سے بنا لائے بلکہ یہ تو اس سے پہلے جو (کتاب) آ چکی ہے اس کی تصدیق ہے اور تمام (آسمانی) کتابوں کی تفصیل ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا كَانَ: امکان کی نفی ہے کہ ممکن ہی نہیں کہ یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہو اس پر خود قرآن شاہد ہے جو سب کے سامنے ہے۔ هٰذَا الْقُرْاٰنُ کہ اس قرآن کا کائناتی تصور، ملکوتی معانی ماوراء طبیعتی موضوعات اور الہیاتی حقائق سب کے سامنے ہیں پھر ان سب کا انسانوں میں زیر استعمال حروف وجملات کے حدود میں رہ کر ایک اسلوب بیان کے اندر سمو دینا ایک ناخواندہ ماحول میں پیدا ہونے والے فرد کا ذکر کیا

تمام جن و انس مل کر بھی ایسا قرآن پیش نہیں کر سکتے۔

پھر جس طرح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا:

قُلۡ مَا کُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ ....[1]　کہہ دیجیے: میں رسولوں میں انوکھا (رسول) نہیں ہوں

۲۔ وَ لٰکِنۡ تَصۡدِیۡقَ: میں رسولوں میں انوکھا تو ہوں نہیں، بالکل اسی طرح یہ قرآن بھی کوئی انوکھا تو ہے نہیں، اس سے پہلے بہت سی کتابیں رسولوں پر نازل ہوتی رہی ہیں۔ یہ قرآن ان آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔

۳۔ وَ تَفۡصِیۡلَ الۡکِتٰبِ: اور گزشتہ کتابوں میں مذکور کلیات کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ ان کتابوں اور قرآن میں اگر کوئی فرق ہے تو اجمال و تفصیل کا ہے، ورنہ تمام ادیان ایک دین اسلام کے ساتھ منسلک ہیں: اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ....۔

اہم نکات

۱۔ قرآن تمام کتب آسمانی میں موجود دستور الٰہی کا جامع ہے۔ وَ تَفۡصِیۡلَ الۡکِتٰبِ ....۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّثۡلِہٖ وَ ادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو (محمد نے) از خود بنایا ہے؟ کہہ دیجیے: اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جسے تم بلا سکتے ہو بلا لاؤ۔

تفسیر آیات

مشرکین اپنے موقف کی درستگی اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو مسترد کرنے کے لیے دو باتوں کا زیادہ سہارا لیتے تھے۔ اول یہ کہ یہ شخص جادوگر ہے۔ دوسری یہ کہ یہ قرآن خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے ذہن کی ایجاد ہے۔ اس آیت میں خود مشرکین کے موقف کے مطابق چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر یہ قرآن ایک انسان کی ایجاد ہے تو سب انسان مل کر کل قرآن نہیں، ایک سورت بنا کر پیش کریں۔

توجہ رہے کہ قرآن کا چیلنج صرف لفظی وضاحت و بلاغت یا صرف معانی و مطالب کی بلندی کے متعلق نہیں ہے بلکہ قرآن کا چیلنج یہ ہے کہ اس قرآن میں موجود رحمت و ہدایت اور حکمت و موعظہ سے لبریز مطالب کو اسی اسلوب میں بیان کر کے پیش کرو جو اس قرآن میں موجود ہے۔ لہٰذا چیلنج کا تعلق مطالب و معانی اور اس کی ادائیگی کے لیے اسلوب بیان، دونوں سے ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۲۳۔

---

[1] ۴۶ احقاف: ۹

بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ يُحِيۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَ لَمَّا يَاۡتِهِمۡ تَاۡوِيۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جو ان کے احاطہ علم میں نہیں آئی اور ابھی اس کا انجام بھی ان کے سامنے نہیں کھلا، اسی طرح ان سے پہلوں نے بھی جھٹلایا تھا، پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا۔

تفسیر آیات

۱۔ بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ يُحِيۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ: انہوں نے اس قرآن کو جھٹلایا ہے جس کے حقائق سے وہ آگاہ ہی نہیں۔ کسی چیز کو قبول یا رد کرنے کا حق اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اس چیز کے بارے میں پوری طرح کھوج لگایا ہو۔ ایک ایک بات کی تحقیق کی ہو۔ ان مشرکین نے تو کسی قسم کی علمی صلاحیت اور کاوش سے پہلے صرف اس ضد کی بنا پر قرآن کی تکذیب کی کہ یہ ہمارے معبودوں کو رد کرتا ہے۔

۲۔ وَلَمَّا يَاۡتِهِمۡ تَاۡوِيۡلُهٗ: اور نہ ہی اس تکذیب کا انجام جو خود عذاب سے عبارت ہے ابھی ان کے سامنے کھلا ہے۔ جب عذاب الٰہی ان کے سامنے آئے گا تو وہ بطور اضطرار تصدیق کریں گے۔ وہاں تکذیب کی گنجائش نہیں ہو گی۔

تاویل سے مراد اس تکذیب کا انجام ہے۔ عذاب جو ابھی ان کے سامنے نہیں ہے۔ ان لوگوں کو قرآنی حقائق کا علم ہی نہیں تو وہ ان چیزوں کی تکذیب کر رہے ہیں جو ان کے احاطہ علم میں آئی ہی نہیں۔ اس کا انہیں علم نہیں ہے۔ نہ بذات خود علم رکھتے ہیں، نہ رسولؐ کے ذریعے علم حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ: تکذیب کا یہ عمل بھی اپنی جگہ انوکھا نہیں۔ سابقہ انبیاء علیہم السلام میں کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس کی تکذیب نہ کی گئی ہو۔

اہم نکات

۱۔ کفر و تکذیب جہالت کی وجہ سے سرزد ہوتی ہے۔
۲۔ انجام گناہ پر علم و آگاہی سے گناہ سرزد نہیں ہوتا۔
۳۔ ادیان کے بارے میں لوگوں کی طرف سے تاریخ دہرائی جاتی رہی ہے۔

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يُّؤۡمِنُ بِهٖ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّا يُؤۡمِنُ بِهٖ ؕ وَ رَبُّكَ اَعۡلَمُ

۴۰۔ اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو ایمان نہیں لاتے

بِالۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۴۰﴾
اور آپ کا پروردگار ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔

وَ اِنۡ کَذَّبُوۡکَ فَقُلۡ لِّیۡ عَمَلِیۡ وَ لَکُمۡ عَمَلُکُمۡ ۚ اَنۡتُمۡ بَرِیۡٓـُٔوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَ اَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اور اگر یہ لوگ آپکو جھٹلائیں تو کہہ دیجیے: میرا عمل میرے لیے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لیے،تم میرے عمل سے بری ہو اور میں تمہارے عمل سے بری ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنۡهُمۡ: آج جو لوگ آپ کی تکذیب کر رہے ہیں ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو آیندہ ایمان لائیں گے۔ انہی کی وجہ سے ان پر عذاب نازل نہیں ہوتا۔ ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو مرتے دم تک ایمان نہیں لائیں گے۔

۲۔ وَرَبُّکَ اَعۡلَمُ: اور ان کے ایمان نہ لانے کا محرک ان کا مفسد ہونا ہے۔ اللہ کو ان مفسدین کا خوب علم ہے یہ کون لوگ ہیں۔

۳۔ وَاِنۡ کَذَّبُوۡکَ: اس آیت میں وہ موقف بتایا جو ان مفسدین کے ساتھ اختیار کیا جانا چاہیے کہ پہلے تو ان مفسدین کو حق کی طرف دعوت دی جائے، انکار کی صورت میں ان سے بیزاری اختیار کرنی چاہیے۔ کسی قسم کے جبر و اکراہ سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ ان کے عمل بد سے برائت کا اعلان کرنا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ کافر کو اس لیے بھی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ آیندہ ایمان لا سکے: وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یُّؤۡمِنُ ....

۲۔ دعوت حق مسترد ہونے کے بعد برائت و بیزاری کی نوبت آتی ہے: وَ اَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ۔

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡکَ ؕ اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ وَ لَوۡ کَانُوۡا لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو آپ کی طرف کان لگائے بیٹھے ہیں، پھر کیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں خواہ وہ عقل نہ رکھتے ہوں؟

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّنۡظُرُ اِلَیۡکَ ؕ اَفَاَنۡتَ تَهۡدِی الۡعُمۡیَ وَ لَوۡ کَانُوۡا لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں پھر کیا آپ اندھوں کو راہ دکھا سکتے ہیں خواہ وہ کچھ بھی نہ دیکھتے ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴿۴۴﴾

۴۴۔ اللہ یقیناً لوگوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ لوگ ہیں جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ: کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قرآن کو سمجھنے کے لیے نہیں پڑھتے، صرف حروف و اصوات کو سنتے ہیں۔ اس سے آگے ان آیات کے مطالب ومعانی پر غور وفکر کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور عقل سے کام لینے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ اس طرح وہ لایعقل کی طرح ہوگئے۔ جیسا کہ آج کل بہترین لحن اور آواز میں لوگ قرآن مجید کی تلاوت کو بڑے شوق سے سنتے ہیں مگر ان آیات کے مطالب سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

۲۔ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ: اسی طرح وہ آپ کو دیکھتے تو ہیں لیکن نہ انہیں آپ کے کمالات نظر آتے ہیں، نہ معجزات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ: ان لوگوں سے سماعت اور بصارت کی قوت سلب ہونے کا اصل سبب یہ لوگ خود ہیں۔ ان کے اپنے کردار سے ان کو یہ دن دیکھنے کی نوبت آ گئی، ورنہ اللہ بلاوجہ ان سے یہ قوت سلب کر کے ان پر ظلم نہیں کرتا۔ اللہ کسی چیز کا محتاج نہیں، ظلم کس لیے کرے گا، نہ ہی اللہ تعالیٰ میں انتقامی جذبات ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس طرح خود اپنے نفس پر ظلم کرتے اور اپنی ابدی زندگی کو تباہ کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اسلام کے منکر عقل وفہم سے عاری ہوتے ہیں: وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ۔

۲۔ کفر، انسانی صلاحیتوں کے سلب ہونے کا باعث بنتا ہے: وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ۔

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴿۴۵﴾

۴۵۔ اور جس (قیامت کے) دن اللہ انہیں جمع کرے گا تو (دنیا کی زندگی یوں لگے گی) گویا وہ دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ یہاں نہیں رہے وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان لیں گے جنہوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا وہ خسارے میں رہے اور وہ ہدایت یافتہ نہ تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ: جب ان منکرین کو اللہ کی بارگاہ میں جمع کیا جائے گا اور یہ لوگ عالم آخرت

میں قدم رکھیں گے تو اپنے آگے ایک بے پایان اور لا محدود زندگی کا مشاہدہ کریں گے اور دنیا کی زندگی اس ابدی زندگی کے مقابلے میں نہایت حقیر محسوس ہوگی۔ گویا کہ ایک گھڑی تھی جو غفلت میں گزر گئی۔ ایک لمحہ سا تھا جو بیہودگیوں میں گزر گیا۔

۲۔ یَتَعَارَفُوۡنَ بَیۡنَہُمۡ : جیسے ایک نشست تھی جس میں ایک دوسرے کا تعارف ہوا پھر وہاں سے اٹھ گئے۔ اس وقت انہیں احساس ہوگا کہ اس حقیر اور ناچیز زندگی کی خاطر اپنی ابدی زندگی کو تباہ کر کے کتنا بڑا خسارہ اٹھایا۔

اہم نکات

۱۔ عاقل انسان وہ ہے جو گزر گاہ سے قیام گاہ کے لیے کچھ لے کر جائے۔

۲۔ قیامت کا انکار، بہت بڑے خسارے کا باعث ہے۔

وَ اِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیۡنَا مَرۡجِعُہُمۡ ثُمَّ اللّٰہُ شَہِیۡدٌ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۶﴾

۴۶۔اور جس (عذاب) کا ہم ان کافروں سے وعدہ کر رہے ہیں اس کا کچھ حصہ ہم آپ کو زندگی میں دکھا دیں یا آپ کو پہلے (ہی دنیا) سے اٹھا لیں انہیں بہرحال پلٹ کر ہماری بارگاہ میں آنا ہے پھر جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اس پر اللہ شاہد ہے۔

تفسیر آیات

منکرین سے جس عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا ایک حصہ خواہ آپ کی زندگی میں دکھا دیں یا آپ کی زندگی کے بعد۔ بہر حال ان کو اس عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا:

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ ۝ [1]

پس آپ صبر کریں، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے، اب انہیں ہم نے جو وعدہ (عذاب) دیا ہے اس میں سے کچھ حصہ ہم آپ کو (زندگی ہی میں) دکھا دیں یا آپ کو دنیا سے اٹھا لیں، بہرحال انہیں ہماری طرف پلٹ کر آنا ہے۔

منکرین کو نکبت و ذلت اور شکست و خواری جیسے عذاب سے دو چار ہونا پڑے گا۔ یہ سورہ مکی ہونے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس وعدے کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ اللہ کے اس سچے وعدے

---

[1] ۴۰ غافر: ۷۷

کے بعد بدر کی نکبت سے لے کر فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ان کو طلقاء، آزاد کردہ قرار دینے تک، پھر حنین کی شکست کو نظر میں لایا جائے تو اللہ کے اس وعدے کی سچائی ثابت ہو جاتی ہے کہ اس عذاب کا ایک حصہ رسولؐ کی زندگی میں ان منکرین پر نازل ہو گیا۔ چنانچہ سابقہ امتوں کو دفعۃً عذاب دے کر تباہ کر دیا اور رسول آخر الزمانؐ کی رسالت کے منکرین کو تدریجاً ختم کر دیا۔ البتہ دفعۃً عذاب نازل نہ کرنا اس امت پر اللہ کی رحمت ہے اور وجود رسولؐ کی وجہ سے ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ خود انسان کے تمام اعمال کا گواہ ہے۔ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ

۲۔ منکرین کو دنیا میں بھی عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۴۷

۴۷۔ اور ہر امت کے لیے ایک رسول (بھیجا گیا) ہے، پھر جب ان کا رسول آتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جاتا ہے اور ان پر کوئی ظلم روا نہیں رکھا جاتا۔

تفسیر آیات

ہر امت کے لیے ایک رسول کا بھیجنا اور حجت پوری کرنا اللہ کے ذمے ہے۔ جب رسول، اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیتا ہے تو امت میں سے کچھ لوگ اس دعوت پر لبیک کہیں گے اور کچھ لوگ اس کا انکار کریں گے۔ اللہ کی اس دعوت کو قبول کرنے اور انکار کرنے والوں میں سے ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا جائے گا اور مؤمن کو اجر و ثواب دینے اور کافر کو سزا دینے میں کسی قسم کی زیادتی نہیں ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ اللہ حجت پوری کرنے سے پہلے مؤاخذہ نہیں کرتا: فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ ....

۲۔ کوئی قوم رسول کے بغیر نہیں گزری: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ....

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴۸

۴۸۔ اور وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا

۴۹۔ کہد یجیے: میں اللہ کی منشا کے بغیر اپنے نقصان

نَفۡعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُہُمۡ فَلَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَۃً وَّ لَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ﴿۴۹﴾	اور نفع کا بھی اختیار نہیں رکھتا، ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جب ان کا مقررہ وقت آئے گا تو وہ گھڑی بھر کے لیے نہ تاخیر کر سکیں گے اور نہ تقدیم۔

تفسیر آیات

۱۔ وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی: منکرین یہ بات طنز و تعریض اور تکذیب کے طور پر کہتے تھے: تمہاری دھمکی کب پوری ہوگی؟ اور اس فیصلے کا دن کب آئے گا جس کا ذکر کر کے ہم کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتے ہو؟

۲۔ قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِکُ: جواب میں فرمایا: اے رسولؐ آپ کہہ دیجیے کہ یہ وعدہ میں نے نہیں، اللہ نے کیا ہے اور اسے پورا کرنے کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ سے ہٹ کر میں تو اپنے نقصان اور نفع کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔ میں بذات خود کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ جو کچھ رکھتا ہوں وہ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کے تحت رکھتا ہوں۔

یہ اللہ کے مقابلے میں ذاتی اختیار کی نفی ہے۔ اللہ کی طرف سے اس کی مشیت و حکمت کے تحت عطا کردہ اختیارات کی نہ صرف یہ کہ نفی نہیں ہے بلکہ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ سے اس کا اثبات ہوتا ہے۔

لہٰذا اللہ کی طرف سے ماذون ہستیوں کو شفیع اور وسیلہ سمجھ کر ان کی طرف رجوع کرنا اذن الٰہی کے مطابق ہے، شرک نہیں ہے:

یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ؕ مَا مِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ ...[1]	وہ تمام امور کی تدبیر فرماتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔

لہٰذا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیر ماذون مشائخ و اولیاء پر قیاس کرنا کس قدر ناانصافی اور کج فہمی ہے۔

نہ معلوم بڑے فحول مفسرین کی نگاہیں ایسے مواقع پرصرف لَّاۤ اَمۡلِکُ پر مرکوز کیوں ہو جاتی ہیں اور اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ جملہ مَا مِنۡ شَفِیۡعٍ کے ساتھ بڑی دلچسپی ہوتی ہے اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ سے نگاہیں چراتے ہیں۔ بالکل اس شخص کی طرح جو کہتا ہے: کلو و اشربوا را فراگوش کن۔ ولا تسرفوا را فراموش کن۔ البتہ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ اذن دینے کا اختیار صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کے اذن کے بغیر ساری دنیا کے انسان جمع ہو کر بھی ایک فرد کو نہ کوئی الٰہی منصب دے سکتے ہیں، نہ ہی کسی کو ولی بنا سکتے ہیں۔

۳۔ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ: یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ کے جواب میں فرمایا: اس وعدے کا تعلق اس الٰہی

---

[1] ۱۰ یونس: ۳

قانون و دستور کے ساتھ ہے جو تمام قوموں پر حاکم ہے۔ وہ دستور یہ ہے: لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ ہر امت کی عمر معین ہے اور امتوں اور قوموں کو اپنی عمر پوری کرنا ہوں گی ان کی عمر پوری ہونے پر پھر ان کو مہلت نہیں دی جائے گی۔مزید تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں: الاعراف آیت ۳۴۔

اہم نکات

۱۔ ہر فرد کی طرح ہر قوم کی بھی ایک عمر ہوتی ہے: لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ....۔

۲۔ سنت الٰہی تغیر ناپذیر ہے: فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً ....۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ ان سے کہد یجیے: یہ تو بتاؤ کہ اللہ کا عذاب رات کو یا دن کو تم پر آجائے؟ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے یہ مجرم جلد بازی کرتے ہیں؟

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔کیا جب عذاب آچکے گا تب اس پر ایمان لاؤ گے؟ کیا اب (بچنا چاہتے ہو؟) حالانکہ تم خود اسے جلدی چاہ رہے تھے۔

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ پھر ظالموں سے کہا جائے گا: دائمی عذاب چکھو، جو تم کرتے رہے ہو اس کی سزا کے علاوہ اور تمہیں کیا مل سکتا ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ : اللہ کی طرف سے جب عذاب آئے گا تو ناگہاں آئے گا۔ اس سے بچنے کی مہلت نہیں ملے گی۔ ایسے عذاب کے بارے میں تم جلد بازی کرتے ہو جب کہ یہ عذاب تو بچنے کی چیز ہے، نہ جلد بازی کی۔

۲۔ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ: جب تم عذاب کا مشاہدہ کرو گے تو اس وقت ایمان لے آؤ گے۔ اس اضطراری ایمان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، نہ اس عذاب سے بچنے کا کوئی راستہ ہوگا جس کے بارے میں تم طنز اور استہزا کیا کرتے تھے۔

۳۔ اس دنیوی عذاب و ذلت کے بعد ابدی عذاب کا بھی مزہ چکھنا ہوگا جو ان کے کرتوتوں کا لازمی نتیجہ ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ منکرین کو کبھی دنیا و آخرت، دونوں میں عذاب دیا جاتا ہے: اِنۡ اَتٰىکُمۡ عَذَابُہٗ بَیَاتًا...۔

۲۔ عذاب آنے پر ایمان لانا فائدہ نہیں دیتا: اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنۡتُمۡ ...۔

وَ یَسۡتَنۡۢبِـُٔوۡنَکَ اَحَقٌّ ہُوَ ؕ قُلۡ اِیۡ وَ رَبِّیۡۤ اِنَّہٗ لَحَقٌّ ؕ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ﴿۵۳﴾

۵۳۔اور یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں (کہ جو آپ کہہ رہے ہیں) کیا وہ حق ہے؟ کہد یجیے: ہاں! میرے رب کی قسم یقیناً یہی حق ہے اور تم اللہ کو کسی طرح عاجز نہیں کر سکتے۔

تفسیر آیات

منکرین اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر بات کی تکذیب کرتے تھے لیکن وہ اندر سے خوفزدہ بھی تھے اور پوچھتے تھے کہ یہ دھمکی وحشت زدہ کرنے کے لیے ہے یا واقعی ہے؟ جواب نہایت ٹھوس لفظوں میں دیا کہ اس عذاب نے توحتماً آنا ہے۔ جب یہ عذاب آئے گا تو اس وقت تم کچھ کر بھی نہیں کر سکتے:

اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَہٗ مِنۡ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾[۵۲] — آپ کے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے، اسے ٹالنے والا کوئی نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ عذاب الٰہی کو بعید از امکان تصور کرنا جرائم کا باعث ہے۔

وَ لَوۡ اَنَّ لِکُلِّ نَفۡسٍ ظَلَمَتۡ مَا فِی الۡاَرۡضِ لَافۡتَدَتۡ بِہٖ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَۃَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ ۚ وَ قُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ﴿۵۴﴾

۵۴۔ اور جس جس نے ظلم کیا ہے اگر اس کے پاس روئے زمین کی دولت بھی ہو تب بھی وہ (عذاب سے بچنے کے لیے یہ پوری دولت) فدیہ دینے پر آمادہ ہو جائے گا اور جب عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو دل ہی دل میں پشیمان ہوں گے اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ ہو گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَوۡ اَنَّ: عذاب کی شدت اور حدت کی طرف اشارہ ہے کہ منکر اس سے بچنے کے لیے ہر قیمت

----

۵۲ طور: ۷۔۸

ادا کرنے پر آمادہ ہوگا۔ وہ دنیا میں عذاب سے بچنے کے لیے ایک روپیہ دینے کے لیے حاضر نہ تھا، قیامت کے دن جب عذاب کا مشاہدہ کرے گا تو اگر اس کے پاس پوری روئے زمین کی دولت ہو، سب کو فدیہ میں دینے کے لیے تیار ہوگا۔ مشاہدۂ عذاب کے بعد اس میں ایمان آئے گا اور ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ ہر چیز قربان کر دے، اپنے کو عذاب سے بچائے۔ یہ عمل دنیا میں وہ ہستیاں انجام دیتی ہیں جن کا ایمان قیامت میں مشاہدہ کرنے والوں سے بھی زیادہ ہے:

لو کشف الغطاء ما ازددت یقیناً۔[1] اگر پردہ ہٹ بھی جائے تو میرے یقین میں اضافہ نہ ہوتا۔

یقیناً اسی وجہ سے اپنی جان بھی اللہ کی مرضی کے حصول کے لیے قربان کر دیتے ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَہُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ ...[2] اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضاجوئی میں اپنی جان بیچ ڈالتا ہے....

۲۔ وَاَسَرُّوا النَّدَامَۃَ: اور رسوائی کا یہ عالم ہوگا کہ وہ اپنی ندامت کا اظہار بھی نہیں کر پائیں گے اور دل ہی دل میں پچھتاتے رہیں گے۔

۳۔ وَقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ: مجرم کو اس کے جرم کے مطابق سزا دی جائے گی۔ کسی جذبہ انتقام سے نہیں، عدل انصاف کی بنیاد پر ہوگی۔

اہم نکات

۱۔ عذاب باوجود ہولناک ہونے کے عادلانہ ہوگا: وَقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ ....

۲۔ قیامت کے دن حقیقی قدریں اجاگر ہوں گی: لَافۡتَدَتۡ بِہٖ ....

۵۳ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۵﴾ ہُوَ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۵۔ آگاہ رہو! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے یقیناً وہ اللہ کی ملکیت ہے، اس بات پر بھی آگاہ رہو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۵۶۔ وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَاۤ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ: پوری کائنات کی ملکیت جب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے تو اس میں اللہ

---

[1] فرمان امیر المومنین (ع) ارشاد القلوب ۲: ۲۱۲ [2] ۲ بقرۃ: ۲۰۷

اپنی حکمت کے مطابق جیسے چاہے گا تصرف کرے گا۔ لہٰذا وعدۂ الٰہی کے حق ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، نہ ہی اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی صاحب اختیار ہے جو اللہ کے وعدے کے سامنے آڑے آئے۔

۲۔ هُوَ يُحۡيٖ وَيُمِيۡتُ: اور موت و حیات بھی اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ بالآخر اسی کی طرف ہی پلٹ کر جانا ہے۔ ایک وعدے کے پورے ہونے کے جو لوازم و شرائط ہیں وہ سب اللہ کے قبضے میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ مالک ارض و سماء کا وعدہ پورا نہ ہوگا تو کس کا وعدہ پورا ہوگا: اَلَاۤ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ ....

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوۡرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۵۷﴾	۵۷۔ اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے (یہ قرآن) تمہارے پاس نصیحت اور تمہارے دلوں کی بیماری کے لیے شفا اور مومنین کے لیے ہدایت اور رحمت بن کر آیا ہے۔

تشریح کلمات

مَّوۡعِظَةٌ: (و ع ظ) الوعظ کے معنی ایسے زجر و توبیخ کے ہیں جس میں خوف کی آمیزش ہو۔

تفسیر آیات

قرآن کی تکذیب کرنے والوں کو عذاب دارین سے آگاہ کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر قرآن مجید میں مضمر انسان ساز خواص و اوصاف کو بیان فرمایا:

۱۔ مَّوۡعِظَةٌ: قرآن موعظہ ہے۔ انسان کو ہر قسم کے خطرات سے بچاتا ہے اور قرآنی و الٰہی مواعظہ پر عمل کرنے والا شخص پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۲۳۲ میں موعظہ الٰہی کے بارے میں فرمایا:

ذٰلِكُمۡ اَزۡكٰى لَكُمۡ وَاَطۡهَرُ .... تمہارے لیے نہایت شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے.

موعظ سے انسان میں ارتقائی صلاحیت آجاتی ہے اور ظرف پاک ہو جاتا ہے۔

۲۔ وَشِفَآءٌ: قرآن دل کے تمام روحانی امراض کے لیے شفا ہے۔ قرآن میں تعصب کے بغیر غور و فکر کرنے سے دلوں میں موجود تمام شکوک و شبہات کے لیے تشفی، ہر قسم کے تزلزل اور اضطراب کے لیے عافیت مل جاتی ہے اور شرک، کفر، نفاق، باطل پرستی، ظلم و عداوت کا مؤثر ترین علاج میسر آجاتا ہے۔ دل کے موضوع پر ہم پہلے بات کر چکے ہیں۔

۳۔ وَهُدًى: قرآن، انسان کو ہر قسم کے ہلاکت خیز راستوں سے بچا کر راہ راست کی طرف

ہدایت کرتا ہے جس میں دنیا و آخرت دونوں کی سعادت موجود ہے۔

۴۔ وَّ رَحۡمَۃٌ: قرآن، رحمت خدا اور ارحم الراحمین کی تجلی ہے مگر یہ خاص ہے مؤمنین کے کے لیے کیونکہ زمین زرخیز ہو تو نمی فائدہ دیتی ہے۔ غیر مؤمن میں اللہ کی رحمت کے لیے ظرف نہیں ہوتا۔ یہ ہیں وہ ارتقائی مراحل جو موعظہ سے شروع ہو کر رحمت پر ختم ہوتے ہیں۔ پہلے تین مراحل کے مخاطب عامۃ الناس ہیں۔ ان مراحل کو طے کرنے کے بعد انسان ایمان کی منزل پر فائز ہو جاتا ہے اور اس کے بعد رحمت خدا اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔

قرآن اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعہ موعظہ ملتا ہے، شفا ملتی ہے، ہدایت میسر آتی ہے، آخر میں رحمت الٰہی سے مؤمن سرشار ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ بدبخت ہے وہ شخص جس پر اللہ کے مواعظہ اثر نہ کریں، جس کے دل کی بیماریاں قرآن سے دور نہ ہوں، جو قرآن کو اپنا راہنما نہ بنائے، جس کے لیے قرآن رحمت الٰہی کا ذریعہ نہ بنے۔

۲۔ قرآن فضل خداوندی کا سرچشمہ ہے: قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ شِفَآءٌ ....

قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰہِ وَ بِرَحۡمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ ہُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ کہد یجیے: اللہ کے اس فضل اور اس کی اس رحمت کو پا کر لوگوں کو خوش ہونا چاہیے کیونکہ یہ اس (مال و متاع) سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

قرآن کے ذریعے جس فضل و کرم سے اللہ نے اپنے بندوں کو نوازا ہے اور اسے فیضان رحمت کا وسیلہ بنایا ہے وہ مؤمن کے لیے متاع حیات و سرمایۂ زندگی ہے۔ اگر انسان نے کسی چیز کو پا کر خوش ہونا ہے تو اس فضل و رحمت کو پا کر اسے خوش ہونا چاہیے۔

حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں کہا گیا ہے:

ان الفضل القران والرحمۃ محمد صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم[1]	فضل قرآن اور الرحمۃ، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

ابن عباس سے دوسری روایت میں آیا ہے:

---

[1] المنار ۱۱: ۴۰۴

قال بفضل اللّٰہ النبی صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم و برحمۃ علی علیہ السلام۔[1]

بفضل اللّٰہ سے مراد حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور برحمتہ سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

یہی روایت مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف سے مروی ہے نیز الدر المنثور تاریخ بغداد ۵: ۱۵، تاریخ دمشق ۲: ۴۲۶ میں مذکور ہے۔

اہم نکات

۱۔ حقیقتاً مؤمن ہی خوشحال ہوتا ہے: فَلۡیَفۡرَحُوۡا ....۔

۲۔ مؤمن اللہ کے اس فضل و رحمت پر نازاں ہوتا ہے جب کہ غیر مؤمن مال و متاع پر نازاں ہوتا ہے: هُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ۔

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ فَجَعَلۡتُمۡ مِّنۡہُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلۡ آٰللّٰہُ اَذِنَ لَکُمۡ اَمۡ عَلَی اللّٰہِ تَفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ کہد یجیے: یہ تو بتاؤ کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لیے نازل کیا ہے اس میں سے تم از خود کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال ٹھہراتے ہو؟ کہد یجیے: کیا اللہ نے تمہیں (اس بات کی) اجازت دی ہے یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟

تفسیر آیات

سورہ مائدہ آیت ۱۰۳ میں اور سورہ انعام آیت ۱۳۶ میں اس بات کا ذکر آچکا کہ مشرکین کچھ جانوروں کو از خود حرام قرار دیتے تھے اور کچھ کو حلال۔ اس آیت میں مشرکین کی طرف سے قانون سازی میں مداخلت پر سرزنش کی گئی ہے کہ قانون سازی کے تحت حلال وحرام کرنے کا حق تو صرف اللہ کو حاصل ہے۔ یہ قانون جو تم لوگوں نے بنایا ہے، دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو اللہ نے تمہیں ایسا کرنے کی اجازت دی ہے، ورنہ اللہ کی طرف نسبت ہے جو کہ افتراء ہے۔

واضح رہے کہ قانون سازی کا حق، بالادستی اور حاکمیت کے مترادف ہے۔ اللہ کو حاکمیت اعلیٰ کا حق دینے کے بعد اللہ کی حاکمیت اعلیٰ میں مداخلت کرنے کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں ہوتا۔

مشرکین اللہ کو خالق اور رازق مانتے تھے۔ اس کے باوجود وہ مقام تشریع و تقنین میں اللہ کی حاکمیت اعلیٰ میں مداخلت کرتے تھے۔

آج کے مسلمان بھی اللہ کے وجود کے معترف ہوتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ

---

[1] شواھد التنزیل ۱: ۳۵۲

تعالیٰ کا حق ہے۔ اس کے باوجود وہ تشریع و تقنین میں اللہ کی حاکمیت اعلیٰ میں مداخلت کرتے ہیں بلکہ اللہ کے قانون کے خلاف قانون وضع کرتے ہیں۔

آیۂ شریفہ میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ تشریع و تقنین میں اللہ کی طرف سے اذن ثابت ہونا چاہیے اور اس کا ذریعہ قرآن و سنت ہے۔ اگر یہ ثابت نہ ہو تو مداخلت فی التشریع ہے اور اللہ پر افتراء کرنے اور بہتان باندھنے کے مترادف ہے۔

قیاس و استحسان اور ذاتی رائے یقیناً مَّآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ میں سے نہیں ہے۔ لہٰذا ان چیزوں کے ذریعے احکام شریعت اور حلال و حرام ثابت کرنا بھی مداخلت فی التشریع ہے، خواہ اس پر کتنا زور صرف کر دیں کہ اس میں اصل دلیل تو نصوص ہی ہوتے ہیں۔ یقیناً اگر صرف نصوص پر توقف کرتے تو یہ مااذن اللّٰہ میں شامل رہ جاتا لیکن قیاس میں محل نص کے علاوہ غیر منصوص کا حکم ذاتی رائے سے بناتے ہیں۔ مثلاً نص میں آ گیا کفن تیار کرنے کے بعد میت ضایع ہو جائے تو کفن وارث کو واپس جاتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہیں کہ مسجد بے مصرف ہو جائے تو واقف کو واپس جاتی ہے۔ یہاں کفن کا حکم نص میں ہے مگر مسجد کا حکم نص میں نہیں ہے۔ اجتہاد بالرائے کے ذریعے اس کا حکم نکالا ہے جو صریحاً مداخلت فی التشریع ہے اور اس مداخلت کی بنیاد کوئی شرعی دلیل یا اذن اللّٰہ نہیں ہے بلکہ بنیاد صرف یہ خیال ہے کہ کفن اور مسجد دونوں بے مصرف ہیں، لہٰذا دونوں کا حکم ایک ہونا چاہیے۔ حالانکہ دو چیزیں ایک میں نہیں، دس باتوں میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود ان دونوں کا حکم ایک ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پھر مسجد خانۂ خدا، وقف شدہ مال کا ذاتی مال، کفن پر قیاس کرنا کیا اذن خدا ہے؟ ان ھذا لشئی عجاب۔

اہم نکات

۱۔ اجتہاد و استنباط اذن خدا کی حدود میں جائز ہے۔

۲۔ بنیادی طور پر کھانے کی ہر چیز حلال ہے مگر وہ جسے شریعت حرام قرار دے۔

وَمَا ظَنُّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ اور جو لوگ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں ان کا کیا خیال ہے قیامت کے دن کے بارے میں کہ (اللہ ان کیساتھ کیا سلوک کرے گا؟) اللہ تو لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔

تفسیر آیات

اللہ لوگوں پر بڑا فضل و کرم کرنے والا ہونے کے باوجود لوگ ناشکرے ہوتے ہیں اور اللہ پر افترا باندھتے ہیں، اس افترا و بہتان کا لازمی نتیجہ قیامت کے دن ان کے سامنے آئے گا۔ اللہ فضل کا مالک ہونے کے باوجود یہ لوگ فضل خدا کے نہیں، غضب خدا کے مستحق ٹھہرے۔ خطاب اگرچہ مشرکین سے ہے مگر تعبیر کے عموم میں اللہ پر افتراء کرنے والے سب شامل ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی طرف کذب و افتراء بدترین گناہوں میں سے ہے۔ خدا وند عالم ہم سب کو، خصوصاً ان لوگوں کو جو منبروں پر اسلامی حقائق بیان کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں، اس سے بچائے۔ آمین

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۱

۶۱۔ اور (اے نبی) آپ جس حال میں ہوتے ہیں اور آپ قرآن میں سے اللہ کی طرف سے جو تلاوت کر رہے ہوتے ہیں اور تم لوگ جو عمل بھی کرتے ہو دوران مصروفیت ہم تم پر ناظر ہیں اور زمین اور آسمان کی ذرہ برابر اور اس سے چھوٹی یا بڑی کوئی چیز ایسی نہیں جو آپ کے رب سے پوشیدہ ہو اور روشن کتاب میں درج نہ ہو۔

تشریح کلمات

تُفِيْضُوْنَ: (ف ی ض) کہتے ہیں افاضوا فی الحدیث۔ باتوں میں مشغول ہو جانا اور چرچا کرنا۔

يَعْزُبُ: (غ ز ب) العازب۔ دور نکل جانا۔ پوشیدہ ہو جانا۔

تفسیر آیات

منکرین اور مکذبین کی سرزنش کے بعد نہایت جامع الفاظ میں حضورؐ کے لیے اطمینان خاطر اور منکرین کے لیے تنبیہ اور دھمکی پر مشتمل ایک ساتھ چند نکات بیان فرمائے ہیں:

۱۔ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ: رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اطمینان خاطر کے لیے فرمایا: آپ (ص)

تبلیغ و ارشاد کے سلسلے میں جس پر مشقت حالت میں ہیں اور اعلائے کلمۂ حق کے لیے جن مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں، جس انہماک سے لوگوں کو ہدایت کا سامان فراہم کر رہے ہیں، خصوصاً جس ترتیل و لہجے میں آیات قرآنی کی تلاوت کر رہے ہیں، اللہ ان تمام حالات کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ یہ سب اللہ کے حضور میں انجام پا رہے ہیں۔ اللہ ان تمام امور کی نگرانی فرما رہا ہے۔

۲۔ وَلَا تَعۡمَلُوۡنَ مِنۡ عَمَلٍ: اس کے بعد رخ خطاب پوری امت کی طرف ہو گیا اور فرمایا: تم لوگ بھی جو عمل خیر یا بد انجام دیتے ہو، وہ سب اللہ کے سامنے انجام پا رہا ہوتا ہے۔ اس کائنات میں رونما ہونے والا کوئی بھی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں ہے جو اللہ سے پوشیدہ ہو۔ نہ کسی کا عمل خیر ضائع جائے گا، نہ کوئی مجرم سزا سے بچ سکے گا۔

۳۔ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ: یہ سب کتاب مبین میں درج ہے۔ کتاب مبین کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: الانعام آیت ۵۹۔

اہم نکات

۱۔ مالک اگر دیکھ رہا ہو تو انعام پانے والے کے لیے اطمینان اور سزا پانے والے کے لیے اضطراب میں اضافہ ہوتا ہے: کُنَّا عَلَیۡکُمۡ شُہُوۡدًا ....

۲۔ کائنات میں ذرہ سے بھی چھوٹی چیز موجود ہے: وَلَاۤ اَصۡغَرَ مِنۡ ذٰلِکَ ....

اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ سنو! جو اولیاء اللہ ہیں انہیں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَکَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ جو ایمان لائے اور تقویٰ پر عمل کیا کرتے تھے۔

لَہُمُ الۡبُشۡرٰی فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی، اللہ کے کلمات میں تبدیلی نہیں آ سکتی، یہی بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ تعالیٰ جب اپنے خاص بندوں کا ذکر فرماتا ہے تو پورے اہتمام کے ساتھ پہلے توجہ مبذول کراتا ہے: اَلَاۤ سنو! آگاہ رہو! اس کے بعد مضمون شروع ہو جاتا ہے۔

۲۔ اولیائے خدا کو نہ کوئی خوف لاحق ہوگا، نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ ولی الولاء والتوالی کے اصل معنی بقول راغب اصفہانی یہ ہیں: دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو۔ آگے لکھتے ہیں: الولایۃ (بکسر واؤ) کے معنی تصرف، اوالولایۃ (بفتح واؤ) کے معنی کسی کا متولی ہونے کے ہیں۔ اس تشریح کے مطابق ولی کا اصل معنی تولیت و حاکمیت ہے، پھر بطور استعارہ دیگر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ رسول اور امام جب لوگوں کے ولی ہوتے ہیں تو تولیت و حاکمیت کے معنوں میں ہوتا ہے: اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ الَّذِیۡنَ ...[1]

جب کوئی ہستی اللہ کی ولی بن جاتی ہے تو ولایت کے چند ایک آثار اور اللہ کے ولی کے لیے چند باتیں اس آیہ شریفہ میں ثابت فرمائی ہیں:

۱۔ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ: انہیں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ یہاں لَا خَوۡفٌ مطلق ذکر ہوا ہے۔ اس لیے دنیاوی و اخروی دونوں شامل ہے۔ اللہ کے ولی کے دل میں ہمیشہ یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں آداب بندگی میں خلل نہ آئے۔ کہیں کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جو اپنے حقیقی محبوب ذات باری تعالیٰ کے لیے پسند نہ ہو۔ یہ خوف ولی اللہ کو جہاں تمام گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے، وہاں دوسرے تمام خوف سے نجات دلاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

یٰمُوۡسٰی لَا تَخَفۡ ۟ اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ۟[2]	اے موسیٰ! ڈریے نہیں، بے شک میرے حضور مرسلین ڈرا نہیں کرتے۔

اولیاء اللہ وہ ہوتے ہیں جو غیر خدا سے نہیں ڈرتے۔ وہ کیوں ڈریں۔ ان کی ساری زندگی اپنے محبوب کے لیے ہے اور اگر یہ زندگی چلی جاتی ہے تو وہ اپنے محبوب کی بارگاہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ لہٰذا ولی اللہ موت سے بھی نہیں ڈرتے:

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ ہَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّکُمۡ اَوۡلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۟[3]	کہدیجیے: اے یہودیت اختیار کرنے والو! اگر تمہیں یہ زعم ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو دوسرے لوگ نہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔

ولی اللہ عاشق خدا ہوتا ہے اور اپنے رب کی ملاقات کا اشتیاق رکھتا ہے۔ ولی اللہ اس اشتیاق کے تحت لقائے رب کی منزل پانے پر کہہ اٹھتا ہے:

فزت و ربّ الکعبۃ۔[4]	رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔

۲۔ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ: وہ رنجیدہ اور غمگین نہیں ہوتے۔ ولی اللہ کو کوئی مادی اور دنیاوی بات رنجیدہ نہیں کرسکتی۔ وہ رنجیدہ کیوں ہو کیونکہ وہ تو ہمیشہ اپنے آپ کو کامیاب دیکھتا ہے۔ اس کی زندگی کی متاع

---

[1] ۵ مائدہ: ۵۵　[2] ۲۷ نمل: ۱۰　[3] ۶۲ جمعہ: ۶　[4] امیر المؤمنین علیہ السلام۔ بحار الانوار ۲۰: ۱۴۷

رضائے رب ہے۔ ولی اللہ کا نعرہ ہوتا ہے:

ما ذا وجد من فقدك و ما الذی فقد من وجدك ....[1]	اے اللہ جس نے تجھے کھویا اس نے کیا پایا اور جس نے تجھے پایا اس نے کیا کھویا۔

ولی اللہ اپنی زندگی میں اللہ کو پانے کے بعد کچھ بھی نہیں کھو دیتا تو وہ رنجیدہ کس بات کے لیے ہو۔ آخرت میں بھی کوئی رنج نہیں ہوگا۔ یہ تو واضح ہے محبّ کو محبوب کے پاس کوئی حزن و ملال نہیں ہوا کرتا:

فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ....[2]	اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انہیں دیا ہے اس پر وہ خوش ہیں....

۳۔ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: یہ اولیآء اللہ ایمان کے ایک خاص درجہ پر فائز ہیں، ورنہ وہ ایمان جو کبھی شرک کے ساتھ آلودہ رہا ہو، انسان کو مقام ولایت پر فائز نہیں کر سکتا۔ ایمان کے اس خاص رتبہ پر فائز ہونے کے بعد انسان اپنے آپ کو کاملاً اللہ کے حوالہ کر دیتا ہے اور اللہ ہی کو کل کا مالک مان لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو کسی چیز کا حتیٰ اپنی جان کا بھی مالک نہیں سمجھتا تو جب وہ مالک ہے نہیں تو کیا کھوئے گا؟ جب کوئی چیز کھو نہیں دیتا تو حزن و خوف کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

۴۔ وَکَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ: ماضی استمراری کے ساتھ تعبیر یہ بتاتی ہے کہ وہ تقویٰ کو ایمان کے تمام مراحل میں اپنا شعار بناتے ہیں۔

۵۔ لَہُمُ الۡبُشۡرٰی: دنیا و آخرت دونوں میں ان کے لیے بشارت ہوگی۔ دنیا میں بشارت کا مطلب یہ ہوگا کہ انہیں کامیابی کی خوشخبری دی جاتی ہے اور آخرت میں ثواب و رضائے رب کی صورت میں ہوگی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مؤمن کی روح جب سینے تک پہنچ جاتی ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتا ہے اور آپؐ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ہوں۔ تجھے بشارت ہو۔ پھر فرمایا: علی بن ابی طالبؑ کو دیکھے گا اور آپؑ فرمائیں گے: میں علی بن ابی طالب ہوں جس سے تو محبت کرتا تھا۔ آج تیرے کام آؤں گا۔[3]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی حضرت ابو بصیر راوی ہیں:

میرا ایک ہمسایہ حکومت وقت کا حامی تھا۔ اس کے پاس وافر دولت آ گئی۔ وہ مئے نوشی کی محفلیں جماتا تھا جس سے مجھے بڑی اذیت ہوتی تھی۔ میں نے کئی بار خود اس سے شکایت کی لیکن وہ باز نہ آیا اور ان باتوں کا اس پر اثر نہ ہوا۔ ایک دن اس نے کہا:

---

[1] حضرت امام حسین علیہ السلام۔ دعائے عرفہ۔ بحار الانوار ۹۵: ۲۲۶	[2] ۳ آل عمران: ۱۷۰

[3] الکافی ۳: ۱۳۳ باب ما یعاین المؤمن و الکافر۔

میں تو اس گندگی میں مبتلا ہوں آپ سالم ہیں۔ اگر آپ اپنے صاحب (مولا) سے میرا تعارف کراتے تو ممکن ہے آپ کے ذریعے اللہ مجھے بچا لیتا۔ اس بات کا مجھ پر اثر ہوا۔ جب میں حضرت ابو عبد اللہ (امام جعفر صادق علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان سے اس شخص کا حال بیان کیا۔ آپؑ نے فرمایا:

جب کوفہ واپس جاؤ تو وہ تمہارے پاس آئے گا۔ اس سے کہنا کہ جعفر بن محمد علیہما السلام کہتے ہیں جس چیز کا تو ارتکاب کر رہا ہے اس کو ترک کر دو۔ میں اللہ کے حضور تیرے لیے جنت کا ضامن بنتا ہوں۔

جب میں کوفہ واپس آیا تو دیگر آنے والوں میں یہ بھی میرے پاس آیا۔ میں نے اسے روک رکھا۔ جب خلوت ہوئی تو میں نے اس سے کہا:

میں نے جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام سے تیرا ذکر کیا تھا تو آپؑ نے فرمایا: جب کوفہ واپس جاؤ تو وہ تمہارے پاس آئے گا۔ اس سے کہنا جعفر بن محمد علیہما السلام کہتے ہیں کہ جس چیز کا تو ارتکاب کر رہا ہے اسے ترک کرو۔ میں اللہ کے حضور تیرے لیے جنت کا ضامن بنوں گا۔

یہ سن کر وہ رویا اور پوچھا: بخدا کیا ابو عبد اللہ نے فرمایا ہے؟

میں نے قسم کھائی ایسا ہی فرمایا ہے۔ اس نے کہا: بس کافی ہے اور چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد اس نے مجھے بلایا۔ دیکھتا ہوں وہ اپنے گھر کے عقب میں عریاں بیٹھا ہے اور کہا:

اے ابو بصیر! گھر میں کچھ نہ رہا۔ میں نے سب کچھ نکال دیا اور میرا یہ حال ہو گیا۔

ابو بصیر کہتے ہیں:

میں نے دوستوں سے کچھ کپڑے جمع کر کے اسے پہنائے۔ ابھی چند دن گزرے تھے کہ اس نے مجھے بلایا اور کہا کہ میں مریض ہو گیا ہوں۔ میں اس کا معالجہ کراتا رہا یہاں تک اس کی موت نزدیک آ گئی۔ حالت نزع میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس پر غشی طاری ہو گئی۔ ہوش میں آ کر کہنے لگا:

اے ابو بصیر قد وفی صاحبك لنا۔ آپ کے صاحب (مولا) نے میرے ساتھ اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ پھر اس کی روح پرواز کر گئی۔

حج کے موقع پر میں نے حضرت ابو عبد اللہ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے اجازت طلب کی۔ میں ابھی آپؑ گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ میرا ایک پاؤں صحن میں اور دوسرا پاؤں دروازے کی چوکھٹ پر تھا۔ آپؑ نے فرمایا:

اے ابو بصیر! قد وفینا لصاحبك ہم نے تیرے ساتھی کے ساتھ وعدہ پورا کر دیا۔[1]

"دنیا کی زندگی میں بشارت" کے سلسلے میں یہ واقعہ نہایت درس آموز ہے۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ الکافی ۵: ۱۰۶ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۶۔ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ: مذکورہ اوصاف کے حامل لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی کی بشارت دینے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حتمی فیصلوں میں سے ہے۔ اس میں کسی قسم کا تغیر اور تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

۷۔ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ: ابدی کامیابی سے بڑھ کر اور کامیابی کیا ہو سکتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ جس کے دل میں غیر خدا کا خوف ہو وہ مقام ولایت پر فائز نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ولی خدا دنیا سے اپنی کامیابی کی بشارت لے کر جاتا ہے: لَہُمُ الۡبُشۡرٰی فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ....

وَ لَا یَحۡزُنۡکَ قَوۡلُہُمۡ ۘ اِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ؕ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ اور (اے نبی) آپ کو ان (کافروں) کی باتیں رنجیدہ نہ کریں ساری بالادستی یقیناً اللہ کے لیے ہے، وہ خوب سننے والا، دانا ہے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں فرمایا: اولیاء اللہ کو نہ خوف لاحق ہوتا ہے نہ حزن تو سرکار اولیاء کے لیے نہ ہونا تو نہایت طبعی بات ہے۔ تاہم یہاں حزن و ملال کا امکان اس لیے نظر آتا ہے کہ یہ اپنی ذات کے لیے نہ تھا بلکہ کافروں کی طرف سے دین اسلام، قرآن، توحید اور نظریہ آخرت کو طنز و استہزاء کا نشانہ بنانے پر اللہ کے لیے رنجیدہ ہو رہے تھے۔ اس لیے اپنے حبیب کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ آپؐ رنجیدہ نہ ہوں۔ سارا غلبہ اور ساری طاقت اور بالادستی اللہ کے پاس ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب مکہ میں مشرکین کی اکثریت تھی اور بظاہر قوت و غلبہ اور ساری بالادستی ان کے پاس تھی۔ اسی طاقت و کثرت کی بنیاد پر وہ رسول اللہؐ کی تکذیب کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابو طالب کا یتیم کہہ کر طنز و تعریض کا نشانہ بناتے تھے۔ اس وقت یہ وعدہ فتح و غلبہ ہے اور عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ بالادستی اللہ کے پاس ہے۔ صدق اللّٰہ العلی العظیم۔

اہم نکات

۱۔ طاقت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے: اِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ....

---

[1] الکافی ۱: ۴۷۴ باب مولد ابی عبد اللّٰہ جعفر بن محمد (ع)

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰہِ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ شُرَکَآءَ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ ہُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ آگاہ رہو! جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے یقیناً سب اللہ کی ملکیت ہے اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسرے شریکوں کو پکارتے ہیں وہ کسی چیز کے پیچھے نہیں چلتے بلکہ صرف ظن کے پیچھے چلتے ہیں اور وہ فقط اندازوں سے کام لیتے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ استدلال اس طرح ہے: جب کائنات کی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو اللہ ہی معبود اور رب ہے کیونکہ رب وہ ہوتا ہے جو مالک ہے اور عبد وہ ہے جو اپنے رب کا مملوک ہے۔ غیر اللہ کے پاس کچھ ہے نہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ یہ غیر اللہ مشرکین کے وہم و گمان میں مالک ہیں۔ حقیقت میں وہ خود اللہ کے مملوک ہیں۔ مشرکین جن چیزوں کو اللہ کا شریک بناتے ہیں وہ حقیقت کے مقابلے میں ظن وتخمین کے پیچھے چل رہے ہیں اور حقیقت سے عاری ایک موہوم چیز سے اپنی امیدیں وابستہ کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ توحید اور اس سے متعلقہ تمام باتوں میں قطعی دلیل کے پیچھے چلنا ضروری ہے۔

ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَ النَّہَارَ مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ اس میں تم آرام کرو اور دن کو روشن بنایا، بتحقیق سننے والوں کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

کائناتی نظام میں باہمی ربط اور وحدت سے نظام دہندہ کی ربوبیت اور وحدت پر استدلال ہے۔ ایسا نہیں کہ رات کا وجود دن کے وجود کے ساتھ متصادم ہو بلکہ یہ دونوں ایک ہی نظام حیات کے لیے ضروری ہیں۔ رات آرام وسکون کے لیے تاکہ آنے والے دن کے لیے چارج ہو سکے اور تازہ دم ہو کر دن کی روشنی میں سامان زندگی فراہم کر سکے۔ اس طرح دن اور رات کے قدرتی پہیوں پر یہ قافلہ اپنا سفر جاری رکھ سکے۔

قرآن توحید ربوبیت کے اثبات کے لیے دن اور رات کی حکمت پر زیادہ تکیہ کرتا ہے کیونکہ یہ اس

کائنات میں زمین پر بسنے والوں کے لیے سب سے زیادہ واضح اور محسوس مظاہر قدرت ہیں۔ ایک عام ناخواندہ انسان بھی نہایت سادہ طور پر اس سے توحید ربوبیت کو سمجھ سکتا ہے اور ایک سائنسداں بھی ان دونوں میں مضمر پیچیدگیوں کے پیچھے ایک باشعور ذہن اور اس کی وحدت کا کھوج لگا سکتا ہے۔ البتہ ایک شرط کے ساتھ۔ وہ یہ کہ غیر جانبدار ہو کر ان دلائل پر توجہ دی جائے ورنہ ظن و تخمین کی بنیاد پر ایک موقف بنا لینے کے بعد اس قسم کی واضح دلیل بھی مؤثر نہیں ہوتی۔ اس لیے فرمایا: ان میں صرف ان لوگوں کے لیے رب ایک ہونے نشانیاں ہیں جو ان پر توجہ دیتے اور دلائل کو سنتے ہیں۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سور بقرہ آیت ۱۶۴، سورہ آل عمران آیت ۱۹۰۔

اہم نکات

۱۔ حق کی تلاش کرنے والوں کے لیے اللہ کی نشانیاں مؤثر ہیں: لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ۔

۲۔ جو لوگ رات کو نہیں، صبح دس گیارہ بجے تک سوتے ہیں وہ نظام فطرت و بدن کے باغی ہیں۔ ان کے اعصاب کو سکون میسر نہیں آئے گا: لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ ....

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبۡحٰنَہٗ ؕ ہُوَ الۡغَنِیُّ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ بِہٰذَا ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ وہ کہتے ہیں: اللہ نے کسی کو بیٹا بنا لیا ہے اس کی ذات پاک ہے وہ بے نیاز ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اسی کا ہے، تمہارے پاس اس بات پر کوئی دلیل بھی نہیں ہے، کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں؟

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا: اللہ کے لیے بیٹے کا تصور اللہ کی خالقیت اور مالکیت کے تصور کے منافی اور نہایت مبتذل اور سطحی ذہن کی ایجاد ہے۔ یہ نظریہ تعقل سے خالی صرف محسوس پرستی پر مبنی ہے۔ ان لوگوں نے اللہ کو انسان پر قیاس کر کے یہ رائے قائم کی کہ جس طرح انسان اپنے وجود کو کسی بیٹے کی صورت میں دوام دے سکتا ہے ورنہ وہ مقطوع النسل ہو جاتا ہے، اولاد نہ ہونے سے انسان محرومیت کا احساس کرتا ہے اور اپنے آپ کو بے دست و بازو اور بے یار و مددگار خیال کرتا ہے، اللہ کو بھی ایک محتاج بے سہارا انسان کے مقام پر اتارا جو بہت بڑی جسارت ہے۔

۲۔ ھُوَ الۡغَنِیُّ: اس کی ذات اس قسم کی تمام باتوں سے بے نیاز ہے۔ اللہ کو فرزند کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی کوئی اس کا فرزند ہو سکتا ہے۔

۳۔ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمام کائنات کی نسبت مالک و مملوک کی ہے، نہ کہ فرزندی اور عزیز داری کی۔ تثلیث کے عقیدے نے انسانیت کو جس المیے سے ساتھ دو چار کیا ہے، وہ یہی نسبت کی گمراہی ہے کہ عبد و معبود، خالق و مخلوق کی نسبت کی جگہ باپ اور بیٹے کی نسبت قائم کی، پھر چرچ کی طرف سے دین الٰہی کو خرافات کا مجموعہ بنایا اور اس کی علم دشمنی کی وجہ سے لوگوں نے چرچ کے ساتھ دین سے بیزاری اختیار کی، جس کے اثر پوری انسانیت اور تمام ادیان پر پڑا۔

۴۔ اِنۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ: تمہارے پاس اللہ کے لیے فرزند ہونے پر کوئی دلیل بھی نہیں ہے کہ اللہ کی ربوبیت، خالقیت، معبود ہونے کے لیے فرزند کا ہونا ضروری ہے بلکہ دلیل اس کے خلاف ہے کہ فرزند ہونا اللہ کی ربوبیت، خالقیت اور معبود ہونے کے منافی ہے۔ فرزند باپ کا حصہ ہوتا ہے، جو اس سے جدا ہوتا ہے۔ اگر اللہ کا بیٹا ہے تو یہ بیٹا اللہ کا حصہ ہو گا جو اس سے جدا ہوا۔ اس سے اللہ کا مادی اور مرکب ہونا اور بیٹے کا محتاج ہونا لازم آتا ہے۔ یہ سب اللہ کے لیے محال ہے۔

۵۔ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ: اللہ کے لیے بیٹا ہونے کا مفروضہ جہالت پر مبنی ہے۔ یہ مفروضہ کسی علم و دلیل اور واقعیت پر مبنی نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر موقف کے پیچھے ایک دلیل کا ہونا ضروری ہے: اِنۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ بِہٰذَا....

۲۔ علم کے بغیر کسی بات کو قبول کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ....

قُلۡ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ لَا یُفۡلِحُوۡنَ ﴿۶۹﴾

مَتَاعٌ فِی الدُّنۡیَا ثُمَّ اِلَیۡنَا مَرۡجِعُہُمۡ ثُمَّ نُذِیۡقُہُمُ الۡعَذَابَ الشَّدِیۡدَ بِمَا کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۷۰﴾

۶۹۔ کہہ دیجیے: جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں وہ یقیناً فلاح نہیں پائیں گے۔

۷۰۔ یہ دنیا کی عیش ہے پھر انہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے پھر ہم انہیں شدید عذاب چکھائیں گے اس کفر کی پاداش میں جس کے وہ مرتکب رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ: اللہ پر بہتان باندھنے والے دنیا اور آخرت میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اگر کسی ظاہر بین کو یہ نظر آتا ہے کہ یہ لوگ اللہ پر افتراء و بہتان تراشی کرنے کے باوجود کامیاب ہیں تو اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے کہ یہ کامیابی نہیں ہے۔

۲۔ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا: اللہ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کی دنیاوی چند روزہ زندگی کا زرق و برق کامیابی کا معیار نہیں۔ یہ تو اولاً آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں حقیر ہے۔ ثانیاً خود دنیاوی زندگی میں بھی یہ مال و متاع نہایت حقیر ہے کیونکہ یہ چیزیں ان لوگوں کو دنیا میں بھی سکون و طمانیت نہیں دے سکتیں بلکہ جوں جوں یہ مال و متاع اور مادی ترقیاں زیادہ ہوتی جاتی ہیں ان سے زندگی کا مزہ چھن جاتا ہے۔ بے آرامی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بظاہر وہ خوشحال نظر آتے ہیں مگر وہ اندر کے جحیم میں جل رہے ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ کوئی عاقل شخص چند روزہ زندگی کی خاطر اپنی ابدی زندگی کو تباہ نہیں کرتا: مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا...۔

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ نُوۡحٍ ۘ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكُمۡ مَّقَامِىۡ وَتَذۡكِيۡرِىۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَكُمۡ وَشُرَكَآءَكُمۡ ثُمَّ لَا يَكُنۡ اَمۡرُكُمۡ عَلَيۡكُمۡ غُمَّةً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَىَّ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ انہیں نوح کا قصہ سنا دیجیے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا کر تمہیں نصیحت کرنا تمہیں ناگوار گزرتا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے پس تم اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر مضبوطی سے اپنا فیصلہ کر لو پھر اس فیصلے کا کوئی پہلو تم پر پوشیدہ نہ رہے پھر میرے ساتھ جو کچھ کرنا ہے کر گزرو اور مجھے مہلت بھی نہ دو۔

تشریح کلمات

اجمعوا: (ج م ع) فراء کہتے ہیں: الا جماع العزم علی الامر و الاحکام علیه۔ یعنی اجماع کے معنی کسی امر کے پختہ اور مضبوط کرنے کے ہیں۔[۱] اسی طرح ابن عرہ نے کہا: اجمعو ای اعزموا علیه۔[۲] صدر اسلام میں اجماع سے لغوی معنی مراد لیے جاتے تھے۔ یعنی پختہ عزم کرنا۔ اجمعوا وہ اس وقت کو کہتے تھے جب کسی معاملے میں استحکام پیدا کیا جائے اور اس میں انتشار و تردد نہ آنے دیا جائے۔

غُمَّةً: (غ م م) غمة الامر کے معنی کسی معاملے کا پیچیدہ اور مشتبہ ہونا ہیں۔

[۱و۲] تاج العروس

تفسیر آیات

۱۔ وَاتۡلُ عَلَیۡهِمۡ : تاریخ انبیاء کا وہ حصہ بیان ہو رہا ہے جس میں انبیاء علیہم السلام اسی قسم کے حالات سے دو چار رہے جن سے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں دو چار تھے۔ تکذیب کرنے والوں کی کثرت و قوت ایمان لانے والوں کی قلت وکمزوری۔ منطق و استدلال کے مقابلے میں خرافات۔ ایسے نامساعد حالات میں حضرت نوح نے اپنی قوم کو جس لہجے، انداز میں چیلنج اور جس استقامت اور توکل کا اظہار کیا ہے وہ اس قسم کے حالات سے دو چار ہونے والے حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے باعث تسلی و اطمینان ہے۔

۲۔ اِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكُمۡ : حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: اگر میرا تمہارے درمیان موجود رہنا اور نصیحت کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہے تو ادھر میں اپنے اللہ پر بھروسہ کر کے تمہارے مقابلے کے لیے کھڑا ہوں، تم اپنی پوری طاقت میرے خلاف استعمال کرو اور میرے مقابلے کے لیے اپنے شریکوں کو بھی بلاؤ۔ تم سوچ سمجھ کر میرے خلاف فیصلہ کرو۔ اس فیصلے کا کوئی حصہ تم پر پوشیدہ نہ ہو۔ ہر پہلو کا جائزہ لو پھر مجھ پر حملہ کرو۔

۳۔ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ: فرمایا: فیصلہ کرنے کے فوراً بعد مجھ پر حملہ کرو۔ مجھے مہلت بھی نہ دو کہ میں اپنے دفاع کے لیے کچھ کرسکوں۔ یہ ایسا بھرپور چیلنج ہے کہ قوم جو کچھ کرسکتی ہے میرے خلاف کر ڈالے۔ اس چیلنج میں پوری قوم کے مقابلے میں ایک عظیم طاقت کا اظہار ہے۔ وہ طاقت توکل علی اللہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ پر توکل کی طاقت کے مقابلے میں تمام دنیا کی طاقتیں ہیچ ہیں: فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَكُمۡ ....

فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَمَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ پس اگر تم نے منہ موڑ لیا تو میں نے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگا میرا اجر تو صرف اللہ پر ہے اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں شامل رہوں۔

تفسیر آیات

انبیاء کسی ذاتی اور مادی مفاد کے لیے لوگوں کو حق کی طرف دعوت نہیں دیتے۔ انبیاء کا کوئی مفاد

لوگوں کے ساتھ وابستہ نہیں ہے کہ لوگوں کی توجہ نہ ہونے پر اسے کوئی ضرر پہنچے۔ انبیاء کے سارے مفادات اپنے رب کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس وابستگی کے لیے تسلیم درکار ہے کہ سارے معاملات اسی پر چھوڑ دیے جائیں۔

اہم نکات

۱۔ داعیان حق کو کوئی مفاد جاہل اور نادان لوگوں کے ساتھ وابستہ نہیں کرنا چاہیے: اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ....۔

فَکَذَّبُوۡہُ فَنَجَّیۡنٰہُ وَ مَنۡ مَّعَہٗ فِی الۡفُلۡکِ وَ جَعَلۡنٰہُمۡ خَلٰٓئِفَ وَ اَغۡرَقۡنَا الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ مگر جب انہوں نے نوح کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے بچا لیا اور انہیں (زمین پر) جانشین بنا دیا اور ان سب کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا پھر دیکھ لو جنہیں تنبیہ کی گئی تھی (نہ ماننے پر) ان کا کیا انجام ہوا۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کی قدرت لایزال پر توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ کمزور اور اقلیت والے اس زمین کے وارث بن گئے اور رسول کی تکذیب و تحقیر کرنے والے ایسے مٹ گئے کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

اہم نکات

۱۔ حجت پوری ہونے کے بعد انکار کرنے والوں کا انجام قوم نوح کی طرح ہوتا ہے: کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ۔

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ رُسُلًا اِلٰی قَوۡمِہِمۡ فَجَآءُوۡہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡا بِمَا کَذَّبُوۡا بِہٖ مِنۡ قَبۡلُ ؕ کَذٰلِکَ نَطۡبَعُ عَلٰی قُلُوۡبِ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ پھر نوح کے بعد ہم نے بہت سے پیغمبروں کو اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا پس وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے مگر وہ جس چیز کی پہلے تکذیب کر چکے تھے اس پر ایمان لانے والے نہ تھے، اس طرح ہم حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کے انبیاء کا ذکر ہے۔ ان تمام انبیاء کے ساتھ ان کی قوموں نے ایک ہی روش اختیار کی۔ انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قوم کو حق کی دعوت دیتے اور اللہ کا نمائندہ ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ اس اعلان کو ہر قوم نے مسترد کر دیا، اللہ کے نمائندہ ہونے کی تکذیب کی اور ساتھ اس کے ثبوت کے لیے معجزہ بھی طلب کیا جس پر انبیاء علیہم السلام نے واضح اور روشن دلائل اور معجزات بھی پیش کیے مگر وہ اپنی سابقہ تکذیب پر اڑے رہے۔ آیات و بینات کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ معجزہ پیش کرنے سے قبل اور معجزہ پیش کرنے کے بعد میں کوئی فرق نہیں پڑا اور انبیاء علیہم السلام کی طرف سے پیش کردہ معجزات کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

۲۔ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ: اللہ کسی دل پر ابتداءً مہر نہیں لگاتا۔ اللہ کی طرف سے مہر کا مطلب یہ ہے کہ جب مجرم اپنا جرم جاری رکھتا اور اللہ کی ہدایت کو مسترد کرتا ہے تو دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو اس پر ہدایت کو جبراً تھوپ دے یا اس کو اپنے حال پر چھوڑ دے۔ اللہ جبر نہیں کرتا بلکہ اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ جب سرچشمۂ ہدایت اللہ نے اس سے ہاتھ اٹھا لیا تو اس کو کہیں اور سے ہدایت ملنا نہیں ہے۔ اس طرح اس پر ہدایت کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ یہی مہر لگنا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حدود اللہ سے تجاوز کرنے سے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے: نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام جب فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف مبعوث ہوئے تو وہ بھی ایسے ہی حالات سے دوچار تھے۔ موسیٰ و ہارون علیہما السلام بے بس، بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں اور فرعون اپنی دولت اور اقتدار کے نشے میں بدمست اپنی جاہ و جلالت اور سلطنت کی بنا پر موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے

میں بڑے متکبرانہ انداز میں پیش آتا اور کسی قسم کے جرم کے ارتکاب سے باز نہیں آتا تھا۔ قصۂ موسیٰ (ع) و فرعون کی مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ اعراف آیت ۱۰۲ تا ۱۵۵)

اہم نکات

۱۔ ہر نبی کو اس کی قوم نے حقیر سمجھا اور تکبر سے پیش آئی: فَاسۡتَکۡبَرُوۡا ....

فَلَمَّا جَآءَھُمُ الۡحَقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوۡۤا اِنَّ ھٰذَا لَسِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ پھر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آیا تو کہنے لگے: بے شک یہ تو صریح جادو ہے۔

قَالَ مُوۡسٰۤی اَتَقُوۡلُوۡنَ لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَکُمۡ ؕ اَسِحۡرٌ ھٰذَا ؕ وَ لَا یُفۡلِحُ السّٰحِرُوۡنَ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ موسیٰ نے کہا: جب حق تمہارے پاس آیا تو کیا اس کے بارے میں یہ کہتے ہو، کیا یہ جادو ہے؟ جب کہ جادوگر تو کبھی فلاح نہیں پاتے۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو معجزات پیش کیے تھے ان کے انکار کے لیے منکرین کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ اسے جادو قرار دیں جب کہ حق اور جادو میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ کیا جادو کے ذریعے انسان ساز دستور دیا جا سکتا ہے؟ کیا جادو کے ذریعے دارین کی سعادت کے لیے انسان کی رہنمائی کی جا سکتی ہے؟ کیا جادو انسان کو اخلاق و روحانیت کی منزل پر فائز کر سکتا ہے؟

۲۔ اَسِحۡرٌ ھٰذَا: تم حق کو جادو کہتے ہو۔ پھر استفہام انکاری کے طور پر فرمایا: کیا یہ جادو ہے؟ اَتَقُوۡلُوۡنَ لِلۡحَقِّ تم حق کو جادو کہتے ہو جب کہ حق امر واقع کی نشاندہی کرتا ہے اور جادو صرف نظروں کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اس کا حق اور امر واقع کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ حق ساتھ نہ ہو تو تصنع سے کامیابی نہیں ملا کرتی: وَلَا یُفۡلِحُ السّٰحِرُوۡنَ۔

قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِتَلۡفِتَنَا عَمَّا وَجَدۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا وَ تَکُوۡنَ لَکُمَا الۡکِبۡرِیَآءُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَا نَحۡنُ لَکُمَا بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ وہ کہنے لگے: کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمیں اس راستے سے پھیر دو جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور ملک میں تم دونوں کی بالادستی قائم ہو جائے؟ اور ہم تو تم دونوں کی بات ماننے والے نہیں ہیں۔

تشریح کلمات

لِتَلۡفِتَنَا: (ل ف ت) لفته عن کذا۔ کسی چیز سے پھیر دینا۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا: حضرت موسیٰ علیہ السلام جو کچھ پیش کر رہے تھے وہ مصریوں کے آبائی مذہب کے سراسر خلاف تھا۔

۲۔ وَتَکُوۡنَ لَکُمَا الۡکِبۡرِیَآءُ: مصری مذہب کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے بادشاہ کو خدا کا اوتار مانتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا نتیجہ آج کل کی اصطلاح کے مطابق دینی اور سیاسی یکساں طور پر نکلتا تھا۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا مطلب یہ بنتا تھا کہ مصر کی بادشاہت غیر قانونی ہے اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اللہ کے حقیقی نمائندہ ہیں۔ اس سے واضح ہو رہا تھا کہ مصری مذہب نے جو مقام فرعون کو دے رکھا تھا، حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اللہ کے نمائندے ہونے کے اعتبار سے اسی مقام کے مدعی تھے۔

اہم نکات

۱۔ مفاد و اقتدار پرستوں کے ساتھ دین کی جنگ رہی ہے: وَتَکُوۡنَ لَکُمَا الۡکِبۡرِیَآءُ ....

۲۔ متکبر اپنی کبریائی اور اقتدار چھوڑ کر ایمان نہیں لاتا: وَمَا نَحۡنُ لَکُمَا بِمُؤۡمِنِیۡنَ ۔

وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ائۡتُوۡنِیۡ بِکُلِّ سٰحِرٍ عَلِیۡمٍ ﴿۷۹﴾

۷۹۔ اور فرعون نے کہا: تمام ماہر جادوگروں کو میرے پاس لے آؤ۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَۃُ قَالَ لَہُمۡ مُّوۡسٰۤی اَلۡقُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ مُّلۡقُوۡنَ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ جب جادوگر حاضر ہوئے تو موسیٰ نے ان سے کہا: تمہیں جو کچھ ڈالنا ہے ڈالو۔

فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا قَالَ مُوۡسٰی مَا جِئۡتُمۡ بِہِ ۙ السِّحۡرُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَیُبۡطِلُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ پس جب انہوں نے ڈالا تو موسیٰ نے کہا: جو کچھ تم نے پیش کیا ہے وہ جادو ہے، اللہ یقیناً اسے نابود کر دے گا، بے شک اللہ مفسدوں کے کام نہیں سدھارتا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ: چنانچہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کا مقابلہ کرنے کے لیے

اپنے ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو بلایا اور مصر کے کسی تہوار کے دن برملا مقابلے کے لیے آمادہ کیا:

قَالَ مَوۡعِدُکُمۡ یَوۡمُ الزِّیۡنَۃِ وَ اَنۡ یُّحۡشَرَ النَّاسُ ضُحًی ۝ [1] — موسیٰ نے کہا: تمہارے ساتھ جشن کے دن وعدہ ہے اور یہ کہ دن چڑھے لوگ جمع کیے جائیں۔

۲۔ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَۃُ: فرعون کے جادوگر جشن کے دن سب لوگوں کے سامنے آگئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان جادوگروں سے فرمایا: پہلے تم اپنے فن کا مظاہرہ کرو۔

فَاِذَا حِبَالُہُمۡ وَ عِصِیُّہُمۡ یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِہِمۡ اَنَّہَا تَسۡعٰی ۝ [2] — اتنے میں ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کی وجہ سے موسیٰ کو دوڑتی محسوس ہوئیں۔

۳۔ مَا جِئۡتُمۡ بِہِ ۙ السِّحۡرُ: تم نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ جادو ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۴۔ اِنَّ اللّٰہَ سَیُبۡطِلُہٗ: اللہ تمہارے سحر کو باطل ثابت کر دے گا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا بحکم خدا پھینکا تو عصا اژدھے کی شکل میں آ کر ان کی لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل لیا۔

۵۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ: معجزاتِ موسیٰ علیہ السلام کو فرعونیوں نے سحر کہہ کر مسترد کیا تھا۔ آج حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سحر کی نشاندہی کا موقع ملا اور فرمایا: سحر تو یہ ہے جو تم پیش کر رہے ہو، صرف نظروں کا دھوکہ، حقائق سے عاری۔ کوئی مشن نہ کوئی پیغام، نہ کوئی انسانی تحریک۔ ایسے جادو کو تو اللہ خود نابود کر دے گا۔ جیسا کہ اللہ کا فرین، فاسقین کی ہدایت نہیں کرتا ایسے مفسدوں کے کام کو سدھارتا نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ جس کے ساتھ حق ہو وہ ناحق کی چال بازیوں سے خوف نہیں کھاتا: اِنَّ اللّٰہَ سَیُبۡطِلُہٗ ....

۷۳

وَ یُحِقُّ اللّٰہُ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۸۲﴾ — ۸۲۔ اور اللہ اپنے فیصلوں سے حق کو ثابت کر دکھاتا ہے خواہ مجرموں کو ناگوار گزرے۔

تفسیر آیات

۱۔ بِکَلِمٰتِہٖ: کلمات سے مراد اللہ کا تکوینی ارادہ یا وعدۂ فتح و نصرت یا معجزات و دلائل ہیں۔ اللہ اپنے فیصلوں کے ذریعے حق کو دوام و ثبات فراہم اور باطل کو نابود کرتا ہے۔ البتہ باطل کو کچھ وقت کے لیے مہلت مل جاتی ہے، دوام نہیں ملتا۔ آج اسلامی تعلیمات کی شکل میں عظمت موسیٰ علیہ السلام زندہ و تابندہ

---

[1] طٰہٰ: ۵۹ [2] طٰہٰ: ۶۶

ہے۔ جب کہ فرعونیت ظلم و استبداد کی نشانی ہے۔

۲۔ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ: مجرموں پر ناگوار اس لیے گزرتا ہے چونکہ ان لوگوں نے حق کا راستہ روکنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگائی تھی۔ ان تمام کوششوں کے باوجود ذلت کے ساتھ شکست کھانا ان کے لیے یقیناً ناگوار گزرے گا۔

اہم نکات

۱۔ حق کے ثبات اور استحکام سے مجرم کبھی خوش نہیں ہوتا: وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ۔

فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوۡسٰۤی اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ مِّنۡ قَوۡمِہٖ عَلٰی خَوۡفٍ مِّنۡ فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہِمۡ اَنۡ یَّفۡتِنَہُمۡ ؕ وَ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ لَعَالٍ فِی الۡاَرۡضِ ۚ وَ اِنَّہٗ لَمِنَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿۸۳﴾

۸۳۔ چنانچہ موسیٰ پر ان کی اپنی قوم کے چند افراد کے سوا کوئی ایمان نہ لایا، فرعون اور اس کے سرداروں کے خوف کی وجہ سے کہ کہیں وہ انہیں مصیبت سے دوچار نہ کر دیں کیونکہ ملک میں فرعون کی بالادستی تھی اور وہ حد سے بڑھا ہوا تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ سے مراد مفسرین نے کہا ہے کہ ضعیف اور کمزور لوگ ہیں۔ یعنی قوم موسیٰ سے چند بے آسرا لوگ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور ممکن ہے ذریت سے مراد چھوٹی عمر کے جواں سال افراد ہوں جو فرعون کے جبر و استبداد اور ظلم و تشدد کی پرواہ کیے بغیر ایمان لے آئے۔ اس خوف کے پیچھے جو اسباب کار فرما تھے قرآن مجید ان کو بیان فرماتا ہے۔ وہ دو باتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ لَعَالٍ فِی الۡاَرۡضِ فرعون کو اس ملک میں بالا دستی حاصل تھی اور دوسری بات یہ کہ وَ اِنَّہٗ لَمِنَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ وہ کسی قانون و اخلاق یا انسانی قدروں کی حد بندی کا قائل نہ تھا۔ طاغوت کے پاس جب طاقت اور بالادستی آ جاتی ہے تو اس سے خوف نہ کرنا ہر ایک کے بس بات نہیں ہوتی۔

۲۔ قَوۡمِہٖ سے قوم فرعون اور بنی اسرائیل کی قوم یا دونوں مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ جس قوم کی طرف موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے وہ بنی اسرائیل اور قبطی قوم دونوں ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ابوجعفر الاحول سے فرما رہے تھے: کیا تو بصرہ گیا تھا؟

عرض کیا: جی ہاں

فرمایا: لوگوں کا ہماری طرف رجوع اور ہمارے مکتب میں شمولیت کیسی تھی؟
عرض کیا: بہت کم۔
فرمایا: علیك بالاحداث فانهم اسرع الی كل خیر۔
تم نئی نسل پر توجہ دو۔ وہی لوگ ہر کار خیر کی طرف سبقت لے جاتے ہیں۔[1]

اہم نکات

۱۔ ایمان کی تاریخ ان لوگوں نے بنائی جو جابروں کے ظلم وتشدد کی پرواہ کیے بغیر ایمان لے آئے۔

وَقَالَ مُوۡسٰی یٰقَوۡمِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰہِ فَعَلَیۡہِ تَوَکَّلُوۡۤا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّسۡلِمِیۡنَ﴿۸۴﴾
فَقَالُوۡا عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلۡنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَۃً لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۸۵﴾ۙ
وَ نَجِّنَا بِرَحۡمَتِکَ مِنَ الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۸۶﴾

۸۴۔ اور موسیٰ نے کہا: اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسا کرو اگر تم مسلمان ہو۔
۸۵۔ پس انہوں نے کہا: ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا ہے، اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالموں کے لیے (ذریعہ) آزمائش نہ بنا۔
۸۶۔ اور اپنی رحمت سے ہمیں کافر قوم سے نجات عطا فرما۔

تفسیر آیات

۱۔ فَعَلَیۡہِ تَوَکَّلُوۡۤا: توکل اور بھروسہ، ایمان کے بعد بہت بڑی طاقت ہے، جس کے ساتھ طاغوت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اللہ پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ اپنی سی محنت و توجہ کے بعد تمام تر امور اللہ کے سپرد کیے جائیں اور نتیجہ اسی پر چھوڑ دیا جائے۔ ظاہری علل و اسباب کو اگرچہ تمہیدی دخل ہے لیکن منزل مقصود تک جانے کے لیے توکل کی ضرورت ہے۔ یہاں توکل کے لیے دو باتوں کو بنیاد بنایا۔ ایک یہ کہ ایمان ہو:

i۔ اِنۡ کُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰہِ: ظاہر ہے ایمان باللہ کے بغیر توکل علی اللّٰہ کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

ii۔ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّسۡلِمِیۡنَ: دوسری بات یہ کہ تسلیم کی منزل پر ہو کہ اللہ کے ہر فیصلے کو تسلیم و رضا سے لیا جائے

۲۔ فَقَالُوۡا عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلۡنَا: جواب میں اہل ایمان نے کہا: ہم اللہ پر توکل اور دو چیزوں کی اللہ

----

[1] الکافی ۸: ۹۳

سے درخواست کرتے ہیں:

i۔ لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَۃً: ظالموں کو آزمانے کے لیے ہم کو ذریعہ امتحان نہ بنا۔ ایسا نہ ہو کہ قوم موسیٰ کے ظلم کی داستان ہمارے خون سے لکھی جائے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں روایت ہے۔ فرمایا:

قال لا تسلطهم علینا فتفتنهم بنا۔[1] ان کو ہم پر مسلط نہ فرما کہ ہمارے ذریعے ان کے آزمائش ہو۔

ii۔ وَ نَجِّنَا بِرَحۡمَتِکَ: دوسری درخواست یہ ہے کہ ہم کو فرعون جیسے کافروں سے نجات مرحمت فرما۔

اہم نکات

۱۔ توکل علی اللہ ایمان کا لازمی نتیجہ ہے: اِنۡ کُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰہِ فَعَلَیۡہِ تَوَکَّلُوۡۤا ....

وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰی وَ اَخِیۡہِ اَنۡ تَبَوَّاٰ لِقَوۡمِکُمَا بِمِصۡرَ بُیُوۡتًا وَّ اجۡعَلُوۡا بُیُوۡتَکُمۡ قِبۡلَۃً وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ اور ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ مصر میں اپنی قوم کے لیے مکانات مہیا کرو اور اپنے مکانوں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو اور مومنوں کو بشارت دو۔

تشریح کلمات

تَبَوَّاٰ: (ب و ء) البواء کے اصل معنی کسی جگہ کے اجزاء کا مساوی (ہموار) ہونا کے ہیں۔ سازگار جگہ کو مکان بواء کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ بُیُوۡتًا: حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم ملتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے مصر میں مکانات تیار کریں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے وہ گھروں میں نہیں رہتے تھے، خیموں میں بدوؤں کی طرح رہتے تھے؟ بعض کہتے ہیں: بیوت سے مراد یہ ہے کہ وہ خیموں میں رہائش اختیار کرنی شروع کریں، یہاں سے فلسطین کی طرف روانہ ہونے کی تیاری کے لیے۔ چنانچہ توریت کے سفر خروج فصل چہارم میں آیا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو تین دن عید الفصح منانے کے لیے صحرا میں

---

[1] تفسیر عیاشی ۲: ۱۲۷ ذیل آیہ

لے جاؤ۔ بعض کہتے ہیں ان گھروں سے مراد مساجد ہیں۔ جیسے فرمایا:

فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَ یُذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ ۔۔۔[1] | ایسے گھروں میں ہیں جن کی تعظیم کا اللہ نے اذن دیا ہے اور ان میں اس کا نام لینے کا بھی۔۔۔

بعض نے کہا اپنے گھروں ہی کو مسجد قرار دو۔ چونکہ فرعون نے بنی اسرائیل کی عبادت گاہوں کو مسمار کر دیا تھا۔ بعض نے کہا ہے: بُیُوۡتَکُمۡ قِبۡلَۃً کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھروں کو متقابلین آمنے سامنے بناؤ۔

۲۔ ظاہر آیت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو اللہ کی طرف سے وحی ہوئی کہ سکونت کے لیے مکانات تعمیر کیے جائیں جیسا کہ تَبَوَّاٰ اور بُیُوۡتًا سے ظاہر ہے دوسرا حکم یہ ہوا کہ اپنے گھروں کو قبلہ بنا دو۔ قرآنی اصطلاح میں قبلہ اسی مکان کو کہتے ہیں جس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے اور وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ قرینہ بھی ہے کہ قبلہ سے یہی معنی مراد ہے۔

اسی سلسلے میں مفسرین نے جو تفصیل لکھی ہے وہ محض ظن و تخمین پر مبنی ہے۔ بحار الانوار اور مستدرك الوسائل کی روایت سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ گھروں میں نماز پڑھیں: امروا ان یصلوا فی بیوتھم۔[2] ممکن ہے گھر تعمیر کرنے کا حکم اسی لیے ہوا ہو کہ فرعونیوں کی نظر سے پوشیدہ ہو کر عبادت کی رسوم قائم کی جا سکیں۔

اہم نکات

۱۔ فرعون جیسے استبدادی نظام میں بھی نماز اور نماز کی جگہ کو اولیت دی گئی ہے۔

وَ قَالَ مُوۡسٰی رَبَّنَاۤ اِنَّکَ اٰتَیۡتَ فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَاَہٗ زِیۡنَۃً وَّ اَمۡوَالًا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۙ رَبَّنَا لِیُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِکَ ۚ رَبَّنَا اطۡمِسۡ عَلٰۤی اَمۡوَالِہِمۡ وَ اشۡدُدۡ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَلَا یُؤۡمِنُوۡا حَتّٰی یَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ ﴿۸۸﴾

۸۸۔ اور موسیٰ نے عرض کی: اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیاوی زندگی میں زینت بخشی اور دولت سے نوازا ہے پروردگارا! کیا یہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ (دوسروں کو) تیری راہ سے بھٹکائیں؟ پروردگارا ان کی دولت کو برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے تاکہ یہ لوگ دردناک عذاب کا سامنا کرنے تک ایمان نہ لائیں۔

---

[1] النور: ۳۶ [2] مستدرك الوسائل ۳: ۴۳۹

تفسیر آیات

۱۔ اٰتَیۡتَ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَاَہٗ: دنیوی زندگی میں زینت سے مراد لباس، اچھی سواری، اچھا گھر، اچھی صحت، اچھی جسامت ہے۔ وَّاَمۡوَالًا کبھی اموال میں زینت ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ اس پر صرف مال صادق آتا ہے اور زینت کی چیزیں سب اموال شمار ہوتی ہیں۔

۲۔ رَبَّنَا لِیُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِکَ: یضلوا میں لام برائے بیان عاقبت ہے۔ فرعون اور فرعونیوں کو جو کچھ آپ نے دے رکھا ہے اس کی عاقبت اور انجام یہ ہوگا کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں گے جیسے حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا تھا:

اِنۡ تَذَرۡہُمۡ یُضِلُّوۡا عِبَادَکَ ....[۱]　　اگر تو انہیں چھوڑ دے گا تو وہ یقیناً تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے....

۳۔ رَبَّنَا اطۡمِسۡ عَلٰۤی اَمۡوَالِہِمۡ: اے میرے رب! فرعونیوں کی دولت برباد کر دے تاکہ تیرے بندوں کو گمراہ نہ کریں۔

۴۔ وَاشۡدُدۡ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ: ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر ان کے دل ایسے سخت کر دے کہ ایمان ان دلوں میں داخل ہی نہ ہو سکے۔ یہ دعائے بد اس وقت کی گئی جب ہر قسم کے دلائل و معجزات دکھانے کے باوجود وہ اپنے کفر پر اڑے رہے اور آئندہ ایمان لانے کی امید بھی باقی نہ رہی۔ یہ بد دعا بالکل اسی طریقے پر ہے جو خود اللہ تعالیٰ اختیار فرماتا ہے کہ حجت پوری ہونے پر بھی کفر پر جمے رہے تو پھر ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ان کا ہاتھ نہیں تھامتا، ان کو توفیق نہیں دیتا۔ اس دعا کا مضمون بھی یہی ہے کہ ان کو ہدایت نہ دینا پھر وہ مؤمن نہیں بن سکتے۔ اپنے اعمال، اپنی کی سرکشی کی وجہ سے یہ ایمان کے لیے اہل نہیں رہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کو دشمن کی دولت اور جاہ و سلطنت دیکھ کر مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

قَالَ قَدۡ اُجِیۡبَتۡ دَّعۡوَتُکُمَا فَاسۡتَقِیۡمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیۡلَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۹﴾

۸۹۔ اللہ نے فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول کی گئی ہے پس تم دونوں ثابت قدم رہنا اور ان لوگوں کے راستے پر نہ چلنا جو علم نہیں رکھتے۔

۱؎ نوح: ۲۷

تفسیر آیات

۱۔ قَدۡ اُجِیۡبَتۡ: تمہاری دعا قبول ہے۔ فرعونیوں کی دولت برباد ہو گی۔ ایمان کی توفیق بھی سلب ہو جائے گی۔ عذاب الیم بھی ان کے لیے مقدر ہے۔

۲۔ فَاسۡتَقِیۡمَا: لیکن تم دونوں میں بھی مزید استقامت کی ضرورت ہے کہ دعا قبول ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ باتیں فوری طور پر وقوع پزیر ہوں گی۔ تاخیر اس لیے ہو گی کہ یہ سنت الٰہی کی بات ہے اور حکمت و مصلحت سے مربوط ہے۔

۳۔ وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ: استقامت کے نتیجے کا علم بھی ضروری ہے کیونکہ علم نہ ہو تو صبر استقامت نہیں آ سکتی:

وَ کَیۡفَ تَصۡبِرُ عَلٰی مَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ خُبۡرًا ﴿۶۸﴾[1]	اور اس بات پر بھلا آپ کیسے صبر کر سکتے ہیں جو آپ کے احاطہ علم میں نہیں ہے؟

کافی، تفسیر قمی، تفسیر عیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہوئی ہے کہ فرعون اس دعا کے بعد چالیس سال تک زندہ رہا۔

اہم نکات

۱۔ صبر و استقامت کے لیے علم درکار ہے: فَاسۡتَقِیۡمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیۡلَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ۔

وَ جٰوَزۡنَا بِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡبَحۡرَ فَاَتۡبَعَہُمۡ فِرۡعَوۡنُ وَ جُنُوۡدُہٗ بَغۡیًا وَّ عَدۡوًا ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِہٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۹۰﴾	۹۰۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار دیا تو فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور زیادتی کرتے ہوئے ان کا تعاقب کیا یہاں تک کہ جب فرعون غرق ہونے لگا تو کہنے لگا: میں ایمان لے آیا کہ اس ذات کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمانوں میں سے ہو گیا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ جٰوَزۡنَا: بنی اسرائیل مصر میں فرعونی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے آبائی وطن

---

[1] ۱۸ الکہف: ۶۸

فلسطین کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ فلسطین جاتے ہوئے سمندر کے ساحل سے سفر کر رہے تھے کہ پیچھے سے فرعونی لشکر نے راستہ روک لیا۔ آگے سمندر ہے پیچھے فرعونی لشکر۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر شق کر کے بنی اسرائیل کو محاصرے سے نکالا اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا۔

۲۔ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ: جب فرعون کو سمندر نے گرفت میں لے لیا اور موجوں کے تھپیڑے لگنے لگے اور موت سامنے آ گئی تو کہنے لگا: میں ایمان لاتا ہوں اور ایمان کے ساتھ اطاعت و تسلیم کے لیے آمادہ ہوں: وَاَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۔ عذاب کے مشاہدے کے بعد جب نجات کی کوئی امید نہ رہی، اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ، غرق نے گرفت میں لے لیا، اس وقت کا ایمان فائدہ نہیں دیتا چونکہ یہ اختیاری ایمان نہیں ہے۔

۳۔ کل اس نے بنی اسرائیل کو غلام اور محکوم بنا رکھا تھا۔ آج جب عذاب الٰہی کو سامنے دیکھ لیتا ہے تو ایمان و تسلیم کے لیے بنی اسرائیل کا حوالہ دیتا ہے کہ بنی اسرائیل نے جس معبود کو مانا ہے میں بھی اسے مانتا ہوں۔ جب وہ مرا تو بنی اسرائیل کی نظریاتی بالا دستی کو قبول کر کے مرا۔

اہم نکات

۱۔ تکبر کا انجام تنزل پر ہوتا ہے: اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ ....

آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَ کُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۹۱﴾

۹۱۔ (جواب ملا) اب (ایمان لاتا ہے) جب تو پہلے نافرمانی کرتا رہا اور فسادیوں میں سے تھا؟

۱۔ آٰلۡـٰٔنَ : کیا اب ایمان لاتے ہو جب کہ ایمان کا وقت نکل گیا۔ چنانچہ ہم بھی اس شخص کے لیے یہی لفظ استعمال کرتے ہیں جو وقت گزرنے کے بعد آتا ہے۔ کیا اب آئے ہو؟ یعنی کیا یہ کوئی آنے کا وقت ہے۔ آلان اصل أ ألآن ہے۔ دو ہمزہ یکجا ہونے کے وجہ سے الف میں بدل گیا۔

۲۔ وَقَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ : اب سے پہلے جہاں ایمان فائدہ دیتا تھا، اس وقت تو نے نافرمانی کی بلکہ تو فسادیوں میں شمار ہوتا رہا۔

فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَکَ اٰیَۃً ؕ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ عَنۡ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوۡنَ ﴿۹۲﴾

۹۲۔ پس آج ہم تیری لاش کو بچائیں گے تاکہ تو بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت کی نشانی بنے، اگرچہ بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل رہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں پوری وضاحت کے ساتھ دو باتیں بیان ہوئی ہیں:

i۔ وہ اسلام اور توبہ قبول نہیں ہے جو موت اور عذاب کا سامنا کرنے پر بجا لائی جاتی ہے۔

ii۔ وہ ایمان بھی قبول نہیں ہے جو اضطراری حالت میں مشروط طور پر لایا جاتا ہے۔ لہٰذا فرعون کا حالت غرق کا ایمان یا تو اضطراری، مشروط ایمان تھا کہ بنی اسرائیل کی طرح اس کو بھی غرق ہونے سے نجات مل جائے یا موت نظر آنے کی وجہ سے ایمان کا اظہار تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کو ایمان تسلیم نہیں کیا جاتا۔

۲۔ فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡکَ بِبَدَنِکَ: البتہ آیت میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی لاش کو بچا لیا تا کہ لوگ مشاہدہ کریں کہ وہ پانی میں غرق ہو کر مر گیا ہے ورنہ ممکن تھا لوگ اس کی موت کو تسلیم ہی نہ کرتے اور توہمات وخرافات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا کیونکہ مصریوں کے عقیدے کے مطابق فراعنہ کی نسل خدائی اوتار تھی۔ بادشاہ سب سے بڑے دیوتا سورج کا نمائندہ ہوتا تھا اور اس کی پوجا کرنا خود سورج دیوتا کی پوجا سمجھی جاتی تھی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس فرعون کا نام متاح بن رمسیس ۱۲۲۵ قبل مسیح ہے۔ ڈاکٹر زحیلی کہتے ہیں میں نے خود قاہرہ کے میوزیم میں فرعون کی ممی کا معائنہ کیا اور اس لاش کی پیشانی کی ہڈی پر بحر ابیض کے نمکین پانی کے اثرات کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔[1]

تفہیم القرآن میں اس آیہ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> اگر ڈوبنے والا وہی فرعون منفتہ ہے جس کو زمانہ حال کی تحقیق نے فرعون موسیٰ قرار دیا ہے تو اس کی لاش قاہرہ کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سر گرافٹن الیٹ سمتھ نے اس کی ممی پر سے جب پٹیاں کھولی تھیں تو اس کی لاش پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی تھی جو کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی ایک کھلی علامت تھی۔

۲۔ لِتَکُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَکَ اٰیَۃً: فرعون کے مردہ بدن کو سمندر میں ناپید ہونے سے اس لیے بچایا کہ فرعون کے ماننے والوں کے لیے نشان عبرت بننے کے علاوہ یہ بات واضح ہو جائے کہ فرعون مر گیا ہے ورنہ وہ اس کے مرنے کے تصدیق نہ کرتے اور یہ عقیدہ رکھتے کہ بڑے دیوتا کا نمائندہ مر نہیں سکتا اور اس کی پوجا پاٹ جاری رکھتے۔

---

[1] التفسیر المنیر ۱۱: ۲۶۰

۳۔ عَنۡ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوۡنَ: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے ہر موقع پر دلیل، نشانی، معجزہ قائم فرمایا ہے۔ جس طرح فرعون کی پوجا سے بچانے کے لیے اس کی لاش کو بچایا لیکن لوگ معجزات و دلائل پر توجہ نہیں دیتے۔

اہم نکات

۱۔ زندگی سے ناامید ہونے کے موقع پر ایمان کا اظہار اللہ کو دھوکہ دینے کا مترادف ہے۔

۲۔ فرعون کے غرق میں انبیاء اور ان کی شریعت کی تکذیب کرنے والوں کے لیے ایک عبرت ہے۔

وَ لَقَدۡ بَوَّاۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مُبَوَّاَ صِدۡقٍ وَّ رَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡا حَتّٰی جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۹۳﴾

۹۳۔ بتحقیق ہم نے بنی اسرائیل کو خوشگوار ٹھکانے فراہم کیے اور انہیں پاکیزہ رزق سے نوازا پھر انہوں نے اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ ان کے پاس علم آ گیا، آپ کا رب قیامت کے دن ان کے درمیان یقیناً ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں یہ لوگ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ بَوَّاۡنَا: اس خوشگور ٹھکانے سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے جس کی شادابی اور خوش آب و ہوا اور اچھی پیداوار آج بھی مشہور ہے۔ حق تو یہ تھا کہ مصر کی غلامی سے نجات دلا کر فلسطین جیسی سرسبز و شاداب سرزمین پر تمکنت دینے کا شکر الٰہی ادا کرتے مگر ان لوگوں نے دین میں اختلاف کیا اور تفرقہ بازی کی۔ جس کی ان سے قیامت کے دن باز پرس ہو گی۔

۲۔ فَمَا اخۡتَلَفُوۡا: اس جملے کی ایک تفسیر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث برسالت ہونے سے پہلے آپؐ کی رسالت کا اقرار کرتے تھے لیکن جب آپؐ مبعوث ہوگئے اور اس بات کا علم ان کے پاس آگیا کہ نبی آخر الزمان مبعوث ہو چکے ہیں تو اختلاف کیا۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہود کے پاس توریت آنے کے بعد اختلاف کیا۔ بعض ایمان لے آئے اور بعض نے کفر اختیار کیا۔

۳۔ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ: قیامت کے دن ہی ان کے اختلاف کا فیصلہ ہو سکتا ہے چونکہ دنیا میں اختلافات کو ختم کرنے کے لیے ان کے پاس علم آگیا تو اسی علم ہی کے بارے میں اختلاف کرنے لگے۔

اہم نکات

۱۔ ان لوگوں کا انجام بہت برا ہو گا جنہوں نے علم و دولت ملنے کے بعد انحراف کیا۔

فَاِنۡ كُنۡتَ فِىۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ فَسۡـئَلِ الَّذِيۡنَ يَقۡرَءُوۡنَ الۡـكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكَ‌ۚ لَقَدۡ جَآءَكَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ۙ‏﴿۹۴﴾

۹۴۔ اگر آپ کو اس بات میں کوئی شبہ ہے جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لیں جو آپ سے پہلے کتاب پڑھ رہے ہیں، بتحقیق آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس حق آ چکا ہے لہٰذا آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔

وَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ‏﴿۹۵﴾

۹۵۔ اور ہرگز ان لوگوں میں سے نہ ہوں جنہوں نے اللہ کی نشانیوں کی تکذیب کی ورنہ آپ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاِنۡ كُنۡتَ فِىۡ شَكٍّ: اگر آپ کو شک لاحق ہے، رسول اللہ (ص) کو شک لاحق نہیں ہو سکتا۔ یہاں لفظ اِن استعمال ہوا ہے جو اکثر و بیشتر وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں واقعہ وجود میں نہ آیا ہو اور کبھی وہاں استعمال ہوا ہے جہاں واقعہ وجود میں آنا محال اور ناممکن ہے۔ جیسے:

قُلۡ اِنۡ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدٌ‌ ‌ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الۡعٰبِدِيۡنَ ○ [۱]

کہد یجیے: اگر رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے (اس کی) عبادت کرنے والا ہوتا۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَاِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكَ اِعۡرَاضُهُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِىَ نَفَقًا فِى الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ .... [۲]

اور ان لوگوں کی بے رخی اگر آپ پر گراں گزرتی ہے تو آپ سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی تلاش کریں ....

ظاہر ہے یہ دونوں کام ممکن نہیں ہیں۔ اللہ کے لیے اولاد ہونا ناممکن ہے، اسی طرح رسول اللہؐ کے لیے اس بات میں شک گزرنا بھی ناممکن ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ مخاطب رسولؐ ہیں لیکن دوسروں کو سمجھانا مقصود ہے۔ اگر کسی کو شک ہے تو اس شک کو دور کرنے کا ذریعہ موجود ہے۔ وہ ہے توریت و انجیل۔ قرآن میں نوح اور موسیٰ علیہما السلام کے بارے میں جو مطالب بیان کیے ہیں وہ ان کتابوں میں ہیں یا نہیں؟

۲۔ لَقَدۡ جَآءَكَ الۡحَـقُّ: سابقہ کتب آسمانی کی طرف رجوع کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے

۱؎ ۴۳ الزخرف: ۸۱ ۲؎ ۶ انعام: ۳۵

گی کہ آپؐ کے پاس وہ حق آیا ہے جس میں کسی قسم کے شک کے لیے گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ: اس آیت میں فرمایا: آیات الٰہی کی تکذیب ایک ایسا جرم ہے کہ جس سے بھی صادر ہو جائے، بفرض محال آپؐ سے بھی صادر ہو جائے تو آپؐ زندگی کے سرمائے سے محروم ہو کر نقصان اور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ تکذیب ایک جرم ہے کہ اس کے بارے میں اس ذات کو بھی خبردار کیا جا رہا ہے جس کے لیے تکذیب کا سوچنا بھی ناممکن ہے۔

اہم نکات

۱۔ شک کا فرض کر لینے سے کبھی یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً،

۲۔ اگر شک ہے تو متعلقہ ماہرین سے سوال کرنا چاہیے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾	۹۶۔ جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا فیصلہ قرار پا چکا ہے وہ یقیناً ایمان نہیں لائیں گے۔
وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾	۹۷۔ اگرچہ ان کے پاس ہر قسم کی نشانی آ جائے جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ: كَلِمَتُ رَبِّكَ کا مطلب رب کا فیصلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ازل سے یہ فیصلہ ہے:

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ ۝ [۱]	بھلا جو مومن ہو وہ فاسق کی طرح ہو سکتا ہے؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

مؤمن اور فاسق برابر نہیں ہو سکتے۔ جب حضرت آدمؑ کو زمین پر بسایا: قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا [۲] اس وقت یہ فیصلہ سنا دیا تھا:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ [۳]	اور جو لوگ کفر کریں اور ہماری آیات کو جھٹلائیں وہی دوزخ والے ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس حکم کلی کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے۔ اس حکم کلی کی تطبیق جن لوگوں پر ہو گی ان کے بارے میں فرمایا: حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ۔ آپ کے رب کا قدیم فیصلہ ان پر ثابت ہو گیا۔ اللہ کا کلی فیصلہ ان پر لاگو ہو گیا۔

---

[۱] ۳۲ السجدۃ: ۱۸ [۲] ۲ بقرۃ ۳۸

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اللہ نے فیصلہ کر رکھا تھا یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس فیصلے کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لا سکتے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے ایمان کے سامنے رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ کسی کو اس کی وحدانیت اور ربوبیت پر ایمان لانے کی اجازت نہ دے، پھر بعد میں ایمان نہ لانے پر عذاب میں ڈالے جیسا کہ مذہب جبریہ کا نظریہ ہے۔

بنی امیہ کے دور میں حکمرانوں نے اپنے مظالم کے جواز کے لیے یہ نظریہ بنوا لیا کہ سب کچھ اللہ کرتا ہے بندے کے اختیار میں نہیں ہے۔ صاحب تفسیر روح المعانی کا اس آیت کے ذیل میں اضطراب قابل مطالعہ ہے۔ کہتے ہیں:

والذی علیہ اھل السنة ان افعال العباد باسرھا معلومة لہ تعالی و مرادة و لا یکون الا ما ارادہ و علمه و ارادته متوافقان لا تجوز المخالفة بینھما۔	جس موقف کو اہل سنت نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ بندوں کے تمام افعال کا اللہ کو علم ہے اور ارادہ بھی ہے اور ہوتا وہی ہے جس کا اللہ ارادہ کرے۔ اللہ کا علم اور ارادہ باہم متفق ہے۔ ان دونوں میں اختلاف ممکن نہیں ہے۔

جب اللہ کا علم اور ارادہ ایک ہے، یہی جبر ہے کہ اللہ کو علم ہے ابوجہل ایمان نہیں لائے گا اور اللہ کی مراد بھی یہی ہے کہ ابوجہل ایمان نہ لائے تو ابوجہل ایمان نہ لانے پر مجبور ہوا۔ اگر ابوجہل اس کے باوجود ایمان لے آئے تو اللہ کا ارادہ عاجز رہ گیا۔ لہٰذا ابوجہل ایمان نہ لانے پر مجبور ہے۔ اس طرح اپنے مذہب جبر کی وضاحت کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

و لا جبر ھناك و لا تفویض بل امر بین امرین۔	جبر درست ہے نہ تفویض بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک تیسری صورت ہے۔

نہ جبر، نہ تفویض شیعہ امامیہ کا موقف ہے۔ صاحب روح المعانی نے اپنے مذہب جبر پر شیعہ امامیہ کا نعرہ استعمال کر کے نظریہ جبر کی پردہ پوشی کی کوشش کی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: لا جبر و لا تفویض بل امر بین الامرین۔[1]

اہم نکات

۱۔ بالآخر اللہ پر ایمان سب لائیں گے۔ اختیاری ہو یا اضطراری۔

فَلَوۡ لَا کَانَتۡ قَرۡیَۃٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَہَاۤ   ۹۸۔ کیا کوئی بستی ایسی ہے کہ (بر وقت) ایمان

----

[1] الکافی ۱: ۱۶۰

اِیۡمَانُہَاۤ اِلَّا قَوۡمَ یُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا کَشَفۡنَا عَنۡہُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡیِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ مَتَّعۡنٰہُمۡ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۹۸﴾

لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے سودمند ثابت ہوا ہو سوائے قوم یونس کے؟ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ان سے ٹال دیا اور ایک مدت تک انہیں (زندگی سے) بہرہ مند رکھا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَوۡ لَا: قوم یونس کا واقعہ اس طرح ہوا:

حضرت یونسؑ عراق کے نینوی علاقے موصل میں مبعوث ہوئے۔ اپنی قوم کو ایمان کی دعوت دیتے رہے۔ قوم نے ان کی تکذیب کی تو حضرت یونسؑ نے کہا: اگر تم توبہ نہ کرو گے تو تین دن میں تم پر عذاب نازل ہو گا۔ حضرت یونسؑ علاقے سے نکل گئے۔ تیسرے روز صبح کے وقت دیکھا آسمان پر سیاہ بادل چھا گیا جس سے شدید قسم کا دھواں نکل رہا تھا۔ انہوں نے اپنے نبی یونسؑ کو تلاش کیا۔ نہیں ملے تو بروایتے ایک عالم کی ہدایت پر سب لوگ صحرا میں نکل گئے اور اولاد کو ماؤں سے جدا کیا۔ مویشوں کی بھی ماؤں سے اولاد کو جدا کیا۔ فریاد کا شور مچا۔ سب نے ایمان قبول کیا اور توبہ کی جس سے عذاب ٹل گیا۔[1]

۲۔ غالباً ایسے تو ہوتا رہا کہ مختلف علاقوں اور بستیوں میں انبیاء آتے رہے۔ لوگوں کو راہ حق کی طرف دعوت دی مگر لوگوں نے انبیاءؑ کی تکذیب کی اور عذاب الٰہی سے ڈرانے اور عذاب کے آثار دکھانے پر بھی ایمان لانے کے لیے آمادہ نہ ہوئے سوائے قوم یونس کے کہ جب عذاب کے آثار نمایاں ہوئے تو وہ ایمان لے آئی اور اس سے عذاب ٹل گیا۔ اس طرح اس کا ایمان سود مند ثابت ہوا۔

وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ کُلُّہُمۡ جَمِیۡعًا ؕ اَفَاَنۡتَ تُکۡرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۹۹﴾

۹۹۔ اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو تمام اہل زمین ایمان لے آتے، پھر کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر سکتے ہیں؟

وَ مَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تُؤۡمِنَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ یَجۡعَلُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰۔ اور کوئی شخص اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا اور جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اللہ انہیں پلیدی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

---

[1] مجمع البیان

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّکَ: اگر اللہ چاہتا تو تمام اہل ارض کو مؤمن بنا کر خلق فرماتا، فرشتوں کی طرح ان میں صرف ایمان کی یکطرفہ صلاحیت ودیعت فرماتا اور اگر اللہ چاہتا تو ان سے کفر کی قدرت سلب کر دیتا کہ وہ مؤمن ہی رہیں۔ اگر ہم ایسا چاہتے تو انسان کو کفر و ایمان کے درمیان کھڑا نہ کرتے اور ان دونوں میں سے ایک کو ترجیح دینے کی قوت اور صلاحیت اس کو نہ دیتے بلکہ یہ صلاحیت ہم اپنے پاس رکھتے۔ اس صورت میں وہ ایمان لانے پر مجبور ہو جاتا۔ اس قسم کا جبری ایمان ہم کو منظور نہیں ہے۔

۲۔ اَفَاَنۡتَ تُکۡرِہُ النَّاسَ: اللہ نے جب نہیں چاہا کہ سب لوگ بالجبر ایمان میں داخل ہو جائیں تو کیا آپؐ جبر و اکراہ کے ذریعے لوگوں کو مؤمن بنائیں گے؟ اول تو ایسا نہیں ہے۔ اگر ہوا تو ایسا ایمان اللہ کو قبول نہیں ہے۔

۳۔ وَمَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تُؤۡمِنَ: البتہ یہ انسان فُجُوۡرَہَا وَتَقۡوٰىہَا [1] بدکرداری اور تقویٰ اور اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا [2] شکر و کفر میں سے ایک کو خود مختارانہ طور پر ترجیح دیتا ہے۔ اگرچہ ترجیح اس کا اپنا عمل ہو گا تاہم اللہ کی طرف سے فراہم شدہ اسباب و علل کے ذریعے ہی وہ ایمان و کفر، خیر و شر، تقویٰ اور فجور میں سے ایک کا انتخاب کرے گا۔ اللہ اس کو عقل دیتا ہے۔ اللہ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی فراہم ہوتی ہے۔ یہی اذن خدا ہے اور یہی خود مختاری ہے اور یہی امر بین اَمرین ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو البقرۃ آیت ۲۵۵۔

۴۔ وَیَجۡعَلُ الرِّجۡسَ: ایمان کے مقابلے میں رجس کا ذکر ہوا ہے جو عدم ایمان یعنی شک ہے۔ ایمان نہ لانا عقل کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے ہو گا۔ لَا یَعۡقِلُوۡنَ وہ لوگ ہیں جو عقل کو بروئے کار نہیں لاتے۔

حضرت ابی جعفر علیہ السلام سے روایت ہے:

الرجس هو الشك ولا نشك فی دیننا ابداً۔ [3]	رجس سے مراد شک ہے اور ہم اپنے دین میں کبھی شک نہیں کرتے۔

اہم نکات

۱۔ انسان مجبور بھی نہیں، اذن خدا بھی چاہیے: تُکۡرِہُ النَّاسَ ... اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ انسان خود مختار ہے اور محتاج بھی ہے۔

قُلِ انۡظُرُوۡا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ   ۱۰۱۔ کہدیجیے: آسمانوں اور زمین میں نظر ڈالو کہ

---

[1] ۹۱ شمس: ۸   [2] ۷۶ انسان: ۳   [3] بصائر الدرجات: ۲۰۶

الْاَرۡضِ ؕ وَمَا تُغۡنِی الۡاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ عَنۡ قَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾

ان میں کیا کیا چیزیں ہیں اور جو قوم ایمان لانا ہی نہ چاہتی ہو اس کے لیے آیات اور تنبیہیں کچھ کام نہیں دیتیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلِ انۡظُرُوۡا: ایمان کا تعلق قلب سے ہے اور قلب جبر کی منطق کو نہیں سمجھتا۔ وہ دلیل، فکر و استدلال اور عقل سے رام ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو رام کرنے کے لیے فکر و نظر سے کام لو۔ ان آسمانوں اور زمین میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن پر غور و فکر کر کے انسان آسانی کے ساتھ اپنے رب تک پہنچ سکتا ہے۔

۲۔ وَمَا تُغۡنِی الۡاٰیٰتُ: لیکن یہ سب اس شخص کے لیے ہے جو حسن نیت سے اپنی عقل کو بروئے کار لاتا ہے اور جو لوگ شروع سے یہ تہیہ کر رکھتے ہیں کہ ہم نے ایمان لانا ہی نہیں ”ان کے لیے آیات اور تنبیہیں کچھ کام نہیں دیتیں۔“

اہم نکات

۱۔ ایمان کا تعلق قلب و نظر سے اور قلب و نظر کا تعلق حسن نظر سے ہے: وَمَا تُغۡنِی الۡاٰیٰتُ ....

فَهَلۡ یَنۡتَظِرُوۡنَ اِلَّا مِثۡلَ اَیَّامِ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ قُلۡ فَانۡتَظِرُوۡۤا اِنِّیۡ مَعَكُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ اب یہ لوگ اس کے سوا کس کے انتظار میں ہیں کہ اس طرح کے برے دن دیکھیں جو ان سے پہلے کے لوگ دیکھ چکے ہیں؟ کہد یجیے: پس تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

ثُمَّ نُنَجِّیۡ رُسُلَنَا وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَیۡنَا نُنۡجِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳۔ پھر ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کو نجات دیں گے، یہ بات ہمارے ذمے ہے کہ ہم مومنین کو نجات دیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَهَلۡ یَنۡتَظِرُوۡنَ: یہ لوگ نہ آیات الٰہی پر توجہ دیتے ہیں، نہ فکر و نظر سے کام لیتے ہیں۔ کفر و انکار پر ایسے جم جاتے ہیں جیسا کہ جان بوجھ کر عذاب کا انتظار کر رہے ہوں۔ اسی طرح کا عذاب جو گزشتہ امتوں پر آیا ہے۔

تمام امتوں کی تاریخ یہی تو ہے کہ ان کی طرف انبیاء بھیجے گئے جیسا کہ تمہاری طرف رسولؐ بھیجے گئے۔ پھر ان میں سے کچھ ایمان لے آئے اور کچھ تمہاری طرح منکر ہو گئے۔ ان کو عذاب الٰہی سے بچنے کے لیے کہا جیسا تم سے کہا جا رہا ہے۔ انجام کار یہ ہوا کہ منکرین کو عذاب الٰہی نے گرفت میں لے لیا۔

۲۔ ثُمَّ نُنَجِّیۡ رُسُلَنَا: ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کو نجات دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔

۳۔ کَذٰلِکَ ۚ حَقًّا عَلَیۡنَا: اسی طرح اس امت کے مؤمنین کی نصرت ہمارے ذمے ثابت ہے۔ اس امت کے مؤمنین کے لیے آیت کا یہ حصہ نوید نجات ہے لیکن یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآن کی رو سے مؤمن کون ہے۔ جو سچے مؤمن ہیں ان کی نجات کو اللہ نے اپنے ذمے لیا ہے جو نہایت بڑی خوشخبری ہے۔

اہم نکات

۱۔ امت محمدیہ کے مؤمنین کی نجات کو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے: کَذٰلِکَ ۚ حَقًّا عَلَیۡنَا نُنۡجِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّنۡ دِیۡنِیۡ فَلَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ لٰکِنۡ اَعۡبُدُ اللّٰهَ الَّذِیۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ ۚۖ وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۰۴﴾

۱۰۴۔ کہد یجیے: اے لوگو! اگر تمہیں میرے دین میں کوئی شک ہے تو (جان لو کہ) تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا بلکہ میں تو صرف اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور مجھے یہی حکم ملا ہے کہ میں ایمان والوں میں سے ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ: اگر تمہیں میرے دین کی حقانیت یا میری استقامت میں شک ہے کہ میں اپنے دین پر قائم رہ سکتا ہوں یا نہیں تو سن لو کہ میں اللہ کو چھوڑ کر تمہارے معبودوں کی پرستش نہیں کر سکتا میں تو صرف اس ذات کو لائق عبادت سمجھتا ہوں جس کے قبضہ میں تمہاری جان ہے۔ موت و حیات کا مالک ہی لائق عبادت ہے۔ میں ایسی چیز کی عبادت کیوں کروں جو کہ خود اپنی جان کی بھی مالک نہیں ہے۔

۲۔ وَ لٰکِنۡ اَعۡبُدُ اللّٰهَ: مشرکین خود اس بات کے قائل تھے کہ روح قبض کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔ اس لیے طرفین کی مسلمہ بات کو بنیاد بنا کر فرمایا: تمہاری روحیں قبض کرنے والی ذات کی بندگی کرتا ہوں۔ چونکہ ان پر عذاب روح قبض ہونے کے وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔

۳۔ وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ: میں اپنے معبود کے حکم کا پابند ہوں جس نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ ایمان

والوں میں رہوں۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میرا معبود میری رہنمائی کرتا ہے، مجھے ہدایت دیتا ہے۔ تمہارے معبودوں کی طرح جامد و بے شعور نہیں ہے

اہم نکات

۱۔ عبادت و بندگی اس ذات کی ہوتی ہے جس کے قبضہ میں ہماری جان ہے۔

وَ اَنۡ اَقِمۡ وَجۡہَکَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا ۚ وَ لَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۰۵﴾

۱۰۵۔ اور یہ کہ آپ یکسوئی کے ساتھ اپنا رخ دین کی طرف ثابت رکھیں اور مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہوں۔

وَ لَا تَدۡعُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُکَ وَ لَا یَضُرُّکَ ۚ فَاِنۡ فَعَلۡتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾

۱۰۶۔ اور اللہ کے سوا کسی ایسی چیز کو نہ پکاریں جو آپ کو نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان، اگر آپ ایسا کریں گے تو یقیناً آپ ظالموں میں شمار ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَنۡ اَقِمۡ وَجۡہَکَ: کہہ دیجیے کہ مجھے جیسے مؤمنین میں سے ہونے کا حکم ملا ہے اسی طرح یہ حکم ملا ہے کہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی پوری توجہ اسی دین پر مرکوز کروں۔ حنف ایک طرف مائل ہونے کو کہتے ہیں۔ حنیفاً مائل ہونے والا۔ جس کا ترجمہ ہم نے ”یکسوئی“ کے ساتھ کیا ہے جو حنیف کا قریب ترین ترجمہ ہے۔ اپنا پورا وجود اسی دین کے ساتھ مربوط رکھوں، کسی اور نظریہ اور مذہب کو اعتنا میں نہ لاؤں۔

۲۔ وَ لَا تَدۡعُ: اور ایسی چیزوں سے اپنی امیدیں وابستہ نہ کروں جنہیں کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں ہے۔ اگر ایسی بے بس چیزوں سے امیدیں وابستہ کرتا ہوں تو یہ اپنی ذات کے ساتھ زیادتی ہے۔

۳۔ فَاِنۡ فَعَلۡتَ: اسی سورہ کی آیت ۹۴ میں بیان ہوا ہے کہ لفظ اِنۡ اکثر، وقوع پذیر نہ ہونے والے واقعات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں فَاِنۡ فَعَلۡتَ اگر آپ نے ایسا کیا، بفرض محال ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس ذات کو پکارنا چاہیے جس کے قبضہ قدرت میں دنیا و آخرت کا نفع و نقصان ہے۔

وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا

۱۰۷۔ اور اگر اللہ آپ کو کسی تکلیف میں ڈالے تو

كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنۡ يُّرِدۡكَ بِخَيۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِهٖ ؕ يُصِيۡبُ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۰۷﴾

اس کے سوا کوئی نہیں جو اس تکلیف کو دور کرے اور اگر اللہ آپ سے بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل کو روکنے والا کوئی نہیں، وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فضل کرتا ہے اور وہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

جس دین توحید پر آپ کو استقامت کے ساتھ قائم رہنا ہے اس کے توحیدی تقاضے اس طرح ہیں:

۱۔ وَ اِنۡ يَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ: ہر قسم کی تکلیف، مرض، دشمن کا خوف، مالی نقصانات، ظالم کی طرف سے زیادتی اور قدرتی آفات وغیرہ کا دور کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ ظاہر ہے کائنات پر اسی کی حاکمیت ہے۔کوئی اور اس کے ساتھ شریک نہیں ہے تو اس کے سوا ان تکلیفوں کو دور کر بھی کون سکتا ہے۔

۲۔ وَ اِنۡ يُّرِدۡكَ بِخَيۡرٍ: اللہ کسی بندے پر فضل و کرم کرنا چاہے تو اس کے فضل و کرم کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں طاقت آزمائی کرے،

تو کیا عقلمندی نہیں ہے کہ انسان صرف اسی ذات کی عبادت کرے اور اسی سے ساری امیدیں وابستہ رکھے اور

۳۔ : اپنے آپ کو اللہ کے فضل و کرم کا سزا دار بنائے۔ اس کا فضل اندھی بانٹ نہیں ہے کہ بغیر استحقاق و ضابطے کے جس کو چاہے دے دے۔

اہم نکات

۱۔ توحید یہ ہے کہ اللہ کے مقابلے میں کسی طاقت کو بغیر اذن خدا مؤثر تسلیم نہ کیا جائے۔

قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۚ فَمَنِ اهۡتَدٰى فَاِنَّمَا يَهۡتَدِىۡ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيۡهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيۡكُمۡ بِوَكِيۡلٍ ؕ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔ کہہ دیجیے: اے لوگو! جب تمہارے رب کی جانب سے حق تمہاری طرف آ چکا ہے، پس جو کوئی ہدایت حاصل کرتا ہے تو اپنی ذات کے لیے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ بھی اپنی ذات کو گمراہ کرتا ہے اور میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَدۡ جَآءَکُمُ : حق تمہاری دست رسی میں آ گیا ہے۔ راہ تمہیں دکھلا دی گئی ہے۔ ہدایت اور گمراہی کو الگ کر کے دکھلا دیا گیا ہے۔ اب یہ خود تمہاری اپنی ذمہ داری ہے کہ گمراہی کو چھوڑ کر حق کے زیر سایہ آ جاؤ۔

۲۔ وَمَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ : رسولؐ کی ذمے داری تم تک حق پہنچانا تھا۔ تمہارا ہاتھ پکڑ کر جبراً ہدایت کی طرف لے جانا ان کی ذمے داری نہیں ہے۔ ہدایت کوئی مکروہ چیز نہیں کہ لوگوں پر مسلط کی جائے بلکہ ہدایت نور ہے جس کی طرف ہر چشم بینا رکھنے والا خود شوق سے آتا ہے۔ اپنی ذات کے لیے اس کی طرف لپکتا ہے کسی اور کے لیے نہیں۔

اہم نکات

۱۔ انسان خود مختارانہ طور پر ہدایت یافتہ یا گمراہ ہوتا ہے۔ اللہ اور رسولؐ کی طرف مسلط نہیں کیا جاتا: وَمَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِوَکِیۡلٍ۔

وَ اتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ وَ اصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ ۚۖ وَ ہُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾

۱۰۹۔ اور (اے نبی) آپ کی طرف جو وحی بھیجی جاتی ہے اس کی پیروی کریں اور اللہ کا فیصلہ آنے تک صبر کریں اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاتَّبِعۡ : کسی کو اعتنا میں لائے بغیر صرف وحی کی پیروی کریں اور اللہ کی طرف سے جو رہنمائی آتی رہے گی اس پر عمل کرتے جائیں۔

۲۔ وَاصۡبِرۡ : ساتھ اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ صبر سے کریں۔ ایک دن آنے والا ہے کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ اس دن حق کا بول بالا ہوگا۔ باطل مٹ چکا ہوگا۔

صدق اللّٰہ العلی العظیم والحمد للّٰہ الذی انجز وعدہ و نصر عبدہ۔

اہم نکات

۱۔ اطاعت اور صبر، فتح و کامرانی کے دو ستون ہیں: وَاتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ وَاصۡبِرۡ ....

سُورَةُ هُودٍ

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اور مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مکہ میں اس وقت نازل ہوا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت نامساعد حالات سے دوچار تھے۔ مشرکین کی طرف سے طنز و آزار، نامعقول مطالبے اور استہزاء میں اضافہ ہوا تھا۔ اس آیت سے ایک عندیہ ملتا ہے:

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعۡضَ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدۡرُكَ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ....[1]

آپ کی طرف جو وحی کی گئی ہے شاید آپ اس کا کچھ حصہ چھوڑنے والے ہیں اور ان کی اس بات پر دل تنگ ہو رہے ہیں کہ اس پر خزانہ کیوں نازل نہیں ہوا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا...؟

حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ میں دشوار ترین اور مصائب و آلام سے پر زندگی حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبری علیہا السلام کی وفات کے بعد گزارنا پڑی۔ حضرت ابو طالبؑ کی زندگی میں قریش آپؐ کے خلاف براہ راست جسارت نہیں کر سکتے تھے، حضرت ابو طالب کے بعد تو قریش کے باؤلے بھی حضورؐ کے سر مبارک پر مٹی پھینکنے کی جسارت کرنے لگے۔ اس لیے اس سورہ میں تاریخ انبیاء بیان کرتے ہوئے اس پہلو کو نمایاں کر دیا کہ بالآخر دعوت انبیاء کو ہی کامیابی حاصل رہی اور ان کی تکذیب کرنے والوں کا انجام برا ہوا۔ چنانچہ تاریخ انبیاء بیان کرنے کے بعد فرمایا:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَیۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ ....[2]

ہم پیغمبروں کے وہ تمام حالات آپ کو بتاتے ہیں جن سے ہم آپ کو ثبات قلب دیتے ہیں ....

دیگر سورہ ہائے مکی کی طرح اس سورۃ کا مضمون بھی توحید کی دعوت ہے اور اس پر بہت پر زور دیا گیا ہے۔ حتیٰ تاریخ انبیاء بیان کرتے ہوئے تمام انبیاء کی دعوت کو ان جملوں میں خلاصہ کیا گیا:

---

[1] ۱۱ ھود: ۱۲ [2] ۱۱ ھود: ۱۲۰

یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ۔[1] اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے....

دوسرا موضوع جس پر تاریخ انبیاء کے ضمن میں زور دیا گیا ہے وہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ گزشتہ تکذیبی قوموں کی طرح تمہارا بھی انجام بہت برا ہو گا۔ اللہ تمہیں نابود کر کے تمہاری جگہ ایک اور قوم پیدا کرے گا۔ تکذیبی عناصر خواہ انبیاء کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، اس مکافات عمل سے نہیں بچ سکتے۔ اس سلسلے میں نوح علیہ السلام کے بیٹے کا خاص کر ذکر فرمایا۔

---

[1] ۱۱ ھود: ۵۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ ۙ﴿۱﴾

اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنَّنِیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ ۙ﴿۲﴾

بنام خدائے رحمن رحیم

۱۔ الف لام را، یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات مستحکم کی گئی ہیں پھر ایک باحکمت باخبر ذات کی طرف سے تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔

۲۔ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، میں اللہ کی طرف سے تمہیں تنبیہ کرنے والا اور بشارت دینے والا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ: یہ وہ کتاب وحی ہے جس کی آیتوں میں کسی قسم کی کمزوری نہیں ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے اس کی آیات کا حق اور امر واقع سے کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ یہ عین حقیقت کے بیان کی متکفل ہیں۔ مضمون کے اعتبار سے یہ کتاب ایک جامع نظام حیات، ایک معبود، ایک دین اور اخلاقیات کے ایک انسان ساز دستور کی طرف بلاتی ہے۔ مضامین میں اس قدر استحکام ہے کہ مختلف ادوار کی تاریخ ہو یا انبیاء کی دعوت کا ذکر ہو، منکرین کی تنبیہ ہو یا نصیحت یا بیان احکام ہو، اجمال کا مقام ہو یا تفصیل کا سب کا محور ایک، نقطۂ آغاز و انجام ایک، ہدف ایک اور منزل ایک ہے۔ وہ یہ کہ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

۲۔ ثُمَّ فُصِّلَتۡ: اس کتاب میں کوئی پیچیدگی ہے نہ کوئی ابہام ہے۔ مطالب کو کھول کر پوری وضاحت، روشن مثالوں اور تاریخی واقعات کے شواہد کے ساتھ عام فہم صریح لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ جو ایک عام انسان کے لیے بھی قابل فہم ہیں۔ علماء کے لیے بھی اس میں تحقیقات کی کافی گنجائش ہے اور شاید علم و آگہی کی ترقی و پیشرفت کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی تفصیل میں بھی اضافہ ہو جائے۔ ممکن ہے ثُمَّ فُصِّلَتۡ

سنت رسولؐ کی طرف اشارہ ہو۔ چونکہ قرآنی کلیات کی تفصیل سنت کے ذمے ہے۔

۳۔ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا: یہ کتاب جس کی آیات محکم اور مفصل ہیں درج ذیل باتوں کی طرف دعوت دیتی ہے:

پہلی بات یہ کہ صرف اللہ کی بندگی کی جائے جو اس کتاب کے مضامین میں سب اہم مضمون ہے کہ بندگی میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے۔

اہم نکات

۱۔ توحید عبادت و ربوبیت قرآنی دعوت کا مرکزی نقطہ ہے: اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ ....

وَّ اَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ یُمَتِّعۡکُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّ یُؤۡتِ کُلَّ ذِیۡ فَضۡلٍ فَضۡلَہٗ ؕ وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ کَبِیۡرٍ ﴿۳﴾

۳۔ اور یہ کہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو پھر اس کے آگے توبہ کرو وہ تمہیں مقررہ مدت تک (دنیا میں) اچھی متاع زندگی فراہم کرے گا اور ہر احسان کوش کو اس کی احسان کوشی کا صلہ دے گا اور اگر تم نے منہ پھیر لیا تو مجھے تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۴﴾

۴۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَّ اَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ: دوسری بات یہ ہے کہ اپنے رب کے حضور استغفار کرو۔ اپنی تقصیروں کا اعتراف کر کے اللہ سے معافی مانگنا بندگی کی بنیاد ہے۔

۲۔ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا: تیسری بات یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کرے۔ توبہ سے گناہ دھل جاتے ہیں۔ ابی جعفر علیہ السلام سے روایت ہے:

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔[1]

گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں ہے۔

---

[1] الکافی ۲: ۴۳۵

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لا صغیرة مع الاصرار و لا کبیرة مع الاستغفار۔[1] گناہ تکراراً بجا لانے سے صغیرہ نہیں رہتا اور استغفار کے ساتھ گناہ کبیرہ نہیں رہتا۔

پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے:

خیر العبادة الاستغفار ...۔[2] بہترین عبادت استغفار ہے۔

ایمان کے ساتھ اور مغفرت کے لیے درگاہ الٰہی میں راز و نیاز سے توبہ کے ذریعے تطہیر باطن سے انسان فطرتی طور پر اعتدال میں آ جاتا ہے۔ اس کا ضمیر مطمئن، اس کی روح پرسکون، اس کے اعصاب میں توازن ہوتا ہے۔

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّہۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَ مَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ؕ کَذٰلِکَ یَجۡعَلُ اللّٰہُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ○ [3]

پس جسے اللہ ہدایت بخشنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہو، ایمان نہ لانے والوں پر اللہ اس طرح ناپاکی مسلط کرتا ہے۔

یعنی جو میری نصیحت سے منہ موڑے گا اس کے لیے ایک دشوار زندگی ملے گی۔

۳۔ یُمَتِّعۡکُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا: اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان و عمل صالح سے نہ صرف یہ کہ آخرت کی زندگی سدھرتی ہے، دنیوی زندگی میں بھی بہتری آ جاتی ہے۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ دینداری غربت و افلاس کا دوسرا نام ہے اور دنیاداری کا مطلب بے دینی ہے۔ البتہ جہاں دنیاداری دین سے متصادم ہو تو یہ بات درست ہے ورنہ مؤمن کے لیے دنیا و آخرت دونوں کی سعادتیں میسر آ جاتی ہیں۔

۴۔ وَّ یُؤۡتِ کُلَّ ذِیۡ فَضۡلٍ فَضۡلَہٗ: ایمان اور تقویٰ کے درجات ہیں۔ ایک کا ایمان اور تقویٰ دوسرے سے افضل اور بالاتر ہوتا ہے۔ ایمان اور تقویٰ میں جو صاحب فضیلت ہے اسے اس درجے کے مطابق اجر و منزلت دی جائے گی۔ ہر شخص کو اس کے ایمانی اور تقوائی مقام کے مطابق درجہ دیا جائے گا۔ کسی کا ذرہ برابر عمل ضائع نہیں جائے گا۔

حاکم حسکانی نے شواھد التنزیل میں ذیل آیت روایت کی ہے: وَّ یُؤۡتِ کُلَّ ذِیۡ فَضۡلٍ فَضۡلَہٗ ... حضرت علی علیہ السلام کی شان میں ہے۔ یہی روایت ابن مردویہ نے بھی بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو کشف الغمة ۱: ۳۱۷۔

---

[1] الکافی ۲: ۲۸۸ [2] الکافی ۲: ۵۱۷ [3] ۶ انعام: ۱۲۵

اہم نکات

۱۔ دعا اور تقویٰ و طہارت سے دنیا کی زندگی بھی سدھر جاتی ہے: مَّتَاعًا حَسَنًا ....

۲۔ ہر مؤمن کو چاہیے کہ وہ آخرت میں اپنا درجہ بلند کرنے کی اس دنیا میں کوشش کرے۔

۳۔ عمل کے اعتبار سے انسانوں میں امتیاز آ جاتا ہے: وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ....

اَلَاۤ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۵

۵۔ آگاہ رہو! یہ لوگ اپنے سینوں کو لپیٹ لیتے ہیں تاکہ اللہ سے چھپائیں، یاد رکھو! جب یہ اپنے کپڑوں سے ڈھانپتے ہیں تب بھی وہ ان کی علانیہ اور پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے، وہ سینوں کی باتوں سے یقیناً خوب واقف ہے۔

تشریح کلمات

يَثْنُوْنَ: (ث ن ی) اَلثَّنْیَ کسی چیز کو موڑنا، دوہرا کرنا، لپیٹنا۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جابر بن عبد اللہ نے مجھ سے بیان کیا: جب خانہ کعبہ کے گرد مشرکین، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک سے گزرتے تو سر اور پشت جھکا کر اور کپڑے سے سر ڈھانپ کر گزرتے تھے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ ان پر نہ پڑے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

تفسیر آیات

روایت اور آیت دونوں سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مشرکین جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کعبہ کے نزدیک قرآن کی تلاوت کرتے سنتے تو چونکہ ان کے دلوں میں یہ بات مرکوز ہو گئی تھی کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہو سکتا، اللہ ہی کا کلام ہو سکتا ہے۔ اگر اللہ کا کلام ہے تو ہم سنیں گے ہی نہیں کہ متاثر ہو جائیں۔ اپنے آپ کو چھپا کر یہ خیال کرتے تھے کہ اللہ کے سامنے حائل بن سکتا ہے۔ وہ تو دل کے بھیدوں کو بھی جانتا ہے اور اس کائنات میں کوئی چیز اس سے چھپ نہیں سکتی۔

اہم نکات

۱۔ مشرکین آیت قرآن کا سامنا کرنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے: يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ ....

---

[1] الکافی ۸: ۱۴۴

۲۔ انسان اگر یہ تصور ہمیشہ زندہ رکھے کہ ہم ہمیشہ اللہ کے سامنے ہیں تو گناہ کرنے سے شرم کرے:
اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ۔

وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُہَا وَ یَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّہَا وَ مُسۡتَوۡدَعَہَا ؕ کُلٌّ فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۶﴾

۶۔اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور وہ جانتا ہے کہ اس کی جائے قرار کہاں ہے اور عارضی جگہ کہاں ہے، سب کچھ روشن کتاب میں موجود ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ: زمین پر چلنے والے تمام جانداروں کا رزق اللہ کے ذمے ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اللہ ان جانوروں کے مختلف حالات کے تقاضوں کے تحت روزی پہنچاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات نہایت طبیعی ہے کہ اللہ کو ان جانوروں کی مستقل اور عارضی رہائشی جگہوں کا علم ہے اور ہر مقام کے تقاضوں کے مطابق روزی پہنچاتا ہے۔ صلب پدر اور رحم مادر میں عارضی تقاضوں کے مطابق اور روئے زمین نسبتاً مستقل ہونے کے تقاضوں کے مطابق اور ان جانوروں کے ارتقائی مراحل میں ہر مرحلہ کے تقاضوں کے مطابق روزی پہنچاتا ہے۔

اللہ کی طرف سے ہر جاندار تک اس کی روزی پہنچانے کی دو صورتیں اہم ہیں: دوران تخلیق، بعد از تخلیق، دوران تخلیق مستودع ہے اور بعد از تخلیق مستقر ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ہر جاندار کی خلقت و فطرت میں تکوینی طور پر یہ ہدایت ودیعت فرماتا ہے کہ اسے روزی کہاں سے اور کس طرح حاصل کرنا ہے۔ اگر جانور ابھی خلقت کے مراحل میں ہے اور روزی حاصل کرنے کے طریقوں کے لیے تکوینی درس لے رہا ہے اور ابھی کورس مکمل نہیں ہوا ہے کیونکہ یہ کورس اس کی تخلیق کے مکمل ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچے گا، اس صورت میں اللہ اس کی روزی اس تک پہنچا دیتا ہے اس کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جیسے رحم مادر میں جنین کی روزی، انڈے کے اندر چوزے کی روزی وغیرہ۔

۳۔ جب جانور کی تخلیق کے ساتھ یہ کورس بھی مکمل ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی کے لیے ضرورت کی روزی کہاں سے اور کیسے حاصل کرنا ہے تو اس صورت میں اللہ اسی ہدایت کے ذریعے اسے روزی پہنچا دیتا ہے جو اس کی خلقت و جبلت کے اندر ودیعت کی ہوئی ہے۔ چنانچہ حیوانات کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی ماں کے تھن کا پتہ چلتا ہے کہ ان کی روزی تھن میں ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ تھن ماں کے جسم کے کس حصے میں ہیں۔

۳۔ كُلٌّ فِيۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ: كُلٌّ یعنی سب کی سب موجودات، وجود میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک ساتھ موجود ہیں۔ اس خزانہ غیب کو کتاب مبین، کبھی لوح محفوظ، کبھی کتاب حفیظ، کبھی ام الکتاب کہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ سے روزی لینے کے لیے اس کی تکوینی ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔

۲۔ روزی دینے کے لیے علم ضروری ہے۔ يَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَ مُسۡتَوۡدَعَهَا

وَهُوَ الَّذِيۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِيۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّ كَانَ عَرۡشُهٗ عَلَى الۡمَآءِ لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ لَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّكُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَيَقُوۡلَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۝۷

۷۔ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں بنایا اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں بہتر عمل کرنے والا کون ہے اور (اے نبی) اگر آپ (لوگوں) سے یہ کہدیں کہ تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر ضرور کہیں گے: یہ تو محض کھلا جادو ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ نے چھ مراحل میں آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے آسمان و زمین، دوسرے لفظوں میں کل کائنات موجود نہ تھی۔ کچھ نہ تھا، صرف اللہ کی ذات تھی۔ حدیث میں آیا ہے:

کان اللّٰہ و لم یکن معه شئی ....[۱] اللہ اس وقت بھی تھا جب اس کے ساتھ کوئی شے موجود نہ تھی۔

اللہ کی ذات زمانی نہیں ہے۔ وہ زمانہ سے ماوراء ذات ہے تو یہ سوال ذہنوں میں ابھرنا ایک طبیعی بات ہے کہ پھر اللہ کی حکومت کس چیز پر تھی؟ فرمایا:

وَّ كَانَ عَرۡشُهٗ عَلَى الۡمَآءِ .... اللہ کی سلطنت پانی پر تھی۔

اور پانی سے مراد یہی پانی ہوسکتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ہر زندہ شے کو پیدا کیا ہے:

وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَيۡءٍ حَيٍّ ؕ ...[۲] اور تمام جاندار چیزوں کو ہم نے پانی سے بنایا ہے۔

---

[۱] بحار ۵۴: ۲۳۳ باب تفهيم و تميم نفعه عميم ....
[۲] ۲۱ انبیاء: ۳۰

ان دونوں آیات سے یہ دو باتیں تو ثابت ہوتی ہیں: i۔ اللہ کی سلطنت پانی پر تھی۔ ii۔ پانی مادۂ حیات ہے اور تمام زندہ موجودات کا مادۂ مشترکہ ہے۔اس سے زیادہ پانی کی تفصیل میں ہم نہیں جا سکتے اور ایسے غیبی موضوعات میں صریح نص کے بغیر اظہار خیال کرنا درست بھی نہیں ہے کہ پانی سے مراد مائع مذاب ہے یا گیس ہے یا سدیم ہے یا ہوا ہے؟ صرف ظن و تخمین ہے اور یہاں سب سے بڑا اشتباہ یہ ہے کہ لوگ قرآنی حقائق کو سائنس کی روشنی میں وزن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً آیہ:

اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا ....[1] یہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کر دیا ہے۔

کو سائنس کی اس مشہور تھیوری سے تطبیق کرتے ہیں کہ کائنات ایک عظیم دھماکے سے وجود میں آئی ہے حالانکہ قرآنی حقائق خالق کائنات کی طرف سے ابدی اور ناقابل شک و تغیر ہیں۔ جب کہ سائنسی تھیوری کو تو صرف ظن و تخمین جتنی قیمت حاصل ہے۔ البتہ سائنسی حقائق تجربات کی بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں اور تجربے سے اخذ شدہ نتیجے کا یقینی اور قطعی ہونا ضروری نہیں ہے۔ مثلاً تجربے سے پتہ چلا کہ سانپ رات کی تاریکی میں چوہا پکڑتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ سانپ کو تاریکی میں بھی چوہا نظر آتا ہے، صحیح ثابت نہیں ہوا کیونکہ آنکھ بند کرنے کی صورت میں بھی اس نے چوہے کو پکڑ لیا۔ تجربے کا سلسلہ جاری رکھا اور یہ تھیوری قائم کی گئی شاید سانپ چوہے کی بو سونگھتا ہے۔ یہ تھیوری بھی صحیح ثابت نہ ہوئی۔ آخر میں اس بات پر سلسلہ رک گیا کہ سانپ چوہے کے جسم کی حرارت حس کرتا ہے۔

جب ایک نہایت جزئی مسئلے میں تجربات کو دیر تک آگے جانا پڑا تو کل کائنات کے بارے میں انسانی تجربے نے ابھی کون سی مسافت طے کی ہے اور کتنی مسافت باقی ہے؟ اس کا ایک نہایت اجمالی اندازہ وہ لوگ لگا سکتے ہیں جو اس میدان میں کام کر رہے ہیں۔

فلکیات میں ابتدائی مراحل میں اسی قسم کے مسائل پیدا بھی ہوئے۔ چنانچہ بطلیموسی نظریے کے مطابق اس نظام کا مرکز زمین کو قرار دیا جاتا تھا اور خیال یہ تھا کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ تجربات نے بتایا کہ زمین نہیں، سورج مرکز ہے اور زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ جب سورج مرکز ہے تو سورج ساکن ہے۔ زمین سورج کے گرد حرکت میں ہے۔ اس سے قرآن کا یہ نظریہ باطل ثابت ہو گیا کہ سورج حرکت میں ہے۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ وَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ۔[2] اور اسی نے شب و روز اور آفتاب و ماہتاب پیدا کیے، یہ سب کسی نہ کسی فلک میں تیر رہے ہیں۔

چنانچہ الحادی نظریے کے لوگوں نے اس جدید انکشاف کو دین کے خلاف ایک فتح قرار دے دیا

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۳۰ [2] ۲۱ انبیاء: ۳۳

لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی دنیا کو پتہ چل گیا کہ سورج واقعاً اپنے فیملی کے ممبران (سیارات) سمیت اپنے مدار میں تیر رہا ہے اور صرف سورج نہیں اجرام سماویہ کی ہر شے، سیارات، ستارے، کہکشائیں سب اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ تجربے سے یہ اجمالی علم تو آ گیا تاہم ابھی اس کی بہت سی تفصیلات کے لیے گنجائش باقی ہے۔

لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا: سے معلوم ہوا کہ اس کائنات کی خلقت کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ کون بہتر عمل کرتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَی الۡاَرۡضِ زِیۡنَۃً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ اَیُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ○[1]

روئے زمین پر جو کچھ موجود ہے اسے ہم نے زمین کے لیے زینت بنایا تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سب سے اچھا عمل کرنے والا کون ہے۔

لہٰذا حسن عمل ہی اس کائنات کی خلقت کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔ علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

> لہٰذا انسانوں میں جو ہستی سب سے افضل ہے وہی کائنات کی خلقت کا مقصد قرار پاتی ہے۔ چنانچہ آیت میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہے بلکہ دلالت موجود ہے کیونکہ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا سے معلوم ہوا کہ اصل غرض و غایت تو یہ ہے کہ بہترین عمل کرنے والوں کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کیا جائے اور عمل کے اعتبار سے جو سب سے بہتر ہو گا وہی کائنات کی خلقت کا مقصد قرار پاتا ہے۔ اس بات سے حدیث قدسی کا مضمون قابل فہم ہو جاتا ہے۔ جس میں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا: لو لاك لما خلقت الافلاك۔ اگر آپؐ نہ ہوتے تو میں افلاک کو خلق ہی نہ کرتا۔ چونکہ حضورؐ مخلوقات میں حسن عمل میں سب سے افضل ہیں۔[2]

وَلَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّکُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ: حیات بعد الموت کو جادو کہنے کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ جس طرح جادوگر ایک غیر واقع کو واقع دکھاتا ہے اسی طرح حیات بعد الموت کو یہ شخص ایک امر واقع کی طرح بیان کرتا ہے جب کہ یہ واقع ہونا ممکن نہیں ہے۔ یعنی قیامت کا تصور ایک ساحرانہ تصور ہے جس کا واقع کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس حسین کائنات کی غرض خلقت حسن عمل اور انسانی ارتقا ہے۔ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ....

۲۔ جو ہستی حسن عمل میں سب سے افضل ہے وہی مقصد خلقت ہے۔ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ....

---

[1] ۱۸ کہف: ۷ [2] تفسیر المیزان ۱۰: ۱۵۲ ذیل آیہ

وَلَئِنۡ اَخَّرۡنَا عَنۡهُمُ الۡعَذَابَ اِلٰۤی اُمَّةٍ مَّعۡدُوۡدَةٍ لَّيَقُوۡلُنَّ مَا يَحۡبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوۡمَ يَاۡتِيۡهِمۡ لَيۡسَ مَصۡرُوۡفًا عَنۡهُمۡ وَ حَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝۸

۸۔ اور اگر ہم ایک مقررہ مدت تک ان سے عذاب کو ٹال دیں تو وہ ضرور کہنے لگتے ہیں: اسے کس چیز نے روک رکھا ہے؟ آگاہ رہو! جس دن ان پر عذاب واقع ہو گا تو ان سے ٹالا نہیں جائے گا اور جس چیز کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں وہی انہیں گھیر لے گی۔

تشریح کلمات

اُمَّةٍ: (ا م م) یہاں امۃ کے معنی عرصہ دراز کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَئِنۡ اَخَّرۡنَا: قرآن کی متعدد آیات سے مشرکین کو اس بات کی دھمکی مل چکی تھی کہ اگر وہ یہ تکذیبی عمل جاری رکھیں تو ان پر عذاب نازل ہونے والا ہے۔ مشرکین نے اس کے جواب میں نہایت تحقیر آمیز لہجے میں کہا: وہ آنے والا عذاب آتا کیوں نہیں ہے؟ کس چیز نے اسے روک رکھا ہے؟ ہم اپنے کفر پر ڈٹے ہوئے ہیں اور تکذیبی عمل بھی جاری رکھے ہوئے ہیں تو وہ عذاب کیوں نہیں آتا؟

۲۔ اَلَا يَوۡمَ يَاۡتِيۡهِمۡ: جواب میں فرمایا: جب وہ عذاب آئے گا تو تم اسی چیز کے گھیرے میں آؤ گے جس کا تم استہزاء کر رہے ہو۔ عذاب کی تاخیر میں جو حکمت پوشیدہ ہے اس کا پہلے کئی بار ذکر ہو چکا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حق کا استہزاء کرنے والوں کا آخر میں استہزاد ہو جایا کرتا ہے: عَنۡهُمۡ وَ حَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ۔

وَلَئِنۡ اَذَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنَّا رَحۡمَةً ثُمَّ نَزَعۡنٰهَا مِنۡهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوۡسٌ كَفُوۡرٌ ۝۹

۹۔ اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد وہ نعمت اس سے چھین لیں تو بے شک وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔

وَ لَئِنۡ اَذَقۡنٰهُ نَعۡمَآءَ بَعۡدَ ضَرَّآءَ مَسَّتۡهُ لَيَقُوۡلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ

۱۰۔ اور اگر ہم اسے تکلیفوں کے بعد نعمتوں سے نوازتے ہیں تو ضرور کہہ اٹھتا ہے: سارے دکھ مجھ سے دور ہو گئے بے شک وہ خوب خوشیاں

عَنِّیۡ ؕ اِنَّہٗ لَفَرِحٌ فَخُوۡرٌ ۙ﴿۱۰﴾	منانے اور اکڑنے لگتا ہے۔
اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾	۱۱۔البتہ صبر کرنے والے اور نیک اعمال بجالانے والے ایسے نہیں ہیں ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَئِنۡ اَذَقۡنَا: انسان کی جلد بازی اور کم ظرفیت کی بات ہے کہ نعمتوں کے چھن جانے سے یہ خیال کرتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے رحمت و نعمت نہیں اس کا اپنا حق تھا جو ناحق چھن گیا اور جتنی دیر وہ اس نعمت سے مستفید رہا اس کا شکر بھی نہیں کرتا۔

۲۔ وَلَئِنۡ اَذَقۡنٰہُ: اسی طرح جب بدحالی کے بعد نعمتوں کا وفور ہونے لگتا ہے تو وہ اس انداز سے خوشیاں مناتا اور اکڑتا ہے کہ برے دن گئے اور دوبارہ ان برے دنوں کے آنے کا امکان ہی نہیں ہے اور ان نعمتوں کے لیے زوال ہی نہیں ہے۔ جب نعمتیں چھن جاتی ہیں تو یہ تنگ نظر انسان خیال کرتا ہے اب ان نعمتوں نے آنا ہی نہیں اور جب نعمتیں وافر ہو جاتی ہیں تو خیال کرتا ہے ان نعمتوں نے جانا ہی نہیں۔ اس کی کوتاہ نظر صرف حال حاضر پر لگی رہتی ہے۔ اسی کو ساری دنیا تصور کرتا ہے۔ نہ ان نعمتوں کے سرچشمہ پر نظر ہے کہ مایوس نہ ہو، نہ ان نعمتوں کے حقیقی مالک کی معرفت ہے کہ وہ ان نعمتوں کو دیکھ کر اکڑ نہ جائے۔

۳۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا: البتہ صبر اور عمل صالح بجالانے والے افراد کی جہاں بینی اس سے مختلف ہے۔ وہ ان نعمتوں کے حقیقی مالک کی معرفت رکھتے ہیں۔ جب نعمت چھن جاتی ہے تو ان کا موقف یہ ہوتا ہے کہ اس کا حقیقی مالک تو اللہ ہی ہے۔ یہ چند روز کے لیے میرے پاس امانت تھی اور جتنی دیر میرے پاس رہی یہ اس مالک حقیقی کی مہربانی اور اس کا کرم تھا۔ جب بدحالی کے بعد نعمتیں وافر ہو جاتی ہیں تو اس کا موقف یہ ہوتا ہے کہ مالک حقیقی نے مجھے اس امانت کا اہل سمجھا ہے۔ جتنی دیر میرے پاس رہے یہ اس کی رحمت و شفقت ہے اور ہر حالت کے لیے اپنے آپ کو آمادہ اور تیار رکھتا ہے۔

اس آیت میں قریش کے برائی میں بدمست افراد کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے دن گنے جا چکے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کو چاہیے کہ اچھے دنوں میں برے دنوں کے لیے آمادہ رہے اور برے دنوں میں رحمت الٰہی کا منتظر رہے۔

۲۔ گردش ایام سے محفوظ رہنے کا بہترین وسیلہ صبر ہے۔
۳۔ تعیش انسان سے قوت مقاومت سلب کرتی ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعۡضَ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡكَ وَ ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدۡرُكَ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ نَذِیۡرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ وَّكِیۡلٌ ﴿۱۲﴾

۱۲۔(اے رسول) آپ کی طرف جو وحی کی گئی ہے شاید آپ اس کا کچھ حصہ چھوڑنے والے ہیں اور ان کی اس بات پر دل تنگ ہو رہے ہیں کہ اس پر خزانہ کیوں نازل نہیں ہوا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ آپ تو صرف تنبیہ کرنے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کا ذمہ دار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ: نہایت نامساعد حالات میں بار رسالت کی سنگینی کی طرف اشارہ ہے کہ حالات ایسے ہیں کہ آپؐ کے لیے نہایت دشوار ہے کہ وحی کی باتیں بلا فاصلہ ایسے لوگوں تک پہنچا دیں جن کے راہ راست پر آنے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے بلکہ ان کے عناد اور ہٹ دھرمی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

۲۔ لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡهِ كَنۡزٌ: اب یہ لوگ کہنے لگے ہیں کہ اگر تو اللہ کا رسول ہے تو تجھ پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں ہوتا یا کوئی فرشتہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آتا؟ ایسے حالات میں یہ خیال دل میں آ سکتا ہے کہ انہیں وحی کی باتیں سنانے کا کیا فائدہ ہوگا۔ ان لوگوں نے ایمان لانا نہیں ہے۔ آیت میں اس احتمال کی نفی کی ہے کہ ابلاغ وحی کا مطلب صرف یہ نہیں کہ وہ ایمان لے آئیں بلکہ صرف تبلیغ سے بھی کچھ حکمتیں وابستہ ہیں۔ آپؐ صرف تنبیہ و تبلیغ کریں بس۔ ان لوگوں کو گرفت میں لینا ہمارا کام ہے۔

اس آیت سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ترک تبلیغ یا تاخیر کا قصد رکھتے تھے۔ چونکہ لَعَلَّ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں توقع ہو۔ کسی چیز کی توقع سے اس کا وقوع ثابت نہیں ہوتا بلکہ اظہار توقع اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تبلیغ احکام پر زیادہ توجہ دے۔

۳۔ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ نَذِیۡرٌ: آپ کے ذمے واضح لفظوں میں لوگوں کی تنبیہ کرنا ہے۔ خزانہ دار ہونا یا فرشتے کا ساتھ ہونا آپؐ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ نبوت کے لیے مطلوبہ معجزہ و دلیل پیش ہو چکی ہے، اس کے بعد بھی وہ نہیں مانتے ہیں تو منوانا آپؐ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ حق کا پہنچانا آپ کے ذمہ داری ہے۔

۴۔ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ وَّكِیۡلٌ: ہر چیز کی ذمے داری اللہ تعالیٰ سے مربوط ہے۔ اللہ آپؐ کا

ذمے دار ہے۔ کسی سے خوف کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کیا کہے گا؟

اہم نکات

۱۔ تبلیغ وحی میں کسی قسم کا تساہل یا تاخیر جائز نہیں ہے: فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ ....

۲۔ مادی انسان دولت کو ہی تمام قدروں کا معیار قرار دیتا ہے: لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ کَنۡزٌ ....

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِہٖ مُفۡتَرَیٰتٍ وَّ ادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے (قرآن کو) خود بنایا ہے؟ کہدیجیے: اگر تم سچے ہو تو اس جیسی خودساختہ دس سورتیں بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جس جس کو بلا سکتے ہو بلا لاؤ۔

تفسیر آیات

قرآن نے کئی بار چیلنج کیا ہے کہ اگر یہ قرآن کسی ایک انسان کی تصنیف ہے تو تمہارے درمیان ایسے انسان موجود ہوں گے جو ایسا کلام تصنیف کر سکیں۔ ایک سے نہیں ہوتا تو تو پوری جماعت مل کر ایسا کلام بنا لائے جس میں انسانیت کے لیے ایک پیغام ہو اور دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی ہو۔ مضمون بھی اسی سطح کا ہو اور ساتھ اسلوب کلام بھی یہی ہو لیکن بار بار چیلنج دینے کے باوجود تم ایسا کلام پیش نہیں کر سکے تو تمہیں قبول کرنا ہو گا کہ یہ میرا نہیں، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

بعض حضرات نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے سورہ ہود، سورہ یونس سے پہلے نازل ہوا ہے کیونکہ سورہ ہود میں دس سورتیں بنا کر لانے کا چیلنج دیا گیا ہے۔ سورہ یونس میں کہا گیا کہ اگر دس سورتیں نہیں پیش کر سکتے تو ایک ہی سورہ بنا کر پیش کرو۔

لیکن قرآن چیلنج مختلف حالات اور تقاضوں کے مطابق مختلف اوقات میں دیتا رہا۔ کبھی پورے قرآن کا اور کبھی دس سورتوں کا اور کبھی ایک سورہ کا۔ اس آیت میں درحقیقت قرآن کے مضمون اور پیغام کا چیلنج ہے، نہ الفاظ و اسلوب کا۔ دوسرے لفظوں میں اس چیلنج کا تعلق قرآن کی نوعیت سے ہے کہ اس قسم کا کلام پیش کرو، نہ مقدار سے کہ کتنا کلام پیش کیا جائے۔ لہٰذا چیلنج کی مقدار سے ترتیب نزول کا اثبات ممکن نہیں ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ البقرۃ آیت ۲۳. سورہ یونس آیت ۳۸۔

فَاِلَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا

۱۴۔ پھر اگر وہ تمہاری مدد کو نہ پہنچیں تو جان لو کہ

أَنَّمَآ أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَأَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٤﴾

یہ اللہ کے علم سے نازل ہوا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، کیا تم اس بات کو تسلیم کرنے والے ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ فَاِلَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ : اگر منکرین نے تمہارے چیلنج کا جواب نہ دیا تو جان لو یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے: اگر تمہارے خداؤں کے بھرپور مخالف اور توحید کا علمبردار یہ قرآن محمدؐ کا اپنا خود ساختہ ہے تو اپنے خداؤں کو مدد کے لیے بلاؤ۔ اگر وہ کچھ کر سکتے ہیں تو وہ تمہارے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر دیں گے کہ تم اس قرآن کا مقابلہ کر سکو اگر ایسا نہ کیا تو اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے:

۱۔ قرآن اللہ کا کلام ہے کسی بشر کا خود ساختہ نہیں ہے۔

۲۔ تمہارے معبود سب خود ساختہ ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، ورنہ وہ اس اہم موقع پر تمہاری فریاد رسی کرتے جب کہ یہ خود ان معبودوں کے حق میں ہیں کہ قرآن کا مقابلہ ہو اور ان کا معبود ہونے پر خدشہ وارد نہ ہو۔

۳۔ قرآن ہر موقف کے لیے دلیل پیش کرتا ہے۔ یہاں استدلال کیا ہے جب تمہارے معبود تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے تو وہ باطل ثابت ہوگئے ہمارا یکتا معبود جس نے قرآن جیسا کلام نازل فرمایا ہے، اس کی وحدانیت ثابت ہوگئی۔

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا وَ زِیۡنَتَہَا نُوَفِّ اِلَیۡہِمۡ اَعۡمَالَہُمۡ فِیۡہَا وَ ہُمۡ فِیۡہَا لَا یُبۡخَسُوۡنَ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ جو دنیوی زندگی اور اس کی زینت کے طالب ہوتے ہیں ان کی محنتوں کا معاوضہ ہم انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور ان کے لیے اس میں کمی نہیں کی جائے گی۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَیۡسَ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا النَّارُ ۫ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِیۡہَا وَ بٰطِلٌ مَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں آتش کے سوا کچھ نہ ہو گا اور وہاں ان کے عمل برباد اور ان کا کیا دھرا سب نابود ہو جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا : قریش کے دنیا پرستوں کے زرق برق سے مسلمان متاثر نہ ہوں۔

اس روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا ایک فیزیکلی نظام نافذ ہے جسے نظام علل و اسباب کہتے ہیں۔ اس نظام کے تحت جو بھی ان علل و اسباب کو بروئے کار لائے گا اس کا نتیجہ حاصل کرے گا۔ ان علل و اسباب سے ایک کافر کو بھی اسی طرح نتیجہ ملے گا جس طرح ایک مؤمن کو ملتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ کافر کا نصب العین صرف دنیا کی ترقی اور آسائش ہے اس لیے کافر کو اس کی محنتوں کا صلہ اسی دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے۔ وَھُمۡ فِیۡھَا لَا یُبۡخَسُوۡنَ: اللہ کے فیزیکلی قانون میں کسی کی حق تلفی نہیں کی جاتی ہے۔

۲۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَیۡسَ لَھُمۡ: اور آخرت میں اسے کچھ نہیں ملے گا۔ خواہ اس کا یہ عمل اپنی جگہ انسانیت کے لیے خدمت ہی کیوں نہ ہو کیونکہ کافر کی طرف سے جو انسانی خدمت ہوتی ہے اس خدمت میں تو حسن ہے لیکن اس خدمت کے انجام دینے والے میں کوئی حسن نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں فعل میں حسن ہے لیکن فاعل میں حسن نہیں ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ ایک بدکار عورت اپنی ناجائز کمائی سے یتیم پالتی ہے۔ اسی طرح ایک منکر خدا جو خدا کے وجود کا معترف نہیں یا اس کے ساتھ شرک کر کے مقام الٰہیت میں جسارت کا ارتکاب کرتا ہے اس کا اپنا کام اللہ کے لیے ہوتا ہی نہیں تاکہ اسے اللہ سے کوئی صلہ مل جائے۔

۳۔ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِیۡھَا: اس میں وہ ریاکار بھی شامل ہے جو اپنے اعمال کو دنیاوی مفاد کے لیے انجام دیتا ہے۔ وہ نیک اعمال بجا لاتا ہے لیکن اس کی نمازوں، روزوں اور خدمات کا نصب العین اللہ نہیں، دنیاوی مفادات ہیں۔ اس کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں اور سارا کیا دھرا ناکارہ ہو جاتا ہے۔

مؤمن کو بھی ان علل و اسباب سے وہی نتیجہ ملتا ہے مگر مؤمن کا نصب العین صرف دنیاوی زیب و زینت تک محدود نہیں ہے۔ مؤمن کی دنیا بھی اللہ کے لیے ہے۔ وہ جس منہ سے کھاتا ہے اسی منہ سے یہ دعا نکلتی ہے: قو علی خدمتك جوارحی۔ تیری عبادت کے لیے میرے اعضاء میں طاقت عنایت فرما۔

ایسے مؤمنوں کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے:

فَاٰتٰىھُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَۃِ ...[1] چنانچہ اللہ نے انہیں دنیا کا ثواب بھی دیا اور آخرت کا بہتر ثواب بھی عطا کیا ...

اہم نکات

۱۔ اس آیت سے اس سوال کا جواب بھی ملا کہ کافر بہتر ترقی میں کیوں ہیں؟: مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ...

۲۔ مادی ترقی کا انحصار محنت اور کاوش پر ہے نظریہ وعقیدہ پر نہیں: نُوَفِّ اِلَیۡھِمۡ اَعۡمَالَھُمۡ فِیۡھَا ...

۳۔ اللہ کا عدل واحسان ہے کہ دنیاپرست کی نیکی کا معاوضہ دنیا میں ہی دیتا ہے: وَھُمۡ فِیۡھَا لَا یُبۡخَسُوۡنَ ..

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۴۸

اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ وَ یَتۡلُوۡہُ شَاہِدٌ مِّنۡہُ وَ مِنۡ قَبۡلِہٖ کِتٰبُ مُوۡسٰۤی اِمَامًا وَّ رَحۡمَۃً ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُہٗ ۚ فَلَا تَکُ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡہُ ٭ اِنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ بھلا وہ شخص (افترا کر سکتا ہے) جو اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہو اور اس کے پیچھے اس کے رب کی طرف سے ایک شاہد بھی آیا ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب (بھی دلیل ہو جو) رہنما اور رحمت بن کر آئی ہو؟ یہی لوگ اس پر ایمان لائیں گے اور دوسرے فرقوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کریں تو اس کی وعدہ گاہ آتش جہنم ہے، آپ اس (قرآن) کے بارے میں کسی شک میں نہ رہیں، یقیناً یہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ: سلسلہ کلام رسول و قرآن کی حقانیت کے بارے میں جاری ہے کہ وہ شخص افترا کیوں کرے جس کے ساتھ اللہ کی طرف سے حجت و دلیل موجود ہے اور اس دلیل و حجت کا تم مقابلہ بھی نہ کر سکے۔ قرآن رسولؐ کا برہان اور واضح دلیل ہے۔ آپؐ کی حقانیت پر ایک واضح معجزہ ہے۔

۲۔ وَ یَتۡلُوۡہُ شَاہِدٌ مِّنۡہُ: قرآن کے بعد رسولؐ کی حقانیت پر گواہ بھی موجود ہے، جو اس قرآن کے واضح دلیل ہونے کا نزدیک سے مشاہدہ کرنے والا ہے۔ وَ یَتۡلُوۡہُ شَاہِدٌ مِّنۡہُ میں دونوں ضمیریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہیں۔ اس لیے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ شاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جزء ہے۔ آگے ہم بیان کریں گے کہ یہ شاہد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ حدیث ہے:

علی منی وانا منہ ....[1]

چنانچہ امالی شیخ طوسی میں ایک روایت میں یہی تفسیر کی گئی ہے۔ اس روایت میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

انا الشاھد و انا منہ ....[2]

اور اگر شَاہِدٌ مِّنۡہُ کی ضمیر اللہ کی طرف ہے تو اس سے یہ بات سامنے آجائے گی کہ یہ شاھد اللہ کی طرف سے ہے اور حضرت علی علیہ السلام کو اللہ نے شاھد بنایا ہے۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں

---

[1] بحار ۳۸: ۷۴ باب ۶۰۔ الاستدلال بولایۃو استنباتہ....۔ [2] الامالی للطوسی: ۳۷۱

ارشاد ہوا:

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَجَعَلۡنَا مَعَہٗۤ اَخَاہُ ہٰرُوۡنَ وَزِیۡرًا ۞[1]　　اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت فرمائی اور ان کے بھائی ہارون کو مددگار بنا کر ان کے ساتھ کر دیا۔

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں متعدد طرق سے روایات وارد ہوئی ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور یَتۡلُوۡہُ شَاہِدٌ مِّنۡہُ علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

i۔ ابن عباس: اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور یَتۡلُوۡہُ شَاہِدٌ مِّنۡہُ علی (ع) ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی، تفسیر ثعلبی، تفسیر شواھد التنزیل ذیل آیہ۔ کنزالعمال ۲: ۴۳۹۔ حدیث ۴۴۴۰۔

ii۔ جابر بن عبد اللہ الانصاری کی روایت ملاحظہ ہو۔ تفسیر قرطبی، الدرالمنثور ۳: ۳۲۴۔ تفسیر طبری، الکشف و البیان ثعلبی۔

iii۔ انس بن مالک کی روایت ملاحظہ ہو۔ شواھد التنزیل ذیل آیت۔

iv۔عباد (عبادۃ) بن عبداللہ کی روایت کنا فی الرحبۃ۔ ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ذیل آیت۔ مناقب ابن المغازلی حدیث ۳۱۸ صفحہ ۲۷۰۔ تفسیر البحر المحیط ذیل آیت۔ کنز العمال ا: ۲۵۰ طبعۃ اولیٰ۔

v۔ حارث کی روایت۔ ملاحظہ ہو تفسیر شواھد التنزیل ذیل آیت۔، تاریخ دمشق ۲: ۴۳۰۔

vi۔ ابوالطفیل سے بسام بن عبد اللہ نے روایت کی ہے حضرت علی علیہ السلام خطبہ دے رہے تھے۔ ابن کواء نے پوچھا: آپؑ کے بارے میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ فرمایا: نبیؐ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ ہیں اور وَیَتۡلُوۡہُ شَاہِدٌ مِّنۡہُ میں ہوں۔ ملاحظہ ہو شواھد التنزیل۔

vii۔عبد اللہ بن نجی (یحیی) کی روایت۔ ملاحظہ ہو تفسیر طبری ذیل آیت۔

viii۔ راذان کی روایت۔ تفسیر ثعلبی الکشف و البیان۔ شواھد التنزیل ذیل آیت۔سید بن طاؤس علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب سعد السعود صفحہ ۷۳ میں لکھا ہے:

> محمد بن العباس بن مروان نے اپنی کتاب میں اس روایت کو ٦٦ طرق سے اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔

شیخ القرآن علامہ محمد ثناء اللہ مظہری اپنی مشہور تصنیف التفسیر المظہری میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

---

[1] فرقان: ۳۵

بعض کہتے ہیں: وَیَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ میں شاہد علی بن ابی طالب ہیں۔ بغوی نے کہا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قریش میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کے بارے میں کوئی آیت قرآن نازل نہ ہوئی ہو۔ ایک شخص نے پوچھا: آپ کے بارے میں کون سی آیت نازل ہوئی ہے؟ تو آپ نے فرمایا: وَیَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ۔

آگے لکھتے ہیں: اگر کوئی پوچھے علی کو الشاھد کہنے کی وجہ کیا ہے؟ میں کہوں گا: شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ علی نے لوگوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا ہے۔ لہٰذا علی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی سب سے پہلے تصدیق کی ہے لیکن میرے نزدیک اس کی بہتر توجیہ یہ ہے: والاوجه عندی ان یقال: ان علیا رضی الله عنه کان قطب کمالات الولایة وسائر الاولیاء حتی الصحابة رضوان الله علیهم اتباع له فی مقام الولایة، و افضیلة الخلفاء الثلاثة بوجه آخر، کذاحقق المجدد رضی الله عنه فی مکتوب من اواخر مکتوباته کہ علی رضی اللہ عنہ کمالات ولایت میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرے اولیاء حتی صحابہ رضوان اللہ علیہم مقام ولایت میں علی کے تابع ہیں اور خلفاء ثلاثہ کی افضلیت دوسری صورت سے ہے۔ چنانچہ مجدّد رضی اللہ عنہ نے اپنی آخری مکتوب میں اسی حقیقت کو ثابت کیا ہے۔

آگے لکھتے ہیں: تو گویا آیت کے معنی یہ ہوئے اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ یعنی واضح حجت، برہان قاطع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے چونکہ آپؐ واضح حجت اور اپنے رب کی طرف سے برہان قاطع کے ساتھ ہیں جس سے آپ کے رسول اللہ ہونے پر قطعی علم حاصل ہوتا ہے اور وہ آپؐ کے معجزات ہیں جن میں افضل قرآن اور وحی سے مربوط علوم ہیں اور اس کے بعد ایک شاہد ہے اللہ کی طرف سے جو اس نبی کی صداقت کی گواہی دیتا ہے اور وہ علی ہیں اور علی کی طرح کے دیگر اولیاء۔

اس کے بعد وہ احادیث انا مدینة الحکمة علی بابها اور انا مدینة العلم و علی بابها سے استدلال کرتے ہیں کہ علوم اولیاء صرف علی کے پاس ہیں۔ ملاحظہ ہو التفسیر المظہری ۵:۷۷ ط رشیدیة سنۃ ۱۴۱۲۔

۳۔ وَمِنۡ قَبۡلِهٖ کِتٰبُ مُوۡسٰۤی: اس سے پہلے کتاب موسیٰ (ع) کی شکل میں اس رسولؐ کی حقانیت پر ایک بین دلیل موجود ہے۔ لہٰذا اس رسولؐ کی حقانیت کی دلیل صرف قرآن میں منحصر نہیں ہے۔ موسیٰ (ع) کی کتاب میں بھی پہلے واضح حجت و دلیل آچکی ہے۔

۴۔ اِمَامًا وَّ رَحۡمَۃً: اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو راہنما اور رحمت خدا ہونے کا اعزاز

حاصل ہے۔

۵۔ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ: یہی واضح دلیل رکھنے اور گواہی دینے والے لوگ اللہ پر، اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔

۶۔ فَلَاتَکُ فِیۡ مِرۡیَۃٍ: آپؐ کی رسالت شک و تردید سے بالاتر ہے چونکہ آپ کے ساتھ بَیِّنَۃٍ واضح دلیل ہے، شاہد بھی ہے اور توریت کی بھی شہادت ہے کہ آپؐ رسول برحق ہیں۔ اس مقصد کے لیے "سرّ دلبران در حدیث دیگران" کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ خطاب رسولؐ سے ہے اور سمجھانا دوسروں کو مقصود ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیادت کو ایک فیصلہ کن موقف رکھنا چاہیے۔

۲۔ صاحب دعوت پر ایمان کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب اس کے گواہ کو بھی تسلیم کیا جائے: یَتۡلُوۡہُ شَاہِدٌ مِّنۡہُ ....

وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ؕ اُولٰٓئِکَ یُعۡرَضُوۡنَ عَلٰی رَبِّہِمۡ وَیَقُوۡلُ الۡاَشۡہَادُ ہٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ کَذَبُوۡا عَلٰی رَبِّہِمۡ ۚ اَلَا لَعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿ۙ۱۸﴾

۱۸۔ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ افترا کرتا ہے، ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش کیے جائیں گے اور گواہ کہیں گے: یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا تھا، خبردار! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔

الَّذِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَیَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ؕ وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ جو لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی لانا چاہتے ہیں اور یہی لوگ آخرت کے منکر ہیں۔

تفسیر آیات

مشرکین کا موقف یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ایک کتاب بنائی اور اس کی نسبت اللہ کی طرف دی اور افترا کیا۔ جواباً اس آیت میں فرمایا: وہ افترا باز، جو سب سے بڑھ کر ظالم ہے، خود تم ہو۔ اللہ پر شرک کر کے افترا کرتے ہو۔ اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہو۔

یُعۡرَضُوۡنَ عَلٰی رَبِّہِمۡ: ان کو اللہ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن

پردے اٹھ جائیں گے۔ حق آشکار ہو جائے گا اور تمام حقائق کھل کر سامنے آئیں گے:

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○[1] اور سب خدائے واحد و قہار کے سامنے پیش ہوں گے.

وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ: گواہان کہیں گے: یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا تھا۔ واضح رہے قرآن کی متعدد آیتوں کی روشنی میں، انسان کے اعمال کی گواہی دینے والے کئی ایک ہوں گے:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ○[1] پس (اس دن) کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے رسولؐ) آپ کو ان لوگوں پر بطور گواہ پیش کریں گے۔

نیز فرمایا:

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ○[2] اور ہر شخص ایک ہانکنے والے (فرشتے) اور ایک گواہی دینے والے (فرشتے) کے ساتھ آئے گا۔

اور فرمایا

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○[3] اس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان سب اعمال کی گواہی دیں گے جو یہ کرتے رہے ہیں.

حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○[4] یہاں تک کہ جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔

نیز ارشاد ہے:

وَجِایْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ ....[5] اور پیغمبروں اور گواہوں کو حاضر کیا جائے گا....

اہم نکات

۱۔ اللہ پر جھوٹی نسبت دینے والے یعنی دینی تعلیمات کے بارے میں جھوٹ بولنے والے ظالم اور لعنت کے سزاوار ہیں۔

اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ

۲۰۔ یہ لوگ زمین میں اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی حامی ہے ان کا عذاب دوگنا کیا جائے گا، کیونکہ وہ (کسی کی)

---

[1] ۱۴ ابراھیم: ۴۸ [1] ۴ نساء: ۴۱ [2] ۵۰ ق: ۲۱ [3] ۲۴ نور: ۲۴ [4] ۴۱ حٰم سجدہ: ۲۰ [5] ۳۹ زمر: ۶۹

الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ	سن ہی نہ سکتے تھے اور نہ ہی دیکھتے تھے۔
السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾	۲۱۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے آپ کو خسارے میں
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ	ڈال چکے ہیں اور وہ جو کچھ افترا کرتے تھے وہ
وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾	بھی ان سے کھو گیا۔
لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ	۲۲۔ لازمی بات ہے آخرت میں یہ لوگ سب
الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾	سے زیادہ گھاٹے میں ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا: ان افترا کرنے والوں کی حالت یہ ہے کہ نہ تو اللہ کے مقابلے میں یہ خود کسی طاقت وقوت کے مالک ہیں، نہ ہی اللہ سے ہٹ کر ان کا کوئی اور حامی اور کارساز ہے۔ ان کو بالآخرہ اللہ کی بارگاہ میں پلٹ کر آنا ہوگا۔

۲۔ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ: وہاں ان کو دوگنا عذاب ملے گا کیونکہ یہ خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے۔ چنانچہ آیات قرآنی اور سنت نبوی میں یہ بات ثابت ہے:

من سن سنة سيئة كان عليه وزرها و وزر من عمل بها ....[۱]	جو ایک گناہ کا رواج ڈالے گا تو اس پر رواج ڈالنے کا گناہ ہے اور جس جس نے اس گناہ پر عمل کیا ہے اس کا گناہ اس کے ذمے ہے۔

گمراہی کی وجہ یہ رہی کہ یہ لوگ کسی ہادی کی ہدایت یا کسی ناصح کی تنبیہ کو سننے کے لیے آمادہ ہی نہ تھے۔ نہ ہی آیات الٰہی پر فکر ونظر سے کام لیتے تھے۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا:

وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ....[۲]	اور ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں ....

۳۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی حیات کا سودا ہلاکت سے کیا تو بڑے خسارے کا سودا کیا۔ ان کے لیے سب سے عزیز اپنی زندگی تھی۔ اسے دے کر ابدی ہلاکت خرید لی۔ اس سے زیادہ خسارہ کیا ہوگا۔

۴۔ وَضَلَّ عَنْهُمْ: اور جن کو ان لوگوں نے اللہ کے ساتھ شریک گردانا تھا، قیامت کے دن وہ ان کو ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔

---

[۱] بحار ۷۱: ۲۰۴	[۲] ۷ اعراف: ۱۷۹

۵۔ لَاجَرَمَ: لہٰذا یہ بات لازمی ہے کہ یہ لوگ قیامت کے دن، اپنی زندگی کا خسارہ اٹھانے والوں میں سب سے زیادہ خسارہ والے ہوں گے۔ لا اور جرم بعض اہل لغت کے نزدیک ایک لفظ ہے۔ بعض کہتے ہیں اس کے معنی لابد اور لا محالہ کے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ آخرت میں سب سے زیادہ گھاٹے میں وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں ہادیان برحق کی نصیحت سننے کے لیے آمادہ نہ تھے۔

۲۔ آخرت میں قدریں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ فِی الۡاٰخِرَۃِ ہُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ....

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخۡبَتُوۡۤا اِلٰی رَبِّہِمۡ ۙ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجا لائے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کرتے رہے یقیناً یہی اہل جنت ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تشریح کلمات

اَخۡبَتُوۡۤا: (خ ب ت) الخبت۔ نشیبی اور نرم زمین کو کہتے ہیں۔ بعد میں الاخبات نرمی اور تواضع کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: تکذیبی جماعت کے مقابلے میں ایمان کی جماعت کا ذکر ہے کہ ایمان و عمل صالح کے ساتھ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے سامنے تواضع اور عاجزی کرتے ہیں جو ایمان کا بہترین مظہر، ایمان کی پختگی پر سب سے بڑی دلیل اور معرفت رب کا لازمی نتیجہ ہے۔

۲۔ اَخۡبَتُوۡۤا: عبادت اور خضوع کو، ذوق بندگی نہ رکھنے والے، انسان کی توہین اور ذلت پسندی سمجھتے ہیں۔ جب کہ کمال خدا کی معرفت رکھنے والا، اس کمال کے سامنے تواضع اور عاجزی کرنے کو اپنے لیے معراج سمجھتا ہے۔ جو کمال کے سامنے اکڑ جاتا ہے وہ انسانی قدروں سے محروم ذلت پسند انسان ہے۔

اہم نکات

۱۔ کمال مطلق کے سامنے جھکنا کمال کی علامت ہے: وَ اَخۡبَتُوۡۤا اِلٰی رَبِّہِمۡ ....

مَثَلُ الۡفَرِیۡقَیۡنِ کَالۡاَعۡمٰی وَ الۡاَصَمِّ

۲۴۔ دونوں فریقوں (مومنوں اور کافروں) کی مثال

وَالۡبَصِیۡرِ وَالسَّمِیۡعِ ؕ ہَلۡ یَسۡتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

ایسی ہے جیسے (ایک طرف) اندھا اور بہرا ہو اور (دوسری طرف) دیکھنے والا اور سننے والا ہو کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم نصیحت نہیں لیتے؟

تفسیر آیات

دونوں فریقوں کی صورت حال کی ایک محسوس اور سادہ مثال۔ مؤمن اپنی عقل سے کام لینے کے لیے اپنے اعضا و جوارح سے کام لیتا ہے۔ وہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ پھر سمجھتا ہے۔ اس پر عمل کرتا ہے۔ نجات اور کامیابی نصیب ہو جاتی ہے۔ کافر اپنے اعضا سے کام نہیں لیتا۔ نہ بصارت سے، نہ سماعت سے اور نتیجتاً نہ عقل سے۔ لہٰذا وہ ہدایت حاصل کر سکتا ہے نہ نصیحت سن سکتا ہے۔

کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب واضح ہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن دیدہ و گوش رکھتا ہے جب کہ کافر اندھے بہرے ہوتے ہیں۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ ۫ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿ۙ۲۵﴾

اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۶﴾

۲۵۔ اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، (انہوں نے اپنی قوم سے کہا) میں تمہیں صریحاً تنبیہ کرنے والا ہوں

۲۶۔ کہ تم غیر اللہ کی عبادت نہ کرو مجھے تمہارے بارے میں ایک دردناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا: تاریخ انبیاء میں سب سے پہلا داعی توحید، ثنیت و بت پرستی کے خلاف سب سے پہلا جہاد اور تاریخ ادیان میں سب سے پہلے مجاہد حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے۔ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا: تم جن مہلک خطرات میں گھرے ہوئے ہو اور جس انجام سے تمہیں دوچار ہونا ہو گا، اس سے بچنے اور تنبیہ کرنے آیا ہوں

۲۔ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ: اور یہ سمجھانے آیا ہوں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو، بت پرستی کو چھوڑ دو۔

۳۔ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ: حضرت نوح علیہ السلام ایک ہادی و رہبر کے عنوان سے اپنی قوم پر مہربان ہیں اور ان کے درد کو اپنا درد محسوس کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ مجھے تمہارے بارے

میں خوف لاحق ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ان کے بارے میں خوف لاحق ہے اور خود ان کو اپنے بارے میں خوف لاحق نہیں ہے۔

۴۔ یَوۡمٍ اَلِیۡمٍ: ایک دردناک دن کا خوف۔ اس سے مراد طوفان کے ذریعے ان کی تباہی کا دن یا قیامت کا دن ہوسکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ دعوت نوح علیہ السلام کا بنیادی نقطہ توحید در عبادت ہے۔

فَقَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ مَا نَرٰىکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثۡلَنَا وَ مَا نَرٰىکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیۡنَ ہُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاۡیِ ۚ وَ مَا نَرٰی لَکُمۡ عَلَیۡنَا مِنۡ فَضۡلٍۭ بَلۡ نَظُنُّکُمۡ کٰذِبِیۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ تو ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: ہماری نظر میں تو تم صرف ہم جیسے بشر ہو اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے ادنیٰ درجے کے لوگ سطحی سوچ سے تمہاری پیروی کر رہے ہیں اور ہمیں کوئی ایسی بات بھی نظر نہیں آتی جس سے تمہیں ہم پر فضیلت حاصل ہو بلکہ ہم تو تمہیں کاذب خیال کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

الرذل: (ر ذ ل) وہ چیز جس سے اس کے ردی ہونے کی وجہ سے بے رغبتی کی جائے۔ اراذل، ارذل کی جمع ہے جس کے معنی حقیر اور ذلیل شخص کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا نَرٰىکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثۡلَنَا: وہ خیال کرتے تھے کہ انسان اللہ کی نمائندگی اور اس بار امانت کے لیے اہل نہیں ہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ہم جیسا بشر اور ہماری طرح کا انسان اللہ کی طرف سے رسول نہیں بن سکتا۔

۲۔ وَ مَا نَرٰىکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیۡنَ ہُمۡ اَرَاذِلُنَا: مادی بینش رکھنے والی قدیم و جدید جاہلیت کے لوگ انسان کو مادی قدروں میں تولتے ہیں انسانی قدروں میں نہیں۔ وہ نادار لوگوں کو ادنیٰ درجہ کے سمجھتے ہیں اور دولتمندوں کو اعلیٰ درجہ پر فائز خیال کرتے ہیں۔ غالباً فقیر اور نادار لوگ انبیاء کی دعوت پر لبیک کہنے میں پہل کرتے ہیں کیونکہ ان پر مادیت غالب نہ آنے کی وجہ سے ان کی روح شفاف اور باطن صاف ہوتا ہے۔ مادے کی بندگی سے آزاد ہونے کی وجہ سے وہ اپنے لیے صحیح راستے کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

چھوٹے اور بڑے کا مادی معیار ہر زمانے میں یہی رہا ہے جس کے تحت مال و دولت رکھنے والے کو او نچے طبقہ اور ناداروں کو چھوٹے طبقہ کے لوگ تصور کرتے رہے۔ آج بھی لوگ اسلام کو بعنوان دین و دستور حیات قبول کرنے کے باوجود اسی مادی معیار کے مطابق درجہ بندی کرتے اور مال و دولت کے طبقاتی تفوق کو ہی معیار فضیلت و اہمیت سمجھتے ہیں۔

۳۔ بَادِیَ الرَّاۡیِ: وہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ رسول پر ایمان لائے ہیں وہ سطحی سوچ رکھنے والے کم فکر لوگ ہیں جن کی فکری بلوغت اس حد تک نہیں کہ ان کے ایمان کو کسی اعتبار میں تولا جائے۔ لہٰذا بڑوں کو ان چھوٹے لوگوں کے ایمان کو اعتنا میں نہیں لانا چاہیے۔ آج کے منکرین اور مستکبرین بھی اہل ایمان کو قدامت پسند سادہ لوح، نادان اور ناخواندہ کہتے ہیں۔

۴۔ وَمَا نَرٰی لَکُمۡ عَلَیۡنَا: ان منکرین کے موقف کے مطابق اہل ایمان میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جس سے ان کو منکرین پر فضیلت حاصل ہو۔ نہ مال و دولت میں، نہ جاہ سلطنت میں، نہ فکر و عقل میں بلکہ منکرین کے مطابق دولتمند افضل، جاہ وحشم والا زیادہ سمجھدار، کرسی و اقتدار کے لائق اور زیادہ عاقل ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کو انسانی قدروں سے نہیں بیرونی قدروں سے مقام و منزلت حاصل ہو جاتی ہے۔

۵۔ بَلۡ نَظُنُّکُمۡ کٰذِبِیۡنَ: حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کرنے والے خود حضرت نوح علیہ السلام کو کاذب سمجھتے تھے کہ رسالت کا دعویٰ جھوٹ ہے۔ اللہ کسی انسان کو اپنا نمائندہ نہیں بناتا۔ آپؑ پر ایمان لانے والے کم عقل بے حیثیت لوگ ہیں، نہ مال دولت کے اعتبار سے ان کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل ہے۔ لہٰذا دعوائے نبوت میں کوئی صداقت نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ محروم طبقہ نے ہمیشہ حق پر لبیک کہا ہے: اِلَّا الَّذِیۡنَ ہُمۡ اَرَاذِلُنَا ....

۲۔ اہل باطل ہمیشہ اہل حق کی تحقیر کرتے رہے ہیں: اِلَّا الَّذِیۡنَ ہُمۡ اَرَاذِلُنَا ....

۳۔ متکبرین، دین والوں کی کسی فضیلت کے قائل نہیں ہوتے: وَمَا نَرٰی لَکُمۡ عَلَیۡنَا مِنۡ فَضۡلٍ ....

قَالَ یٰقَوۡمِ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کُنۡتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَ اٰتٰىنِیۡ رَحۡمَۃً مِّنۡ عِنۡدِہٖ فَعُمِّیَتۡ عَلَیۡکُمۡ ؕ اَنُلۡزِمُکُمُوۡہَا وَ اَنۡتُمۡ لَہَا کٰرِہُوۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ (نوح نے) کہا: اے میری قوم! یہ تو بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہوں اور اس نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا ہے مگر وہ تمہیں نہ سوجھتی ہو تو کیا ہم تمہیں اس پر مجبور کر سکتے ہیں جب کہ تم اسے ناپسند کرتے ہو؟

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں منکرین کی طرف سے اٹھائے گئے شبہات میں سے ایک ایک کا جواب آنے والی چند آیات میں دیا جا رہا ہے۔

۱۔ پہلا شبہ یہ تھا کہ تم ہم جیسے بشر ہو۔ اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے دو نکتے بیان فرمائے:

i۔ اِنۡ کُنۡتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ: میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہوں تو بھی تم جیسا ہوں۔ جو ذات ناقابل تردید دلیل کے ذریعے مقام ربوبیت کے ساتھ اتصال میں ہو وہ تم جیسی ہے۔ جو ہستی معرفت کردگار کی اس منزل فائز ہو جس سے وہ خالق اور مخلوق، عبد اور معبود کے درمیان واسطہ فیض بن گئی ہو، وہ تم جیسی ہے۔

ii۔ وَ اٰتٰىنِیۡ رَحۡمَۃً مِّنۡ عِنۡدِہٖ: اس نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا اور مجھے نبوت کے درجے پر فائز فرمایا اور جن خصوصیات کی بنا پر اللہ کی طرف سے نمائندگی کرنے کا شرف حاصل کر چکا ہوں پھر بھی میں تم جیسا ہوں؟

۲۔ فَعُمِّیَتۡ عَلَیۡکُمۡ: بات یہ ہے کہ تم چشم بینا نہیں رکھتے جس کی وجہ سے تم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہو کہ میں کون ہوں، میرا کیا مقام ہے۔ جو لوگ مادیت کی تہ بہ تہ تاریکیوں میں رہتے ہوں وہ روشنی کی حقیقت اور اس سے محرومی کا ادراک نہیں کر سکتے۔

۳۔ اَنُلۡزِمُکُمُوۡہَا: تمہارا شعور جب اس نور کا ادراک نہیں کر سکتا اور اس نور کے لیے تمہارے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے تو ہم جبراً اس نور کو تم پر مسلط نہیں کر سکتے کیونکہ ایمان کی جگہ دل ہے اور دل جبر کو قبول نہیں۔ جبر سے گردنیں جھکتی ہیں دل نہیں۔ دل میں جب آمادگی ہوتی ہے تو وہ نہایت اشتیاق کے ساتھ ایمان کا استقبال کرتا اور اپنی آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ اس کے بعد دل کے لیے ایمان، دل سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اگر دل میں ایمان سے اشتیاق کی جگہ کراہت ہے تو ایمان کے لیے بھی وہ دل مکروہ ہو جاتا ہے اور اس کے نزدیک جانا گوارا نہیں کرتا۔

اہم نکات

۱۔ عام بشر اور انبیاء میں مایۂ امتیاز دلیل و رحمت الٰہی ہے: عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَ اٰتٰىنِیۡ رَحۡمَۃً ....

۲۔ شریعت کی ابتدا حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں ہوئی۔ جب سے آج تک دین میں جبر کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے: اَنُلۡزِمُکُمُوۡہَا ....

۳۔ دین ہمیشہ دلیل کے ساتھ اپنا موقف پیش کرتا ہے: عَلٰی بَیِّنَۃٍ ....

وَ يٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًا ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ اِنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَلٰـكِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ قَوۡمًا تَجۡهَلُوۡنَ ۝۲۹

۲۹۔ اور اے میری قوم! میں اس کام پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف اللہ پر ہے اور میں ان لوگوں کو اپنے سے دور بھی نہیں کر سکتا جو ایمان لا چکے ہیں، یقیناً یہ لوگ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے ہیں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جاہل قوم ہو۔

وَ يٰقَوۡمِ مَنۡ يَّنۡصُرُنِىۡ مِنَ اللّٰهِ اِنۡ طَرَدْتُّهُمۡ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ۝۳۰

۳۰۔ اور اے میری قوم! اگر میں انہیں دور کروں تو مجھے اللہ (کے قہر) سے کون بچائے گا؟ کیا تم نصیحت نہیں لیتے ؟

تفسیر آیات

۱۔ وَ يٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ: دوسرا شبہ یہ تھا کہ تمہاری پیروی کرنے والے ادنی درجے کے لوگ ہیں۔ اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے: انبیاء لوگوں کے مال و دولت سے بے نیاز ہوتے ہیں لہٰذا ان کے سامنے امیر و فقیر یکساں ہوتے ہیں۔ ہدایت و رہنمائی کا لوگوں سے کسی قسم کا معاوضہ بھی نہیں مانگا جاتا۔ اس لیے دعوت انبیاء کے بارے میں فقیر و امیر کا سوال بے معنی ہو جاتا ہے۔

۲۔ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا: لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ جن لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہی ہے ان کو صرف فقیر و نادار ہونے کے بنیاد پر دھتکار دیا جائے۔

۳۔ اِنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ: یہ لوگ ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں اور وہ اپنے رب کی بارگاہ میں جانے والے ہیں۔ وہاں ان کو اپنے اپنے عمل کے مطابق درجہ ملنا ہے۔ میں دنیا میں ان کو مؤمن کا درجہ دیتا ہوں۔

۴۔ وَلٰـكِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ قَوۡمًا تَجۡهَلُوۡنَ: تم اہل ایمان کو نادار ہونے کی وجہ سے حقیر سمجھتے ہو جب کہ جاہل ہونے کے وجہ سے تم کو بے قیمت سمجھتا ہوں۔ حقیقت امر یہ ہے کہ منکرین، جہالت کی اتاہ گہرائیوں میں سقوط کر رہے ہیں۔ اہل ایمان اپنے رب کی بارگاہ کی طرف کمال و ارتقا کی منازل طے کر رہے ہیں۔

۵۔ مَنۡ يَّنۡصُرُنِىۡ مِنَ اللّٰهِ: ایسے لوگوں کو اپنے سے دور کروں۔ اللہ کے قہر و غضب کا مستحق بنوں تو کون مجھے بچائے گا۔ اس جملے میں اہل ایمان کا اللہ کے نزدیک مقام بیان ہوا ہے۔

اہم نکات

۱۔ سرمایہ دار غریبوں کا استحصال کرنے کے ساتھ ان سے نفرت بھی کرتے ہیں: وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا .... اس لیے انبیاء سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کو دھتکار دو۔

وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ وَلَاۤ اَقُوۡلُ اِنِّیۡ مَلَکٌ وَّلَاۤ اَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ تَزۡدَرِیۡۤ اَعۡیُنُکُمۡ لَنۡ یُّؤۡتِیَہُمُ اللّٰہُ خَیۡرًا ؕ اَللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ۚۖ اِنِّیۡۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اور میں تم سے نہ تو یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور جنہیں تمہاری نگاہیں حقیر سمجھتی ہیں ان کے بارے میں یہ نہیں کہتا کہ اللہ انہیں بھلائی سے نہیں نوازے گا، ان کے دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے، اگر میں ایسا کہوں تو میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔

تشریح کلمات

تَزۡدَرِیۡ: (ر ز ی) کے معنی کسی پر عیب لگانے کے ہیں اور اذدریت بہ اذدریت کے معنی ہیں کسی کو حقیر اور بے وقعت گردانا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ: منکرین کا تیسرا شبہ یہ تھا کہ تم کو ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ فضیلت کے جاہلی معیار کی اس آیت میں نفی کی گئی ہے کہ نہ میرے پاس اللہ کے خزانوں کی کنجیاں ہیں کہ جسے چاہوں دولت سے مالا مال کروں، نہ کاہنوں کی طرح غیب دانی کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں نے کبھی فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں انسان ہوں۔ کھاتا، پیتا، چلتا پھرتا ہوں۔

رسول کا کام انسان کی ہدایت و رہبری اور اللہ کی طرف سے دستور حیات دینا ہے مگر جاہل طرز فکر کے مطابق رسول کو مافوق البشر، خزانوں کا مالک اور غیب داں ہونا چاہیے۔

۲۔ وَّلَاۤ اَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ: نوح علیہ السلام کے زمانے میں موجود طبقاتی تفاوت کا اس جملے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان اہل ایمان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کو معاشرے کے نچلے درجے کے لوگ سمجھتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے بارے میں اپنا یہ موقف پیش کیا کہ میں ان اہل ایمان کو صرف غریب ہونے کی بنیاد پر اپنے سے دور نہیں کر سکتا۔ اس جملے میں ان کی فضیلت اور مقام کے بارے میں فرمایا:

۳۔ لَنۡ یُّؤۡتِیَہُمُ اللّٰہُ خَیۡرًا: جن کو تمہاری نگاہیں حقیر سمجھتی ہیں، عین ممکن ہے کہ اللہ اپنے فضل و کرم سے ان کو نوازے کیونکہ الٰہی معیار فضیلت انسانوں کی باطنی طہارت و قلبی پاکیزگی ہے اور اللہ ان لوگوں کے باطن سے خوب واقف ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ ان کو بھلائی سے نہیں نوازے گا۔

۴۔ اِنِّیۡۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ: اگر میں ان ایمان والوں کے بارے میں یہ بات کہوں کہ ایمان کے باوجود اللہ ان کو کسی بھلائی سے نہیں نوازے گا، یہ ایسا موقف ہو گا جو اللہ کے موقف کے خلاف ہے۔ اس قسم کا موقف اختیار کرنا ظلم اور ناانصافی ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کو اس کی درونی حالت سے فضیلت مل جاتی ہے: اَللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ....۔

۲۔ مادی اعتبار سے طبقاتی تفاوت ظلم ہے: اِنِّیۡۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ۔

قَالُوۡا یٰنُوۡحُ قَدۡ جٰدَلۡتَنَا فَاَکۡثَرۡتَ جِدَالَنَا فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ لوگوں نے کہا: اے نوح! تم نے ہم سے بحث کی ہے اور بہت بحث کی اور اب اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔

قَالَ اِنَّمَا یَاۡتِیۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ اِنۡ شَآءَ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ کہا: اسے تو بے شک اللہ ہی تم پر لائے گا اگر وہ چاہے اور تم (اسے) عاجز تو نہیں کر سکتے۔

تشریح کلمات

الجدل: (ج د ل) کے معنی ایسی گفتگو کرنا کے ہیں جس میں طرفین ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اصل میں جدلت الحبل سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں رسی کو مضبوط بٹنا۔ اسی سے بٹی ہوئی رسی کو الجدیل کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم جب حجت و دلیل کا مقابلہ نہ کر سکی تو دلیل کی جگہ چیلنج کو اختیار کیا اور اسی تحقیری اور تکذیبی لہجے میں کہا: وہ عذاب لے آؤ جس سے ہم کو ڈراتے رہے ہو اگر تم سچے ہو۔ یعنی تمہارا دعوائے نبوت سچا ہے اور نہ عذاب کی دھمکی۔

لوگوں نے عذاب لانے کی نسبت حضرت نوح علیہ السلام کی طرف دی لیکن حضرت نوح علیہ السلام نے یہ نسبت اللہ کی طرف دے کر یہ واضح کر دیا کہ میں خود بھی مشیت الٰہی کے تابع ہوں۔ عذاب لانا، نہ لانا میرے اختیار میں نہیں ہے بلکہ عذاب اللہ کی مشیت کے مطابق آئے گا۔

اہم نکات

۱۔ عذاب آنے سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام ایک لمبی مدت تک لوگوں کو دلائل سے راہ راست

پر لانے کی کوشش کرتے رہے: فَاَکۡثَرۡتَ جِدَالَنَا ....

وَلَا یَنۡفَعُکُمۡ نُصۡحِیۡۤ اِنۡ اَرَدۡتُّ اَنۡ اَنۡصَحَ لَکُمۡ اِنۡ کَانَ اللّٰہُ یُرِیۡدُ اَنۡ یُّغۡوِیَکُمۡ ؕ ہُوَ رَبُّکُمۡ ۟ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور جب اللہ نے تمہیں گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیا تو اگر میں تمہیں نصیحت کرنا بھی چاہوں تو میری نصیحت تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے گی، وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔

تفسیر آیات

اللہ کسی کو از خود گمراہ نہیں کرتا بلکہ خود انسان اپنی گمراہی پر ڈٹ جاتا ہے اور قابل ہدایت نہیں رہتا۔ اللہ اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور جس کو اللہ اپنے حال پر چھوڑ دے اس کو کون بچائے۔ اس سے پہلے بھی ذکر ہوا کہ کافر پر جب حجت پوری ہو جاتی ہے اور کوئی عذر باقی نہیں رہتا، پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتا تو دو صورتیں ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ اللہ جبر سے اسے ایمان لانے پر مجبور کرے۔ واضح ہے اللہ جبری ایمان کو کوئی قیمت نہیں دیتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس نا قابل ہدایت کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اس صورت میں اس کے لیے ہدایت کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ وَلَا یَنۡفَعُکُمۡ نُصۡحِیۡۤ میری نصیحت تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے گی کا مطلب یہی ہے۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ اِنِ افۡتَرَیۡتُہٗ فَعَلَیَّ اِجۡرَامِیۡ وَ اَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُجۡرِمُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں: اس شخص (محمد) نے یہ باتیں بنائی ہیں؟ کہدیجیے: اگر یہ باتیں میں نے بنائی ہیں تو میں اپنے جرم کا خود ذمے دار ہوں اور جس جرم کے تم مرتکب ہو میں اس سے بری ہوں.

تفسیر آیات

حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اسی قسم کے دلائل پیش کرنا پڑے اور مکہ کے منکرین نے بھی اسی قسم کا جواب دیا تھا۔ کفار مکہ نے یہ الزام لگایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نوح علیہ السلام کے نام سے ایسے واقعات خود گھڑ لیتے ہیں جو خود انہیں پیش آ رہے ہیں اور اسے ہم پر چسپاں کرتے ہیں۔ اس لیے واقعہ نوح کے بارے میں سلسلہ کلام قطع کر کے اس شبہ کا جواب دیا گیا کہ اگر میں اپنی طرف سے اس قسم کے قصے کہانیاں بنا لیتا ہوں تو یہ ایک جرم ہے جب میں اسے جرم سمجھتا

ہوں تو میں کیسے اس کا ارتکاب کروں گا مگر تم جس جرم کے ہمیشہ مرتکب ہو رہے ہو اسے جرم ہی نہیں سمجھتے لہٰذا تم ہی جرم کے مرتکب ہو، میں اس سے برائت چاہتا ہوں۔

اہم نکات

۱۔ ہر شخص اپنے جرم کا خود ذمے دار ہے: فَعَلَیَّ اِجۡرَامِیۡ....

وَ اُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ اَنَّہٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِکَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔اور نوح کی طرف یہ وحی کی گئی کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ آپ کی قوم میں سے ہرگز کوئی اور ایمان نہیں لائے گا لہٰذا جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں آپ اس سے رنجیدہ نہ ہوں۔

تفسیر آیات

ایک طویل عرصہ دعوت حق کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو اس امر واقع سے آگاہ کیا کہ اَب دعوت کا وقت ختم ہو گیا، حجتیں پوری ہوئیں، کوئی عذر بھی باقی نہ رہا۔ علم الٰہی کے مطابق آیندہ کوئی ایمان لے آنے والا بھی نہیں ہے لہٰذا ان کے ایمان نہ لانے سے آپ غم نہ کریں۔ مقولہ ہے: الیاس احدی الراحیتن۔ ناامیدی ایک قسم کی راحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو ایک قسم کی راحت فراہم فرمائی اور دعوت و ارشاد کا دور ختم ہونے کے بعد آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔

وَ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا وَ وَحۡیِنَا وَ لَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّہُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔اور ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے ایک کشتی بنائیں اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے بات ہی نہ کریں کیونکہ وہ ضرور ڈوبنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جہاز رانی اور کشتی سازی کی صنعت ممکن ہے رائج نہ ہو۔ اس لیے بذریعہ وحی اس صنعت کو متعارف کرایا گیا یا ممکن ہے یہ صنعت کم و بیش رائج ہو لیکن کشتی کی نوعیت اور ظرفیت و دیگر خصوصیات وحی کے ذریعہ بتا دی گئی ہوں۔ بِاَعۡیُنِنَا وَ وَحۡیِنَا کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ہماری نگرانی میں بناؤ۔ اس کشتی کی تفصیلات، جزئیات اور جملہ ہدایات اللہ کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔

کشتی بنانے کا حکم اس وقت ہوا جب ان پر حجت پوری ہو چکی تھی، مہلت دی گئی تھی اور کوئی ایمان

لانے والا بھی نہ تھا۔ نہ ان کی نسلوں میں کوئی مؤمن تھا:

وَلَا یَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا [1] اور یہ لوگ صرف بدکار کافر اولاد ہی پیدا کریں گے۔

اس لیے ان کی سفارش و شفاعت بھی ممنوع ہوگئی۔

کہتے ہیں مسیحی علماء نے اس کشتی کے طول و عرض پر تحقیق کی ہے کہ اس کا طول پانچ سو پچیس فٹ عرض ساڑھے ستاون فٹ اور اونچائی ساڑھے باون فٹ تھی جب کہ اسلامی روایت اور توریت کی عبارت اس سے مختلف ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے حتمی فیصلے کے بعد دعا بے اثر ہو جاتی ہے: وَلَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ....

۲۔ کشتی کی صنعت کی ابتدا وحی کے ذریعہ ہوئی: وَاصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا ....

وَ یَصۡنَعُ الۡفُلۡکَ ۟ وَ کُلَّمَا مَرَّ عَلَیۡہِ مَلَاٌ مِّنۡ قَوۡمِہٖ سَخِرُوۡا مِنۡہُ ؕ قَالَ اِنۡ تَسۡخَرُوۡا مِنَّا فَاِنَّا نَسۡخَرُ مِنۡکُمۡ کَمَا تَسۡخَرُوۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور وہ (نوح) کشتی بنانے لگے اور ان کی قوم کے سرداروں میں سے جو وہاں سے گزرتا وہ ان کا مذاق اڑاتا تھا، نوح نے کہا: اگر آج تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو کل ہم تمہارا اسی طرح مذاق اڑائیں گے جیسے تم مذاق اڑاتے ہو۔

فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ یَّاۡتِیۡہِ عَذَابٌ یُّخۡزِیۡہِ وَ یَحِلُّ عَلَیۡہِ عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ عنقریب تمہیں علم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر ہمیشہ رہنے والا عذاب نازل ہوگا۔

تفسیر آیات

حضرت نوح علیہ السلام جب خشکی پر کشتی بنا رہے تھے تو منکرین وحی اور ایمان بالغیب سے محروم، ظاہر بین اور سطحی سوچ رکھنے والے اس عمل کو نوح علیہ السلام کی دیوانگی کا واضح ثبوت قرار دیتے اور مذاق اڑاتے تھے اور غیب پر ایمان رکھنے والے اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے انجام کی بھلائی اور نجات کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ ان کو اپنے ایمان کی آنکھوں سے طوفان نظر آ رہا تھا اور منکرین کی غرق آبی کا بھی مشاہدہ کر رہے تھے جب کہ یہ ظاہر پرست اپنے انجام سے بے خبر الٹا نجات پانے والوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔

----

[1] ۷۱ نوح: ۲۷

اہم نکات

۱۔ ایمان بالغیب والے جو ذریعہ نجات بناتے ہیں وہ ظاہر پرستوں کی نظر میں مضحکہ ہوتا ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡہَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَ اَہۡلَکَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡہِ الۡقَوۡلُ وَ مَنۡ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور تنور (سے پانی) ابلنے لگا تو ہم نے کہا: (اے نوح) ہر جوڑے میں سے دو دو کشتی پر سوار کرو اور اپنے گھر والوں کو بھی سوائے ان کے جن کی بات پہلے ہو چکی ہے اور ان کو بھی (سوار کرو) جو ایمان لا چکے ہیں اگرچہ ان کے ساتھ ایمان لانے والے بہت کم تھے۔

تشریح کلمات

فَارَ : (ف و ر) الفور کے معنی سخت جوش مارنے کے ہیں۔ آگ بھڑک اٹھنے، ہانڈی اور غصے کے جوش کھانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ ہانڈی کے ابال کو فوارۃ کہا جاتا ہے۔ تشبیہ کے طور پر پانی کے ابلتے ہوئے چشمے کو بھی فوراۃ الماء کہتے ہیں۔ التنور سطح زمین اور روٹی پکانے کے تنور دونوں کو کہتے ہیں۔ اس لفظ پر عربی اور فارسی دونوں کا اتفاق ہے یا یہ کہ یہ لفظ اصل میں فارسی ہے۔

تفسیر آیات

سیاق آیت سے مفہوم ہوتا ہے کہ تنور کا ابل پڑنا طوفان کی ابتدا کی علامت تھی۔ چنانچہ جس وقت تنور نے ابلنا شروع کیا تو حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ملا کہ جن جن کو کشتی پر سوار کرنا ہے انہیں سوار کرنا شروع کرو۔ تنور سطح زمین کو بھی کہتے ہیں اس کے مطابق، جب سطح زمین سے پانی ابلنا شروع ہو جائے تو کشتی پر سوار کرنا شروع کرو۔

اکثر قدیم مفسرین کہتے ہیں کہ یہ تنور کوفہ میں تھا۔ چنانچہ آج بھی مسجد کوفہ میں اس تنور کی جگہ معروف ہے۔ مفسر شعبی کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے بعد چوتھی مسجد، کوفہ کی جامع مسجد ہے جو ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔[۱]

احادیث اہل بیت علیہم السلام میں اس مسجد کی فضیلت میں کثرت سے روایات موجود ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ مسجد کوفہ بہترین مسجد ہے جس میں ایک ہزار نبیوں، ایک ہزار وصیوں نے نماز پڑھی ہے۔ اسی مسجد سے تنور ابل پڑا تھا اور اسی مسجد میں کشتی بنائی گئی۔[۲]

---

۱ معارف القرآن ۴: ۶۲۲ ۲ الکافی ۳: ۴۹۲

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ابوحمزہ ثمالی سے فرمایا:

مساجد چار ہیں: مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد بیت المقدس، مسجد کوفہ۔ اے ابوحمزہ! ان مساجد میں ایک فرض نماز ایک حج کے برابر، ایک سنت نماز ایک عمرہ کے برابر ہے۔[1]

زوجیت: چونکہ حیوانات اور نبات کی حیات، زوجیت پر موقوف ہے۔ طوفان نے علاقے کی تمام موجودات کو فنا کر دینا تھا اور طوفان کے بعد یہاں ایک نئی زندگی شروع ہونا تھی جس کے لیے زوجیت لازمی امر تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہوا: ''ہر جوڑے میں سے دو دو کشتی پر سوار کرو'' تا کہ آیندہ زندگی کا تسلسل قائم رکھا جا سکے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام موجودات میں سے دو دو کشتی پر سوار کرو بلکہ اپنے اور مؤمنین کے پاس موجود مویشوں میں سے دو دو جوڑے سوار کرو۔

ایمان اور کشتی: اس ذریعہ نجات کشتی پر صرف اہل ایمان سوار ہو سکتے تھے اور خود حضرت نوح علیہ السلام کے گھر والوں میں بھی جو اہل ایمان نہ تھے وہ غرق ہو گئے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی زوجہ خیانت کار تھی اور غرق ہو گئی۔ چنانچہ سورۂ تحریم میں مذکور ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا ...[2]	اللہ نے کفار کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال پیش کی ہے، یہ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں مگر ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی ....

اور غرق ہونے والے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کا ذکر آگے آنے والا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی نو سو پچاس سالہ تبلیغ کے نتیجے میں صرف بارہ یا اسی (۸۰) افراد ایمان لائے جس سے ابتدائی انسان کی طفولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

نسل انسانی: یہ نظریہ علمائے تاریخ و انساب میں عام ہے کہ نوح علیہ السلام کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے کنعان نامی بیٹا غرق ہو گیا اور سام، حام اور یافث سے نسل انسانی چلی۔ یہ نظریہ اس مفروضے پر قائم ہے کہ طوفان سے حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں اور ان کی بیویوں کے سوا کوئی نہ بچا تھا لیکن قرآن کی متعدد آیات میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے خاندان کے علاوہ اہل ایمان کی ایک تعداد کشتی میں موجود تھی۔ چنانچہ زیر بحث آیت میں وَاَهْلَكَ گھر والوں کے ذکر کے بعد وَمَنْ اٰمَنَ ایمان والوں کا بھی ذکر ہے۔ آیہ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ....[3] بھی اس مطلب پر شاہد ہے۔

اہم نکات

۱۔ خاندانی ربط کے لیے بھی ایمان شرط ہے: وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ ....

---

[1] من لا يحضره الفقيه ۱: ۲۲۹ [2] ۶۶ تحریم: ۱۰ [3] ۱۷ اسرائیل: ۳

۲۔ زوجیت کو نظام خلقت میں بنیادی اہمیت حاصل ہے: مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ ....

وَ قَالَ ارۡکَبُوۡا فِیۡهَا بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَ مُرۡسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اور نوح نے کہا: کشتی میں سوار ہو جاؤ اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے، بتحقیق میرا رب بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

خطاب اہل ایمان سے ہے اور سواری کے وقت نام خدا لینا سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے شروع کیا۔ دنیائے طوفان میں کشتی کی دو حالتیں ہوتی ہیں: چلنا اور تھمنا۔ ان دونوں حالتوں کے لیے اسم خدا یا اذن خدا چاہیے۔ خشکی میں بھی تمام حالتوں کے لیے نام خدا درکار ہوتا ہے۔ اس سے حضرت نوح علیہ السلام کی تعلیمات میں توحید کا عنصر سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تدبیر کے ساتھ اللہ کی قدرت و مشیت پر بھروسہ بھی ضروری ہے۔ ”تدبیر“ کشتی پر سوار ہونا اور ”بھروسہ“ اللہ کا نام لینا ہے: ارۡکَبُوۡا فِیۡهَا بِسۡمِ اللّٰهِ ....

وَ هِیَ تَجۡرِیۡ بِهِمۡ فِیۡ مَوۡجٍ کَالۡجِبَالِ ۟ وَ نَادٰی نُوۡحُ ۨابۡنَهٗ وَ کَانَ فِیۡ مَعۡزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارۡکَبۡ مَّعَنَا وَ لَا تَکُنۡ مَّعَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اور کشتی انہیں لے کر پہاڑ جیسی موجوں میں چلنے لگی، اس وقت نوح نے اپنے بیٹے کو جو کچھ فاصلے پر تھا پکارا: اے بیٹا! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ نہ رہو۔

قَالَ سَاٰوِیۡۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعۡصِمُنِیۡ مِنَ الۡمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الۡیَوۡمَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَیۡنَهُمَا الۡمَوۡجُ فَکَانَ مِنَ الۡمُغۡرَقِیۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ اس نے کہا: میں پہاڑ کی پناہ لوں گا وہ مجھے پانی سے بچا لے گا، نوح نے کہا: آج اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں مگر جس پر اللہ رحم کرے، پھر دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی اور وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا۔

تفسیر آیات

۱۔ فِیۡ مَوۡجٍ کَالۡجِبَالِ: ''پہاڑ جیسی موجوں میں'' کی تعبیر سے طوفان کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۔ وَنَادٰی نُوۡحُ: حضرت نوح علیہ السلام کا ایک بیٹا جس کا نام کنعان بتایا جاتا ہے کشتی سے کچھ فاصلہ پر تھا اور کشتی پر سوار نہیں ہو رہا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بڑے شفیق لہجے میں اسے کشتی پر سوار ہونے کے لیے پکارا کیونکہ اللہ تعالیٰ آپؑ کے علم میں نہیں لایا تھا کہ یہ بیٹا نفاق کا مرتکب ہو رہا ہے اور ایمان نہیں لایا ہے۔ وہ درحقیقت جس طرح کشتی سے فاصلہ پر تھا ایمان سے بھی فاصلہ پر تھا۔

۳۔ قَالَ سَاٰوِیۡۤ اِلٰی جَبَلٍ: اس لیے اس عاق الوالد بیٹے نے باپ کی شفقت بھری آواز کو مسترد کر دیا اور نجات کے حقیقی ذریعے کشتی کو چھوڑ کر ایک موہوم ذریعے پہاڑ کی طرف دوڑا۔ اس موہوم ذریعے نے اس کو نہیں بچایا اور وہ غرق ہو گیا۔

اہم نکات

۱۔ وسیلہ وہ ہوتا ہے جس کی نشاندہی اللہ اور اس کا رسول کریں: ارۡکَبۡ مَّعَنَا ....

۲۔ ایمان کی دولت سے محروم لوگ حقیقی وسیلہ نجات کی جگہ موہوم وسیلے کی طرف دوڑتے ہیں: سَاٰوِیۡۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعۡصِمُنِیۡ ....

۳۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ رسولؐ کی آواز پر لبیک نہ کہنے والے پہاڑ کی طرف دوڑ پڑے: وَالرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ ....[1]

وَ قِیۡلَ یٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِیۡ مَآءَکِ وَ یٰسَمَآءُ اَقۡلِعِیۡ وَ غِیۡضَ الۡمَآءُ وَ قُضِیَ الۡاَمۡرُ وَ اسۡتَوَتۡ عَلَی الۡجُوۡدِیِّ وَ قِیۡلَ بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ اور کہا گیا: اے زمین! اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! تھم جا اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام تمام کر دیا گیا اور کشتی (کوہ) جودی پر ٹھہر گئی اور کہا گیا ظالموں پر نفرین ہو۔

تشریح کلمات

ابۡلَعِیۡ: (ب ل ع) بلعت کسی چیز کے نگل لینا کے معنوں میں ہے۔

غِیۡضَ: (غ ی ض) غاض کسی چیز کے کم کرنے یا از خود کم ہونے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اس طوفان میں زمین و آسمان، دونوں سے کام لیا گیا تھا:

فَفَتَحۡنَاۤ اَبۡوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنۡهَمِرٍ ۫ۖ وَّ فَجَّرۡنَا الۡاَرۡضَ عُيُوۡنًا فَالۡتَقَى الۡمَآءُ عَلٰۤى اَمۡرٍ قَدۡ قُدِرَ ۚ ...[1]

پھر ہم نے زوردار بارش سے آسمان کے دھانے کھول دیے اور زمین کو شگافتہ کر کے ہم نے چشمے جاری کر دیے تو (دونوں) پانی اس امر پر مل گئے جو مقدر ہو چکا تھا...

۱۔ وَقِیۡلَ یٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِیۡ: اب آسمان اور زمین دونوں کو اللہ کا حکم ملتا ہے کہ زمین اپنا پانی جذب کرے اور بارش تھم جائے۔ حکم خدا کی تعمیل ہوگئی۔ طوفان تھم گیا۔ پانی خشک ہو گیا۔ ہر طرف سکون وسکوت چھا گیا۔ کشتی کوہ جودی پر ٹھہر گئی۔ کفر و طغیان والوں کا کام تمام ہو گیا۔ زمین خدا کی تطہیر ہوگئی۔ جن لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ان کے نبی نو سو پچاس سال کی صبر آزما مدت تک تبلیغ کرتے رہے، پھر بھی وہ راہ راست پر نہیں آئے بلکہ اپنے شفیق ہادی و رہبر کو اذیتیں دیتے رہے، ان کی تطہیر کے علاوہ اور کیا صورت ہو سکتی تھی۔

۲۔ وَاسۡتَوَتۡ عَلَی الۡجُوۡدِیِّ۔ **کوہ جودی:** آرمیا سے لے کر کردستان تک کوہستان کا ایک سلسلہ ہے اس سلسلہ کو ارارات کہتے ہیں۔ توریت میں صرف اس سلسلہ کوہ ارارات کا ذکر ہے لیکن کسی ایک مخصوص چوٹی کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن مجید نے اس چوٹی کا نام بتایا ہے۔

قدیم تاریخوں میں کشتی کے ٹھہرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ مسیح (ع) سے ڈھائی سو برس پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا بیراسس (BERASUS) نے پرانی کلدانی روایات کی بنا پر اپنے ملک کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں وہ کشتی نوح کے ٹھہرنے کا مقام جودی ہی بتاتا ہے۔ ارسطو کا شاگرد ابیڈینوس (ABYDENUS) بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے نیز وہ اپنے زمانے کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جنہیں وہ گھول گھول کر بیماروں کو پلاتے ہیں۔[2]

لیکن دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے محققین اس بابلی روایت کو رد کرتے ہیں کہ جودی کسی پہاڑ کا نام نہیں ہے بلکہ اس جگہ کا وصف جہاں نوح علیہ السلام کی کشتی لنگر انداز ہوئی تھی۔ جودی زرخیز جگہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عرب جاہلیت کے زمانے کے شاعر نے کہا ہے:

سبحان ثم سبحانا یعود له
و قبله سبح الجودی والجُمُدُ

اس شعر میں جودی "جود" سے ہے۔ وہ زمین جو زرخیزی میں جود وسخا والی ہے اور الجُمُد وہ زمین جو زرخیز نہیں ہے۔ اس پر اگلی آیت قرینہ ہے

---

[1] ۵۴ قمر: ۱۱۔۱۲ [2] تفہیم القرآن ۲: ۳۴۱

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ... [1] کہا گیا: اے نوح! اترو ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ...

زرخیز زمین میں سلامتی اور برکت ہوتی ہے نہ کئی کلومیٹر اونچی چوٹی پر۔ "قردو" نامی جگہ کو بلا تحقیق جودی کا نام دیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۷: ۱۶۱۔۱۶۳۔ بحوالہ شبہات وردود۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ اور نوح نے اپنے رب کو پکار کر عرض کی: اے میرے پروردگار! میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۫ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ فرمایا: اے نوح! بے شک یہ آپ کے گھر والوں میں سے نہیں ہے، یہ غیر صالح عمل ہے لہٰذا جس چیز کا آپ کو علم نہیں اس کی مجھ سے درخواست نہ کریں، میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ مبادا نادانوں میں سے ہو جائیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ نوح نے کہا: میرے رب میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ ایسی چیز کا تجھ سے سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے اور اگر تو مجھے معاف نہیں کرے گا اور مجھ پر رحم نہیں کرے گا تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ: جب نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے درمیان موج حائل ہو گئی، اس وقت اضطراری حالت میں پکارا ہو گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے یہ موقف اختیار کیا کہ میرا بیٹا میرے گھر والوں میں شامل ہے اور تیرا وعدہ ہے کہ گھر والوں کو نجات مل جائے گی۔

۲۔ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ: اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: تو نہیں جانتا کہ تیرا بیٹا تیرے گھر والوں میں شامل ہی نہیں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اس مسئلہ میں یہ نکتہ نہیں جانتے تھے یا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ خاندانی رشتے کے لیے نسبی رشتہ کافی نہیں ہے ایمانی رشتہ ضروری ہے یا یہ نہیں جانتے تھے کہ بیٹا فی الواقع

----

[1] ۱۱ ھود: ۴۸

مؤمن نہیں ہے۔

ایک اولعزم نبی کے لیے ناممکن ہے کہ وہ پہلے نکتہ کو نہ جانتے ہوں لہٰذا لازماً حضرت نوح علیہ السلام اس بات کو نہیں جانتے تھے کہ بیٹا مومن نہیں ہے ورنہ خود حضرت نوح علیہ السلام نے درخواست کی تھی:

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝[1] — اور نوح نے کہا: پروردگارا! روئے زمین پر بسنے والے کفار میں سے ایک کو بھی باقی نہ چھوڑ۔

اب نوح علیہ السلام یہ کیسے درخواست کر سکتے ہیں کہ میرے کافر بیٹے کو چھوڑ دیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کو جس نادانی پر سرزنش کی گئی ہے وہ یہ ہو کہ بیٹے کا کشتی پر سوار ہونے سے انکار معصیت نہیں کفر ہے یا یہ کہ بیٹے کی منافقت کا حضرت نوح علیہ السلام کو علم نہ ہو۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب

۳۔ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ: نوح علیہ السلام کے بیٹے کی ذات کو غیر صالح عمل کہنا اس بات کی تاکید کے لیے ہے کہ اس کی ذات غیر صالح عمل سے عبارت ہے۔ اگر یہ تاکید مطلوب نہ ہوتی تو انه ذو عمل غير صالح کہتے یا انه يعمل عملا غير صالح فرماتے۔

نوح علیہ السلام کے بیٹے کے واقعہ میں ان نظریات کی نفی ہے جو نژادی بنیاد پر اپنے آپ کو اللہ کی پسندیدہ قوم تصور کرتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کا نظریہ ہے:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ....[2] — ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں ....

مکہ والے بھی اسی قسم کا نظریہ رکھتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ہم پر اللہ کا غضب نازل نہ ہوگا۔

جب غیر اسلامی قدریں رائج ہو جاتی ہیں تو عقیدے، عمل صالح، اخلاقی و انسانی قدروں کی جگہ خون و نسب، زمین، وطن، کبھی رنگ و زبان، کبھی قوم و قبیلے کا جاہلیتی رشتہ کارگر ہو جاتا ہے۔ یہ رشتے انسانی ارادے و اختیار سے قائم نہیں ہوتے۔ انسان اپنے ارادے سے نہ خون و نسب کا انتخاب کرتا ہے، نہ زمین، وطن کا، نہ زبان و رنگ کا۔ اس لیے ان رشتوں کی بنا پر دنیا و آخرت کی قسمت کا فیصلہ کرنا انسان کی خودمختاری کے خلاف ہے۔ لہٰذا فیصلہ کی بنیاد وہ چیز ہونی چاہیے جو انسان کے دائرہ اختیار میں ہو۔

اہم نکات

۱۔ ایمانی رشتہ نہ ہونے کی صورت میں خونی رشتے سے نہ شرف ملتا ہے نہ نجات: لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ....

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ — ۴۸۔ کہا گیا: اے نوحؑ! اترو ہماری طرف سے

---

[1] ۷۱ نوح: ۲۶ [2] ۵ مائدہ: ۱۸

بَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۴۸﴾	سلامتی اور برکتوں کے ساتھ جو آپ پر اور ان جماعتوں پر ہیں جو آپ کے ساتھ ہیں اور کچھ جماعتیں ایسی بھی ہوں گی جنہیں ہم کچھ مدت زندگی کا موقع بخشیں گے پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ: یہ حکم پہاڑ سے میدانی علاقوں میں اترنے اور نئی زندگی کا آغاز کرنے کا ہے جس کے بعد ایک نئی نسل شروع ہونے والی ہے۔

۲۔ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ: طوفان کے بعد زمین اور فضا مکدر ہو چکی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے کشتی کو ایسی جگہ پر ٹھہرایا جو زرخیز تھی۔ جس میں امن و سلامتی تھی۔

۳۔ وَعَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ: اور ان امتوں کو بھی سلامتی عنایت ہوگی جو آپ کی معیت میں موجود لوگوں کی نسل سے چلنے والی ہیں۔ اصل میں و علی امم من الذین معك ہے۔

۴۔ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ: آنے والی نسلوں میں دو جماعتوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو حضرت نوح علیہ السلام کی معیت میں ہے۔ اس جماعت سے ایمانی معیت کے ساتھ آنے والی نسلوں پر اللہ کی طرف سے امن وسلامتی اور برکتیں ہوں گی۔ اس گروہ میں قیامت تک کے اہل ایمان شامل ہیں۔ دوسری جماعت وہ ہے جو صرف دنیاوی زندگی سے بہرہ ور ہوگی۔ یہاں کے مال ومتاع سے لطف اندوز ہونے کے بعد اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو عذاب الٰہی کا سامنا کرنا ہوگا۔

ایک بار اس سرزمین کو کفر و عصیان سے پاک کرنے کے بعد بھی حق و باطل کی جنگ جاری رہے گی۔ نور و ظلمت کا آمنا سامنا ہوتا رہے گا۔ حق کو باطل کے مقابلے میں مقام ملتا ہے۔ کسی ظلمت کے وجود کی صورت میں نور کی قدر دانی ہوتی ہے۔ انسان کو طوفان کے بعد بھی اسی خودمختاری اور آزادی کے میدان میں چھوڑ کر پرکھنا ہے جسکا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ کچھ لوگ حق کا راستہ منتخب کریں گے اور کچھ باطل کا۔ فریق فی الجنة وفریق فی السعیر۔

اہم نکات

۱۔ امن و برکات ان قوموں پر ہیں جو انبیاء کے ساتھ ہیں: اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ ....

تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ	۴۹۔ یہ ہیں غیب کی کچھ خبریں جو ہم آپ کی طرف

اِلَیۡكَ ۚ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَ لَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا ۚۛ فَاصۡبِرۡ ۚۛ اِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۴۹﴾

طرف وحی کر رہے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ ان باتوں کو جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم پس صبر کریں انجام یقیناً پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ: اس قسم کی غیب کی خبریں بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قرآن اللہ عالم الغیب کی طرف سے ہے ورنہ قدیم ترین نبی حضرت نوح علیہ السلام کے ان واقعات کا کماحقہ علم رکھنے والا آپ کی قوم میں کوئی نہیں۔ لہٰذا یہ امکان بھی موجود نہیں کہ آپؐ نے کسی سے سنا ہو۔

نیز واقعہ نوح علیہ السلام سے آپ (ص) تسکین حاصل کریں کہ مخالف خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو بالآخر حق کا بول بالا ہو گا۔ لہٰذا مشکلات و مصائب سے دل شکستہ نہ ہوں، صبر و ہمت کا دامن تھام لیں۔ انجام پرہیزگاروں کے حق میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ زندگی بہرحال گزر ہی جاتی ہے۔ امیر کی بھی اور فقیر کی بھی۔ کامیابی و ناکامی کی منزل انجام کار ہے جس کے لیے صبر درکار ہے: فَاصۡبِرۡ ۚۛ اِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِیۡنَ۔

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمۡ هُوۡدًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا مُفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ اور عاد کی طرف ان کی برادری کے فرد ہود کو بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے (دوسرے معبودوں کو) تم نے صرف افتراء کیا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف آیت ۶۵۔

یٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَیۡهِ اَجۡرًا ؕ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ اے میری قوم! میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر تو اس ذات پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، کیا تم عقل نہیں رکھتے؟

تفسیر آیات

جب میں کسی قسم کے مفاد سے بالاتر ہو کر اس دعوت کا سلسلہ جاری رکھ رہا ہوں۔ یہ سب مشقتیں برداشت کر رہا ہوں اور تمہارے پرانے رسوم و عقائد کی مخالفت کر کے سب کو اپنا دشمن بنا لیا ہے تو تمہیں سوچنا چاہیے کہ اگر حق و حقیقت جیسی اطمینان بخش طاقت میرے پیچھے نہ ہوتی تو ان سب مصائب و مشکلات سے بے پرواہ ہو کر اس گرداب میں کیوں کودتا۔

اہم نکات

۱۔ استحصالی وہ ہوتا ہے جو موجودہ خرافات کو فروغ دے کر اپنا مفاد حاصل کرے اور حق کا داعی وہ ہوتا ہے جو تمام مفادات سے بالاتر ہو کر اپنی بات کرے: لَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا ....

وَ یٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ یُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَیۡکُمۡ مِّدۡرَارًا وَّ یَزِدۡکُمۡ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمۡ وَ لَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِیۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ اور اے میری قوم! اپنے رب سے مغفرت مانگو پھر اس کے حضور توبہ کرو وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارش برسائے اور تمہاری قوت میں مزید قوت کا اضافہ کرے گا اور مجرم بن کر منہ نہ پھیرو۔

تشریح کلمات

المدرار: (د ر ر) صیغہ مبالغہ ہے۔ بہت برسنے والا۔ اصل میں یہ لفظ دَرَّۃٌ سے ہے جس کے معنی دودھ کے ہیں۔ پھر بطور استعارہ بارش کے لیے استعمال ہونے لگا پھر خوبی کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: للّٰہ دَرّہ اس کی خوبی اللہ کے لیے ہو۔ ۱۳۷

تفسیر آیات

۱۔ وَ یٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ: اس مضمون کی آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نازل ہوئی تھی جو سورہ کی ابتداء میں آیت نمبر ۳ میں گزر گئی: اور یہ کہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو پھر اس کے آگے توبہ کرو وہ تمہیں مقررہ مدت تک (دنیا میں) اچھی متاع زندگی فراہم کرے گا۔ اس کے علاوہ دیگر متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی زندگی کی سعادت و شقاوت میں دینی و اخلاقی قدروں کو دخل ہے:

وَ لَوۡ اَنَّ اَہۡلَ الۡقُرٰۤی اٰمَنُوۡا وَ اتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا　اور اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور

عَلَیۡهِمۡ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ...[1]	تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے ....

۲۔ وَّ یَزِدۡکُمۡ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمۡ سے معلوم ہوتا ہے یہ قوم ایک طاقتور قوم تھی۔ اگر وہ ایمان لے آئے تو اس قوت میں جسمانی یا ایمانی یا مال و اولاد کے ذریعے قوت میں اضافہ ہو گا۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام سے بھی اسی طرح کا خطاب ہوا:

یُّرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَیۡکُمۡ مِّدۡرَارًا ۙ وَّ یُمۡدِدۡکُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّ بَنِیۡنَ ...[2]	وہ تم پر آسمان سے خوب بارش برسائے گا، وہ اموال اور اولاد کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا...۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن دنیا و آخرت دونوں کی سعادت حاصل کر سکتا ہے: یُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَیۡکُمۡ مِّدۡرَارًا ....

قَالُوۡا یٰہُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَیِّنَۃٍ وَّ مَا نَحۡنُ بِتَارِکِیۡۤ اٰلِہَتِنَا عَنۡ قَوۡلِکَ وَ مَا نَحۡنُ لَکَ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ کہنے لگے: اے ہود! تم ہمارے سامنے کوئی شہادت نہیں لائے اور ہم تمہاری بات پر اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے اور نہ ہی ہم تجھ پر ایمان لا سکتے ہیں۔

اِنۡ نَّقُوۡلُ اِلَّا اعۡتَرٰىکَ بَعۡضُ اٰلِہَتِنَا بِسُوۡٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیۡۤ اُشۡہِدُ اللّٰہَ وَ اشۡہَدُوۡۤا اَنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ کیونکہ ہم تو یہ کہتے ہیں: تجھے ہمارے معبودوں میں سے کسی نے آسیب پہنچایا ہے، ہود نے کہا: میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ (اللہ کے سوا) جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بیزار رہوں۔

مِنۡ دُوۡنِہٖ فَکِیۡدُوۡنِیۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اس اللہ کے سوا تم سب مل کر میرے خلاف سازش کرو پھر مجھے مہلت نہ دو۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا یٰہُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا: ہود علیہ السلام کی قوم کا موقف یہ تھا کہ اگر آپ اللہ کے نمائندہ ہیں تو کوئی ایسی شہادت پیش کریں کہ ہمیں یقین ہو جائے کہ آپؑ اللہ کی طرف سے آئے ہیں۔ عین ممکن ہے قوم ہود نے بھی اسی قسم کی شہادتیں مانگی ہوں جیسے ہمارے رسولؐ سے لوگوں نے مانگی ہیں کہ آپؐ کے ساتھ کوئی فرشتہ

---

[1] ۷ اعراف: ۹۶	[2] ۷۱ نوح: ۱۱۔۱۲

ہو یا خزانوں کی کنجیاں آپ کے پاس ہوں وغیرہ۔

۲۔ اِنۡ نَّقُوۡلُ اِلَّا اعۡتَرٰىكَ: اگر یہ چیزیں آپ پیش نہیں کر سکتے ہیں تو ہم یہ سمجھیں گے چونکہ آپ نے ہمارے معبودوں کے حق میں گستاخی کی ہے تو اس کی وجہ سے آپ آسیب زدہ ہو گئے ہیں اور نامربوط باتیں کرنا شروع کی ہیں۔

۳۔ اِنِّیۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ: ہود علیہ السلام نے فرمایا: میں اللہ کو اور تم کو گواہ بنا کر تمہارے ان معبودوں سے اعلان بیزاری کرتا ہوں اور تم مل کر میرے خلاف جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔

۴۔ فَكِيۡدُوۡنِيۡ جَمِيۡعًا: اگر تمہارے معبود مجھے آسیب پہنچا سکتے ہیں تو میرے خلاف تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں۔ تم ایک بار میرے خلاف ان معبودوں سے مدد لے کر دکھاؤ۔ حضرت ہود علیہ السلام اس چیلنج میں اس قدر اپنے رب پر اعتماد کا اظہار فرما رہے ہیں کہ کافروں سے فرماتے ہیں کہ جیسے اللہ تمہیں مہلت دیتا ہے، اب مجھے مہلت بھی نہ دو اور اپنی سازش پر فوری عمل کرو۔

اہم نکات

۱۔ اظہار برائت کرنا بھی موقف کی مضبوطی کی دلیل ہے: اَنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ۔

۲۔ دشمن کی طرف سے تمام خطرات کو چیلنج کرنا ہود علیہ السلام کا معجزہ تھا: فَكِيۡدُوۡنِيۡ ....

اِنِّیۡ تَوَكَّلۡتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیۡ وَ رَبِّكُمۡ ؕ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ میں نے اللہ پر بھروسہ کیا ہے جو میرا اور تمہارا رب ہے، کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی پیشانی اللہ کی گرفت میں نہ ہو، بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔

تشریح کلمات

ناصية: (ن ص ی) کے معنی پیشانی یا پیشانی کے بالوں کے ہیں۔ محاورہ ہے: اس نے پیشانی کے بالوں سے پکڑا۔ جس کو پوری گرفت میں لیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنِّیۡ تَوَكَّلۡتُ عَلَى اللّٰهِ: حضرت ہود علیہ السلام نے دشمن کو ان کی ناتوانی کا احساس دلایا، اس کے بعد اپنی طاقت کا بھی احساس دلا رہے ہیں کہ میں نے اس رب پر بھروسہ کیا ہے جس کے قبضہ قدرت

میں ہر جاندار کی جان ہے۔ وہی طاقت کا سرچشمہ ہے اور وہی عدل و انصاف کا مالک بھی ہے۔ وہ حق کا ساتھ دیتا ہے اور باطل کو نابود کرتا ہے۔

۲۔ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ: جس ذات پر میرا توکل اور بھروسہ ہے وہ تمہارے باطل وہمی معبودوں کی طرح نہیں ہے۔ وہ راہ راست، حق پر ہے مجھے بھی راہ راست کی ہدایت دیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ طاقتور شخص وہ ہے جو طاقت کے سرچشمے پر بھروسہ کرتا ہے: اِنِّیۡ تَوَکَّلۡتُ عَلَی اللّٰہِ ....۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہر جاندار کی جان ہے: ہُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِہَا ....۔

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقَدۡ اَبۡلَغۡتُکُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِہٖۤ اِلَیۡکُمۡ ؕ وَ یَسۡتَخۡلِفُ رَبِّیۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۚ وَ لَا تَضُرُّوۡنَہٗ شَیۡئًا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ حَفِیۡظٌ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ پھر اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں نے تو وہ پیغام تمہیں پہنچا دیا ہے جس کے ساتھ میں تمہاری طرف بھیجا گیا تھا اور میرا رب تمہاری جگہ اور لوگوں کو لائے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، بے شک میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقَدۡ اَبۡلَغۡتُکُمۡ: حجت پوری ہونے کے بعد منہ پھیرنے کی صورت میں جو کچھ امتوں کے ساتھ ہوا ہے، اسی انجام سے دو چار ہو جاؤ گے۔ چونکہ حق کا پیغام تم تک پہنچ گیا ہے اور کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے۔

۲۔ وَ یَسۡتَخۡلِفُ رَبِّیۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ: بعد میں اس کی تصریح فرما دی کہ تم کو صفحہ ہستی سے مٹا کر تمہاری جگہ دوسری قوموں کو آباد کرے گا۔ جیسا کہ خود تم کو قوم نوح کے بعد اس زمین پر ان کا جانشین بنایا تھا۔ تمہارے وجود سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے کہ تمہارے جانے سے اسے کوئی نقصان پہنچ جائے۔

اہم نکات

۱۔ کفر طغیانی کی وجہ سے امتیں مٹ جاتی ہیں: وَ یَسۡتَخۡلِفُ رَبِّیۡ قَوۡمًا ....۔

۲۔ کوئی اللہ کی نقصان نہیں پہنچا سکتا: وَ لَا تَضُرُّوۡنَہٗ شَیۡئًا ....۔

وَ لَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّیۡنَا ہُوۡدًا وَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ بِرَحۡمَۃٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّیۡنٰہُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ غَلِیۡظٍ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ پھر جب ہمارا فیصلہ آیا تو ہود اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے تھے ہم نے اپنی رحمت سے انہیں بچا لیا اور ہم نے انہیں سنگین عذاب سے نجات دی۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف آیت ۷۲۔

وَ تِلۡکَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ وَ عَصَوۡا رُسُلَہٗ وَ اتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ کُلِّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ یہ وہی عاد ہیں، جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر سرکش دشمن کے حکم کی پیروی کی۔

وَ اُتۡبِعُوۡا فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنۡیَا لَعۡنَۃً وَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا کَفَرُوۡا رَبَّہُمۡ ؕ اَلَا بُعۡدًا لِّعَادٍ قَوۡمِ ہُوۡدٍ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ اور اس دنیا میں بھی لعنت نے ان کا تعاقب کیا اور قیامت کے روز بھی (ایسا ہوگا)، واضح رہے عاد نے اپنے پروردگار سے کفر کیا، آگاہ رہو! ہود کی قوم (یعنی) عاد کے لیے (رحمت حق سے) دوری ہو۔

تفسیر آیات

قوم عاد کی تین خصلتوں کا ذکر ہے:

i۔ جَحَدُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ: اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد کو حضرت ہود علیہ السلام نے معجزے بھی دکھائے تھے۔

ii۔ وَ عَصَوۡا رُسُلَہٗ: اس قوم نے رسولوں کی نافرمانی کی۔ چونکہ تمام رسولوں کا پیغام اور رسالت ایک ہی ہوتی ہے لہٰذا ایک رسول کی نافرمانی، دوسرے رسولوں کی بھی نافرمانی شمار ہوتی ہے۔

iii۔ وَ اتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ کُلِّ جَبَّارٍ: اس قوم نے اللہ کے نمائندے کی نافرمانی کر کے سرکشوں کی پیروی کی اور اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ میں آ گئے۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رحمت خدا سے بیگانہ ہو گئے۔ اللہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنے بندوں پر رحم کرتا ہے۔ جو قوم یا فرد دنیا میں اللہ کی رحمت سے بیگانہ ہو گا وہ آخرت میں بھی اس کی رحمت سے محروم ہو گا۔ دنیا، آخرت کے لیے کھیتی ہے۔ جو کچھ کھیتی کے لیے دنیا میں رونما ہو گا اس کے اثرات فصل پر

پڑنا ایک طبعی امر ہے۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء کی نافرمانی کا نتیجہ طاغوت کی غلامی ہے: وَعَصَوۡا رُسُلَہٗ وَ اتَّبَعُوۡۤا....

۲۔ طاغوت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، دنیا و آخرت میں لعنت کا موجب ہے: وَ اتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ کُلِّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ۔

وَ اِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاہُمۡ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ ہُوَ اَنۡشَاَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ وَ اسۡتَعۡمَرَکُمۡ فِیۡہَا فَاسۡتَغۡفِرُوۡہُ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ قَرِیۡبٌ مُّجِیۡبٌ ﴿۶۱﴾

۶۱۔اور ثمود کی طرف ان کی برادری کے فرد صالح کو بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس میں تمہیں آباد کیا لہٰذا تم اسی سے مغفرت طلب کرو پھر اس کے حضور توبہ کرو، بے شک میرا رب بہت قریب ہے، (دعاؤں کا) قبول کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قوم ثمود کی تاریخ کی تفصیل الاعراف آیت ۷۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ: حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کا مرکزی نکتہ وہی ہے جو تمام انبیاء کا ہے: اے قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس دعوت توحید کے لیے یہ دلیل پیش کی ہے: بندگی اس ذات کی ہونی چاہیے جس نے تم کو زندگی دی اور زندہ رہنے کے وسائل بھی دیے۔

۳۔ ہُوَ اَنۡشَاَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ: تمہیں اسی مردہ زمین سے پیدا کیا اور زندگی عطا کی۔

۴۔ وَ اسۡتَعۡمَرَکُمۡ فِیۡہَا: تمہیں اسی زمین میں آباد کیا اور زندہ رہنے کے وسائل بھی دیے۔ اس جملے اور سورۃ الاعراف آیت ۷۴ کے جملے:

وَّ بَوَّاَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡ سُہُوۡلِہَا قُصُوۡرًا وَّ تَنۡحِتُوۡنَ الۡجِبَالَ بُیُوۡتًا.. اور تمہیں زمین میں آباد کیا، تم میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو اور پہاڑ کو تراش کر مکانات بناتے ہو۔

سے اس قوم کے تمدن و ترقی اور زمین کی سرسبزی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کے زمانے کے لوگ بت پرست تھے۔ وہ بتوں کو اللہ تک پہنچنے کے لیے وسیلہ سمجھتے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ تک پہنچنا براہ راست ممکن نہیں ہے۔ اس نظریے کی رد میں فرمایا:

۵۔ فَاسۡتَغۡفِرُوۡہُ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ: جس نے تمہیں پیدا اور زمین میں آباد کیا اور ہر آن تمہیں زندگی کے وسائل فراہم کرتا ہے اس کے اور تمہارے درمیان کون سی چیز حائل ہو سکتی ہے تم۔ براہ راست اس سے استغفار کرو۔ اس کی طرف رجوع کرو تو اِنَّ رَبِّیۡ قَرِیۡبٌ مُّجِیۡبٌ میرا رب قریب ہے، دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ جو انسان کا خالق ہے وہی معبود ہوتا ہے: ہُوَ اَنۡشَاَکُمۡ ....

۲۔ انسان زمین کی آبادکاری کا ذمے دار ہے: وَ اسۡتَعۡمَرَکُمۡ فِیۡہَا ....

۳۔ اللہ تک رسائی کے لیے خود ساختہ وسائل نہیں ہوا کرتے: اِنَّ رَبِّیۡ قَرِیۡبٌ مُّجِیۡبٌ ....

قَالُوۡا یٰصٰلِحُ قَدۡ کُنۡتَ فِیۡنَا مَرۡجُوًّا قَبۡلَ ہٰذَاۤ اَتَنۡہٰىنَاۤ اَنۡ نَّعۡبُدَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِیۡ شَکٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ مُرِیۡبٍ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ انہوں نے کہا: اے صالح! اس سے پہلے ہم تم سے بڑی امیدیں وابستہ رکھتے تھے، اب کیا ان معبودوں کی پوجا کرنے سے تم ہمیں روکتے ہو جن کی ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے؟ اور جس بات کی طرف تم ہمیں دعوت دے رہے ہو اس بارے میں ہمیں شبہ انگیز شک ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا یٰصٰلِحُ قَدۡ کُنۡتَ فِیۡنَا: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام رسالت پر مبعوث ہونے سے قبل اپنی قوم میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ قوم کو ان کی فہم و فراست اور اعلیٰ صلاحیتوں سے کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔ ممکن ہے حضرت صالح علیہ السلام اپنی قوم کی تہذیب و تمدن، تعمیر و ترقی کے امور اور اعلیٰ انسانی قدروں کے مالک ہونے کی وجہ سے اعتماد و امانت کے اعتبار سے امیدوں کا مرکز ہوں جیسا کہ مکہ والے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں پہلے اس قسم کا موقف رکھتے تھے۔ امانت و اعتماد اور اعلیٰ انسانی قدروں کے مالک ہونے کی وجہ سے وہ مرکز توجہ تھے۔ اب جب ان کے معبودوں کے خلاف قدم اٹھایا ہے تو ان کے درمیان منفور ہو گئے، اعتماد اٹھ گیا۔

اہم نکات

۱۔ ہر پیغمبر تمام انسانی و اخلاقی قدروں میں اپنے زمانے کے سب لوگوں سے بہتر ہوتا ہے: قَدۡ کُنۡتَ

فِيۡنَا مَرۡجُوًّا ....

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَاٰتٰٮنِىۡ مِنۡهُ رَحۡمَةً فَمَنۡ يَّنۡصُرُنِىۡ مِنَ اللّٰهِ اِنۡ عَصَيۡتُهٗ فَمَا تَزِيۡدُوۡنَنِىۡ غَيۡرَ تَخۡسِيۡرٍ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ صالح نے کہا: اے میری قوم! یہ تو بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے دلیل رکھتا ہوں اور اس نے اپنی رحمت سے مجھے نوازا ہے تو اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کے مقابلے میں میری حمایت کون کرے گا؟ تم تو میرے گھاٹے میں صرف اضافہ کر سکتے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ: اس آیت میں بھی بَيِّنَةٍ سے مراد معجزہ اور رَحۡمَةً سے مراد نبوت ہے جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۲۸ میں گزر چکا ہے۔

۲۔ فَمَنۡ يَّنۡصُرُنِىۡ مِنَ اللّٰهِ: دوسرے جملے میں فرمایا کہ معجزہ اور نبوت عطا ہونے کے باوجود اگر میں اللہ کی نمائندگی چھوڑ کر تمہاری بات مان لوں اور غنی مطلق کے در کو چھوڑ کر محتاج بندوں کے دروازے پر دستک دوں، رحمت کے خزانے کو چھوڑ کر حاجت مندوں کی خالی جھولیوں کو تکتا رہوں تو ہر آن میرے گھاٹے میں اضافہ ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے در کو چھوڑ کر بندوں سے امید رکھی جائے تو خسارے میں اضافہ ہوگا: فَمَا تَزِيۡدُوۡنَنِىۡ غَيۡرَ تَخۡسِيۡرٍ.

وَيٰقَوۡمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَـكُمۡ اٰيَةً فَذَرُوۡهَا تَاۡكُلۡ فِىۡۤ اَرۡضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَيَاۡخُذَكُمۡ عَذَابٌ قَرِيۡبٌ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی ہے لہٰذا اسے آزاد چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی رہے اور اسے تکلیف نہ پہنچانا ورنہ تمہیں ایک فوری عذاب گرفت میں لے گا۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح سورۂ اعراف آیت ۷۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ پس انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو صالح نے کہا: تم لوگ تین دن اپنے گھروں میں بسر کرو، یہ ایک ناقابل تکذیب وعدہ ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْیِ یَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ پھر جب ہمارا فیصلہ آ گیا تو ہم نے صالح اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے نجات دی اور اس دن کی رسوائی سے بھی بچا لیا، یقیناً آپ کا رب بڑا طاقتور، غالب آنے والا ہے۔

تفسیر آیات

جب قوم ثمود نے اس ناقہ کو مار ڈالا تو حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں تین دنوں کی مہلت دی۔ یہ مہلت اس لیے دی گئی تھی کہ کوئی راہ راست پر آنا چاہے تو آ سکے[1] نیز ممکن ہے کہ تین دن کی مہلت سے یہ تشخیص مل جائے کہ یہ وہی عذاب ہے جس کی دھمکی صالح علیہ السلام نے دی تھی ورنہ اسے اتفاقیہ بھی قرار دے سکتے تھے۔

اللہ نے حضرت صالح علیہ السلام اور مؤمنین کو عذاب سے بچایا اور رسوائی سے بھی بچایا۔ ثمود کی ہلاکت کے بعد حضرت صالح علیہ السلام اور مومنوں نے عزت و تکریم کی زندگی گزاری۔

اہم نکات

۱۔ اللہ ایمان والوں کو کبھی رسوا نہیں کرتا: وَمِنْ خِزْیِ یَوْمِئِذٍ ....

وَ اَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ اور جنہوں نے ظلم کیا تھا انہیں ایک ہولناک چنگھاڑ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ گویا وہ ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے واضح رہے ثمود نے اپنے پروردگار سے کفر کیا آگاہ رہو! ثمود کی قوم کے لیے (رحمت حق سے) دوری ہو۔

----

[1] الکافی

تفسیر آیات

سورہ اعراف آیت ۷۸ میں اس واقعے کا ذکر ہو چکا ہے اس فرق کے ساتھ کہ وہاں الرَّجۡفَۃُ زلزلے کا لفظ آیا ہے اور یہاں الصَّیۡحَۃُ ہولناک آواز وارد ہوا ہے۔ ان دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ زلزلے کے ساتھ ہولناک گڑگڑاہٹ عموماً ہوا کرتی ہے۔

قصہ ہود علیہ السلام میں ایسی ہی آیت کی تشریح گزر چکی ہے۔

واضح رہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ایک آدمی نے مارا تھا۔ عذاب سب پر اس لیے آیا کہ سب اس بات پر راضی تھے۔ اسلامی تعلیمات میں جرم و نیکی پر راضی ہونا اس میں شریک ہونے کے برابر ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی زیارت میں یہ جملہ پڑھتے ہیں:

و لعن اللّٰہ اُمّۃً سمعت بذلك فرضیت۔[1]　　اور اس قوم پر بھی لعنت ہو جو اس ناحق قتل کی خبر سن کر اس پر خوش ہوئی۔

اہم نکات

۱۔ قوم ثمود کا ظلم ان کی ہلاکت و نابودی کا سبب بنا۔ وَ اَخَذَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوا

وَ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ بِالۡبُشۡرٰی قَالُوۡا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنۡ جَآءَ بِعِجۡلٍ حَنِیۡذٍ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ اور جب ہمارے فرشتے بشارت لے کر ابراہیم کے پاس پہنچے تو کہنے لگے: سلام، ابراہیم نے (جواباً) کہا: سلام، ابھی دیر نہ گزری تھی کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آئے۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیۡدِیَہُمۡ لَا تَصِلُ اِلَیۡہِ نَکِرَہُمۡ وَ اَوۡجَسَ مِنۡہُمۡ خِیۡفَۃً ؕ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمِ لُوۡطٍ ﴿۷۰﴾

۷۰۔ جب ابراہیم نے دیکھا ان کے ہاتھ اس (کھانے) تک نہیں پہنچتے تو انہیں اجنبی خیال کیا اور ان سے خوف محسوس کیا، فرشتوں نے کہا: خوف نہ کیجیے ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

تشریح کلمات

حَنِیۡذٍ: (ح ن ذ) بھنا ہوا۔

---

[1] التھذیب ۶: ۱۱۳ زیارۃ الأربعین

تفسیر آیات

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آنے والے سلسلۂ انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے۔ھود و صالح علیہما السلام کے بعد حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک اہم واقعے کا بھی ذکر آیا۔ دونوں انبیاء کے معاصر ہونے کی وجہ سے واقعات کا بھی ایک دوسرے کے ساتھ ربط ہے۔

۱۔ وَلَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ : اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند ایک فرشتے زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں اور ان کو زمین پر بسنے والی دو قوموں کے ساتھ کام تھا۔ ایک خاندان ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جن کو بہت بڑی بشارت دینی ہے اور دوسرا قوم لوط کے ساتھ، جسے صفحۂ ہستی سے مٹانا ہے۔

۲۔ قَالُوۡا سَلٰمًا : یہ فرشتے بشری شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے ہاں داخل ہوتے ہوئے سلام کرنا نہ صرف تمام ادیان میں رائج ایک سنت ہے بلکہ آسمانی فرشتوں کی ثقافت کا بھی حصہ ہے اور اہل بہشت کے درمیان بھی ایک دوسرے کو سلام کرنے کا رواج عام ہوگا:

اِلَّا قِيۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا۔[1]　　ہاں ! سلام سلام کہنا ہوگا۔

۳۔ فَمَا لَبِثَ اَنۡ جَآءَ : ان فرشتوں کو عام مہمان سمجھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی پزیرائی کا اہتمام کیا اور ایک بھنا ہوا بچھڑا تیار کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت کر کے کنعان کے سرسبز صحراؤں میں رہائش پذیر تھے جہاں افزائش حیوانات کے لیے ماحول سازگار تھا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس زمانے میں بھی بھنا ہوا گوشت کھانا رائج تھا اور چند مہمانوں کے لیے ایک بچھڑے کا تیار کرنا جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے ضیافت کی فیاضی کا پتہ ملتا ہے وہاں اس زمانے کی سطح زندگی کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

۴۔ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيۡدِيَهُمۡ لَا تَصِلُ : جب دیکھا یہ مہمان کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے متوحش ہوئے اور ان کو اجنبی خیال کرتے ہوئے خوف محسوس کیا۔ یہ خوف ان کے اجنبی محسوس ہونے کے بعد دل میں آیا ہے۔ ایسا نہ تھا کہ کھانا نہ کھانے سے حضرت ابراہیم سمجھ گئے کہ یہ فرشتے ہیں اور فرشتے انسانی شکل میں غیر معمولی حالات ہی میں آیا کرتے ہیں جیسا کہ بعض اہل قلم نے خیال کیا ہے بلکہ سیاق آیت سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ یہ خوف اجنبی خیال کرنے پر آیا تھا۔ آگے آیت اس مسئلے میں خاموش ہے کہ اجنبی خیال کرنے پر خوف کیوں آیا۔ ممکن ہے وجہ وہی ہو جو اکثر مفسرین نے بتائی ہے کہ کھانا نہ کھانے پر یہ شبہ ہوا کہ کہیں دشمنی کے ارادے سے تو نہیں آئے۔ اس لیے نمک کھانا نہیں چاہتے۔ بعد

---

[1] ۵۶ واقعہ: ۲۶

میں فرشتوں کے اظہار سے معلوم ہوا کہ وہ اللہ کے فرستادہ ہیں جو قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کی مسئولیت کے ساتھ بھیجے گئے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مہمان نوازی اخلاق انبیاء ہے: جَآءَ بِعِجۡلٍ حَنِیۡذٍ۔

۲۔ مہمان کی پزیرائی میں دیر نہیں کرنا چاہیے: فَمَا لَبِثَ ....

۳۔ سلام کرنا سنت انبیاء و ملائکہ ہے۔

وَ امۡرَاَتُہٗ قَآئِمَۃٌ فَضَحِکَتۡ فَبَشَّرۡنٰہَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَ مِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ یَعۡقُوۡبَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ اور ابراہیم کی زوجہ کھڑی تھیں پس وہ ہنس پڑیں تو ہم نے انہیں اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی بشارت دی۔

قَالَتۡ یٰوَیۡلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوۡزٌ وَّ ہٰذَا بَعۡلِیۡ شَیۡخًا ؕ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ عَجِیۡبٌ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ وہ بولی: ہائے میری شامت! کیا میرے ہاں بچہ ہو گا جب کہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہیں؟ یقیناً یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ رَحۡمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکٰتُہٗ عَلَیۡکُمۡ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ ؕ اِنَّہٗ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ انہوں نے کہا: کیا تم اللہ کے فیصلے پر تعجب کرتی ہو؟ تم اہل بیت پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکات ہیں، یقیناً اللہ قابل ستائش، بڑی شان والا ہے۔

تشریح کلمات

فضحکت: (ض ح ك) ہنسنے کے معنوں میں معروف ہے۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ ضحك حیض کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ عربوں میں جملہ رائج ہے: ضحك الارنب۔ اذا حاضت۔ جب خرگوش کو حیض آتا ہے تو یہ جملہ کہتے ہیں۔ اگرچہ بعض اہل لغت نے کہا ہے ضحك بمعنی حیض نہیں آتا تاہم من حفظ حجة علی من لم یحفظ۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ امۡرَاَتُہٗ قَآئِمَۃٌ: جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مہمانوں میں گفتگو ہو رہی تھی اس

وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ حضرت سارہ کھڑی یہ گفتگو سن رہی تھیں۔ اس وقت حضرت سارہ کو عالم پیری میں ماہواری آنا شروع ہوگئی۔ اس حالت کے بعد فرشتوں نے یہ بشارت سنائی کہ آپ کے ہاں بچے ہونے والے ہیں۔

فَضَحِكَتۡ: یہ لفظ اگر الضَّحک فتحہ ضاد کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی ماہواری کے ہوں گے اور اگر ضاد کو زیر دے کر الضِّحك پڑھا جائے تو ہنسنا کے معنوں میں ہوں گے۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے وارد احادیث کی وجہ سے ہم دوسرے معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض کے نزدیک آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ آیت اس طرح ہے: فبشرناها باسحاق و یعقوب فضحکت۔ مجمع البیان کے مطابق حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس بات پر روایت بھی ہے۔ حضرت سارہ یہ بشارت سن کر ہنس پڑی تھیں اور فرشتوں نے براہ راست خود حضرت سارہ کو خوشخبری سنائی کہ آپ کے ہاں بیٹا ہونے ولا ہے جس کا نام اسحاق ہے اور اس کے بعد پوتا بھی ہونے والا ہے جس کا نام یعقوب ہوگا۔

۲۔ قَالَتۡ یٰوَیۡلَتٰۤی: اس پر حضرت سارہ کو حیرت ہوئی اور اظہار تعجب کیا کیونکہ بنا بر روایت بائیبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۱۰۰ سال اور حضرت سارہ کی عمر ۹۰ سال تھی۔

۳۔ قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ: فرشتوں نے سارہ کے تعجب و حیرانگی کے جواب میں کہا: اللہ کے فیصلے پر تعجب کرتی ہیں جب کہ اس گھرانے پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوتی رہی ہیں۔ مقولہ ہے کہ جب سبب کا پتہ چلتا ہے تو تعجب ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت سارہ کو جب پتہ چلا یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اس گھرانے کے لیے رحمت و برکت ہے تو تعجب ختم ہوگیا۔

حضرت سارہ ان پاک خواتین میں سے ایک ہیں جو فرشتوں سے ہمکلام ہوئی ہیں۔ فرشتوں نے یہ بشارت حضرت سارہ کو اس لیے دی ہوگی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے تو حضرت ہاجرہ کے بطن سے، حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسے جلیل القدر فرزند موجود تھے۔

اہم نکات

۱۔ اولاد ابراہیم علیہ السلام رحمت و برکت بن کر آئی۔

۲۔ غیر انبیاء بھی فرشتوں سے ہمکلام ہوتے ہیں۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنۡ اِبۡرٰهِیۡمَ الرَّوۡعُ وَجَآءَتۡهُ الۡبُشۡرٰی یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ پھر جب ابراہیم کے دل سے خوف نکل گیا اور انہیں خوشخبری بھی مل گئی تو وہ قوم لوط کے بارے میں ہم سے بحث کرنے لگے۔

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل، اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمۡ اٰتِيۡهِمۡ عَذَابٌ غَيۡرُ مَرۡدُوۡدٍ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ (فرشتوں نے ان سے کہا) اے ابراہیم! اس بات کو چھوڑ دیں، بے شک آپ کے رب کا فیصلہ آچکا ہے اور ان پر ایک ایسا عذاب آنے والا ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔

تشریح کلمات

اَوَّاهٌ: (ا و ہ) یہ لفظ ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو حزن وغم ظاہر کرنے کے لیے اوّہ کرتا ہے اور جو مشیت الٰہی کا بہت زیادہ اظہار کرنے والے کو اَوَّاهٌ کہتے ہیں۔ مُّنِيۡبٌ رجوع کرنے والا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنۡ اِبۡرٰهِيۡمَ: قوم لوط سے عذاب کو ٹالنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصرار وتکرار ایک طرف تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ کے ساتھ گہری محبت اور ناز کو ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ: دوسری طرف حضرت علیہ السلام کی نرم دلی اور ان کے حلم و بردباری کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے جس کا اعلان خود خالق کی زبان سے ہو رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم لوط پر عذاب الٰہی نازل ہونے کے حق میں نہ تھے اور اس عذاب کو ٹالنے کی ابراہیم علیہ السلام بار بار تکرار کرتے تھے۔ اس کے لیے لفظ مجادلت، يُجَادِلُنَا استعمال فرمایا جو بہت زیادہ بحث کرنے کے معنوں میں ہے۔

۳۔ يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا: بعد میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا کہ فیصلہ حتمی ہے اور قوم لوط نا قابل ہدایت ہو چکی ہے اور ان میں کوئی خوبی اور رحم کی کسی قسم کی قابلیت نہیں رہی ہے تو خاموش ہو گئے۔

اہم نکات

۱۔ جب اللہ کا فیصلہ حتمی ہوتا ہے تو اولوالعزم انبیاء کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی: اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا....

وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوۡمٌ عَصِيۡبٌ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ اور جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس آئے تو لوط ان سے رنجیدہ ہوئے اور ان کے باعث دل تنگ ہوئے اور کہنے لگے: یہ بڑا سنگین دن ہے۔

تفسیر آیات

سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرشتے نہایت خوبصورت لڑکوں کی شکل میں آئے تھے۔ ان خوش شکل لڑکوں کو دیکھ کر حضرت لوط علیہ السلام پریشان ہو گئے کیونکہ اپنی قوم کی بدکاری کا انہیں علم تھا۔

وَجَآءَهٗ قَوۡمُهٗ يُهۡرَعُوۡنَ اِلَيۡهِ ؕ وَمِنۡ قَبۡلُ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىۡ هُنَّ اَطۡهَرُ لَـكُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِىۡ ضَيۡفِىۡ ؕ اَلَـيۡسَ مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِيۡدٌ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ اور لوط کی قوم بے تحاشا دوڑتی ہوئی ان کی طرف آئی اور یہ لوگ پہلے سے بدکاری کا ارتکاب کرتے تھے لوط نے کہا: اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں پس تم اللہ کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے سامنے مجھے رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی ہوشمند آدمی نہیں ہے؟

تشریح کلمات

يُهۡرَعُوۡنَ: (ہ ر ع) ہرع و اہرع کے معنی سختی اور تخویف سے ہانکنے اور چلانے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَجَآءَهٗ قَوۡمُهٗ يُهۡرَعُوۡنَ اِلَيۡهِ: لوط علیہ السلام کی بدکار قوم ان خوش شکل لڑکوں کو دیکھ کر لوط علیہ السلام کے گھر کی طرف دوڑی۔ اس سے اس قوم کی بے حیائی کی انتہا کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس عمل بد کو برا ہی نہیں سمجھتے تھے۔ شاید فرشتے بھی خوبصورت لڑکوں کی شکل میں اسی غرض سے آئے ہوں کہ ان کی بے حیائی اور بدکاری ثبت ہو جائے۔

۲۔ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىۡ هُنَّ اَطۡهَرُ لَـكُمۡ: حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا: میری بیٹیاں تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ پاکیزگی کی تعبیر سے تو صاف ظاہر ہے کہ نکاح مراد ہے اور ایک پیغمبر کی طرف سے نکاح ہی کی طرف دعوت ہو سکتی ہے۔ رہا بیٹیوں کا سوال کہ خود حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹیاں تھیں تو کافروں کے ساتھ نکاح کیسے ہو سکتا تھا؟ جواب دیا گیا ہے کہ شریعت لوط علیہ السلام میں ایسا کرنا جائز تھا۔ جیسا کہ ابتدائے اسلام میں بھی جائز تھا اور اگر ان بیٹیوں سے مراد قوم کی بیٹیاں ہیں تو کوئی اعتراض نہیں آتا۔ حضرت لوط علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ تم نے اپنی جنسی خواہشات کو پورا کرنا ہے تو اس کے لیے شائستہ اور فطری راستہ اختیار کرو۔

اہم نکات

۱۔ ہم جنس بازی انسانی رشد و کمال کے منافی ہے: اَلَـيۡسَ مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِيۡدٌ ....

۲۔ تمام ادیان جنسی خواہشات کو فطری اور جائز طریقوں سے پورا کرنے کی اجازت دیتے ہیں: ھُنَّ اَطۡھَرُ لَکُمۡ ....۔

۳۔ مہمان کی عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے حضرت لوط علیہ السلام نے ایک مثالی قربانی پیش فرمائی۔

قَالُوۡا لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَنَا فِیۡ بَنٰتِکَ مِنۡ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّکَ لَتَعۡلَمُ مَا نُرِیۡدُ ﴿۷۹﴾

۷۹۔ وہ بولے: تمہیں خوب علم ہے ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی غرض نہیں ہے اور یقیناً تمہیں معلوم ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔

قَالَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّۃً اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ لوط نے کہا: اے کاش! مجھ میں (تمہیں روکنے کی) طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لے سکتا۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَنَا: وہ حضرت لوط علیہ السلام ہی کا حوالہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ مسئلہ تو خود آپ کے علم میں ہے کہ آپ کی بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں:

> ان کے قومی رواج کے مطابق لوگوں کی عورتوں پر بزور بازو قبضہ کرنا درست نہیں تھا مگر لڑکوں سے اپنی ہوس پوری کرنے میں کوئی حرج نہ تھا۔[1]

اور ممکن ہے ان کی ساری رغبت اس گندگی کی طرف ہو گئی ہو اور فطری راہوں کی طرف وہ سرے سے راغب نہ ہوتے ہوں۔

حضرت لوط علیہ السلام نے اس عار و ننگ سے بچنے کے تمام ذرائع استعمال کیے۔ وعظ و نصیحت تو شروع میں کرتے رہے، فطری راہوں سے خواہشات پوری کرنے کی تجویز بھی سامنے رکھ دی اور قوم کے کسی ہوشمند آدمی کی بھی تلاش کی جو ان کی مدد کو پہنچے۔ جب ان سب چیزوں سے مایوس ہوئے تو اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ کاش کوئی قوم و قبیلہ ہوتا جو میرا دفاع کرتا یا کوئی جائے پناہ ہوتی اس کا سہارا لیتا۔ اس وقت فرشتوں نے انہیں بتایا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہم آپ کے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ عزت و آبرو کے دفاع کے لیے طاقت اور سہارا تلاش کرنا چاہیے: لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّۃً اَوۡ اٰوِیۡۤ ....۔

---

[1] المیزان ۹: ۳۴۰

قَالُوۡا یٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنۡ یَّصِلُوۡۤا اِلَیۡکَ فَاَسۡرِ بِاَہۡلِکَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ وَ لَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَکَ ؕ اِنَّہٗ مُصِیۡبُہَا مَاۤ اَصَابَہُمۡ ؕ اِنَّ مَوۡعِدَہُمُ الصُّبۡحُ ؕ اَلَیۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِیۡبٍ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ فرشتوں نے کہا: اے لوط ! ہم آپ کے رب کے فرستادے ہیں یہ لوگ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے، پس آپ رات کے کسی حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جائیں اور آپ میں سے کوئی شخص پیچھے مڑ کر نہ دیکھے سوائے آپ کی بیوی کے بے شک جو عذاب دوسروں پر پڑنے والا ہے وہی اس (بیوی) پر بھی پڑے گا یقیناً ان کے وعدہ عذاب کا وقت صبح ہے، کیا صبح کا وقت قریب نہیں؟

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا یٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ: حضرت لوط علیہ السلام کا اضطراب و پریشانی دیکھ کر فرشتوں نے اصل راز سے پردہ اٹھا دیا اور کہا: ہم تو آپؐ کے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ یہ لوگ آپؐ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ چنانچہ وہ سب اندھے ہو گئے۔ سورہ قمر آیت ۳۷ میں ان کے اندھے ہو جانے کا ذکر ہے:

وَ لَقَدۡ رَاوَدُوۡہُ عَنۡ ضَیۡفِہٖ فَطَمَسۡنَاۤ اَعۡیُنَہُمۡ ....

اور بتحقیق انہوں نے لوط کے مہمانوں کو قابو کرنا چاہا تو ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں....

۲۔ فَاَسۡرِ بِاَہۡلِکَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ: حضرت لوط علیہ السلام کو حکم ہوا کہ خاندان کے تمام افراد کو لے کر نکل جائیں۔ البتہ ان کی بیوی چونکہ خیانت کار تھی وہ بھی ہلاکت میں جائے گی۔

۳۔ اِنَّ مَوۡعِدَہُمُ الصُّبۡحُ: ممکن ہے حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کی بداعمالیوں اور فحش کارویوں کی بنا پر جلدی عذاب کی درخواست کی تو فرمایا گیا کہ صبح کے وقت عذاب آنے ہی والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کردار بد ہونے کی صورت میں انبیاء کی ہمسری بھی فائدہ نہیں دیتی: اِلَّا امۡرَاَتَکَ ....

فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہَا حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۬ۙ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿۸۲﴾

مُّسَوَّمَۃً عِنۡدَ رَبِّکَ ؕ وَ مَا ہِیَ مِنَ

۸۲۔ پس جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اس (بستی) کو تہ و بالا کر دیا اور اس پر پختہ مٹی کے پتھروں کی لگاتار بارش برسائی۔

۸۳۔ جن پر آپ کے رب کے ہاں (سے) نشانی لگی ہوئی تھی اور یہ (عذاب) ظالموں سے (کوئی)

الظّٰلِمِیۡنَ بِبَعِیۡدٍ ﴿۸۳﴾ دور نہیں۔

تشریح کلمات

سِجِّیۡلٍ: سنگ گل کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے یہ لفظ فارسی سے معرب ہے۔

مَّنۡضُوۡدٍ: (ن ض د) کسی چیز کو تہ بہ تہ رکھے جانے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا: ممکن ہے یہ عذاب آتش فشانی کے دھماکے کے ساتھ آیا ہو جس میں زلزلہ بھی ہوتا ہے، زمین کو الٹ کر تہ و بالا بھی کر دیا جاتا ہے اور آتش فشانی کی وجہ سے اوپر سے پتھروں کی بارش بھی ہوسکتی ہے۔

۲۔ مُّسَوَّمَۃً عِنۡدَ رَبِّکَ: اور ہر پتھر پر نشانی کی کیا تفصیل ہے؟ آیت اس سلسلے میں خاموش ہے اور ظن و تخمین کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کہتے ہیں: آج تک بحر لوط کے جنوب اور مشرق کے علاقے میں اس انفجار کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔

۳۔ الظّٰلِمِیۡنَ: میں الف لام اس نوعیت کی زیادتی کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس نوعیت کے جرائم پر اس قسم کا عذاب بعید نہیں ہے: وَ مَا ہِیَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ بِبَعِیۡدٍ۔

وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاہُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ وَ لَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ اِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ بِخَیۡرٍ وَّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ ﴿۸۴﴾

۸۴۔ اور مدین کی طرف ہم نے ان کی برادری کے فرد شعیب کو بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے اور ناپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو، میں تمہیں آسودگی میں دیکھ رہا ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ دن نہ آ جائے جس کا عذاب تمہیں گھیر لے۔

وَ یٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ وَ لَا تَبۡخَسُوا

۸۵۔ اور اے میری قوم! انصاف کے ساتھ پورا

النَّاسَ اَشۡیَآءَهُمۡ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۸۵﴾

ناپا اور تولا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔

تفسیر آیات

ان دونوں آیات کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف آیت ۸۵

بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۬ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ ﴿۸۶﴾

۸۶۔ اللہ کی طرف سے باقی ماندہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو اور میں تم پر نگہبان تو نہیں ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ : ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شعیبؑ کی قوم تجارت پیشہ تھی۔ اللہ کا رسول جہاں انسان کو الٰہی اقدار سے روشناس کراتا ہے وہاں معاشرتی اصلاح پر بھی توجہ دیتا ہے۔ ناپ تول میں کمی کر کے کمائی گئی ناجائز کمائی سے معاشرے کو پاک کرنا چاہتا ہے اور جائز منافع کمانے پر اکتفا کرنے کی نصیحت فرماتا ہے۔ تجارت کے ذریعے حاصل ہونے والے جائز منافع کو بَقِیَّتُ اللّٰهِ سے تعبیر کرنا یہ بتاتا ہے کہ تجارت کے ذریعے حاصل ہونے والا منافع اللہ کی عنایت ہے بشرطیکہ تاجر مؤمن ہو: وَ الۡبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیۡرٌ ....[1]

155 بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ : اس آیت میں یہ جملہ قوم شعیب کے بارے میں ہے اور بَقِیَّتُ اللّٰهِ سے مراد حلال منافع ہے۔ روایات کے مطابق یہی جملہ حضرت قائم آل محمد علیہ الصلوۃ والسلام کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس کو اقتباس کہہ سکتے ہیں اور تطبیق بھی۔

۲۔ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ : میں اس بات کا ذمے دار نہیں ہوں کہ تم اپنے معاملات میں خیانت کرو، پھر تمہیں عذاب الٰہی سے بچاؤں یا مطلب یہ ہو سکتا ہے: تمہاری خیانت کے باوجود میں تمہارے لیے اللہ کی نعمتوں کو تمہارے لیے باقی رکھنے کا ذمے دار نہیں ہوں۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کے لیے تجارتی منافع عنایت الٰہی ہے: بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ....

---

[1] ۱۸ کہف: ۴۶

۲۔ انبیاء کو دلوں سے کام ہے اس لیے نصیحت فرماتے ہیں، طاقت استعمال نہیں کرتے: وَمَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ ....

قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُکَ تَاۡمُرُکَ اَنۡ نَّتۡرُکَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّکَ لَاَنۡتَ الۡحَلِیۡمُ الرَّشِیۡدُ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ انہوں نے کہا: اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں یا ہم اپنے اموال میں اپنی مرضی سے تصرف کرنا بھی چھوڑ دیں؟ صرف تو ہی بڑا بردبار عقلمند آدمی ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُکَ: وہ بطور طنز و استہزاء کہنے لگے: کیا تمہاری نماز کا یہی تقاضا ہے کہ ہم اپنے معبودوں کی پوجا ترک کر دیں؟ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کے دین اور ان کی نماز کو طنز کا نشانہ بناتے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس نماز کے اثرات عبادت و معاملات پر یکساں طور پر مترتب ہو رہے ہیں۔ اس نماز میں توحید پرستی ہے جس میں بت پرستی اور شرک کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس نماز کے اثرات مالی معاملات پر بھی مترتب ہو رہے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دین و مذہب صرف عبادتی رسوم کا نام نہیں ہے بلکہ یہ تمدن، معاشرت، سیاست اور معاشی نظام پر مشتمل ایک جامع نظام حیات کا نام ہے۔ قدیم جاہلیت کا بھی یہی نظریہ تھا جو آج کل کے روشن خیالوں کا ہے کہ دین کو انسانی زندگی میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔

۲۔ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا: چنانچہ قدیم جاہلیت کو بھی اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ دین و مذہب اقتصادی امور میں مداخلت کرے اور اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کی پوری آزادی نہ ہو۔ اس طرح کل کی قدیم غیر منظّم جاہلیت سے آج کی منظّم جاہلیت میں فکری طور پر کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ وہی موقف، وہی تاریکی اور وہی قدیم ترین نظریہ ہے جس کو روشن خیالی کا نام دے کر پیش کیا جاتا ہے۔

۳۔ اِنَّکَ لَاَنۡتَ الۡحَلِیۡمُ الرَّشِیۡدُ: پوری قوم میں (اے شعیبؑ) صرف تو ایک آدمی پیدا ہوا ہے جو بردبار اور سمجھدار ہے؟ بردباری یہ کہ ہم ناپ تول میں انصاف کی پابندی کریں اور سمجھداری یہ کہ اس سے فائدہ زیادہ ملتا ہے جب کہ ہمارے نزدیک نہ یہ بردباری ہے، نہ سمجھداری۔ سمجھداری یہ ہے کہ ناپ تول میں ہوشیاری کے ذریعے زیادہ کمائیں۔

اہم نکات

۱۔ دین اور بندگی چند رسوم کا نہیں، ایک جامع نظام حیات کا نام ہے۔
۲۔ نماز تمام قدروں کے لیے بنیاد ہے: اَصَلٰوتُکَ تَاۡمُرُکَ....
۳۔ دیندار لوگ فکری برتری رکھتے ہیں: اِنَّکَ لَاَنۡتَ الۡحَلِیۡمُ الرَّشِیۡدُ۔

قَالَ یٰقَوۡمِ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کُنۡتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَ رَزَقَنِیۡ مِنۡہُ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ وَ مَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُخَالِفَکُمۡ اِلٰی مَاۤ اَنۡہٰکُمۡ عَنۡہُ ؕ اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ ؕ وَ مَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰہِ ؕ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَ اِلَیۡہِ اُنِیۡبُ ﴿۸۸﴾

۸۸۔شعیب نے کہا: اے میری قوم! تم یہ تو بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے دلیل کے ساتھ ہوں اوراس نے مجھے اپنے ہاں سے بہترین رزق (نبوت) سے نوازا ہے، میں ایسا تو نہیں چاہتا کہ جس امر سے میں تمہیں منع کروں خود اس کو کرنے لگوں میں تو حسب استطاعت فقط اصلاح کرنا چاہتا ہوں اور مجھے صرف اللہ ہی سے توفیق ملتی ہے اسی پر میرا توکل ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡ کُنۡتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ: حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کے طنز و استہزاء کے جواب میں فرماتے ہیں: تم یہ تو بتاؤ اگر میں اللہ کا رسول ہوں اور اپنی رسالت پر واضح دلیل بھی رکھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے مجھے ایک دستور حیات و آئین زندگی عنایت فرمایا ہے جس میں انسان کی خیر و سعادت ہے پھر بھی میں بے عقل ہوں؟

۲۔ وَ مَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُخَالِفَکُمۡ: حق کے داعی کی سچائی پر بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ جو کچھ دوسروں سے کہتا ہے اسی پر خود عمل کرتا ہے۔ جن قدروں کی طرف وہ دوسروں کو بلاتا ہے وہ قدریں خود اس کے لیے سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ لہٰذا داعی الی الحق اور مصلح ایسا نہیں کرتے کہ دوسروں کو حرام مال کھانے سے منع کریں اور خود مختلف توجیہات کر کے حرام کھائیں۔ مصلح وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو عملی میدان میں سب سے آگے رکھے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ نہ صرف یہ کہ مصلح نہیں ہوگا بلکہ وہ استحصالی ہوگا جو اپنے مفاد کے لیے ایمانداری کا مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے۔

۳۔ اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ: حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں استحصالی نہیں، مصلح

ہوں۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ ان اصلاحی قدروں پر خود عمل کرتا ہوں اور اس دعوت و عمل میں اللہ کی طرف سے توفیق کا محتاج ہوں۔

۴۔ وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰہِ: میں اپنی اس اصلاحی تحریک میں کامیابی صرف اللہ سے چاہتا ہوں جس پر ہر مشکل میں میرا بھروسہ ہے۔ وَ اِلَیۡہِ اُنِیۡبُ میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں کیونکہ مجھے صرف اس سے سہارا ملتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قانون الٰہی سب کے لیے یکساں ہوتا ہے: وَ مَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُخَالِفَکُمۡ ....

۲۔ توکل اس ذات پر کیا جاتا ہے جس سے توفیق ملتی ہے: وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰہِ ....

وَ یٰقَوۡمِ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شِقَاقِیۡۤ اَنۡ یُّصِیۡبَکُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ قَوۡمَ نُوۡحٍ اَوۡ قَوۡمَ ہُوۡدٍ اَوۡ قَوۡمَ صٰلِحٍ ؕ وَ مَا قَوۡمُ لُوۡطٍ مِّنۡکُمۡ بِبَعِیۡدٍ ﴿۸۹﴾

۸۹۔ اور اے میری قوم! میری مخالفت کہیں اس بات کا موجب نہ بنے کہ تم پر بھی وہی عذاب آ جائے جو قوم نوح یا قوم ہود یا صالح کی قوم پر آیا تھا اور لوط کی قوم (کا زمانہ) تو تم سے دور بھی نہیں ہے۔

وَ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ رَحِیۡمٌ وَّدُوۡدٌ ﴿۹۰﴾

۹۰۔ اور تم لوگ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو پھر اس کے آگے توبہ کرو، میرا رب یقیناً بڑا رحم کرنے والا، محبت کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

وَّدُوۡدٌ: اسمائے حسنی سے ہے۔ اس کے معنی ہیں نہایت محبت کرنے والا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یٰقَوۡمِ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شِقَاقِیۡۤ: حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو اس نکتے کی طرف متوجہ کرا رہے ہیں: اگر تمہیں میرے ساتھ عداوت ہے، یہ عداوت تمہاری ہلاکت کا سبب نہ بنے۔ میرے ساتھ عداوت کا یہ بدلہ نہیں کہ تم خود کو ہلاکت میں ڈال دو اور گذشتہ اقوام کی سرنوشت سے دو چار ہو جاؤ۔

۲۔ وَ مَا قَوۡمُ لُوۡطٍ: حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم از لحاظ زمان بھی قوم لوط علیہ السلام سے قریب تھی کیونکہ ان دو قوموں کے درمیان تین سے سات صدیوں کا فاصلہ تھا اور از لحاظ مکان بھی قریب تر تھی۔ چنانچہ

مدین، قوم لوط علیہ السلام کی سرزمین سدوم سے دور نہ تھا جو بحر مردار جسے بحیرۂ لوط بھی کہتے ہیں کے کنارے پر آباد تھی۔ سیاق آیت میں قرب مکانی و زمانی دونوں شامل ہو سکتے ہیں۔

۳۔ اِنَّ رَبِّیۡ رَحِیۡمٌ وَّدُوۡدٌ: اللہ اپنے بندوں پر رحیم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی مخلوق سے پیار و محبت بھی رکھتا ہے۔ اللہ کی طرف سے پیار و محبت اس کی تخلیق و تشریع دونوں میں نمایاں ہے۔ تخلیق میں انسان کو بہترین پیرائے میں بنایا:

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ [۱]   تحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔

اور روئے زمین پر انسان کے لیے بے شمار لذت و ذائقے کی چیزیں پیدا کیں ورنہ اگر انسان کو صرف زندہ رکھنا مقصود ہوتا تو گندم یا جو کا دانہ ہی کافی تھا۔ اس کی مہر و محبت کا جلوہ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت میں نظر آتا ہے۔ انسان تو اپنی جگہ، جانوروں میں بھی اپنی اولاد کے لیے اس قدر مہر و محبت ودیعت فرمائی کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر اولاد کی حفاظت کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ بندوں کی بے رخی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نہایت محبت کرنے والا ہے۔

قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ مَا نَفۡقَہُ کَثِیۡرًا مِّمَّا تَقُوۡلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیۡنَا ضَعِیۡفًا ۚ وَ لَوۡ لَا رَہۡطُکَ لَرَجَمۡنٰکَ ۫ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡنَا بِعَزِیۡزٍ ﴿۹۱﴾

۹۱۔ انہوں نے کہا: اے شعیب! تمہاری اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور بے شک تم ہمارے درمیان بے سہارا بھی نظر آتے ہو اور اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تم ہم تمہیں سنگسار کر چکے ہوتے (کیونکہ) تمہیں ہم پر کوئی بالادستی حاصل نہیں ہے۔

تشریح کلمات

مَا نَفۡقَہُ: (ف ق ھ) سمجھ کے معنوں میں ہیں۔

رَہۡطُکَ: (ر ھ ط) الرھط قوم و عشیرہ کے معنی میں ہے جس کا اطلاق بقول بعضے دس آدمیوں سے کم کی جماعت پر ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا نَفۡقَہُ کَثِیۡرًا مِّمَّا تَقُوۡلُ: عموماً تنگ نظر لوگ اپنے خیالات سے مختلف باتوں کو سننے اور سمجھنے کے لیے آمادہ ہی نہیں ہوتے۔ مکہ کے لوگ بھی اس تنگ نظری میں کسی سے کم نہ تھے۔ حضرت شعیب

---

[۱] ۹۵ تین: ۴

علیہ السلام کی قوم کا قصہ اسی مناسبت اور اس مناسبت سے بھی کہ بنی ہاشم کے خوف سے یہ لوگ حضور (ص) کی طرف اپنا ہاتھ دراز نہیں کرتے تھے، بیان کیا جا رہا ہے۔

اس تعبیر میں حضرت شعیب علیہ السلام کی اہانت بھی ہے کہ تمہارے قبیلے کی وجہ سے تم پر ہم ہاتھ نہیں اٹھاتے ورنہ تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ تعصب، عقل و فہم کے سامنے بڑی رکاوٹ ہے: مَا نَفۡقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ ....

۲۔ الٰہی نظریات کے حامل افراد کو ہمیشہ کمزور سمجھا جاتا رہا ہے: وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيۡنَا ضَعِيۡفًا ....

۳۔ دینی اقدار سے محروم لوگ ہمیشہ قدروں کی نہیں طاقت کی زبان سمجھتے ہیں: وَ لَوۡلَا رَهۡطُكَ ....

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَهۡطِيۡۤ اَعَزُّ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اتَّخَذۡتُمُوۡهُ وَرَآءَكُمۡ ظِهۡرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ ﴿۹۲﴾

۹۲۔ شعیب نے کہا: اے میری قوم! کیا میرا قبیلہ تمہارے لیے اللہ سے زیادہ اہم ہے کہ تم نے اللہ کو پس پشت ڈال دیا ہے؟ میرا رب یقیناً تمہارے اعمال پر احاطہ رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَهۡطِيۡۤ: قوم کے توہین آمیز موقف کے جواب میں حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کی فکری سفاہت اور عقلی بے مایہ گی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اللہ کے مقابلے میں ایک قبیلے کے چند افراد کو طاقتور، قابل لحاظ سمجھتے ہیں۔ جس ذات کے قبضے میں ان کی جان ہے اس سے بے پرواہی برتتے، اسے پس پشت ڈال دیتے ہیں اور چند بے بس انسانوں سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔

۲۔ اِنَّ رَبِّيۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ: میرا رب تمہارے اس موقف پر احاطہ رکھتا ہے جس کے تحت تم اللہ تعالیٰ کو نظر انداز کرتے اور قوم کے چند افراد کا لحاظ رکھتے ہو۔ اس جملے میں اس قوم پر آنے والے عذاب کی طرف اشارہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ مادی انسان کا بھروسہ قوم و قبیلے پر ہوتا ہے جب کہ الٰہی انسان کا بھروسہ اللہ کی ذات پر ہوتا ہے: اَرَهۡطِيۡۤ اَعَزُّ عَلَيۡكُمۡ ....

وَ يٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ ؕ سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ يَّاۡتِيۡهِ عَذَابٌ يُّخۡزِيۡهِ وَ مَنۡ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارۡتَقِبُوۡۤا اِنِّىۡ مَعَكُمۡ رَقِيۡبٌ ﴿۹۳﴾

۹۳۔ اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ پر عمل کرتے جاؤ میں بھی عمل کرتا جاؤں گا، عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ رسوا کن عذاب کس پر آتا ہے اور جھوٹا کون ہے، پس تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار میں ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ مَكَانَتِكُمۡ: ایک جگہ ڈٹ جانا۔ ثابت قدم رہنا۔ مَكَانَتِكُمۡ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے کفرو شرک پر ڈٹے رہو۔

حضرت شعیب علیہ السلام قوت ملکوتی کے حوالے سے بات کر رہے ہیں اور جو لوگ اپنے آپ کو طاقتور اور حضرت شعیب علیہ السلام کو کمزور خیال کر رہے ہیں، ان سے فرمایا:

۲۔ اگر تم کوئی طاقت رکھتے ہو تو اس پر بھروسہ کرو میں اپنی تحریک جاری رکھوں گا۔ عنقریب تمہیں اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا اور اس کائنات میں طاقت کے سرچشمہ کا بھی۔ تم رسوا کن عذاب کا انتظار کرو، میں اللہ کی وسیع رحمت کا انتظار کرتا ہوں۔

اہم نکات

۱۔ باطل خواہ کتنا ہی طاقتور ہو اس کا انجام رسوائی ہے: عَذَابٌ يُّخۡزِيۡهِ ....

۲۔ مشکل حالات میں مؤمن کو رحمت خدا کا انتظار کرنا چاہیے: اِنِّىۡ مَعَكُمۡ رَقِيۡبٌ ....

وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا شُعَيۡبًا وَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الصَّيۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دِيَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ۙ ﴿۹۴﴾ كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا ؕ اَلَا بُعۡدًا لِّمَدۡيَنَ كَمَا بَعِدَتۡ ثَمُوۡدُ ﴿۹۵﴾

۹۴۔ اور جب ہمارا فیصلہ آ گیا تو ہم نے شعیب اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات دی اور ظالموں کو ہولناک چیخ نے آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

۹۵۔ گویا کہ وہاں کبھی بسے ہی نہ تھے، آگاہ رہو! قوم مدین (رحمت حق سے) اس طرح دور ہو جس طرح قوم ثمود دور ہوئی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا: اس آیت میں الصَّیۡحَۃُ ہولناک آواز اور الاعراف میں رجفۃ زلزلہ کہا گیا ہے۔ ان میں تضاد اس لیے نہیں ہے کہ زلزلے کے ساتھ ہولناک آواز بھی ہوتی ہے جو ان کی ہلاکت کا سبب بن گیا ہو۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف آیت ۹۱۔

۲۔ کَمَا بَعِدَتۡ: بعض کے مطابق بَعُدَ مسافت کی دوری کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بَعِدَ ہلاکت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ بعدت علیھم الشقۃ میں لفظ بَعُدَ مسافت کی دوری کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو لسان العرب مادۃ "بعد"۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۹۶﴾

۹۶۔ اور بتحقیق موسیٰ کو ہم نے اپنی نشانیوں اور واضح دلیل کے ساتھ بھیجا،

اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہٖ فَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ فِرۡعَوۡنَ ۚ وَ مَاۤ اَمۡرُ فِرۡعَوۡنَ بِرَشِیۡدٍ ﴿۹۷﴾

۹۷۔ فرعون اور ان کے درباریوں کی طرف، پھر بھی انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی، جب کہ فرعون کا حکم عقل کے مطابق نہ تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ بِاٰیٰتِنَا: نشانیوں سے مراد وہ نو نشانیاں ہو سکتی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کو دکھائی تھیں۔ یہ عصا، ید بیضاء، طوفان، جوئیں، خون، مینڈکوں کی بہتات وغیرہ ہیں۔

۲۔ سُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ: سے مراد وہ واضح دلیل و معجزہ ہے جو عقل و فہم پر غالب آ جاتا ہے۔ اس سے عصا مراد ہو سکتا ہے جس کی اہمیت کے پیش نظر خصوصی طور پر ذکر فرمایا۔

۳۔ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہٖ: حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث نہیں ہوئے بلکہ سب انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ فرعون اور درباریوں کا خاص کر ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ باقی لوگ ان کے تابع تھے، ان کی اپنی کوئی سوچ اور فکر نہیں تھی۔

۴۔ فَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ فِرۡعَوۡنَ: فرعون چونکہ اللہ کی جگہ اپنی طرف دعوت دیتا تھا وہ بشر ہو کر انسانوں کے خدا ہونے کا مدعی تھا جو سراسر حماقت اور سفاہت پر مبنی تھا اس کے درباری اس سفیہانہ و احمقانہ حکم کی تعمیل کرتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ کی بندگی سفاہت و حماقت ہے۔ وَمَآ اَمۡرُ فِرۡعَوۡنَ بِرَشِیۡدٍ

يَقۡدُمُ قَوۡمَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَاَوۡرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئۡسَ الۡوِرۡدُ الۡمَوۡرُوۡدُ ﴿۹۸﴾

۹۸۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے ہوگا اور انہیں جہنم تک پہنچا دے گا، کتنی بری جگہ ہے جہاں یہ وارد کیے جائیں گے۔

وَاُتۡبِعُوۡا فِیۡ هٰذِهٖ لَعۡنَةً وَّيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ بِئۡسَ الرِّفۡدُ الۡمَرۡفُوۡدُ ﴿۹۹﴾

۹۹۔ اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے تعاقب میں ہے اور قیامت کے دن بھی، کتنا برا صلہ ہے یہ جو (کسی کے) حصے میں آئے۔

تشریح کلمات

الۡوِرۡدُ: (و ر د) پانی کا قصد کرنے کے معنوں میں ہے پھر ہر جگہ کا قصد کرنے پر بولا جاتا ہے۔ پانی پر پہنچنے والے کو وارد اور پانی کو مورود کہتے ہیں. الوِرۡد اس پانی کو کہتے ہیں جو وارد کے لیے تیار کیا گیا ہو۔

الرِّفۡدُ: (ر ف د) عطا اور مدد کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت اور دیگر آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ دنیا میں لوگوں کی گمراہی میں پیش پیش ہوتے ہیں وہی قیامت کے دن ان کو جہنم کی طرف لے جانے میں آگے آگے ہوں گے۔

وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً يَّدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ ...[1] اور ہم نے انہیں ایسے رہنما بنایا جو آتش کی طرف بلاتے ہیں....

اسی طرح جو لوگ دنیا میں حق و صداقت کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں قیامت کے دن ان کی رہنمائی اور قیادت کرتے ہوئے جنت کی طرف چلے جائیں گے:

يَوۡمَ نَدۡعُوۡا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمۡ ...[2] قیامت کے دن ہم ہر گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے....

امام حق اور امام باطل دنوں اپنی اپنی جماعت کی رہنمائی کریں گے۔

فَاَوۡرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئۡسَ الۡوِرۡدُ الۡمَوۡرُوۡدُ: اَوۡرَدَ، ان کو آتش کے گھاٹ پر اتارا جیسا کہ چرواہا جانوروں

---

[1] ۲۸ قصص: ۴۱ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۷۱

کو پانی کے گھاٹ کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ کافر لوگ بھی جانوروں کی طرح بے سوچے ان گمراہوں کے پیچھے چلتے رہے، کل قیامت کے دن جب یہ پیرو کار جہنم کی طرف ان کے پیچھے جا رہے ہوں گے تو ان پر لعنتوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے جا رہے ہوں گے۔ لعنتوں کا یہ صلہ کتنا بُرا صلہ ہوگا۔

اس آیۂ شریفہ میں عذاب جہنم کو پانی کے گھاٹ اور عذاب کو عطیہ اور صلہ کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ انسان کو اپنی تشنگی رفع کرنے کے لیے پانی کی طرف اور ثواب وصلہ کی طرف جانا چاہیے تھا لیکن فرعون جیسے رہنما ان کو پانی کی جگہ جہنم اور صلہ وعطیہ کی جگہ عذاب کی طرف لے جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ باطل رہنما دنیا و آخرت دونوں میں لعنتوں کا نشانہ بن جائیں گے۔

ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيۡكَ مِنۡهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيۡدٌ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰـكِنۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَمَاۤ اَغۡنَتۡ عَنۡهُمۡ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِىۡ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ‌ؕ وَمَا زَادُوۡهُمۡ غَيۡرَ تَتۡبِيۡبٍ﴿۱۰۱﴾

۱۰۰۔ یہ ہیں ان بستیوں کے حالات جو ہم آپ کو سنا رہے ہیں، ان میں سے بعض کھڑی ہیں اور بعض کی جڑیں کٹ چکی ہیں۔

۱۰۱۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، پس جب آپ کے رب کا حکم آ گیا تو اللہ کے سوا جن معبودوں کو وہ پکارتے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے اور انہوں نے تباہی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔

تشریح کلمات

تَتۡبِيۡبٍ: (ت ب ب) التب و التباب کے معنی مسلسل خسارہ میں رہنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡقُرٰى: بعض بستیاں جن پر ہلاکت نازل ہو گئی تھی، ان کے آثار نزول وحی کے زمانے تک بلکہ بعض کے تو آج تک موجود ہیں۔ جیسے عاد اور ثمود کی بستیوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔ ان آثار کے بارے میں فرمایا:

وَاِنَّكُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مُّصۡبِحِيۡنَ ۙ وَبِالَّيۡلِ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ؕ[۱]

اور تم دن کو بھی ان (بستیوں) سے گزرتے رہتے ہو اور رات کو بھی، تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

---

[۱] ۳۷ صافات: ۱۳۷۔ ۱۳۸

۲۔ وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ : ان بستیوں کی ہلاکت کسی قسم کی ظلم و زیادتی کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ یہ خود ان میں بسنے والوں کے اعمال بد کا ایک طبعی نتیجہ تھی۔

۳۔ فَمَاۤ اَغۡنَتۡ عَنۡهُمۡ اٰلِهَتُهُمُ: وہ یہ تھے کہ وہ غیر اللہ سے اپنی ساری توقعات وابستہ کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب عذاب نازل ہوا تو جن کے ساتھ ان کی توقعات وابستہ تھیں وہ نہ صرف ان کے کام نہ آئے بلکہ ان کی وجہ سے ہلاکت و بربادی میں اضافہ ہوا۔

اہم نکات

۱۔ قوموں کے انحطاط کے علل و اسباب کا مطالعہ کرنا چاہیے: ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡقُرٰى ....

۲۔ ظلم، انحطاط کے عوامل میں سے ایک ہے: وَلٰـكِنۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ....

وَكَذٰلِكَ اَخۡذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الۡقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ‌ؕ اِنَّ اَخۡذَهٗۤ اَلِيۡمٌ شَدِيۡدٌ ﴿۱۰۲﴾

اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنۡ خَافَ عَذَابَ الۡاٰخِرَةِ‌ ؕ ذٰلِكَ يَوۡمٌ مَّجۡمُوۡعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوۡمٌ مَّشۡهُوۡدٌ ﴿۱۰۳﴾

وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعۡدُوۡدٍ ﴿۱۰۴﴾

۱۰۲۔ اور آپ کے رب کی پکڑ اسی طرح ہے جب وہ کسی ظالم بستی کو اپنی گرفت میں لیتا ہے تو اس کی گرفت یقیناً دردناک اور سخت ہوا کرتی ہے۔

۱۰۳۔ عذاب آخرت سے ڈرنے والے کے لیے یقیناً اس میں نشانی ہے، وہ ایسا دن ہو گا جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ ایسا دن ہو گا جس میں سب حاضر کیے جائیں گے۔

۱۰۴۔ اور ہم اس دن کے لانے میں فقط ایک مقررہ وقت کی وجہ سے تاخیر کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَكَذٰلِكَ اَخۡذُ رَبِّكَ: قوموں کے انحطاط و زوال کی داستانوں میں عمیق مطالعہ کرنے والوں کے سامنے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ یہ ہلاکتیں ایک اندھے اتفاق کے طور پر وقوع پذیر نہیں ہوتیں بلکہ کائنات پر حاکم ایک جامع قانون اور حکمت آمیز مکافات عمل کا نتیجہ ہیں۔

۲۔ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً: ان بستیوں کی ہلاکت میں اللہ تعالیٰ کے اس حکمت آمیز قانون مکافات کو سمجھنے کے لیے بہت سی باتیں ہیں۔ البتہ ان نکات کی طرف ایک مردہ ضمیر اور غافل دل متوجہ نہ ہو گا بلکہ اپنی عاقبت کی فکر میں رہنے اور خوف محسوس کرنے والے ان نشانیوں سے درس سیکھیں گے۔

۳۔ ذٰلِكَ يَوۡمٌ مَّجۡمُوۡعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ: اور یہ اس عظیم مکافات کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے جو اس روز سامنے آئے گا جس میں تمام انس و جن و ملائکہ سب جمع ہوں گے۔ چونکہ اعمال کے حساب کا دوسروں کے ساتھ ربط ہوگا۔ کوئی ظالم کوئی مظلوم ہے اور کسی کا حق کسی کی گردن پر ہے وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ وَ ذٰلِكَ يَوۡمٌ مَّشۡهُوۡدٌ: شہود حاضر ہونے کے معنوں میں ہوسکتا ہے، گواہی دیے جانے کو معنوں میں نہیں۔ چنانچہ اس دن میدان حشر میں جن و انس، ملائکہ سب جمع ہوں گے اور ساتھ لوگوں کے تمام اعمال بھی سامنے لائے جائیں گے۔

۵۔ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ: اس یوم قیامت کو ایک قابل شمار وقت کے لیے مؤخر کیا ہے لاجل میں لام بیان غرض کے لیے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن میں قیامت کے اغراض و مقاصد مضمر ہیں۔

يَوۡمَ تُبۡلَى السَّرَآئِرُ ۙ [1] اس روز تمام راز فاش ہو جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ کردار سازی میں تصور آخرت کا کردار بنیادی ہے: لِّمَنۡ خَافَ عَذَابَ الۡاٰخِرَةِ ....

۲۔ روز قیامت تمام حقائق کھل کر سامنے آئیں گے۔ وَ ذٰلِكَ يَوۡمٌ مَّشۡهُوۡدٌ ....

يَوۡمَ يَاۡتِ لَا تَكَلَّمُ نَفۡسٌ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ۚ فَمِنۡهُمۡ شَقِيٌّ وَّسَعِيۡدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ شَقُوۡا فَفِى النَّارِ لَهُمۡ فِيۡهَا زَفِيۡرٌ وَّشَهِيۡقٌ ۙ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيۡدُ ﴿۱۰۷﴾

۱۰۵۔ جب وہ دن آئے گا تو اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات نہ کر سکے گا، پھر ان میں سے کچھ لوگ بدبخت اور کچھ نیک بخت ہوں گے۔

۱۰۶۔ پس جو بدبخت ہوں گے وہ جہنم میں جائیں گے جس میں انہیں چلانا اور دھاڑنا ہوگا۔

۱۰۷۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے جب تک آسمانوں اور زمین کا وجود ہے مگر یہ کہ آپ کا رب (نجات دینا) چاہے، بے شک آپ کا رب جو ارادہ کرتا ہے اسے خوب بجا لاتا ہے۔

تشریح کلمات

زَفِيۡرٌ: (ز ف ر) اس کے اصل معنی سانس کی اس قدر تیز آمد و رفت کے ہیں کہ جس سے سینہ پھول جائے۔

----

[1] ۸۶ طارق: ۹

شَهِيْقٌ : (ش ھ ق) کے معنی لمبا سانس کھینچنے کے ہیں لیکن شَهِيْقٌ سانس لینے اور زَفِيْرٌ سانس چھوڑنے پر بولا جاتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ شاھق سے ماخوذ ہے جس کے معنی انتہائی بلند پہاڑ کے ہیں۔ استعمال میں یہ دونوں الفاظ مصیبت زدہ لوگوں کی چیخ و پکار کے لیے زیادہ رائج ہیں۔ بقول زجاج زَفِيْرٌ بری طرح چلانے کی ابتدائی حالت کو کہتے ہیں جیسے گدھے کی ابتدائی آواز ہوتی ہے اور شَهِيْقٌ اس سے زیادہ بلند آواز کو کہتے ہیں جیسے گدھے کی انتہائی بلند آواز۔

تفسیر آیات

۱۔ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ : قیامت کے روز اللہ کی طرف سے اجازت کے بغیر کوئی بات نہیں کر سکے گا۔ اللہ کی بارگاہ میں کسی کو کسی قسم کی شفاعت و التجا کرنے کی جرات نہ ہوگی۔ اللہ سے ہمکلام ہونا ممکن ہی نہ ہوگا مگر اینکہ اللہ کی طرف سے اجازت ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ○ ... [1]	اس روز روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے اور کوئی بات نہیں کر سکے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور جو درست بات کرے۔
يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ ... [2]	اس دن شفاعت کسی کو فائدہ نہیں دے گی سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے ....

یہ ان لوگوں کی رد میں فرمایا جو غیر مجاز اور غیر ماذون لوگوں کی شفاعت کی امید میں رہتے ہیں۔

۲۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا : بدبخت لوگ جب تک آسمان اور زمین ہیں جہنم میں رہیں گے۔ یہ ان کی جہنمی زندگی کی ابدیت کو ظاہر کرنے کے لیے فرمایا۔

۳۔ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ : یعنی جہنم کی زمین و آسمان۔ ورنہ دنیاوی زمین و آسمان تو نابود ہو چکے ہوں گے۔

۴۔ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ : سوائے ان لوگوں کے جن کے بارے میں آپؐ کے رب کی مشیت یہ ہو کہ وہ آتش میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ احادیث کے مطابق وہ گناہ گار مؤمنین ہیں جو اپنی گناہوں کی کثرت کی وجہ سے جہنم میں داخل ہو جائیں گے مگر بالآخر شفاعت کے ذریعے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیے جائیں گے۔

۵۔ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ : اللہ تعالیٰ جب عدل و انصاف کے مطابق ارادہ فرماتا ہے تو اس کے لیے اس پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ قابل تصور نہیں ہے۔ اس لیے لفظ فَعَّالٌ کے ساتھ تعبیر فرمایا کہ اللہ اپنے

---

[1] ۷۸ نباء: ۳۸ [2] ۲۰ طٰہٰ: ۱۰۹

تمام ارادوں پر خوب عمل کرنے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ جہنم کے بھی زمین و آسمان ہوں گے: مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ ....

۲۔ اہل جہنم گدھوں کی آواز کی طرح چلائیں گے: لَهُمۡ فِيۡهَا زَفِيۡرٌ وَّشَهِيۡقٌ ....

وَ اَمَّا الَّذِيۡنَ سُعِدُوۡا فَفِى الۡجَـنَّةِ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ‌ ؕ عَطَآءً غَيۡرَ مَجۡذُوۡذٍ ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔ اور جو نیک بخت ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین کا وجود ہے مگر جو آپ کا رب چاہے وہاں منقطع نہ ہونے والی بخشش ہو گی۔

تشریح کلمات

مَجۡذُوۡذٍ: (ج ذ ذ) الجذ کے معنی کسی چیز کو توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں۔ فجعلهم جذاذا ان کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَمَّا الَّذِيۡنَ سُعِدُوۡا: جو نیک بخت لوگ جنت میں داخل ہوں گے وہ اللہ کے وعدے کے مطابق ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کوئی نیک بخت جنت نہ جائے اور ساتھ یہ بھی وعدہ ہے کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ لہٰذا یہ بھی ناممکن ہے کہ اللہ کسی کو جنت سے نکال دے۔ اس لیے فرمایا: اللہ کی بخشش غیر مقطوع اور دائمی ہے۔

۲۔ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ: صرف اپنی قدرت کاملہ و تصرف کو بتانے کے لیے ہے کہ یہ امر کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں ہے۔ اللہ ہر وقت ہر عمل پر قادر ہے۔

اہم نکات

۱۔ جنت کی نعمتیں ابدی دائمی ہیں: عَطَآءً غَيۡرَ مَجۡذُوۡذٍ ....

فَلَا تَكُ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّمَّا يَعۡبُدُ هٰٓؤُلَاۤءِ‌ ؕ مَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا كَمَا

۱۰۹۔ (اے نبی) جس کی یہ لوگ پوجا کر رہے ہیں اس سے آپ کو شبہ نہ ہو، یہ لوگ اسی طرح پوجا

يَعۡبُدُ اٰبَآؤُهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوۡهُمۡ نَصِيۡبَهُمۡ غَيۡرَ مَنۡقُوۡصٍ ﴿۱۰۹﴾

کر رہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا پوجا کرتے تھے اور ہم انہیں ان کا حصہ (عذاب) بغیر کسی نقص و کسر کے پورا کرنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَا تَكُ فِیۡ مِرۡیَۃٍ: تاریخ اقوام و ملل اور ان کے انحطاط و ہلاکت کی عبرت انگیز داستانیں بیان فرمانے کے بعد فرمایا: اے رسولؐ یہ لوگ بھی انہی خطوط پر چل رہے ہیں۔ انحطاط و ہلاکت کے عوامل ان میں بھی موجود ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ بھی ہماری سنت جاریہ کے مطابق مکافات عمل کی گرفت میں پوری طرح آ جائیں گے۔

۲۔ مَا یَعۡبُدُوۡنَ: بت پرستوں کا انجام بھی وہی ہو گا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی خاطر بھی مراد ہے۔ ساتھ یہ بات بھی بیان کرنا مقصود ہے کہ جن بتوں کی یہ لوگ پوجا کر رہے ہیں وہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کے بارے میں شک کیا جائے بلکہ ہر صاحب عقل انسان کو پہلی نظر میں ہی انہیں مسترد کر دینا چاہیے۔

۳۔ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوۡهُمۡ نَصِيۡبَهُمۡ: ان بت پرستوں کے لیے جس عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اس میں کسی قسم کی تخفیف نہ ہو گی: خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ ...[1] وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے ان کے عذاب میں تخفیف نہ ہوگی۔

اہم نکات

۱۔ اور غیر اللہ سے لو لگانا سقوط و انحطاط کے عوامل میں سے ہے۔

۲۔ بت پرستی قابل ذکر مذہب نہیں ہے: فَلَا تَكُ فِیۡ مِرۡیَۃٍ ...

وَ لَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ فَاخۡتُلِفَ فِيۡهِ ؕ وَ لَوۡ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ لَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ ؕ وَ اِنَّهُمۡ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِيۡبٍ ﴿۱۱۰﴾

۱۱۰۔ بتحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب دی پھر اس کے بارے میں اختلاف کیا گیا اور اگر آپ کے رب کی طرف سے فیصلہ کن کلمہ نہ کہا گیا ہوتا تو ان کا بھی فیصلہ ہو چکا ہوتا اور وہ اس بارے میں تردد میں ڈالنے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

----

[1] ۲ بقرۃ: ۱۶۲

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ: وہ بت پرستوں کا انجام تھا اور اہل کتاب کی حالت یہ تھی کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تو لوگوں نے اس کتاب میں ایسا ہی اختلاف کیا جیسا کہ آج آپؐ پر نازل ہونے والی کتاب کے بارے میں کر رہے ہیں۔ اس اختلاف سے مراد ایمان میں اختلاف ہے، نہ کہ ایمان کے بعد کا اختلاف۔ اگرچہ بعض اجلّہ نے بعد کا اختلاف لکھا ہے۔

۲۔ وَلَوۡلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ: کتاب جیسی دلیل کے ذریعے ہم نے ان قوموں پر حجت قائم کر کے یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا کہ ایک تو ان کو ڈھیل دی جائے اور ثانیاً ان کے درمیان فیصلہ قیامت کے روز کرنا ہے تو آج اہل کتاب کا انجام بھی بت پرستوں سے مختلف نہ ہوتا۔

یہودیوں کو تو اب بھی اپنی کتاب کی صحت کے بارے میں شک ہے کیونکہ توریت بابل کی اسیری کے بعد صرف حافظے کی بنیاد پر لکھی گئی۔ اصل توریت تو نذر آتش ہو گئی۔

۳۔ وَاِنَّہُمۡ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ: یہ منکرین مِّنۡہُ قرآن کے بارے میں ایک ایسے شک میں مبتلا ہیں جو شبہ آور ہے۔ چونکہ شک میں نفی اور اثبات دونوں برابر ہوتے ہیں جبکہ مُرِیۡبٍ وہ ہے جس میں نفی کو ترجیح دی جائے۔

اہم نکات

۱۔ دینی اختلاف کی صورت میں ڈھیل دی جاتی ہے۔

وَ اِنَّ کُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّہُمۡ رَبُّکَ اَعۡمَالَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱۔ اور بے شک آپ کا رب ان سب کے اعمال کا پورا بدلہ ضرور دے گا، وہ ان کے اعمال سے یقیناً خوب باخبر ہے۔

تفسیر آیات

ان سب کو اپنے اپنے اعمال کا بدلہ دے گا یعنی ان اختلاف کرنے والوں اور بت پرستوں میں سے ہر ایک کو ان کے کرتوتوں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اس آیت میں تاکیدی لہجے میں کافروں کا بدلہ دینے کا ذکر اس لیے ہے کہ مؤمنین ستم سہ سہ کر بد دل نہ ہوں۔ کسی دل میں کہیں یہ خیال نہ آئے کہ ظلم و ستم اور مصیبتیں تو نقداً مل رہی ہیں اور حق کی فتح اور کفار کا بدلہ دینے کی صرف بات ہو رہی ہے۔ عملاً ان کے خلاف کچھ ہو نہیں رہا۔

اہم نکات

۱۔ جزائے اعمال میں کوئی کوتاہی نہیں ہوسکتی: لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ ....

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾

۱۱۲۔ جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے آپ اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ (اللہ کی طرف) پلٹ آئے ہیں ثابت قدم رہیں اور (حد سے) تجاوز بھی نہ کریں اللہ تمہارے اعمال کو یقیناً خوب دیکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ: جس عظیم انقلاب کا حضورؐ نے بیڑا اٹھایا ہے وہ اپنی جگہ ایک نہایت سنگین ذمے داری ہے اور ایسی قوم کے درمیان اس دعوت کو رواج دینا ہے جو ہر اعتبار سے پسماندہ اور تمام انسانی و اخلاقی قدروں سے نا آشنا ہے۔ دوسری طرف اس عظیم انقلاب کے لیے کوئی مادی طاقت و حمایت بھی نہیں ہے۔ خود انقلاب کا داعی یتیمانہ زندگی گزار چکا ہے۔ ایسے حالات میں ایک انقلاب کے لیے سوچنا اور ابتدائی قدم اٹھانا قدرے آسان ہوا کرتا ہے لیکن بعد میں جب جاں فرسا مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو قدم لرزتے ہیں اور ہمت جواب دے جاتی ہے۔ خصوصاً جب لوگوں کے عقائد و مقدسات کو مسترد کرنا ہو تو ایک لامتناہی نفرت و حقارت کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انقلاب اسلامی کے ابتدائی مراحل میں مشکلات و مصائب میں گھرے ہوئے تھے لیکن بعد میں حالات قدرے سازگار ہوگئے اور اسلامی تحریک کو کامیابیاں حاصل ہوگئیں۔ ایسے حالات میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ اب شاید فتح و ظفر کی کوئی خبر آ جائے۔ شاید تاریکی ختم ہونے کو ہے اور روشنی کی کرن نظر آنے والی ہے۔ اتنے میں مزید استقامت اور ثابت قدمی کا حکم زور دار لفظوں میں آتا ہے تو اس حکم کی سنگینی کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: شیّبتنی هود ....[۱] سورہ ہود... نے مجھے بوڑھا کر دیا۔

استقامت اور ثابت قدمی کے مقابلے میں لغزش اور حد سے تجاوز آتا ہے۔ اس لیے حد سے تجاوز نہ کرنے کا حکم دے کر اس کی مزید تاکید کی گئی۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ....[۲]

لہٰذا آپ اس کے لیے دعوت دیں اور جیسے آپ کو حکم ملا ہے ثابت قدم رہیں اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں....

---

۱ وسائل الشیعة ۶: ۱۷۲	۲ ۴۲ شوری: ۱۵

یہاں استقامت کے مقابلے میں خواہشوں کی اتباع کا ذکر آیا ہے جس کا مطلب حد سے تجاوز ہی ہے۔ لہٰذا استقامت کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی انقلاب کے لیے جن حدود کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعین ہوا ہے ان میں رہ کر قدم بڑھایا جائے۔

حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ رسول اللہؐ پر اس آیت سے زیادہ سخت اور دشوار آیت نازل نہیں ہوئی۔ اس لیے جب اصحاب نے آپؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ پر بڑھاپا جلدی آ گیا۔ آپؐ نے فرمایا:

شیّبتنی هود والواقعه ....[1] سورہ ہود اور سورہ واقعہ ... نے مجھے بوڑھا کر دیا۔

اہم نکات

۱۔ رہبر میں استقامت اور عدم طغیان شرط ہے۔

۲۔ دین کی طرف آنا بھی ایک قسم کی توبہ ہے: وَمَنۡ تَابَ مَعَكَ ....

وَلَا تَرۡكَنُوۡۤا اِلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ اَوۡلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

۱۱۳۔ اور جنہوں نے ظلم کیا ہے ان پر تکیہ نہ کرنا ورنہ تمہیں جہنم کی آگ چھو لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی سرپرست نہ ہو گا پھر تمہاری کوئی مدد بھی نہیں کی جائے گی۔

تشریح کلمات

تَرۡكَنُوۡۤا: (ر ك ن) رکن کے معنی ہیں۔ کسی کی طرف مائل ہو جانا۔ جس سہارے پر کوئی قائم ہو اس سہارے کو رکن کہتے ہیں۔ اسی سے ستون کو رکن کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اسلامی سیاست اور معاشرت کی ایک اہم ترین اساس، ظلم و ناانصافی کی نفی ہے۔ اسلام اپنے معاشرے کو ظلم و تجاوز سے پاک رکھنے کے لیے جامع قوانین وضع فرماتا ہے۔ من جملہ ظالموں کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات جن میں ظالم کی بالا دستی ہو ممنوع قرار دیے کیونکہ ظالم پر تکیہ کرنا:

i۔ اپنی کمزوری کا عملی اعتراف ہے۔

ii۔ ظالم کے ظلم کی تائید ہے۔

---

[1] وسائل الشیعة ۶: ۱۷۲

iii۔ ظالم کی بالادستی کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے نفرت نہیں ہے اور یہ خود ظلم کی طرف پہلا قدم ہے۔

iv۔ استحصال کے لیے ظالم کی راہ ہموار کرنے کے مترادف ہے۔

v۔ ظلم کو قبول کرنا ہے۔

vi۔ جن مقاصد کے لیے ظالم پر تکیہ کیا ہے وہ حاصل نہیں ہوتے۔ یہ اسلام کا خارجی سیاسی موقف ہے کہ ظالم طاقتوں کے ساتھ معاملہ ہوسکتا ہے لیکن ان پر تکیہ کرنا جائز نہیں ہے۔

vii۔ اس کو مداخلت کا حق دینے کے مترادف ہے۔

viii۔ ظالم کی مداخلت اسلامی ریاست کی خودمختاری اور استقلال کے منافی ہے۔

ظلم کرنے والوں پر تکیہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے احیاء کے لیے ظالموں کا سہارا لیا جائے۔ احیائے حق کے لیے حق کو پامال کیا جائے۔

تفسیر قمی میں آیا ہے لَا تَرۡکَنُوۡۤا کا مطلب ہے:

رکون مودة و نصيحة و طاعة...[1] محبت، نصیحت اور فرمانبرداری میں تکیہ کرنا۔

اہم نکات

۱۔ ظالم پر تکیہ کرنے والا بے سہارا رہتا ہے: ثُمَّ لَا تُنۡصَرُوۡنَ....

۲۔ اللہ کے علاوہ کوئی سہارا دینے والا نہیں ہے: وَمَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ اَوۡلِیَآءَ ....

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِکَ ذِکۡرٰی لِلذّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾ وَ اصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۱۵﴾

۱۱۴۔ اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں اور رات کے کچھ حصوں میں، نیکیاں بیشک برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، نصیحت ماننے والوں کے لیے یہ ایک نصیحت ہے۔

۱۱۵۔ اور صبر کرو یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

تشریح کلمات

زُلَفًا: (ز ل ف) الزلفة کے معنی قرب کے ہیں اور رات کے حصوں کو بھی زلف کہا گیا ہے۔ الزلفی قرب و مرتبہ۔

---

[1] تفسیر القمی ا: ۳۳۷

تفسیر آیات

۱۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ: اس آیت میں (دن کے دوسروں) سے مراد بعض احادیث کے مطابق صبح اور مغرب کی نمازیں ہیں اور ”رات کے کچھ حصوں“ سے مراد عشاء کی نماز ہے۔ اس آیت میں نماز ظہرین کا ذکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ ممکن ہے ابتدائے تشریع نماز میں نمازوں کے اوقات یہی ہوں اور معراج کے بعد پانچ نمازیں فرض کی گئیں جیسا کہ بعض مفسرین کہتے ہیں اور ضروری بھی نہیں کہ تمام نمازوں کا ہر جگہ ذکر ہو۔

۲۔ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ: نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ نیکیاں بجا لانے سے گناہ دھل جاتے ہیں۔ اس طرح نیکی کے دو اثرات ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ نیکی کا ثواب ملتا ہے اور دوسرا یہ کہ گناہ دھل جاتے ہیں۔

واضح رہے انسان اگر راہ راست پر ہو اور گناہ سرزد ہو تو اس سے آزاد ہونے کے درج ذیل ذرائع ہیں:

i۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔ وہ گناہوں کو خود معاف فرماتا ہے۔

ii۔ توبہ کے ذریعے بھی انسان گناہ سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔

iii۔ نیکیوں کے بجا لانے سے گناہ دھل جاتے ہیں اور یہ سب نہ ہو اور گناہوں کے بوجھ کے ساتھ وارد قیامت ہو جائے اور راہ راست پر ہو تو

iv۔ شفاعت معصومینؑ کے ذریعے گناہوں سے نجات مل سکتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے ایک دن لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

اللہ کی کتاب میں سب سے زیادہ امید افزا آیت کون سی ہے؟

کسی نے کہا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ۔۔۔۔ [۱]	اللہ صرف شرک سے درگزر نہیں کرتا اس کے علاوہ جس کو چاہے معاف کر دیتا ہے ۔۔۔۔

فرمایا: اچھی بات ہے لیکن وہ آیت یہ نہیں ہے۔

کسی اور نے کہا:

قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ ۔۔۔۔ [۲]	کہدیجیے: اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔۔۔۔

فرمایا: اچھی بات ہے لیکن یہ آیت وہ نہیں ہے۔

کسی اور نے کہا:

---

[۱] ۴ نساء: ۱۱۶ [۲] ۳۹ زمر: ۵۳

وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِہِمۡ ۔[1]

اور جن سے کبھی نازیبا حرکت سرزد ہو جائے یا وہ اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھیں تو اسی وقت خدا کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں...

فرمایا: اچھی بات ہے لیکن یہ وہ آیت نہیں ہے۔

پھر جب لوگ خاموش ہو گئے تو آپؑ نے فرمایا: مسلمانو کیا بات ہے؟

لوگوں نے کہا: ہمارے پاس اور کوئی آیت نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ کتاب خدا میں سب سے زیادہ امید افزا آیت یہ ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِکَ ذِکۡرٰی لِلذّٰکِرِیۡنَ ۞[2]

اس آیت کے ذیل حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

صلوۃ المؤمن باللیل تذھب ما عمل من ذنب النھار۔[3]

مؤمن کی رات کی نماز دن کے گناہوں کو دور کر دیتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ نماز یادِ خدا کا ذریعہ اور یادِ خدا گناہوں کے دھلنے کا ذریعہ ہے۔

فَلَوۡلَا کَانَ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ اُولُوۡا بَقِیَّۃٍ یَّنۡہَوۡنَ عَنِ الۡفَسَادِ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّمَّنۡ اَنۡجَیۡنَا مِنۡہُمۡ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مَاۤ اُتۡرِفُوۡا فِیۡہِ وَکَانُوۡا مُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۱۶﴾

وَمَا کَانَ رَبُّکَ لِیُہۡلِکَ الۡقُرٰی بِظُلۡمٍ وَّاَہۡلُہَا مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾

۱۱۶۔ تم سے پہلے قوموں میں عقل و خرد والے کیوں نہیں رہے جو زمین میں فساد پھیلانے سے منع کرتے سوائے ان چند افراد کے جنہیں ہم نے ان میں سے بچا لیا تھا؟ اور ظالم لوگ ان چیزوں کے پیچھے لگے رہے جن میں عیش و نوش تھا اور وہ جرائم پیشہ لوگ تھے۔

۱۱۷۔ اور آپ کا رب ان بستیوں کو ناحق تباہ نہیں کرتا اگر ان کے رہنے والے اصلاح پسند ہوں۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۳۵ [2] تفسیر عیاشی ذیل آیت [3] الکافی ۳: ۲۱۱

تفسیر آیات

۱۔ فَلَوۡلَا كَانَ مِنَ الۡقُرُوۡنِ: مقام تعجب ہے کہ ان قوموں میں ان تمام ہلاکتوں کے باوجود کوئی ایسی جماعت وجود میں نہ آئی جو معاشرے کو پاک رکھے اور زمین میں فساد کا راستہ روکے۔

۲۔ اُولُوۡا بَقِيَّةٍ: صاحبان فہم و فضیلت۔ چنانچہ انسان بہتر، پسندیدہ اور عمدہ چیز کو محفوظ رکھتا ہے۔ اسی سے ہر عمدہ کو بقیة کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: فلان من بقية القوم۔ یعنی فلاں قوم کا بافضل شخص ہے۔ نیز عربی محاورہ ہے: فی الزوایا خبایا و فی الرجال بقایا۔ (الکشاف) گوشہ و کنار میں کام کی چیزیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور لوگوں میں کچھ بافضل ہوتے ہیں۔

انسانی تاریخ میں جتنی قومیں تباہ ہوئی ہیں ان کی ہلاکت کا بنیادی سبب یہ رہا ہے کہ وہ اس حد تک بگڑ گئی تھیں کہ ان میں سے ایک ایسی جماعت وجود میں نہ آسکی جو خیر و اصلاح کی طرف دعوت دے۔

۳۔ وَاتَّبَعَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مَاۤ اُتۡرِفُوۡا: بلکہ سب اس زندگی کی رعنائیوں میں مگن اور ہوس پرستیوں میں بدمست رہے ورنہ اگر ان کے اندر ایک ایسی جماعت موجود ہوتی جو لوگوں کو حق کی طرف دعوت دے اور لوگ اس جماعت کے وجود کو برداشت کرتے تو ان پر عذاب نہ آتا۔ لہٰذا اگر کسی قوم میں اتنا شعور موجود ہو کہ اس میں سے اصلاح کی داعی ایک جماعت ابھر سکتی ہے اور قوم اس کے وجود کو برداشت کرتی ہے تو اس قوم کو اللہ تباہ نہیں کرتا۔ چنانچہ امت قرآن کو حکم ہوا:

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾ [1]	اور تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی دعوت اور بھلائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکے اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

بلکہ امت اسلامیہ کے بہترین ہونے کی بنیاد یہی عمل ہے۔ ارشاد ہے:

كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ....[2]	تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کیے گئے ہو تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو....

اہم نکات

۱۔ وہ جماعت جو خیر کی طرف دعوت دے اہل ارض کے لیے امان ہے۔

۲۔ پر تعیش زندگی کا ربط ظلم کے ساتھ ہے: مَاۤ اُتۡرِفُوۡا فِيۡهِ ....

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۰۴ [2] ۳ آل عمران: ۱۱۰

وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوۡنَ مُخۡتَلِفِيۡنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمۡ ؕ وَتَمَّتۡ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۱۹﴾

۱۱۸۔ اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔

۱۱۹۔ سوائے ان کے جن پر آپ کے پروردگار نے رحم فرمایا ہے اور اسی کے لیے تو اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے اور تیرے رب کا وہ فیصلہ پورا ہو گیا (جس میں فرمایا تھا) کہ میں جہنم کو ضرور بالضرور جنات اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ: انسانوں میں ایک اختلاف از روئے طبائع، مزاج، سلیقہ، استعداد، لیاقت، ہوشمندی رونما ہوتا ہے۔ یہ اختلاف قابل مذمت نہیں ہے بلکہ اس کی نسبت اللہ نے خود اپنی طرف دی ہے:

وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا ....[1]

اور ہم ہی نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر درجات میں فوقیت دی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لے....

۲۔ وَّلَا يَزَالُوۡنَ مُخۡتَلِفِيۡنَ: دوسرا اختلاف فی الدین ہے۔ یہ اختلاف انسان کی خودمختاری کا ایک لازمی نتیجہ بھی ہے اور قابل مذمت بھی۔ اگر اللہ انسان کو خودمختار نہ بناتا اور لگے بندھے راستے کا پابند بنا دیتا تو اس صورت میں تمام انسان امۃ واحدہ ہوتے۔ اللہ اگر چاہتا تو تمام انسان کو جبراً ایک امت بنا دیتا ایسا کرنا اللہ کے لیے ممکن تھا لیکن ایسا کرنے کی صورت میں دعوت و شریعت، بعثت انبیاء بے معنی ہو جاتی۔ لہٰذا انسان کو راستہ دکھایا مگر اس پر چلنے کے لیے جبر استعمال نہیں کیا بلکہ صحیح اور غلط کے انتخاب میں آزادی دی تو نتیجۃً یہ لوگ ہمیشہ دین کے بارے میں اختلاف کرتے رہیں گے۔

۳۔ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّكَ: البتہ ایک فرقہ اس اختلاف سے محفوظ رہے گا اور اس جماعت پر اللہ کی رحمت شامل حال رہے گی۔ یہ لوگ ہمیشہ حق پر رہیں گے اور حق میں اختلاف نہیں کریں گے۔ اس فرقے کو اختلاف ہوگا مگر باطل کے ساتھ اختلاف ہوگا۔

۴۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمۡ: اللہ نے انسانوں کو رحم کے لیے خلق فرمایا ہے اور اسی لیے ان کے لیے پہلے ہدایت کا انتظام فرمایا اور ہر چیز ان کے لیے مسخر فرمائی۔ اللہ کا نظام تکوینی و تشریعی خود بتاتا ہے کہ اللہ نے انسانوں کو رحم کے لیے پیدا کیا ہے لیکن یہ ناشکرا انسان ہے جو اپنے آپ کو اس رحمت کے قابل نہیں بناتا

---

[1] ۴۳ زخرف: ۳۲

اور جہنم کا ایندھن بناتا ہے۔

۵۔ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ: اس طرح اللہ کا وہ فیصلہ بھی پورا ہو جاتا ہے جس کے تحت جہنم جنوں اور انسانوں سے پُر ہو جائے گی۔

روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

خَلَقَهُمْ لِيَفْعَلُوا مَا يَسْتَوجِبُونَ بِهِ رَحْمَتَهُ فَيَرْحَمَهُمْ۔[1] — اللہ نے انہیں اس لیے خلق فرمایا کہ وہ اعمال بجا لائیں جو موجب رحمت خدا ہیں پھر اللہ ان پر رحمت کرے۔

حضرت محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

اهل رحمة لا يختلفون فی الدين[2] — رحمت کے اہل لوگ دین میں اختلاف نہیں کرتے۔

اہم نکات

۱۔ دین میں اتحاد و اتفاق موجب رحمت الٰہی ہے: اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّكَ ....

۲۔ انسان اپنے ارادوں میں خود مختار ہے: وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ ....

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِىۡ هٰذِهِ الۡحَقُّ وَ مَوۡعِظَةٌ وَّذِكۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۲۰﴾

۱۲۰۔ اور (اے رسول) ہم پیغمبروں کے وہ تمام حالات آپ کو بتاتے ہیں جن سے ہم آپ کو ثبات قلب دیتے ہیں اور ان کے ذریعے حق بات آپ تک پہنچ جاتی ہے نیز مومنین کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہو جاتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اس سورہ میں تاریخ انبیاء علیہم السلام بیان فرمانے کے بعد آخر میں اس تاریخ کے بیان کے فوائد و اغراض بیان فرمائے:

i۔ اس سے قلب رسول کو ثبات اور حوصلہ ملتا ہے کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام نے بھی ایسے ہی نامساعد اور مشکل حالات میں اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ آخر میں نتیجہ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں رہا اور ان کے مخالفین نابود ہو گئے۔ انبیاء کی تاریخ بیان کرنے سے قلب رسولؐ میں مضبوطی آنا ایک طبعی امر ہے، چونکہ ان تاریخوں میں آیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ان تمام مشکلات کے ساتھ دوچار رہے جن سے آج رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوچار ہیں۔ تکذیب و تحقیر، ایذاء، نامعقول

[1] الوسائل ۱: ۸۴ [2] تفسیر القمی ۱: ۳۳۸

نامعقول مطالبے اور استہزاء و طعنے وغیرہ کا مقابلہ تمام انبیاء علیہم السلام کو کرنا پڑا لیکن انجام میں انبیاء و مؤمنین سربلند ہوئے اور ان کے معاندین ذلیل وخوار اور نابود ہو گئے۔

ii۔ ان تاریخی واقعات میں وہ حقائق بھی کھل کر سامنے لائے گئے جو اسلامی تعلیمات کے لیے بھی اہم ہیں۔ مثلاً توحید، قیامت، قوموں کی سرگزشت میں اللہ کی سنت وغیرہ۔

iii۔ ان واقعات میں مؤمنین کے لیے بھی نہایت عبرت آموز دروس ہیں کہ تکذیب اور تکبر کرنے والوں کا انجام کیا رہا اور ایمان پر ثابت قدم رہنے والوں کا انجام کیا تھا۔

۲۔ وَجَآءَكَ فِيۡ هٰذِهِ الۡحَقُّ: آیت کے اس جملے میں هٰذِهِ کا اشارہ انباء یعنی انبیاء علیہم السلام کے حالات کی طرف ہے جو حق پر مبنی حالات ہیں جن میں نصیحت اور تذکر ہیں۔

اہم نکات

۱۔ تاریخ انبیاء علیہم السلام میں انسان ساز دروس ہیں۔

۲۔ مادی طاقت سے نفسیاتی طاقت (ثبات قلب) کی اہمیت زیادہ ہے: مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ....

وَقُلۡ لِّلَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ ؕ اِنَّا عٰمِلُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانۡتَظِرُوۡا ۚ اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾

۱۲۱۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان سے کہد یجیے: تم اپنی جگہ عمل کرتے جاؤ ہم بھی عمل کرتے جائیں گے۔

۱۲۲۔ اور تم انتظار کرو ہم بھی انتظار کریں گے۔

تفسیر آیات

مطالعہ تاریخ کے بعد جب آپؐ کا دل مطمئن ہو جائے کہ آخر میں فتح آپؐ کی ہے اور آپ کے معاندین کے نصیب میں رسوائی اور نابودی ہے تو بے خوف ہو کر دوٹوک لفظوں میں اعلان کریں: کافرو! اپنی پوری طاقت صرف کر کے جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔ ظلم وستم توڑتے جاؤ۔ تحقیر و تکذیب اور استہزاء کرتے جاؤ۔ طعنے دیتے جاؤ۔ ہم پوری استقامت کے ساتھ انقلاب کا عمل جاری رکھیں گے۔ آؤ ہم دونوں اس تاریخ ساز مقابلے کے انجام کا انتظار کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ عمل اور انتظار اسلامی انقلاب کے دو اہم اصول ہیں۔

وَلِلّٰهِ غَيۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَ

۱۲۳۔ اور آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کا علم

اِلَیۡهِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّهٗ فَاعۡبُدۡهُ وَ تَوَکَّلۡ عَلَیۡهِ ؕ وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾	صرف اللہ کو ہے اور سارے امور کا رجوع اسی کی طرف ہے لہٰذا اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا کرو اور تمہارا رب تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لِلّٰهِ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: کفار و معاندین سے جب کہا گیا کہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ جو کچھ کر سکتے ہو کرو پھر انجام کا انتظار کرو اور اہل اسلام کو بھی انتظار کے لیے کہا، اس کے بعد اس عمل اور انتظار کے انجام کے بارے میں فرمایا: انجام ان لوگوں کے حق میں ہوگا جن کا تعلق اس ذات کے ساتھ ہے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کا علم رکھتی ہے جب کہ ان کے معبود تو اپنی ذات کا بھی تحفظ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جن معبودوں پر ان کا بھروسہ ہے وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

۲۔ وَ اِلَیۡهِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّهٗ: اور تمام معاملات کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہے۔ اپنے اعمال و امور کا رجوع جس ذات کی طرف ہے کامیابی اسی سے ملتی ہے، ان بے شعور بتوں سے نہیں۔

۳۔ فَاعۡبُدۡهُ وَ تَوَکَّلۡ عَلَیۡهِ: پس اے رسولؐ! آپ کو بھی اسی ذات کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

۴۔ وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ: اور کسی کے عمل سے وہ غافل بھی نہیں ہے۔ لہٰذا کامیابی وہی ذات دے سکتی ہے جو انسان کے اعمال کی قریب سے نگرانی کر رہی ہے۔

سورہ کا آغاز توحید اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ سے اور اختتام بھی توحید فَاعۡبُدۡهُ پر ہوا جو اسلامی تعلیمات کی بنیاد ہے۔

اہم نکات

۱۔ عبادت اور توکل میں باہمی ربط ہے: فَاعۡبُدۡهُ وَ تَوَکَّلۡ عَلَیۡهِ ....

۲۔ انجام بخیر اس ذات کے ہاتھ میں ہے جس کی طرف تمام معاملات کی بازگشت ہے۔

سُورَةُ يُوسُف

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ سورۃ مبارکہ مکہ میں نازل ہوئی اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورۃ دفعۃً نازل ہوئی ہے۔

سبب نزول

روایت کے مطابق اس سورہ مبارکہ کا سبب نزول یہ تھا کہ مشرکین نے یہودیوں کے اشارے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے یہ سوال کیا کہ بنی اسرائیل کے مصر جانے کی وجہ کیا تھی؟ یہودیوں کو اس بات کا علم تھا کہ اہل عرب اس تاریخ سے بالکل بے خبر ہیں اس لیے محمد ﷺ کے لیے اس کا درست جواب دینا ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ اس سورۃ میں بنی اسرائیل کے مصر کی طرف منتقل ہونے کے سارے واقعے کو اہم جزئیات کے ساتھ بیان کر کے یہ ثابت کر دیا کہ قرآن محمد ﷺ کا خود ساختہ نہیں، وحی ہے۔ چنانچہ اسی سورۃ کی آیت نمبر ۷ میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا:

لَقَدۡ کَانَ فِیۡ یُوۡسُفَ وَ اِخۡوَتِہٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیۡنَ ○	بتحقیق یوسف اور اس کے بھائیوں (کے قصے) میں پوچھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ پوچھنے والوں کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ دوسرا نکتہ یہ بھی واضح ہوا کہ سورۃ یوسف میں رسول اسلام ﷺ کے برحق ہونے پر چند ایک معجزات موجود ہیں: اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیۡنَ۔

حضرت یوسف، حضرت یعقوب علیہما السلام کے بیٹے اور حضرت اسحاق -کے پوتے ہیں۔ حضرت یعقوب - کے بارہ بیٹے تھے۔ حضرت یوسف - اور بن یامین ایک ماں کے بطن سے تھے۔ باقی دوسری

بیویوں کے بطن سے۔

جس زمانے میں حضرت یوسف ؑ مصر پہنچے تھے، مصر پر عربی النسل بادشاہوں کی حکومت تھی اور مقامی نہ ہونے کی وجہ سے بنی اسرائیل کو ان بادشاہوں نے پذیرائی دی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
بنام خدائے رحمن رحیم

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ①
۱۔ الف لام را، یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ②
۲۔ ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو۔

تشریح کلمات

قران: اصل میں اس کے معنی ہیں "پڑھنا"۔ قرآن اپنی فصاحت و بلاغت، معانی و مطالب اور اسلوب کلام کی بلندی کی وجہ سے بہ کثرت پڑھا جائے گا۔ اس لیے اسے قرآن کہا ہے۔ چنانچہ آج یہ کتاب دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ: قرآن کو کتاب مبین اس لیے کہتے ہیں کہ یہ کتاب ماورائے محسوسات ملکوتی مطالب کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ محسوس پرست انسان کے فہم میں بھی آ جائے۔ عربی زبان میں اسے نازل کر کے سب سے پہلے ان مطالب و تعلیمات کو ایک ناخواندہ بدو غیر مہذب قوم کو سمجھایا اور ایسے مقام میں یہ کتاب پیش کی جہاں کبھی بھی علمی سرگرمی نہیں رہی اور وہاں سے اس کتاب نے پوری دنیا کو تہذیب و تعلیم کی راہ دکھائی۔

۲۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: عقل کو دعوت دینا قرآن کی حقانیت کی دلیل ہے ورنہ جن کی دعوت حق پر مبنی نہیں ہے وہ عقل اور عقل والوں سے اجتناب کرتے ہیں کہ کہیں ان کا راز فاش نہ ہو جائے۔

اہم نکات

۱۔ قرآنی مطالب واضح اور قابل فہم ہیں: الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ....

۲۔ قرآن اندھی تقلید کی نہیں، تعقل کی دعوت دیتا ہے: لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ۔

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ ‌ۖ وَاِنۡ كُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِيۡنَ ۳

۳۔ ہم اس قرآن کو آپ کی طرف وحی کر کے آپ سے بہترین قصہ بیان کرنا چاہتے ہیں اور آپ اس سے پہلے (ان واقعات سے) بے خبر تھے۔

تفسیر آیات

اس قصہ کو قرآن نے احسن القصص کے ساتھ اس لیے تعبیر کیا ہے کہ اس میں متعدد کرداروں اور ان کرداروں میں سے ہر ایک کے انجام کا ذکر ہے۔ پدری شفقت، آتش حسد، اسارت و غلامی کی زندگی، پر تعیش زندگی، عورت کی مکاری و عیاری، پاکدامنی و عفت کے لیے لازوال قربانی، زندانی زندگی، صرف اللہ سے امیدیں وابستہ رکھنے کی مثال، اقتدار و سلطنت پر آنے کے بعد قدرت و تمکنت کے باوجود عفو و درگزر، حکمرانی کے آداب، عدل و انصاف کا قیام، قحط زدہ سالوں میں مشکل ترین اقتصادی امور کا حل، امور سیاست و سلطنت میں اقتصاد کی اہمیت وغیرہ کا ذکر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس قصے میں قرآن کی حقانیت پوشیدہ ہے۔

۲۔ اس قصے میں حسن اسلوب کا معجزہ ہے۔

اِذۡ قَالَ يُوۡسُفُ لِاَبِيۡهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡ رَاَيۡتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوۡكَبًا وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ رَاَيۡتُهُمۡ لِىۡ سٰجِدِيۡنَ ۴

۴۔ جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا: اے بابا! میں نے (خواب میں) گیارہ ستاروں کو دیکھا ہے اور سورج اور چاند کو میں نے دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ قَالَ يُوۡسُفُ لِاَبِيۡهِ: یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراھیم علیہم السلام بقول بعضے غالباً ۱۹۱۰ قبل مسیح فلسطین کی وادی حبرون جسے آج کل الخلیل کہتے ہیں میں پیدا ہوئے۔

آپؑ کے زمانے کے شاہان وقت عربی النسل تھے اور فلسطینی شامی مصر جا کر حکمرانی کرتے تھے۔ عرب مورخین انہیں عمالیق کا نام دیتے ہیں۔ بعض مورخین کی تحقیقات کے مطابق آپؑ بادشاہ رع کانن، جسے عرب ریّان بن ولید کا نام دیتے ہیں، کے زمانے میں مصر آ گئے۔ جن لوگوں نے آپؑ کو کنویں سے نکالا انہوں نے آپؑ کو مصری پولیس کے سربراہ فورطیفا کے ہاتھ فروخت کیا۔[1]

یہی وجہ ہے کہ قرآن حضرت یوسف علیہ السلام کے معاصر بادشاہ کو فرعون کا نام نہیں دیتا کیونکہ فرعون مصریوں کی مذہبی اصطلاح تھی۔ عربی النسل بادشاہان، مصری مذہب کے قائل نہ تھے۔

یہی سبب ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر میں پذیرائی ملی اور عروج حاصل ہوا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو تقریباً ۱۷ سال کی عمر میں مصر لایا گیا اور کچھ عرصہ عزیز مصر کے گھر رہے اور نو سال کے قریب زندان میں رہے۔ یہ زندان ہرم (ببی) کے نزدیک تھا۔ آج بھی یہ جگہ زندان یوسف کے نام سے معروف ہے۔

۲۔ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا: گیارہ ستاروں سے مراد گیارہ بھائی ہیں، سورج اور چاند سے مراد والدین اور سجدہ سے مراد سجدۂ تعظیمی ہے یا بقول بعضے اسرائیلیوں میں سجدہ انقیاد و اطاعت کی علامت تھا۔

قرآنی تصریح کے مطابق خواب سے پیش بینی ہوتی ہے اور آنے والے واقعات جو بہ چشم طبیعت نہیں دیکھ پاتے، ماورائے طبیعی آنکھوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ بات روح کے تجرد اور استقلال پر ایک دلیل سمجھی جاتی ہے چونکہ روح غیر مادی ہونے کی وجہ سے زمان و مکان کی حد بندی میں مقید نہیں ہوتی۔ اس کے لیے حال و مستقبل، قریب و بعید میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ خود راقم اپنی زندگی میں پیش آنے والی اہم باتوں سے خواب کے ذریعے پہلے آگاہ ہو جایا کرتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

الرؤیا ثلاثۃ بشری من اللّٰہ و تحزین من الشیطان و الذی یحدث بہ الانسان نفسہ فیراہ فی منامہ۔۔۔[2]

خواب کی تین قسمیں ہیں: کبھی اللہ کی طرف سے بشارت ہوتی ہے۔ کبھی شیطان کی طرف سے غمزدہ کرنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے بارے میں انسان اپنے ذہن میں زیادہ سوچتا ہے تو وہی خواب میں نظر آتی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ سچا خواب بشارت رحمانی ہوتا ہے۔

---

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی۔ بعض مورخین کے مطابق شاہی خزانے کے وزیر کے ہاتھ فروخت کیا۔ [2] بحار الانوار ۵۸: ۱۹۱

قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡیَاکَ عَلٰۤی اِخۡوَتِکَ فَیَکِیۡدُوۡا لَکَ کَیۡدًا ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۵﴾

۵۔کہا: بیٹا! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا ورنہ وہ آپ کے خلاف کوئی چال سوچیں گے کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

تفسیر آیات

برادران یوسف میں سے کوئی نبی نہ تھا لیکن سب نبی زادے تھے۔ اتنی فہم و فراست رکھتے تھے کہ خواب یوسف کی تعبیر کا ادراک کر لیں اور سمجھ جائیں کہ ہم میں سے صرف یوسف علیہ السلام ایک ممتاز الٰہی منصب پر فائز ہونے والے ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام جانتے تھے کہ دوسرے سوتیلے بھائی یوسف علیہ السلام سے حسد رکھتے ہیں اور شیطان اس حسد سے خوب فائدہ اٹھائے گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام عہد طفولیت میں بھی اپنی ذاتی صلاحیتوں اور اخلاق و کردار کی بلندیوں کی وجہ سے دوسرے بھائیوں سے ممتاز اور والد بزرگوار کی توجہ کا مرکز تھے۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء علیہم السلام کا خواب، نبوت کا پہلا زینہ ہوتا ہے۔

۲۔ حسد ایسی بیماری ہے کہ نبی زادے بھی اس میں مبتلا تھے۔

۳۔ انسان کا بڑا دشمن شیطان ہے۔

وَ کَذٰلِکَ یَجۡتَبِیۡکَ رَبُّکَ وَ یُعَلِّمُکَ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ وَ یُتِمُّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکَ وَ عَلٰۤی اٰلِ یَعۡقُوۡبَ کَمَاۤ اَتَمَّہَا عَلٰۤی اَبَوَیۡکَ مِنۡ قَبۡلُ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّکَ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۶﴾

۶۔اور آپ کا رب اسی طرح آپ کو برگزیدہ کرے گا اور آپ کو خوابوں کی تعبیر سکھائے گا اور آپ پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے آپ کے اجداد ابراہیم و اسحاق پر کر چکا ہے، بے شک آپ کا رب بڑا علم والا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

یَجۡتَبِیۡکَ: (ج ب ی) جبی کے اصل معنی جمع کرنے کے ہیں۔ باب افتعال سے الاجتباء کے معنی انتخاب کے طور پر کسی چیز کو جمع کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ: حضرت یعقوب علیہ السلام خواب کی تعبیر بیان فرماتے ہیں کہ حقیقت بھی اسی طرح ہے جس طرح آپؑ نے خواب میں دیکھا ہے کہ اللہ نے آپؑ ایک منصب کے لیے برگزیدہ کیا ہے

۲۔ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ: اور علم تاویل سے نوزا ہے جس کے ذریعے ہر معاملہ کے انجام کو سمجھ سکو گے۔ جس میں تعبیر خواب سر فہرست ہے۔ یہ نظریہ درست نہیں ہے کہ تاویل الاحادیث سے مراد صرف خواب کی تعبیر ہے بلکہ ہر معاملہ کے انجام کا علم آپؑ کو دیا گیا تھا۔ تاویل کی وضاحت ہم نے مقدمہ تفسیر میں کی ہے۔

۳۔ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ: حضرت یعقوب نے یوسف علیہا السلام کو اسی خواب کی تعبیر میں بتایا کہ اللہ آپؑ پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت پوری کرے گا جس طرح حضرت ابراہیم و حضرت اسحاق علیہا السلام پر پوری کی ہے۔ یعنی نبوت اور ولایت عطا ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ آل یعقوب میں حضرت یوسفؑ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی: عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ ....

۲۔ یوسف کو ماورائے طبیعیات کا علم دیا گیا تھا: يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ....

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ⑦

۷۔ بتحقیق یوسف اور اس کے بھائیوں (کے قصے) میں پوچھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اس جملے سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ یوسف علیہ السلام اور برادران یوسف کے بارے میں حضورؐ سے سوال ہوا تھا۔ اس سورہ میں اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

۲۔ اس قصے میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی حقانیت پر چند ایک آیات موجود ہیں کیونکہ اہل عرب اس قصے سے بالکل ناواقف تھے۔ اس زمانے میں اور کوئی ذریعہ بھی نہ تھا کہ اس تاریخی واقعہ کو اخذ کیا جائے۔ ساتھ اس واقعہ میں اللہ کی قدرت و حاکمیت پر بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ برادران یوسف کے حسد کی زد میں آنے والے کمسن یوسف علیہ السلام کی کامیابیوں میں اور برادران یوسف کی ناکامیوں میں ارادہ الٰہی کی حاکمیت پر بڑی نشانیاں ہیں۔ ایک کمسن بچے کا کنویں میں پھینکا جانا، غلام بن کر مصر پہنچ

جانا، ایک عورت کی مکاری سے دو چار ہونا، پھر زندان اور زندان سے تخت اقتدار پر آنا، یہ سب تدبیر الٰہی کی نشانیاں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے نیک بندوں کی سرنوشت میں بھی آیات الٰہی پوشیدہ ہوتی ہیں۔

اِذۡ قَالُوۡا لَیُوۡسُفُ وَ اَخُوۡہُ اَحَبُّ اِلٰۤی اَبِیۡنَا مِنَّا وَ نَحۡنُ عُصۡبَۃٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنِۣ ۚ﴿۸﴾

۸۔ جب بھائیوں نے (آپس میں) کہا: یوسف اوراس کا بھائی ہمارے ابا کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم ایک جماعت ہیں، بے شک ہمارے ابا تو صریح غلطی پر ہیں۔

تشریح کلمات

العصبۃ: (ع ص ب) وہ جماعت جس کے افراد ایک دوسرے کے حامی اور مددگار ہوں۔ یہ وہ جمع ہے جس کا مفرد نہیں ہوتا۔ جیسے قوم، قبیلہ کا مفرد نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ قَالُوۡا لَیُوۡسُفُ وَ اَخُوۡہُ اَحَبُّ: یوسف علیہ السلام کے بھائی سے مراد بنیامین ہیں۔ یہ دونوں ایک ماں کے بطن سے تھے اور سب بھائیوں میں یہ چھوٹے تھے۔ روایات کے مطابق ان کی والدہ راحیل فوت ہو چکی تھیں لہٰذا حضرت یعقوب علیہ السلام ان دونوں بچوں پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو علم تھا کہ یوسف علیہ السلام ہی نے سلسلہ نبوت کا وارث بننا ہے۔

۲۔ وَ نَحۡنُ عُصۡبَۃٌ: قبائلی زندگی میں تحفظ کا مدار خاندان کی افرادی قوت پر ہوتا تھا۔ اس لیے برادران یوسف کا موقف یہ تھا کہ خاندان کو تحفظ دینے والی قوت ہم ہیں لیکن ہمارے والد صاحب دو کمزور اور ناتواں بچوں کو ہم سے زیادہ چاہتے ہیں۔ یہ صریح غلطی ہے۔

اہم نکات

۱۔ محبت کی کمی کا احساس ارتکاب جرم کا موجب بنتا ہے: لَیُوۡسُفُ وَ اَخُوۡہُ اَحَبُّ...۔

۲۔ حسد، ظلم کا موجب بنتا ہے۔

۳۔ اگر اولاد میں ایک دو میں امتیازات زیادہ ہوں تو ان کے درمیان محبت میں مساوات ممکن نہیں ہے۔

اقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ اَوِ اطۡرَحُوۡہُ اَرۡضًا یَّخۡلُ لَکُمۡ وَجۡہُ اَبِیۡکُمۡ وَ تَکُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ قَوۡمًا صٰلِحِیۡنَ﴿۹﴾

۹۔ یوسف کو مار ڈالو یا اسے کسی سرزمین میں پھینک دو تاکہ تمہارے ابا کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے اوراس کے بعد تم لوگ نیک بن جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ اقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ اَوِ اطۡرَحُوۡہُ اَرۡضًا: یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظروں سے غائب کرنے کے بارے میں دو تجویزیں سامنے آ گئیں: i۔ اسے قتل کر دیا جائے۔ ii۔ اسے ایسی جگہ پہنچا دیا جائے کہ وہاں سے واپس نہ آ سکے۔

۲۔ وَ تَکُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ قَوۡمًا صٰلِحِیۡنَ: اس جرم کے بعد ہم صالح بن جائیں گے۔ برادران یوسف اپنے اس عمل کے گناہ ہونے پر یقین رکھتے تھے لیکن اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر دھوکہ دینا چاہ رہے تھے کہ بعد میں توبہ کر لیں گے۔ جیسا کہ خواہش پرست ارتکاب گناہ کرتے ہوئے اپنے ضمیر کی آواز یہ کہہ کر دبا دیتے ہیں کہ بعد میں توبہ کر کے اس گناہ کے داغ کو صاف کر لیں گے حالانکہ توبہ، معصیت کی راہ ہموار کے لیے نہیں ہے بلکہ نادانی میں معصیت سرزد اور بارگاہ خدا سے دور ہونے کے بعد ندامت کے ساتھ دوبارہ واپس آنے کا نام ہے۔

اس آیت کے اخیری جملے کی ایک دوسری تفسیر بھی ہے کہ یوسف علیہ السلام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد تمہارے معاملات سدھر جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ حصول مقصد کے لیے ناجائز ذرائع کے استعمال اور ناکامی کی عبرت انگیز مثال۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡہُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ وَ اَلۡقُوۡہُ فِیۡ غَیٰبَتِ الۡجُبِّ یَلۡتَقِطۡہُ بَعۡضُ السَّیَّارَۃِ اِنۡ کُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ﴿۱۰﴾

۱۰۔ ان میں سے ایک کہنے والا بولا: یوسف کو قتل نہ کرو (اور اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو) اسے کسی گہرے کنویں میں ڈال دو کوئی قافلہ اسے نکال کر لے جائے گا۔

تشریح کلمات

الۡجُبِّ: کنواں جو پختہ یا لپا ہوا نہ ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡہُمۡ : برادران یوسف میں سے ایک نے یہ رائے دی کہ یوسف علیہ السلام کو قتل نہ کریں بلکہ کسی گہرے کنویں میں ڈال دیں۔

چنانچہ دوسری تجویز منظور کر لی گئی۔ طے یہی ہوا کہ انہیں ایک گہرے کنویں میں پھینک دیا جائے تا کہ راہ گزر لوگ انہیں نامعلوم جگہ لے جائیں۔ اس زمانے میں تجارتی قافلوں کے راستے میں کنویں ہوا کرتے تھے اور فلسطین کے جنوبی مشرقی علاقوں میں مصر اور فلسطین کے درمیان تجارتی قافلوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔

اہم نکات

۱۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کمتر جرم کے ارتکاب کی کوشش۔

قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا مَا لَکَ لَا تَاۡمَنَّا عَلٰی یُوۡسُفَ وَ اِنَّا لَہٗ لَنٰصِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ کہنے لگے: اے ہمارے ابا جان! کیا وجہ ہے کہ آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں۔

اَرۡسِلۡہُ مَعَنَا غَدًا یَّرۡتَعۡ وَ یَلۡعَبۡ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ کل اسے ہمارے ہمراہ بھیج دیجیے تا کہ کچھ کھا پی لے اور کھیل کود کرے اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے۔

تشریح کلمات

یَّرۡتَعۡ: (ر ت ع) رَتَعَ کے اصل معنی جانوروں کے چرنے کے ہیں پھر استعارہ کے طور پر انسانوں کے جی بھر کر کھانے پینے پر یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنَّا لَہٗ لَنٰصِحُوۡنَ: آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسف کے بارے میں برادران یوسف پر اعتماد نہ تھا اور عدم اعتماد کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ وہ یوسف کے خیر خواہ نہ ہوں

۲۔ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ: اور دوسری یہ کہ وہ یوسف علیہ السلام کو تحفظ نہ دے سکتے ہوں۔ برادران یوسف نے دونوں باتوں میں والد کا اعتماد بحال کرنے کی سعی کی کہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں اور تحفظ بھی دے سکتے ہیں۔

۳۔ وَ یَلۡعَبۡ: کھیل کود کرے، سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام ابھی کھیل کھیلنے کی عمر میں تھے اور کھیل بچوں کی نشوونما کے لیے ضروری بھی ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ یوسف علیہ السلام کو پھنسانے کے لیے نفسیاتی اور جذباتی حربے استعمال کیے گئے: یَّرۡتَعۡ وَ یَلۡعَبۡ.

قَالَ اِنِّیۡ لَیَحۡزُنُنِیۡۤ اَنۡ تَذۡهَبُوۡا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنۡ یَّاۡكُلَهُ الذِّئۡبُ وَ اَنۡتُمۡ عَنۡهُ غٰفِلُوۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ یعقوب نے کہا: تمہارا اسے لے جانا میرے لیے حزن کا باعث ہے اور مجھے ڈر ہے اسے بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے غافل ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ اِنِّیۡ لَیَحۡزُنُنِیۡۤ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں پر عدم اعتماد کا اظہار کیے بغیر فرمایا: بات یہ ہے کہ اول تو یوسف کی جدائی میرے لیے شاق ہے۔

۲۔ وَ اَخَافُ اَنۡ یَّاۡكُلَهُ الذِّئۡبُ: ثانیاً مجھے خوف آتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو کہیں بھیڑیا نہ کھا جائے اور تم اپنے کھیل کود میں غافل رہو۔

ممکن ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف سے بھیڑیے کا ذکر آنے میں قدرت کا دخل ہو کہ بعد میں برادران اسی بھیڑیے کے ذمے خون یوسف علیہ السلام ڈال دیں۔ بعد میں گھڑنے کے لیے عذر ان کو خود کلام یعقوب میں مل گیا۔

اہم نکات

۱۔ آداب پدری ہے کہ فرزندوں پر عدم اعتماد کا اظہار نہ کیا جائے۔

۲۔ غم فراق اور خطرات کا خوف۔ پدری جذبات۔

قَالُوۡا لَئِنۡ اَكَلَهُ الذِّئۡبُ وَ نَحۡنُ عُصۡبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ کہنے لگے: ہم ایک جماعت ہیں اس کے باوجود اگر یوسف کو بھیڑیا کھا جائے تو ہم نقصان اٹھانے والے ٹھہریں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ نَحۡنُ عُصۡبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے عدم اعتماد کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ

غفلت کے خطرے کا اظہار فرمایا تو بیٹوں نے طاقت وقوت کا اظہار کیا اور کہا: ہمارے طاقتور جماعت ہونے کے باوجود اگر یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا نے کھا جائے تو ہم معاشرے میں اپنی حیثیت کھو دیں گے۔ بعد میں بیٹوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اظہار کردہ خطرات کو بہانہ بنایا اور کہا: ہم یوسف علیہ السلام کو سامان کے پاس چھوڑ کر کھیل کود میں لگے رہے۔ یعنی ہم غفلت میں رہے اور یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا نے کھا لیا۔

اہم نکات

۱۔ خیانت کار ذہن طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے: وَنَحۡنُ عُصۡبَۃٌ ....

فَلَمَّا ذَہَبُوۡا بِہٖ وَ اَجۡمَعُوۡۤا اَنۡ یَّجۡعَلُوۡہُ فِیۡ غَیٰبَتِ الۡجُبِّ ۚ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡہِ لَتُنَبِّئَنَّہُمۡ بِاَمۡرِہِمۡ ہٰذَا وَ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ پس جب وہ اسے لے گئے اور سب نے اتفاق کرلیا کہ اسے گہرے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے یوسف کی طرف وحی کی (کہ ایک دن ایسا آئے گا) کہ آپ ان کے پاس ان کے اس فعل (شنیع) کے بارے میں انہیں ضرور بتائیں گے جبکہ انہیں اس بات کا شعور تک نہیں ہوگا۔

تشریح کلمات

اَجۡمَعُوۡۤا: پختہ عزم کے معنوں میں ہے۔ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَکُمۡ یونس: ۷۱ میں اس لفظ کی تشریح ملاحظہ ہو۔

تفسیر آیات

حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال رہے تھے تو طبیعی طور پر یوسف علیہ السلام پریشان تھے۔ اس وقت ان پر وحی نازل ہوئی کہ فکر نہ کرو وہ وقت آنے والا ہے کہ تم ان برادران کو جتلاؤ گے کہ تم نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہ وحی، الہام کی بھی ہوسکتی ہے اور نبوت کی بھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام جب کنویں میں ڈالے جا رہے تھے تو اس وقت نبوت کی منزل پر فائز ہوگئے تھے۔ اس صورت میں اسی سورۃ کی آیت ۲۲ میں فرمایا:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗۤ اٰتَیۡنٰہُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ... اور جب یوسف اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے انہیں علم اور حکمت عطا کی....

اس میں حکمت اور علم سے مراد رسالت ہوسکتی ہے۔ جب جوانی کو پہنچے تو رسالت کے مقام پر فائز ہوگئے۔

اللہ تعالیٰ نے یوسف کو کنویں سے نجات ہی کی نہیں دی بلکہ یہ خوشخبری بھی سنائی کہ آخر میں وہ دن

آنے والا ہے کہ یہ لوگ زیر ہوں گے اور تم ان کو ان کی اس کرتوت پر سرزنش کر رہے ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ حسد کرنے والے انجام بد کا شعور نہیں رکھتے۔

۲۔ مؤمن اللہ کی حمایت میں ہوتا ہے۔ وَهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ

وَجَآءُوۡۤ اَبَاهُمۡ عِشَآءً يَّبۡكُوۡنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوۡا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَ تَرَكۡنَا يُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئۡبُ ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَلَوۡ كُنَّا صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۶۔ اور یہ لوگ رات کی ابتدا میں اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔

۱۷۔ کہنے لگے: اے ابا جان! ہم دوڑ لگانے میں مصروف ہو گئے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تو اسے بھیڑیا کھا گیا اور آپ ہماری بات نہیں مانتے گو ہم سب سچے ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَجَآءُوۡۤ اَبَاهُمۡ: کھیل کود پر جانے والے عموماً رات ہونے سے پہلے گھر واپس آتے ہیں۔ برادران یوسف باپ کو اپنی جھوٹی داستان باور کرانے کے لیے دیر سے عشاء کے وقت گھر واپس آئے اور اپنی گھڑی ہوئی داستان سنانا شروع کر دی

۲۔ قَالُوۡا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا: کہ ہم دوڑ مقابلے میں مصروف تھے۔ ظاہر ہے ان لوگوں نے اپنے زمانے میں رائج کھیل، دوڑ کے مقابلے کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ وَتَرَكۡنَا يُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا: ایسا کھیل جس میں یوسف علیہ السلام کی شرکت ممکن نہیں تھی۔ اس لیے یوسف کو سامان کے پاس چھوڑا تو بھیڑیا انہیں کھا گیا۔ چاہے ہم سچے ہوں، آپ ہماری بات کو نہیں مانیں گے۔ یہ جملہ عموماً وہ لوگ کہتے ہیں جن کے پاس کوئی معقول عذر نہیں ہوتا۔ ممکن ہے یہ جملہ ان لوگوں نے اس وقت کہا ہو جب ان کی گھڑی ہوئی داستان یعقوب علیہ السلام کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ چنانچہ بعد کی آیت میں جملہ: بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ ''نہیں، تم نے اپنے تئیں ایک بات بنائی ہے'' سے ظاہر ہے کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام جیسی فہم و فراست کے مالک اللہ کے پیغمبر کے سامنے کوئی جھوٹ بولتا ہے تو اس کے لب و لہجے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بائبل کی روایت کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کو جب مصر لایا گیا تو اس وقت ان کی عمر ۱۷ سال تھی۔ اس روایت کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کھیل کود میں شرکت کے قابل تھے۔ وَتَرَكۡنَا يُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا ''اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے''

سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام دوسرے بھائیوں کی طرح دوڑنے کے قابل نہ تھے۔ چنانچہ حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جب یوسف علیہ السلام زندان میں ڈالے گئے تو ان کی عمر بارہ سال تھی۔[1]

۵۔ وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا: سے معلوم ہوتا ہے کہ برادران یوسف اپنے والد کے ردعمل سے دیکھ رہے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان کی مضطرب باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔

اہم نکات

۱۔ گھڑی ہوئی بات کرنے والا اضطراب کا شکار ہوتا ہے: وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا ....

وَ جَآءُوۡ عَلٰی قَمِیۡصِہٖ بِدَمٍ کَذِبٍ ؕ قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَکُمۡ اَنۡفُسُکُمۡ اَمۡرًا ؕ فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ ؕ وَ اللّٰہُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ چنانچہ وہ یوسف کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر لے آئے، یعقوب نے کہا: نہیں، تم نے اپنے تئیں ایک بات بنائی ہے، پس میں بہت اچھے صبر کا مظاہرہ کروں گا اور جو بات تم بیان کر رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مطلوب ہے۔

تشریح کلمات

سَوَّلَتۡ: (س و ل) خوشنما بنا دینا، آمادہ کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَجَآءُوۡ عَلٰی قَمِیۡصِہٖ: روایات کے مطابق خود قمیص خون کے جھوٹا ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے دیکھ کر فرمایا: بڑا ہوشمند بھیڑیا ہے کہ قمیص کو پھاڑے بغیر اس کے اندر موجود یوسف علیہ السلام کو کھا لیا۔ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا نے کھایا ہے، کوئی عضو تو بچا ہو گا؟

۲۔ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَکُمۡ اَنۡفُسُکُمۡ: بلکہ تم لوگوں نے یہ بات بنائی ہے۔ یوسف علیہ السلام کے خلاف ان لوگوں نے کوئی قدم اٹھایا ہے اور یہ قدم خاندان کے محافظین اور اپنے ہی قوت بازو کی طرف سے اٹھایا گیا ہے لہٰذا بہتر صبر کا مظاہرہ کرنے اور اللہ سے مدد طلب کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے۔

۳۔ فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ: صبر جمیل کا مطلب یہ ہے کہ جو مصیبت اور بلا نازل ہو اسے خدائے رحمٰن و رحیم کا فیصلہ سمجھ کر قبول کرنا، اللہ کے فیصلے پر راضی ہونا، اسے اپنے خلاف فیصلہ تصور کر کے لب شکایت نہ کھولنا اور حواس باختہ نہ ہونا۔ البتہ اس مصیبت پر طبعی اثرات کا مترتب ہونا صبر کے خلاف نہیں ہے۔ صبر یہ نہیں کہ اس پر مصیبتوں کا کوئی اثر ہی نہ ہو۔ مثلاً اپنے بیٹے کے مفقود ہونے پر گریہ کرنا، دل میں دکھ کا احساس کرنا،

صبر کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو یہ اس کے لیے مصیبت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا حضرت یعقوب علیہ السلام کا گریہ صبر کے منافی نہیں ہے۔

۴۔ وَاللّٰہُ الۡمُسۡتَعَانُ: صبر یہ ہے کہ مصیبتوں کے اثرات دل میں لیے اللہ کے فیصلے کو حق سمجھے اور اسی سے مدد طلب کرے۔

اہم نکات

۱۔ صبر کا لازمی نتیجہ توکل بر خدا ہے: فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ ؕ وَاللّٰہُ الۡمُسۡتَعَانُ ....

۲۔ جھوٹ چھپ نہیں سکتا: بِدَمٍ کَذِبٍ ....

وَجَآءَتۡ سَیَّارَۃٌ فَاَرۡسَلُوۡا وَارِدَہُمۡ فَاَدۡلٰی دَلۡوَہٗ ؕ قَالَ یٰبُشۡرٰی ہٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوۡہُ بِضَاعَۃً ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ پھر ایک قافلہ آیا اور انہوں نے اپنا سقا بھیجا جس نے اپنا ڈول کنویں میں ڈالا (تو یوسف آویزاں نکلے) وہ بولا: کیا خوب! یہ تو ایک لڑکا ہے اور انہوں نے اسے تجارتی سرمایہ بنا کر چھپا لیا اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔

تشریح کلمات

وَارِدَ: تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ہود آیت ۹۸

ادلی: (د ل و) ڈول کا کنویں میں ڈالنا۔

بِضَاعَۃً: (ب ض ع) مال کا وافر حصہ جو تجارت کے لیے الگ کر لیا گیا ہو۔ اصل میں یہ لفظ گوشت کے بڑے ٹکڑے کے لیے ہے۔ بعد میں سرمایہ کے ایک بڑے حصے کے لیے استعمال ہوا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَجَآءَتۡ سَیَّارَۃٌ: قافلہ۔ زیادہ چلنے والا۔ جیسے جوالہ اور قناصة ہے۔ اس قافلے نے علاقے میں پانی تلاش کرنے کے لیے اپنے ایک تجربہ کار کو بھیجا۔ اس نے کنواں دیکھ کر اس میں اپنا ڈول ڈالا تو ایک لڑکا ڈول سے آویزاں دیکھا۔

۲۔ قَالَ یٰبُشۡرٰی: اس کا مطلب یہ ہے اے قوم بشارت ہو یا کا منادی محذوف رکھا جاتا ہے۔ یعنی "اے بشارت ہو" کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود کو مراد لے کر بشارت کہنا مقصود ہو۔

۳۔ وَاَسَرُّوۡہُ: اس زمانے میں بردہ فروشی عام تھی۔ اس لیے اس لڑکے کو ایک قابل اعتنا سرمایہ سمجھ

کر پوشیدہ رکھا کہ یہ صاحب جمال لڑکا اچھی قیمت میں فروخت ہو جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ جو امتحان کے کنویں کی اتھاہ تاریکی میں جاتا ہے وہ تخت و تاج کی بلند چوٹیوں کو چھوتا ہے۔

وَ شَرَوۡہُ بِثَمَنٍۭ بَخۡسٍ دَرَاہِمَ مَعۡدُوۡدَۃٍ ۚ وَ کَانُوۡا فِیۡہِ مِنَ الزّٰہِدِیۡنَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اور انہوں نے یوسف کو تھوڑی سی قیمت معدودے چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا اور وہ اس میں زیادہ طمع بھی نہیں رکھتے تھے۔

تشریح کلمات

البخس: (ب خ س) حقیر اور ناقص چیز کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَشَرَوۡہُ بِثَمَنٍۭ بَخۡسٍ: اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو بیچنے والے کون تھے؟ بعض مفسرین کے مطابق برادران یوسف نے بیچ دیا۔ بائبل کے مطابق کنویں سے نکالنے والے مدین کے سوداگر ہی تھے اس لیے ان لوگوں نے اسماعیلی قافلے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔تلمود کے مطابق مدین کے تاجروں کا برادران یوسف سے جھگڑا ہوا۔ چنانچہ بیس درہم دے کر برادران کو خاموش کرا دیا پھر اسی قیمت پر اسماعیلی قافلے کے ہاتھ فروخت کیا۔ اسماعیلی قافلے نے مصر لے جا کر فروخت کیا۔

ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے جس قافلے نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکالا تھا اسی نے فروخت کیا۔خواہ یہ قافلہ اسماعیلیوں کا ہو یا مدین والوں کا کیونکہ اولاً تو سلسلہ کلام اسی قافلے کے بارے میں جاری ہے لہٰذا دیگر ضمائر کی طرح شَرَوۡہُ کی ضمیر بھی اسی قافلے کی طرف جانا چاہیے۔ ثانیاً جن لوگوں نے یوسف علیہ السلام کو تجارتی سرمایہ بنا کر چھپا کر رکھا تھا وہی فروخت کرنے والے ہیں۔

۲۔ وَکَانُوۡا فِیۡہِ مِنَ الزّٰہِدِیۡنَ: ثالثاً تھوڑی قیمت میں فروخت بھی اس لیے کیا گیا کہ مفت میں حاصل شدہ مال ہے اور مالک کی طرف سے دعوے کا خوف ہے یا اس لیے کم قیمت پر فروخت کیا ہو گا کہ انہیں علم ہوا ہو گا کہ یوسف علیہ السلام غلام نہیں ہیں اس لیے انہیں زیادہ قیمت ملنے کی توقع نہیں تھی۔

اہم نکات

۱۔ نبی زادہ غلام بنتا ہے تا کہ ایک قوم کو غلامی سے آزاد کرے۔

وَ قَالَ الَّذِی اشۡتَرٰىہُ مِنۡ مِّصۡرَ لِامۡرَاَتِہٖۤ اَکۡرِمِیۡ مَثۡوٰىہُ عَسٰۤی اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَتَّخِذَہٗ وَلَدًا ؕ وَ کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ وَ لِنُعَلِّمَہٗ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ ؕ وَ اللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰۤی اَمۡرِہٖ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱﴾

۲۱۔اور مصر کے جس آدمی نے انہیں خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا: اس کا مقام معزز رکھنا، ممکن ہے کہ وہ ہمارے لیے فائدہ مند ہو یا ہم اسے بیٹا بنا لیں اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں تمکنت دی اور اس لیے بھی کہ ہم انہیں خوابوں کی تعبیر کی تعلیم دیں اور اللہ اپنے امر میں غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الَّذِی اشۡتَرٰىہُ: بائبل کے مطابق یہ شخص شاہی گارڈ کا کوئی بڑا افسر تھا۔ قرآن مجید اسے عزیز کہتا ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۸۸ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے بھی قرآن نے عزیز کہا ہے: یٰۤاَیُّہَا الۡعَزِیۡزُ مَسَّنَا وَ اَہۡلَنَا الضُّرُّ .... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص قوت و اقتدار کا مالک تھا۔ چنانچہ عزیز طاقتور اور غالب آنے والے کو کہتے ہیں۔

۲۔ اَکۡرِمِیۡ مَثۡوٰىہُ: جس شخص نے یوسف علیہ السلام کو خرید لیا تھا وہ سمجھ گیا ہوگا کہ یہ لڑکا غلام نہیں ہے بلکہ کسی اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ اور صاحب مقام و منزلت ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا: اس کو عزت و تکریم سے رکھو بلکہ یہ کہا: اس کے مقام و منزلت کا احترام رکھنا۔ یعنی یہ نہ کہا اکرمیہ بلکہ کہا: اَکۡرِمِیۡ مَثۡوٰىہُ ورنہ غلاموں کا احترام نہیں کیا جاتا خواہ وہ غلام کتنا ہی لائق اور صاحب جمال ہی کیوں نہ ہو۔

۳۔ عَسٰۤی اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ: یوسف علیہ السلام کی فہم و فراست سے وہ شخص بھانپ گیا کہ مستقبل میں یہ لڑکا ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔ عَسٰۤی اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ بلکہ یہ اس قابل ہے کہ ہم اسے اپنے خاندان کا حصہ بنا لیں اور بیٹا تصور کریں۔

۴۔ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ: یوسف علیہ السلام کو مصر میں تمکنت و اقتدار دینے کے لیے یہ پہلا زینہ تھا کہ اسے عزیز مصر کے گھر پہنچا دیا۔

۵۔ وَلِنُعَلِّمَہٗ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ: اسی گھر میں یوسف علیہ السلام کی پاکیزگی اور عفت کا امتحان بھی لینا تھا جس میں کامیاب ہونے کے بعد تاویل الاحادیث کی تعلیم دینا بھی مقصود تھا۔

۶۔ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰۤی اَمۡرِہٖ: اللہ اپنے امور میں غالب ہے۔ چنانچہ برادران یوسف نے اپنا پورا

زور استعمال کیا۔ تجارتی قافلے نے یوسف علیہ السلام کو غلام بنا کر ذلیل کرنے کی کوشش کی۔ عزیز مصر کی عورت نے بھی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن اللہ کا امر ان سب پر غالب آیا اور یہ سب یوسف علیہ السلام کے خلاف نہیں، ان کے حق میں ثابت ہوا جیسا کہ اللہ چاہتا تھا۔

۷۔ تلمود میں آیا ہے کہ اس عورت کا نام زلیخا تھا۔ ممکن ہے اسلامی روایات کا بھی یہی مآخذ ہو۔

اہم نکات

۱۔ الٰہی منصب پر فائز ہونے کے لیے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے: وَ لِنُعَلِّمَهٗ ....

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور جب یوسف اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے انہیں علم اور حکمت عطا کی اور ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ: اس جگہ اشد سے مراد رشد و جوانی ہے چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کم عمری میں مصر پہنچے تھے۔ بنابر بعض روایات سترہ سال کی عمر میں مصر پہنچے۔ دو یا تین سال عزیز مصر کے گھر رہے۔ اسی اثنا میں آپؑ رشد کو پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں عنایت فرمائیں:

ا۔ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا: حُكْمًا سے مراد ان امور کی فیصلہ کن بینش ہے جن میں لوگ نادانی کی وجہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ عِلْمًا سے مراد وہ علم لدنی ہے جو استاد کے بغیر اللہ تعالیٰ یوسف علیہ السلام جیسی پاکیزہ ہستیوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے۔

۲۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى: ہر وہ شخص جو نیکی و پاکدامنی میں یوسف علیہ السلام کے مرتبے کو پہنچے اس کو بھی حکمت اور علم سے نوازتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی طرف سے حکمت اور علم اندھی بانٹ نہیں ہے بلکہ یہ اصول و قانون کے تحت ملتے ہیں: وَكَذٰلِكَ نَجْزِى ....

۲۔ اور ہر نیکی کرنے والے کو اپنی نیکی کے مطابق اجر مل جاتا ہے: وَكَذٰلِكَ نَجْزِى ....

وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ

۲۳۔ اور یوسف جس عورت کے گھر میں تھے اس نے انہیں اپنے ارادے سے منحرف کر کے اپنی

هَيۡتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيۡۤ اَحۡسَنَ مَثۡوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۳﴾

طرف مائل کرنا چاہا اور سارے دروازے بند کر کے کہنے لگی: آ جاؤ، یوسف نے کہا: پناہ بخدا! یقیناً میرے رب نے مجھے اچھا مقام دیا ہے، بے شک اللہ ظالموں کو کبھی فلاح نہیں دیتا۔

تشریح کلمات

رَاوَدَ: (ر و د) کے اصل معنی نرمی کے ساتھ کسی کی طلب میں بار بار آمد و رفت کے ہیں۔ رَاوَدَ بروزن مفاعلہ کے معنی ارادوں میں باہمی اختلاف اور کشیدگی کے ہیں۔ رودتہ عن نفسہ اس کو اس کے ارادے سے پھسلانے کی کوشش کی۔

هَيۡتَ لَكَ: (ھ ی ت) ہیت اور ھلم دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی .آ جا.. واحد جمع مؤنث مذکر کے لیے ایک لفظ استعمال ہوتا ہے۔ البتہ عدد کے لیے بعد کا لفظ قرینہ بنتا ہے۔ ھیت لك، ھیت لکما، ھیت لکن۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ رَاوَدَتۡهُ الَّتِيۡ هُوَ: حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے گھر کا حصہ بن گئے تھے اور اس گھر میں یوسف علیہ السلام ایک غلام کی نہیں بلکہ قابل احترام شخصیت کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ گھر کی مالکہ کو یہ حکم ملا ہوا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا مقام معزز رکھنا اور وہ خود بھی یوسف علیہ السلام کی آتش عشق میں سوزاں ہے لہٰذا یوسف علیہ السلام کو اسی گھر میں ایسا ماحول فراہم ہے جس کے تحت انسان میں غرور آ جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں ایک طرف ملک کی شہزادی، گھر کی مالکہ ہے، خلوت ہے، افشا کا خوف نہیں کیونکہ سب کچھ خاتون خانہ کے کنٹرول میں ہے۔

۲۔ وَغَلَّقَتِ الۡاَبۡوَابَ: سارے دروازے بند کر کے ماحول کو سازگار بنایا جاتا ہے۔ عورت شرم و حیا کی مالک ہوتی ہے۔ اس کی طرف سے اسیر جنس مرد کو دعوت دی جاتی ہے: هَيۡتَ لَكَ اب یوسف علیہ السلام اور اس شہزادی کے درمیان سوائے یوسف علیہ السلام کی ایک توجہ کے اور کوئی رکاوٹ نہیں اور یوسف علیہ السلام کی توجہ کے لیے نہ صرف کوئی رکاوٹ نہیں ہے بلکہ مختلف عوامل موجود ہیں۔ یوسف علیہ السلام کامل الخلقت مرد ہے۔ ابتدائے شباب میں شہوانی جنون کا وقت ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یوسف علیہ السلام کی طرف سے جو جواب ملتا ہے اس میں اس طاقت کا بھی ذکر ہے جس نے یوسف علیہ السلام کو اس نازک ترین مرحلہ میں سہارا دیا۔ وہ جواب یہ تھا:

۴۔ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ: پناہ بخدا۔ اس جوان صالح نے اس ذات کا سہارا لیا جس نے اسے ممتاز

مقام دیا اور کہا: میرے رب نے مجھے اچھا مقام دیا ہے۔ اس کی پناہ میں ہونے کی وجہ سے یوسف علیہ السلام اس امتحانی مرحلے میں کامیابی کے ساتھ سرخ رو رہے۔

۵۔ رَبِّیۡۤ اَحۡسَنَ مَثۡوَایَ: میرے رب نے مجھے بہتر مقام عنایت کیا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس رب سے یوسف علیہ السلام کی مراد عزیز مصر ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کو مصری اصطلاح کے مطابق رب کہا ہے۔ یہ نظریہ درست نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اس گناہ کے ارتکاب سے اللہ کے لیے نہیں، گھر کے مالک کی وجہ سے اجتناب کیا ہے۔ ثانیاً اگلی آیت میں اس بات کی تشریح موجود ہے کہ ترک گناہ میں برہان رب موجب بنی ہے: لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ .... اس رب سے مراد مالک خانہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ثالثاً حضرت یوسف علیہ السلام مالک خانہ کو رب کیوں کر کہے جب کہ آپؑ کو علم ہے کہ آپؑ غلام نہیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ زنا ایسا ظلم ہے جس میں ناکامی ہے: اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ۔

۲۔ جو ذات اللہ کی پناہ میں ہوتی ہے وہ گناہ نہیں کرتی: قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ ....

۳۔ جنسی شہوت کا خطرہ انسان کے لیے سب سے بڑا ہے۔

۴۔ اسلامی شریعت میں نامحرم عورت کے ساتھ ایک گھر میں تنہا رہنا جائز نہیں ہے۔

وَ لَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ وَ الۡفَحۡشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ اور اس عورت نے یوسف کا ارادہ کر لیا اور یوسف بھی اس کا ارادہ کر لیتے اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ چکے ہوتے، اس طرح ہوا تاکہ ہم ان سے بدی اور بے حیائی کو دور رکھیں، کیونکہ یوسف ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔

تشریح کلمات

هَمَّ: (ھ م م) هَمَّ کے اصل معنی اس ارادہ کے ہیں جو ابھی دل میں ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ هَمَّ بِهَا لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ: آیت کے اس جملے کا واضح مطلب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اس کا ارادہ کر لیتے اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ چکے ہوتے۔ چونکہ یوسف علیہ السلام برہان رب

دیکھ چکے تھے اس لیے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ جس طرح فرمایا:

وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ وَ رَحۡمَتُہٗ لَہَمَّتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ اَنۡ یُّضِلُّوۡکَ ...[1]

اور (اے رسول) اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت آپ کے شامل حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو آپ کو غلطی میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا....

آیت کا مفہوم یہ ہرگز نہیں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بھی گناہ کا ارادہ کر لیا تھا جیسا کہ بعض اکابر مفسرین اہل سنت کا خیال ہے۔ برہان جو انبیاء علیہم السلام کو اللہ کی طرف سے دکھائی جاتی ہے وہ علم یقینی ہے جو کسی محسوس ذریعہ ادراک سے نہیں بلکہ اس قوت کے ذریعے درک ہوتا ہے جو تمام ادراکات و محسوسات کا مرکز ہے۔ جس کو نفس، ضمیر، وجدان اور احیاناً قلب کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انبیاء علیہم السلام برہان الٰہی کو اپنے پورے وجود کے ساتھ وصول کرتے ہیں۔ اسی لیے اس برہان سے یقین کی اس منزل پر فائز ہو جاتے ہیں جہاں کسی قسم کے شک و تردد کی گنجائش نہیں ہوتی اور یقین کی اسی منزل سے عصمت شروع ہوتی ہے۔ جیسا کہ عام انسان دنیاوی مسائل میں اگر یقین کی اسی منزل پر ہو تو وہ بھی جان بوجھ کر خلاف ورزی نہیں کرتا۔ مثلاً کوئی عاقل انسان جان بوجھ کر اپنے آپ کو آگ کے بھٹے میں نہیں ڈالتا چونکہ انجام کا علم ہے۔

۳۔ کَذٰلِکَ لِنَصۡرِفَ عَنۡہُ السُّوۡٓءَ: یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان سے گناہ کی قوت سلب ہو جاتی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء اگرچہ گناہ کرنے پر قادر ہوتے ہیں اور خواہشات بھی رکھتے ہیں لیکن اپنے محکم یقین کی وجہ سے گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ دوسرے لفظوں میں ان کا مضبوط یقین، خواہشات پر غالب آ جاتا ہے جب کہ غیر معصوم میں خواہشات، یقین پر غالب آ جاتی ہیں۔

یوسف علیہ السلام کو برہان دے کر گناہ سے دور اس لیے رکھا کہ وہ اللہ کے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ برگزیدہ بندوں کو برہان دی جاتی ہے اور جن کو برہان ملتی ہے وہ معصوم ہوا کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ یقین کی کمزوری کی وجہ سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے۔

۲۔ اللہ کے خالص بندے معصوم ہوا کرتے ہیں۔

وَ اسۡتَبَقَا الۡبَابَ وَ قَدَّتۡ قَمِیۡصَہٗ مِنۡ دُبُرٍ وَّ اَلۡفَیَا سَیِّدَہَا لَدَا

۲۵۔ دونوں دروازے کی طرف دوڑ پڑے اور اس عورت نے یوسف کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ دیا

----

[1] النساء ۱۱۳

الۡبَابِ ؕ قَالَتۡ مَا جَزَآءُ مَنۡ اَرَادَ بِاَہۡلِکَ سُوۡٓءًا اِلَّاۤ اَنۡ یُّسۡجَنَ اَوۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۵﴾

اتنے میں دونوں نے اس عورت کے شوہر کو دروازے پر موجود پایا، عورت کہنے لگی: جو شخص تیری بیوی کے ساتھ برا ارادہ کرے اس کی سزا کیا ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ اسے قید میں ڈالا جائے یا دردناک عذاب دیا جائے؟

قَالَ ہِیَ رَاوَدَتۡنِیۡ عَنۡ نَّفۡسِیۡ وَ شَہِدَ شَاہِدٌ مِّنۡ اَہۡلِہَا ۚ اِنۡ کَانَ قَمِیۡصُہٗ قُدَّ مِنۡ قُبُلٍ فَصَدَقَتۡ وَ ہُوَ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ یوسف نے کہا: یہ عورت مجھے اپنے ارادے سے پھسلانا چاہتی تھی اور اس عورت کے خاندان کے کسی فرد نے گواہی دی کہ اگر یوسف کا کرتہ آگے سے پھٹا ہے تو یہ سچی ہے اور یوسف جھوٹا ہے۔

وَ اِنۡ کَانَ قَمِیۡصُہٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ فَکَذَبَتۡ وَ ہُوَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو یہ جھوٹی ہے اور یوسف سچا ہے۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِیۡصَہٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ قَالَ اِنَّہٗ مِنۡ کَیۡدِکُنَّ ؕ اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ جب اس نے دیکھا کہ کرتہ تو پیچھے سے پھٹا ہے (تو اس کے شوہر نے) کہا: بے شک یہ (سب) تم عورتوں کی فریب کاری ہے، تم عورتوں کی فریب کاری تو بہت بھاری ہوتی ہے۔

تشریح کلمات

قُدَّ: (ق د د) القد کے معنی کسی چیز کو طول میں قطع کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اسۡتَبَقَا الۡبَابَ: یوسف علیہ السلام فرار ہوتے ہوئے اور وہ عورت پیچھا کرتے ہوئے دونوں، دروازے کی طرف دوڑے۔ اس دوڑ میں یوسف علیہ السلام آگے نکل گئے۔ عورت نے پیچھے سے پکڑنے کی کوشش کی تو کرتے کا پچھلا دامن پھٹ گیا۔ اسی کشمکش کے دوران اس عورت کا شوہر دروازے کے پاس پایا گیا۔ شوہر کو مصر کے قبطی لوگ سید یعنی سردار کہتے تھے۔

۲۔ مَا جَزَآءُ مَنۡ اَرَادَ: شوہر کو دیکھتے ہی عورت نے فوراً اپنے کو پاکیزہ اور یوسف کو حملہ آور، تجاوز کار قرار دیا اور سزا کا مطالبہ بھی کر دیا جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہر شکست کھانے والا اپنی شکست کا انتقام لینے کے لیے کرتا ہے۔

۳۔ قَالَ ہِیَ رَاوَدَتۡنِیۡ: حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی صفائی پیش کی اور حقیقت حال بیان کی

کہ یہ عورت خود مجھے پھسلانے کی کوشش میں تھی۔ الزامات کا تبادلہ ہوا تو ظاہر ہے شوہر حقیقت حال جاننا چاہتا ہے۔ اس نے معاملے کا کھوج لگانے کی کوشش کی۔

۴۔ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا: خود اسی عورت کے خاندان کے ایک فرد[1] نے تحقیق کے لیے راہ دکھائی کہ اگرچہ وہاں کوئی عینی گواہ تو موجود نہ تھا لیکن واقعہ سے مربوط بعض باتوں سے حقیقت حال کا عینی نہ سہی، عقلی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں دروازے کی طرف آگے نکلنے کی کوشش میں دوڑے تھے اور قمیض پھٹی ہوئی تھی۔ اس شخص نے کہا کہ اگر قمیض آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو اقدام یوسف علیہ السلام کی طرف سے ہوا ہوگا اور عورت نے مدافعت کی ہوگی۔ اس کشمکش میں قمیض آگے سے پھٹ گئی ہوگی اور اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو یوسف علیہ السلام بچ نکلنا چاہتے تھے۔ عورت نے ان کا تعاقب کیا ہوگا اور قمیض پیچھے سے پھٹ گئی ہوگی۔ حالات کی شہادت حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں تھی اور دیکھا کہ قمیض پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے۔

۵۔ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ: بادی الرائے میں شوہر نے اپنی بیوی کو مجرم قرار دے کر کہا: یوسف علیہ السلام پر الزام لگانا تم عورتوں کی فریب کاری ہے۔

لیکن قدیم سے مراعات یافتہ طبقہ ہمیشہ اپنے گھروں میں ہونے والی جنسی فضیحتوں کو افشا ہونے نہیں دیتا۔ چنانچہ اس فضیحت کو دبانے کے لیے شوہر نے کہا:

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۜ وَ اسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾	۲۹۔ یوسف اس معاملے سے درگزر کرو اور (اے عورت) تو اپنے گناہ کی معافی مانگ، بے شک تو ہی خطا کاروں میں سے تھی۔

اس معاملے سے درگزر کر، اسے افشاء نہ کر اور کسی سے اس کا ذکر نہ کر۔ اس نے اپنی زوجہ سے کہا تو اپنے گناہ کی معافی مانگ۔ کہتے ہیں مصری لوگ اگرچہ بت پرست تھے تاہم وہ اللہ کے وجود کے قائل تھے۔ پرستش بتوں کی کرتے تھے کیونکہ وہ انہیں وسیلہ سمجھتے تھے اور ممکن ہے مطلب یہ ہو کہ وہ جس کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھتے تھے اسی سے معافی مانگ۔ وہ خدا ہو یا بت۔ بائبل میں اس جگہ لکھا ہے:

> تب اس عورت نے اس کا پیراہن پکڑ کر کہا: میرے ساتھ ہم بستر ہو۔ وہ اپنا پیراہن اس کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگا اور باہر نکل گیا۔

تلمود میں آیا ہے:

---

[1] بعض شیعہ و سنی روایات میں آیا ہے کہ شہادت دینے ولا ایک شیر خوار بچہ تھا۔ اگر شہادت دینے والا بچہ تھا تو بچے کا بولنا شہادت کے لیے کافی تھا۔ جرم کے شواہد بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

فوطیفار (عزیز مصر) نے یوسف کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا اور عدالت کے حکام نے یوسف کی قمیض کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا کہ قصور عورت کا ہے کیونکہ قمیض پیچھے سے پھٹی ہے، نہ کہ آگے سے۔

بعض روایات کے مطابق یہ گواہی ایک شیر خوار بچے نے بطور معجزہ دی۔ بعض دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ یہ گواہی دینے والا شخص اس عورت کا چچیرا بھائی تھا جو حکیم وقت تھا۔ درباری امور میں رائے والا تھا۔

اہم نکات

۱۔ کسی کا پردہ عفت چاک نہ کر، خواہ اپنا دامن چاک ہو جائے: وَقَدَّتۡ قَمِيۡصَهٗ مِنۡ دُبُرٍ ....

۲۔ جو دنیا کے فضیحت کدہ سے بھاگ نکلتا ہے وہ دروازے پر رسوا نہیں ہوتا: لَدَا الۡبَابِ ....

۳۔ فتح سچ کی ہوتی ہے: وَشَهِدَ شَاهِدٌ ....

۴۔ جنسی معاملات میں عورت کی فریب کاری نہایت خطرناک ہے: اِنَّ كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ ۔

وَقَالَ نِسۡوَةٌ فِی الۡمَدِيۡنَةِ امۡرَاَتُ الۡعَزِيۡزِ تُرَاوِدُ فَتٰٮهَا عَنۡ نَّفۡسِهٖ ۚ قَدۡ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰٮهَا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اور شہر کی عورتوں نے کہنا شروع کیا: عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اس کے ارادے سے پھسلانا چاہتی ہے، اس کی محبت اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی ہے، ہم تو اسے یقیناً صریح گمراہی میں دیکھ رہی ہیں۔

تشریح کلمات

شغف: (ش غ ف) الشغاف دل کا اندرونی حصہ۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ نِسۡوَةٌ فِی الۡمَدِيۡنَةِ: یوسف علیہ السلام کے ساتھ معاشقے کا معاملہ ایک مدت تک درون خانہ چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ یہ بات گھر سے باہر نکل گئی۔ شہر کی عورتوں میں یہ بات پھیل گئی اور طعنہ زنی شروع ہو گئی کہ عزیز کی بیوی اپنے زرخرید غلام پر فریفتہ ہو گئی ہے جو مصری بھی نہیں، کنعانی ہے۔ فریفتگی بھی ایسی کہ دل کی گہرائیوں تک چلی گئی ہے۔ اگر یہ لڑکا حسن و جمال کا مالک بھی ہے تو شہزادی کے حسن و جمال سے زیادہ نہ ہوگا۔ ان تمام باتوں کے باوجود یک طرفہ محبت تو شہزادی کے لیے عار و ننگ ہے کہ اس کا زرخرید غلام اس کے عشق و محبت کو اعتنا میں نہ لائے اور عورت کے لیے یہ بھی عار و ننگ ہے کہ وہ مرد کے پیچھے دوڑے اور اس حد تک مرد کا پیچھا کرے کہ اس کی قمیض پھاڑ دے۔ وہ غلام بھی حسن و جمال کے ساتھ اخلاق کے کمال

میں کس اعلا درجہ پر فائز ہے کہ ایسی عظیم شہزادی کے عشق کو اعتنا میں لانے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔

عین ممکن ہے کہ شہر کے بڑے خاندان کی عورتوں نے یوسف علیہ السلام کی صورت و سیرت کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے حیلے بازیاں کی ہوں یا عزیز کی عورت کے خلاف سازش بنائی ہو کیونکہ بعد کی آیت میں اس عمل کو مکاری سے تعبیر کیا ہے۔

فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَكۡرِهِنَّ اَرۡسَلَتۡ اِلَیۡهِنَّ وَ اَعۡتَدَتۡ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتۡ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنۡهُنَّ سِكِّیۡنًا وَّ قَالَتِ اخۡرُجۡ عَلَیۡهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیۡنَهٗۤ اَكۡبَرۡنَهٗ وَ قَطَّعۡنَ اَیۡدِیَهُنَّ وَ قُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیۡمٌ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ پس اس نے جب عورتوں کی مکارانہ باتیں سنیں تو انہیں بلا بھیجا اور ان کے لیے مسندیں تیار کیں اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری دے دی (کہ پھل کاٹیں) پھر اس نے یوسف سے کہا ان کے سامنے نکل آؤ، پس جب عورتوں نے انہیں دیکھا تو انہیں بڑا حسین پایا اور وہ اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور کہ اٹھیں: پاک ہے اللہ، یہ بشر نہیں، یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔

تشریح کلمات

مُتَّكَاً: (ت ك ء) تکیہ جس پر ٹیک لگائی جاتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَكۡرِهِنَّ: عزیز مصر کی بیوی کو جب علم ہوا کہ اس کی ہم رتبہ عورتوں نے اپنے زرخرید غلام سے معاشقہ کرنے پر طعنہ زنی شروع کی ہے تو اس نے ان کے خلاف ایک ایسا حربہ استعمال کیا جس سے وہ بھی رسوا ہو جائیں اور شریک جرم ہونے کی وجہ سے اس کی تضحیک کرنا اور طعنہ زنی بند کر دیں۔

۲۔ وَ اَعۡتَدَتۡ لَهُنَّ مُتَّكَاً: تکیوں سے آراستہ مجلس کا اہتمام اور کھانے کے لیے چھریوں کا استعمال بتاتا ہے کہ اس مجلس میں اونچے خاندان کی خواتین مدعو تھیں۔ مصری تہذیب و تمدن کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہزاروں سال پہلے کس حد تک ترقی یافتہ تھی۔ چنانچہ مصری تہذیب کے آثار قدیمہ سے بھی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مصری اپنی مجلسوں میں تکیے استعمال کرتے تھے۔

۳۔ مَا هٰذَا بَشَرًا: چنانچہ جب جمال یوسف علیہ السلام کے مشاہدے سے حواس باختہ ہو کر ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹنا شروع کیے تو عزیز مصر کی عورت اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ خصوصاً جب ان عورتوں

نے جمال صورت کے ساتھ کمال سیرت اور کردار کی طہارت کے آثار بھی دیکھے اور کہا یہ تو مکرم فرشتہ ہے تو ان کو اندازہ ہوا کہ زلیخا نہ صرف عشق کی آگ میں سوزاں ہے بلکہ اسے اپنے معشوق کے پاکیزہ کردار ہونے کی وجہ سے اس کی بے اعتنائی کا بھی سامنا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عورتیں زیادہ حسن پرست ہوتی ہیں۔

۲۔ آیت میں عورتوں کی مکاری کی ایک بڑی مثال موجود ہے۔

قَالَتۡ فَذٰلِکُنَّ الَّذِیۡ لُمۡتُنَّنِیۡ فِیۡہِ ؕ وَ لَقَدۡ رَاوَدۡتُّہٗ عَنۡ نَّفۡسِہٖ فَاسۡتَعۡصَمَ ؕ وَ لَئِنۡ لَّمۡ یَفۡعَلۡ مَاۤ اٰمُرُہٗ لَیُسۡجَنَنَّ وَ لَیَکُوۡنًا مِّنَ الصّٰغِرِیۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔اس نے کہا: یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں اور بے شک میں نے اسے اپنے ارادے سے پھسلانے کی کوشش کی مگر اس نے اپنی عصمت قائم رکھی اور اگر میرا حکم نہ مانے گا تو ضرور قید کر دیا جائے گا اور خوار بھی ہو گا۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَتۡ فَذٰلِکُنَّ الَّذِیۡ: اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ معاشقہ کوئی راز کی بات نہ رہی۔ عزیز کی عورت شہر کے رؤسا کی بیگمات کے سامنے علانیہ طور پر اعتراف کرتی ہے کہ میں نے اسے پھسلانے کی کوشش کی مگر اس نے اپنا دامن بچایا۔

۲۔ وَ لَئِنۡ لَّمۡ یَفۡعَلۡ: اور ساتھ عزم کا بھی اظہار کرتی ہے کہ یہ کوشش جاری رہے گی۔ اگر یوسف علیہ السلام میری خواہش پوری نہیں کرتے تو انہیں خوار ہونا پڑے گا۔ مصری بیگمات کی یہ محفل حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کے لیے ایک شہادت ثابت ہوئی جس کو حضرت یوسف علیہ السلام نے زندان سے رہائی کے وقت پیش فرمایا۔

اس واقعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مصر کے اونچے خاندانوں کی بیگمات میں بے عفتی عیب کی بات نہ تھی اور اس کا برملا اظہار ہو سکتا تھا۔ جیسا کہ آج کی جدید جاہلیت میں رائج ہے۔

اہم نکات

۱۔ جو اللہ کی پناہ میں جاتا ہے وہ رسوا نہیں ہوتا۔

۲۔ اللہ یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کے لیے ثبوت مہیا فرماتا ہے۔

۳۔ قید ہونا خواری نہیں، عصمت کا ثبوت تھا۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَکُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ یوسف نے کہا: اے میرے رب! قید مجھے اس چیز سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دے رہی ہیں اور اگر تو ان کی مکاریاں مجھ سے دور نہ فرمائے گا تو میں ان عورتوں کی طرف راغب ہو جاؤں گا اور نادانوں میں شامل ہو جاؤں گا۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ کَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ پس اللہ نے یوسف کی دعا سن لی اور یوسف سے ان عورتوں کی مکاری دور کر دی، بے شک وہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ: پہلے صرف عزیز مصر کی بیگم حضرت یوسف علیہ السلام کو پھسلانے کی کوشش میں تھی۔ اب اس جرم میں بڑے گھرانوں کی دیگر خواتین بھی شریک ہیں۔ شہر بھر کے امیر گھرانوں کی خواتین بھی ان کے پیچھے پڑ جاتی ہیں: یَدْعُوْنَنِیْۤ اور ہر طرف حسین و جمیل عورتیں انہیں پھانسنے کے لیے اپنا اپنا جال لیے کھڑی ہیں۔

۲۔ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ: اس اثنا میں یوسف علیہ السلام اپنے رب کی بارگاہ میں اپنے آپ کو حاضر پاتے ہیں۔ نگاہ یوسف علیہ السلام ان عورتوں پر فریفتہ ہونے کی جگہ عرفان رب کی رعنائیوں پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور ان کا دل ان عورتوں کی طرف جانے کی جگہ عشق الٰہی میں مست ہے۔ اسی لیے ان تمام عورتوں کی مکاریوں کا مقابلہ کر کے اسے اپنا ذاتی کمال تصور کرنے کی بجائے اسے الٰہی تائید سمجھتے ہیں۔ یہ دل کی طہارت ہے جس کی وجہ سے یہاں سوائے حب خدا کے کسی گناہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

۳۔ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ: حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا قبول ہوتی ہے اور اللہ ان کو گناہ سے بچا لیتا ہے لیکن زندان جانے سے نہیں بچایا چونکہ خود حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا: السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ.... چنانچہ اللہ نے یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچایا، آزمائش سے نہیں بچایا۔

اہم نکات

۱۔ اولیائے کرام گناہ پر زندان کو ترجیح دیتے ہیں اور زندان، جہاں دیدار رب ہوتا ہے، اہل

معرفت کے لیے زیادہ پسندیدہ ہے: السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ ....

۲۔ جنسی بے راہ روی جہالت کی علامت ہے: وَ اَکُنۡ مِّنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ....

ثُمَّ بَدَا لَہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا رَاَوُا الۡاٰیٰتِ لَیَسۡجُنُنَّہٗ حَتّٰی حِیۡنٍ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ پھر (یوسف کی پاکدامنی کی) علامات دیکھ چکنے کے باوجود انہوں نے مناسب سمجھا کہ کچھ مدت کے لیے یوسف کو ضرور قید کر دیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا رَاَوُا الۡاٰیٰتِ: حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی پر دلالت کرنے والی نشانیوں میں سے ایک کرتہ ہے۔ دوسری اس عورت کے خاندان کے ایک فرد کی گواہی ہے۔ تیسری محفل کی عورتوں کے سامنے یہ اقرار و اعتراف کہ فَاسۡتَعۡصَمَ یوسف علیہ السلام نے اپنی عصمت قائم رکھی۔ حضرت ابن عباسؓ کے مطابق ایک نشانی اس عورت کے ہاتھ سے یوسف علیہ السلام پر لگنے والی خراشیں ہیں۔

۲۔ لَیَسۡجُنُنَّہٗ حَتّٰی حِیۡنٍ: عزیز مصر اپنے گھر کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھ کر مزید رسوائی سے بچنے کے لیے یوسف علیہ السلام کو زندان میں ڈال دیتا ہے۔ یہ درحقیقت مصری سرداروں کی شکست اور حضرت یوسف علیہ السلام کی فتح تھی کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو زندان میں کسی جرم کی پاداش میں نہیں بھیجا گیا بلکہ وہ اپنی عورتوں کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ ظالم اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے بے گناہ کو زندان میں ڈال دیتا ہے۔

۲۔ اخلاقی شکست کھانے والے طاقت کا سہارا لیتے ہیں: لَیَسۡجُنُنَّہٗ ....

وَ دَخَلَ مَعَہُ السِّجۡنَ فَتَیٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُہُمَاۤ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا ۚ وَ قَالَ الۡاٰخَرُ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَحۡمِلُ فَوۡقَ رَاۡسِیۡ خُبۡزًا تَاۡکُلُ الطَّیۡرُ مِنۡہُ ؕ نَبِّئۡنَا بِتَاۡوِیۡلِہٖ ۚ اِنَّا نَرٰىکَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ اور قید خانے میں یوسف کے ساتھ دو جوان بھی داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ شراب کشید کر رہا ہوں اور دوسرے نے کہا: میں نے دیکھا کہ میں اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں، پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں، ہمیں اس کی تاویل بتا دیجیے یقیناً ہمیں آپ نیک انسان نظر آتے ہیں۔

تفسیر آیات

ان دو غلاموں کو حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے کردار کی عظمت کا علم ہو جاتا ہے اور یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کسی جرم کے ارتکاب کی وجہ سے زندان تک نہیں پہنچے بلکہ جرم کا ارتکاب نہ کرنا ان کا جرم ہے۔ اعتماد کے بعد وہ آپؑ سے خواب کی تعبیر پوچھتے ہیں کیونکہ روح کی صفائی اور فکر کی طہارت کی وجہ سے حقائق سے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ جس قدر روح شفاف ہو جاتی ہے پردے بھی شفاف ہو جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ نیکی اور علم تاویل میں گہرا ربط ہے۔

قَالَ لَا یَاۡتِیۡکُمَا طَعَامٌ تُرۡزَقٰنِہٖۤ اِلَّا نَبَّاۡتُکُمَا بِتَاۡوِیۡلِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمَا ؕ ذٰلِکُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیۡ رَبِّیۡ ؕ اِنِّیۡ تَرَکۡتُ مِلَّۃَ قَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ یوسف نے کہا: جو کھانا تم دونوں کو دیا جاتا ہے وہ ابھی آیا بھی نہ ہوگا کہ میں اس کی تعبیر تمہیں بتا دوں گا قبل اس کے کہ وہ کھانا تمہارے پاس آئے، یہ ان (تعلیمات) میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائی ہیں، میں نے اس قوم کا مذہب ترک کر دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ لَا یَاۡتِیۡکُمَا طَعَامٌ: حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: جو کھانا تمہیں دیا جاتا ہے اس کی حقیقت کھانا آنے اور اسے دیکھنے سے پہلے بتا دوں گا کہ کھانا کہاں سے آ رہا ہے، کس قسم کا کھانا ہے، سرد ہے یا گرم، حلال ہے یا حرام، لذیذ ہے یا نہیں۔ بِتَاۡوِیۡلِہٖ میں ضمیر طعام کی طرف ہے اور طعام کی تاویل سے مراد اس کی تفصیل ہے۔ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کو پہلے اعتماد میں لیا کہ میں یہ سب کچھ جانتا ہوں، صرف خوابوں کی تعبیر نہیں۔

۲۔ مِمَّا عَلَّمَنِیۡ رَبِّیۡ: حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے اس علم کا حوالہ بھی بتا دیا کہ یہ علم مجھے اللہ نے دیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح کر دی کہ میرا علم روایتی نہیں، ملکوتی ہے۔

۳۔ اِنِّیۡ تَرَکۡتُ مِلَّۃَ: حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا ان دو قیدیوں میں ایک قسم کا حسن ظن پیدا

ہو گیا ہے لہٰذا مزید اعتماد کے لیے اپنا علمی مقام و مأخذ بیان فرماتے ہیں تا کہ ایسی سازگار فضا وجود میں آ جائے جس میں اصل مدعا ''تبلیغ توحید'' بیان کر سکیں۔ اس کے بعد کافروں سے بیزاری کا اعلان فرماتے ہیں۔ اگلی آیت میں اپنا مذہب، حسب و نسب بیان کرتے ہیں۔

وَ اتَّبَعۡتُ مِلَّۃَ اٰبَآءِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ ؕ مَا کَانَ لَنَاۤ اَنۡ نُّشۡرِکَ بِاللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ ذٰلِکَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ عَلَیۡنَا وَ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور میں نے تو اپنے اجداد ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب کو اپنایا ہے۔ ہمیں کسی چیز کو اللہ کا شریک بنانے کا حق حاصل نہیں ہے، ہم پر اور دیگر لوگوں پر یہ اللہ کا فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اتَّبَعۡتُ مِلَّۃَ اٰبَآءِیۡ: حضرت یوسف علیہ السلام اپنی زندگی کے کسی نازک اور مشکل مرحلے میں اپنے حسب و نسب کا سہارا نہیں لیتے اور اس کا ذکر نہیں کرتے۔ صرف دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں اپنا مذہب و نسب بیان فرماتے ہیں، مخاطب کو یہ باور کرانے کے لیے کہ ان کا تعلق توحید کے عظیم داعی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل سے ہے۔

۲۔ ذٰلِکَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ: اور اللہ نے ہدایت الی التوحید کے فضل و کرم سے خاندان ابراہیم علیہ السلام کو نوازا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو ان کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ ہدایت فطرت سلیمہ اور رسالت انبیاء کے ذریعے اللہ نے اپنے بندوں تک پہنچائی ہے۔

اہم نکات

۱۔ تبلیغ کے لیے فضا سازگار بنانا لازمی ہے۔

۲۔ توحید کی ہدایت اللہ کا بڑا فضل ہے۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ ءَاَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ اللّٰہُ الۡوَاحِدُ

۳۹۔ اے میرے زندان کے ساتھیو! کیا متفرق ارباب بہتر ہیں یا وہ اللہ جو یکتا ہے جو سب پر

الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ | غالب ہے۔
مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٠﴾

۴۰۔ تم لوگ اللہ کے سوا جن چیزوں کی بندگی کرتے ہو وہ صرف تم اور تمہارے باپ دادا کے خودساختہ نام ہیں، اللہ نے تو ان پر کوئی دلیل نازل نہیں کی، اقتدار تو صرف اللہ ہی کا ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو، یہی مستحکم دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ: یہ سوال ضمیر اور فطرت سے ہے جہاں یہ امر مسلم ہے کہ اس کائنات میں صرف ایک ہی رب ہو سکتا ہے۔ وہ سب پر قہار ہو گا اور قہاریت میں تعدد ناممکن ہے۔ دوسرے لفظوں میں تعدد، قہاریت کے منافی ہے کیونکہ تعدد کی صورت میں محدودیت آ جاتی ہے اور محدود مقہور ہوتا ہے، نہ قہار۔ چونکہ متعدد ہونے کی صورت میں ہر رب دوسرے رب کی حدود میں مقہور ہوتا ہے۔ لہٰذا قہاریت کے لیے غیر محدود ہونا ضروری ہے اور غیر محدود متعدد نہیں ہو سکتا، جیسا کہ متعدد غیر محدود نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رب قہار ہوتا ہے اور قہار غیر محدود ہوتا ہے اور غیر محدود ایک سے زیادہ نہیں ہوتا۔

۲۔ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ: اس کے بعد بت پرستوں کے نظریات کے بطلان اور بے حقیقت ہونے کی طرف اشارہ فرمایا کہ جن غیر اللہ کی تم عبادت کرتے ہو وہ ایک بے مفہوم الفاظ، بے معنی عبارت اور اسم بے مسمیٰ ہیں۔ صرف تمہارے باپ دادا کی ذہنی اختراع ہیں کہ کسی کو آسمانوں کا رب، کسی کو زمین کا مالک اور کسی کو صحت و مرض کا رب، کسی کو نعمتوں کا پروردگار وغیرہ کہتے ہو۔ حقائق وہ ہیں جن کی سند اللہ کی طرف سے آئے۔

۳۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ: اس کائنات میں ایک قہار رب کے علاوہ کسی اور کی قہاریت نہیں ہے۔ لہٰذا اقتدار اعلیٰ صرف اسی کے پاس ہے۔ وہی احکام جاری کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ حکم جاری کیا ہے کہ کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے۔

۴۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ: اور بتایا ہے کہ ایک خدا کی پرستش ہی مستحکم دین ہے کہ کسی شک و تردید سے متزلزل نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ دین حقیقی بنیادوں پر استوار ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات میں صرف ایک رب قہار موجود ہے۔

۲۔ اللہ کے سوا ہر معبود اسم بے مسمی ہے۔

۳۔ توحید انسان کا فطری دین ہے۔

۴۔ انسان زندان میں حرف حق سننے کے لیے زیادہ آمادہ ہوتا ہے۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ اَمَّاۤ اَحَدُ کُمَا فَیَسۡقِیۡ رَبَّہٗ خَمۡرًا ۚ وَ اَمَّا الۡاٰخَرُ فَیُصۡلَبُ فَتَاۡکُلُ الطَّیۡرُ مِنۡ رَّاۡسِہٖ ؕ قُضِیَ الۡاَمۡرُ الَّذِیۡ فِیۡہِ تَسۡتَفۡتِیٰنِ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اے میرے زندان کے ساتھیو! تم دونوں میں سے ایک تو اپنے مالک کو شراب پلائے گا اور دوسرا سولی چڑھایا جائے گا پھر پرندے اس کا سر نوچ کھائیں گے، جو بات تم دونوں مجھ سے دریافت کر رہے تھے اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ: توحید کا درس سنانے کے بعد اب خواب کی تعبیر بیان فرماتے ہیں۔ جس کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنے آقا کو شراب پلائے گا، روایات کے مطابق وہ پہلے بھی اس منصب پر فائز تھا۔ جس کے بارے میں فرمایا کہ وہ مصلوب ہوگا، روایات کے مطابق یہ شخص بادشاہ کا نانوائی تھا۔

۲۔ قُضِیَ الۡاَمۡرُ الَّذِیۡ: جس وثوق و یقین کے ساتھ آپؑ نے اس تعبیر کو بیان فرمایا اور اپنی تعبیر کو فیصلہ کن قرار دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کی تعبیر کا مأخذ ظن و تخمین نہیں بلکہ یقینی اور حتمی تھا اور وہ مأخذ وحی ہی ہو سکتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء علیہم السلام کے فرامین فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ کسی غلط فہمی یا ہذیان کا گمان تک نہیں ہوتا: قُضِیَ الۡاَمۡرُ الَّذِیۡ ....

وَ قَالَ لِلَّذِیۡ ظَنَّ اَنَّہٗ نَاجٍ مِّنۡہُمَا اذۡکُرۡنِیۡ عِنۡدَ رَبِّکَ ۫ فَاَنۡسٰہُ الشَّیۡطٰنُ ذِکۡرَ رَبِّہٖ فَلَبِثَ فِی

۴۲۔ اور ان دونوں میں سے جس کی رہائی کا خیال کیا تھا (یوسف نے) اس سے کہا: اپنے مالک (شاہ مصر) سے میرا ذکر کرنا مگر شیطان نے اسے بھلا دیا کہ وہ اپنے مالک سے یوسف کا ذکر کرے،

فِی السِّجۡنِ بِضۡعَ سِنِیۡنَ ﴿۴۲﴾　یوں یوسف کئی سال زندان میں پڑے رہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ لِلَّذِیۡ ظَنَّ: اس آیت میں ظن کا استعمال بہ معنی یقین ہے جیسا کہ دیگر بعض آیات میں بھی یہ لفظ یقین کے معنوں میں آیا ہے۔

۲۔ اذۡکُرۡنِیۡ عِنۡدَ رَبِّکَ: رب کا معنی مالک ہے۔ چنانچہ جوہری نے الصحاح میں کہا ہے: رب کل شیء مالکہ۔ ہر شے کا رب وہی ہے جو اس کا مالک ہے۔ اس طرح لفظ رَبْ از روئے لغت ''مالک'' کو کہتے ہیں۔ مثلاً عربی محاورے میں صاحب خانہ کو ربّ الدار کہتے ہیں۔ کشتی کے مالک کو رب السفینۃ کہتے ہیں۔ اسی طرح زرخرید غلام اپنے مالک کو آقا، مولیٰ اور رَبْ کہتے ہیں۔ چنانچہ طاغوت کے لیے اولیاء کا لفظ استعمال ہوا ہے:

وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَوۡلِیٰٓـُٔہُمُ الطَّاغُوۡتُ ...[1]　اور کفر اختیار کرنے والوں کے اولیاء طاغوت ہیں....

اسی طرح لفظ امام بھی امام حق اور امام باطل دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے:

فَقَاتِلُوۡۤا اَئِمَّۃَ الۡکُفۡرِ ...[2]　کفر کے اماموں سے جنگ کرو....

یہ سب عربی زبان کے استعمالات ہیں۔ رہا یہ سوال کہ شرعاً ہم نے کس کو ربّ، ولی اور امام تسلیم کرنا ہے، اس کا تعین لغت کے استعمالات سے نہیں ہوتا۔ اس کا تعین خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡغِیۡ رَبًّا وَّ ہُوَ رَبُّ کُلِّ شَیۡءٍ ...[3]　کہدیجیے: کیا میں کسی غیر اللہ کو اپنا رَبْ بناؤں؟ حالانکہ اللہ ہر چیز کا رب ہے ....

اس طرح ولی اور امام کا تعین اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے فرمایا ہے۔ لہٰذا اللہ کی طرف سے اس تعین کو چھوڑ کر لغت کو دلیل بنا کر غیر خدا کو ربّ، غیر ولی کو ولی اور غیر امام کو امام معصوم نہیں مان سکتے۔

۳۔ علل و اسباب کے ساتھ متوسل ہونا بھی اخلاص کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ توکل علی اللّٰہ کے لیے بھی علل و اسباب کا وسیلہ اختیار کرنا منافی نہیں ہے۔ لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام نے قید سے رہائی کے لیے وسائل و ذرائع تلاش کیے ہیں تو یہ عمل اخلاص فی اللّٰہ کے منافی ہے اور نہ توکل علی اللّٰہ کے۔

۴۔ فَاَنۡسٰہُ الشَّیۡطٰنُ ذِکۡرَ رَبِّہٖ: مگر شیطان نے اسے یعنی اس زندان سے آزاد ہونے والے کو بھلا دیا کہ بادشاہ سے یوسف علیہ السلام کا ذکر کرے۔ اصل عبارت اس طرح ہے: فانساہ ذکر یوسف عند ربہ۔ بعض نے انساہ کے ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف کی ہے کہ یوسف علیہ السلام کو اللہ کا ذکر بھلا دیا،

---

[1] بقرۃ: ۲۵۷　[2] ۹ توبہ: ۱۲　[3] ۶ انعام: ۱۶۴

جو صحیح نہیں ہے کہ ایک نبی اللہ کو بھول جائے اور وہ بھی زندان میں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اپنی حجت کو مناسب وقت کے لیے غیبت میں رکھتا ہے۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ اور (ایک روز) بادشاہ نے کہا: میں نے خواب میں سات موٹی گائیں دیکھی ہیں جنہیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک (خوشے)، اے دربار والو! اگر تم خوابوں کی تعبیر کر سکتے ہو تو میرے اس خواب کی تعبیر سے مجھے آگاہ کرو۔

تشریح کلمات

عِجَافٌ: (ع ج ف) اعجف کے معنی انتہائی لاغر اور دبلا کے ہیں۔

اضغاث: (ض غ ث) خشک گھاس جو انسان کی مٹھی میں آجائے۔ اسی سے اس خواب کو جس کا مطلب واضح نہ ہو اضغاث کہا جاتا ہے۔

احلام: (ح ل م) حَلَمَ خواب دیکھنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰی: قرآن زمان یوسف علیہ السلام کے مصری بادشاہ کو الملک کہتا ہے اور بائبل اسے فرعون کہتی ہے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے معاصر بادشاہان عربی النسل تھے اور لفظ فرعون مصریوں کی مذہبی اصطلاح ہے۔ لہٰذا عربی النسل بادشاہان کو فرعون کہنا سراسر حقیقت کے خلاف ہے۔ اس سے قرآن کی حقانیت اور بائبل کے مؤلفین کی جہالت اور ان کی طرف سے تحریف ثابت ہو جاتی ہے۔

چنانچہ توریت میں آیا ہے:

> اور فرعون جاگا اور دیکھا کہ وہ خواب تھا اور یوں ہوا کہ صبح کو اس کا جی گھبرایا۔ تب اس نے مصر کے سارے جادوگروں اور اس کے سب دانشمندوں کو بلا بھیجا اور فرعون نے اپنا خواب ان سے کہا پر ان میں سے کوئی فرعون کی تعبیر نہ کر سکا۔[1]

اہم نکات

۱۔ مصر میں خوابوں کی تعبیر کا رواج تھا۔[1]

۲۔ تعبیر خواب کو اللہ نے یوسف علیہ السلام کو اقتدار میں لانے کا ذریعہ بنایا۔

قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍ ۚ وَمَا نَحۡنُ بِتَاۡوِیۡلِ الۡاَحۡلَامِ بِعٰلِمِیۡنَ ﴿۴۴﴾

۴۴۔انہوں نے کہا: یہ تو پریشان خوابوں میں سے ہے اور ہم اس قسم کے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔

وَقَالَ الَّذِیۡ نَجَا مِنۡہُمَا وَادَّکَرَ بَعۡدَ اُمَّۃٍ اَنَا اُنَبِّئُکُمۡ بِتَاۡوِیۡلِہٖ فَاَرۡسِلُوۡنِ ﴿۴۵﴾

۴۵۔اور ان دو قیدیوں میں سے جس نے رہائی پائی تھی اور اسے وہ بات بڑی مدت بعد یاد آ گئی، اس نے کہا: میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتاتا ہوں مجھے (یوسف کے پاس زندان) بھیج دیجیے۔

یُوۡسُفُ اَیُّہَا الصِّدِّیۡقُ اَفۡتِنَا فِیۡ سَبۡعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاۡکُلُہُنَّ سَبۡعٌ عِجَافٌ وَّسَبۡعِ سُنۡۢبُلٰتٍ خُضۡرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیۡۤ اَرۡجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۶﴾

۴۶۔اے یوسف! اے بڑے راستگو! سات دبلی گائیں سات موٹی گایوں کو کھا رہی ہیں اور سات خوشے سبز اور سات خوشے خشک ہیں، ہمیں (اس کی تعبیر) بتائیں تاکہ میں لوگوں کے پاس واپس جاؤں (آپ کی سچی تعبیر سن کر) شاید وہ جان لیں۔

قَالَ تَزۡرَعُوۡنَ سَبۡعَ سِنِیۡنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدۡتُّمۡ فَذَرُوۡہُ فِیۡ سُنۡۢبُلِہٖۤ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّمَّا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ یوسف نے کہا: تم سات برس تک متواتر کھیتی باڑی کرتے رہوگے ان سالوں میں جو فصل تم کاٹو ان میں سے قلیل حصہ تم کھاؤ باقی اس کے خوشوں ہی میں رہنے دو۔

ثُمَّ یَاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ سَبۡعٌ شِدَادٌ یَّاۡکُلۡنَ مَا قَدَّمۡتُمۡ لَہُنَّ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّمَّا تُحۡصِنُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ پھر اس کے بعد سات برس ایسے سخت آئیں گے جن میں وہ غلہ کھا لیا جائے گا جو تم نے ان سالوں کے لیے جمع کر رکھا ہو گا سوائے اس تھوڑے حصے کے جو تم بچا کر رکھو گے۔

ثُمَّ یَاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ عَامٌ فِیۡہِ یُغَاثُ النَّاسُ وَفِیۡہِ یَعۡصِرُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔اس کے بعد ایک سال ایسا آئے گا جس میں لوگوں کو خوب بارش ملے گی اور اس میں وہ رس نچوڑیں گے۔

----

[1] پیدائش ۴۱:۸

تشریح کلمات

اُمَّۃٍ : (ا م م) کے معنی عرصہ دراز کے ہیں۔

دَاَبًا : (د ء ب) مسلسل چلنے، مستمر عادت کے معنوں میں ہے۔ اس میں تسلسل اور استمرار کے معنی پائے جاتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍ : ان لوگوں نے بادشاہ سے کہا: یہ انسان کی ذہنی کیفیت پر مشتمل پریشان خواب ہے۔ اس کی تعبیر ہم نہیں جانتے۔ البتہ یہاں ایک بات قابل توجہ ہے کہ ان لوگوں نے کہا: ہم پریشان خواب کی تعبیر نہیں جانتے۔ یہ نہیں کہا پریشان خواب کی کوئی تعبیر ہوتی نہیں ہے۔ جب کہ حق کلام یہ تھا کہ پریشان خواب کی تعبیر ہم کیا جانیں، اس کی تعبیر ہوتی نہیں ہے۔

۲۔ یُوۡسُفُ اَیُّہَا الصِّدِّیۡقُ: حضرت یوسف علیہ السلام تعبیر پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ ساتھ آنے والے حالات کے لیے منصوبہ بھی بیان فرماتے ہیں۔ ورنہ خواب کی تعبیر تو یہ بنتی ہے کہ موٹی گائیں اور سبز بالیاں نعمت کی فروانی اور کھیتی باڑی کی علامت ہیں۔

دبلی گائیں اور خشک بالیاں قحط کی علامت ہیں۔ سات موٹی گایوں کا سات دبلی گایوں کا کھانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قحط کے سات سالوں میں وہی غلہ کھانا ہو گا جو گزشتہ سالوں میں جمع کر رکھا ہے اور خشک اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فصلوں کو خوشوں کے اندر ہی محفوظ رکھا جائے تا کہ اتنی لمبی مدت میں خراب نہ ہوں۔

سات سال کے بعد خشک سالی اور قحط ختم ہونا ہے۔ اس سے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی فراست یا وحی کے ذریعے دو باتوں کا مزید ذکر فرمایا:

i۔ قحط کے سالوں میں کچھ دانے بیج کے لیے محفوظ رکھنا ہوں گے ورنہ خشک سالی ختم ہونے پر بھی زراعت نہ ہو سکے گی: اِلَّا قَلِیۡلًا مِّمَّا تَاۡکُلُوۡنَ۔

ii۔ خشک سالی کے بعد شادابی کا دور شروع ہو گا کیونکہ خشک سالی ختم ہونے کا مطلب شادابی ہے۔

وَ فِیۡہِ یَعۡصِرُوۡنَ: باران رحمت سے جب زمین شاداب ہو جاتی ہے تو رس دینے والے پھل اور میوے پیدا ہوتے ہیں اور مویشی بھی وافر مقدار میں دودھ دینا شروع کرتے ہیں۔ ان دو باتیں کا ذکر بادشاہ کے خواب میں نہ تھا۔

اہم نکات

۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے زندان سے مملکت مصر کے لیے پندرہ سالوں کے لیے ایک جامع

اقتصادی منصوبہ بندی وضع فرمائی۔

۲۔ اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے زمانے کا علم تعبیر خواب عنایت فرمایا۔

۳۔ داستان یوسف علیہ السلام تین خوابوں پر مشتمل ہے: i۔ خواب یوسف علیہ السلام ii۔ خواب زندانی iii۔ خواب بادشاہ۔

وَقَالَ الۡمَلِكُ ائۡتُوۡنِیۡ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوۡلُ قَالَ ارۡجِعۡ اِلٰی رَبِّكَ فَسۡـَٔلۡهُ مَا بَالُ النِّسۡوَةِ الّٰتِیۡ قَطَّعۡنَ اَیۡدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ بِكَیۡدِهِنَّ عَلِیۡمٌ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ اور بادشاہ نے کہا: یوسف کو میرے پاس لاؤ پھر جب قاصد یوسف کے پاس آیا تو انہوں نے کہا: اپنے مالک کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا مسئلہ کیا تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ دیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاریوں سے یقیناً خوب باخبر ہے۔

تشریح کلمات

البال: (ب و ل) اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جس کی فکر یا پرواہ کی جائے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الۡمَلِكُ ائۡتُوۡنِیۡ بِهٖ: تعبیر خواب سن کر بادشاہ نے اندازہ لگایا ہو گا کہ یوسف علیہ السلام ایک غیر معمولی شخصیت ہیں جو نہ صرف خوابوں کی تعبیر سے بخوبی واقف ہیں بلکہ اپنی جوانی زندان میں گزارنے اور جواں سال، ناتجربہ کار ہونے کے باوجود تدبیر مملکت، بالخصوص اقتصادی پالیسی وضع کرنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ بادشاہ نے اسی لیے ان کو زندان سے آزاد کر کے اپنے پاس بلا لیا۔

۲۔ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوۡلُ: آپؑ نے آزاد ہونے سے انکار کیا اور قاصد سے فرمایا: اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ اور ان سے پوچھو، ان عورتوں کا مسئلہ کیا تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نہیں چاہتے تھے کہ اپنی پیشانی پر ایک الزام کا داغ لیے شاہ کی معافی کے سہارے آزاد ہوں جائیں لہٰذا غیرت اور جوانمردی کا یہی تقاضا تھا کہ پہلے اس الزام سے آزاد ہو جائیں، اصل مجرم بے نقاب ہو جائے اور ان کی پاکدامنی ثابت ہو جائے، اس کے بعد فخر و اعزاز کے ساتھ زندان سے باہر قدم رکھیں۔

۳۔ اِنَّ رَبِّیۡ بِكَیۡدِهِنَّ عَلِیۡمٌ: آپؑ نے کسی پر الزام دھرنے کی جگہ حقیقت امر کے بارے میں تحقیق کرنے کی خواہش ظاہر فرمائی تاکہ امر واقع خود منکشف ہو کر سامنے آ جائے۔ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے پروردگار پر بھرپور بھروسہ ہے جس کے سامنے سرخرو ہیں۔ اس لیے فرمایا: میرا رب تو ان کی

مکاریوں سے باخبر ہے۔

۴۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے اخلاق کا کمال ہے کہ آپؑ نے عزیز مصر کی بیگم کا ذکر نہیں کیا جس نے اپنا جرم چھپانے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام پر الزام دھرا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی اصل مجرم تو وہی عورت تھی۔ شاید اس کا مقصد حتی الامکان عزیز مصر کی آبرو بچانا ہو کیونکہ وہ اس کے گھر میں رہے تھے اور نمک کھایا ہے۔

اہم نکات

۱۔ پاکدامن حقائق کا مشتاق اور مجرم حقیقت سے خوف کھاتا ہے۔

۲۔ جس کا معاملہ اللہ کے ساتھ درست ہو، وہ دنیا و آخرت میں سرخرو رہتا ہے۔

۳۔ غیرت مند انسان کے لیے الزام سے آزادی، زندان سے آزادی سے زیادہ اہم ہے۔

قَالَ مَا خَطۡبُکُنَّ اِذۡ رَاوَدۡتُّنَّ یُوۡسُفَ عَنۡ نَّفۡسِہٖ ؕ قُلۡنَ حَاشَ لِلّٰہِ مَا عَلِمۡنَا عَلَیۡہِ مِنۡ سُوۡٓءٍ ؕ قَالَتِ امۡرَاَتُ الۡعَزِیۡزِ الۡـٰٔنَ حَصۡحَصَ الۡحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدۡتُّہٗ عَنۡ نَّفۡسِہٖ وَ اِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ (بادشاہ نے عورتوں سے) پوچھا: اس وقت تمہارا کیا واقعہ تھا جب تم نے یوسف کو اس کے ارادے سے پھسلانے کی کوشش کی تھی؟ سب عورتوں نے کہا: پاکیزہ ہے اللہ، ہم نے تو یوسف میں کوئی برائی نہیں دیکھی (اس موقع پر) عزیز کی بیوی نے کہا: اب حق کھل کر سامنے آ گیا میں نے ہی یوسف کو اس کی مرضی کے خلاف پھسلانے کی کوشش کی تھی اور یوسف یقیناً سچوں میں سے ہیں۔

تشریح کلمات

خطبکم: (خ ط ب) الخطب اہم معاملہ جس کے بارے میں کثرت سے تخاطب ہو۔

حَصۡحَصَ الۡحَقُّ: (ح ص ح ص) کے معنی ہیں حق بات جو کسی دباؤ کی وجہ سے چھپی ہوئی ہو۔ اس دباؤ کے دور ہونے کی وجہ سے واضح ہو کر سامنے آ گئی۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ مَا خَطۡبُکُنَّ: بادشاہ بذات خود اس مسئلہ پر تحقیق شروع کرتا ہے اور لگتا ہے ان عورتوں سے سوال کرنے سے پہلے بادشاہ اس معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ بادشاہ کے سوال کا لب و لہجہ بتاتا

ہے: مَا خَطۡبُكُنَّ وہ قابل توجہ معاملہ اور اس کی حقیقت کیا تھی جب تم نے یوسف کو پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ شاہ کے سوال میں یہ امر مسلم مانا گیا ہے کہ اقدام جرم عورتوں کی طرف سے ہی ہوا تھا: اِذۡ رَاوَدۡتُّنَّ۔ سوال یہ تھا کہ اس اقدام کے بعد کیا ہوا؟ عورتوں نے دیکھا کہ اس جگہ اعتراف جرم کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ جواب میں کہا:

۲۔ قُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ: پاکیزہ ہے اللہ کی ذات۔ ہم نے یوسف علیہ السلام میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔ معاملہ اس حد تک واضح ہو چکا تھا کہ عورتوں نے اپنی صفائی تک پیش نہیں کی۔ صرف یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کی گواہی دی۔

سوال پہلے دیگر عورتوں سے اس لیے ہوا کہ وہ اس واقعہ کی عینی شاہد تھیں۔ ان سب کے سامنے عزیز کی بیوی نے کہا تھا: میں نے یوسف علیہ السلام کو پھنسانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے اپنی عصمت قائم رکھی۔ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کر دیا جائے گا (آیت ۳۲)۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کو قید کیا جانا ان کی پاکدامنی کا ایک ثبوت تھا۔

۳۔ قَالَتِ امۡرَاَتُ الۡعَزِيۡزِ: بعد میں اس جرم کی مرکزی کردار عزیز کی بیوی نے دیکھا راز کھل چکا ہے، حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے، اب اعتراف جرم کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے۔ کہا: اب حق کھل کر سامنے آگیا۔ میں نے ہی یوسف علیہ السلام کو اپنے ارادے سے پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ بالکل سچے ہیں۔

مقدمہ ختم ہوا۔ یوسف علیہ السلام کی فتح ہوئی۔ اس طویل سازش میں کنعان کا غریب الوطن غلام اور برسوں کا زندانی کامیاب ہوا۔ جب کہ عزیز مصر، اس کی بیگم اور بڑے بڑے خاندانوں کی بیگمات ناکام ہو گئیں۔ آخر میں وہ حق و صداقت کے سامنے سرنگوں ہوئیں اور حق سربلند ہوا۔

اہم نکات

۱۔ حق ایسی طاقت ہے جس کے سامنے دوسری طاقتیں سرنگوں ہو جاتی ہیں: الۡـٰٔنَ حَصۡحَصَ الۡحَقُّ ....

۲۔ دنیا والے کتنا ہی جھٹلائیں، سچائی دب نہیں سکتی: وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيۡنَ۔

ذٰلِكَ لِيَعۡلَمَ اَنِّيۡ لَمۡ اَخُنۡهُ بِالۡغَيۡبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِيۡ كَيۡدَ الۡخَآئِنِيۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ (یوسف نے کہا) ایسا میں نے اس لیے کیا کہ وہ جان لے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ کوئی خیانت نہیں کی اور اللہ خیانت کاروں کے مکر و فریب کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بات کہ میں نے زندان سے آزاد ہونے کو قبول نہیں کیا اور اپنے اوپر عائد الزام کی تحقیقات کی شرط لگائی تا کہ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے اور عزیز جان لے کہ میں نے در پردہ اس کی ناموس کے بارے میں کوئی خیانت نہیں کی ہے اور دنیا والے بھی یہ جان لیں کہ مکر وفریب پر مبنی کوئی سازش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتی، اس وقت کہی ہوگی جب شاہی دربار میں فیصلہ آپؑ کے حق میں ہوا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے یہ جملہ عزیز کی بیوی کا ہے کہ اس نے کہا: میں نے یوسف علیہ السلام کی غیر حاضری میں اس کے ساتھ کوئی خیانت نہیں کی ہے بلکہ اپنے جرم کا اقرار کر رہی ہوں۔ یہ سیاق آیت کے صریح خلاف ہے کیونکہ عزیز کی بیوی کی خیانت کی وجہ سے یوسف علیہ السلام آٹھ نو سال زندان میں رہ چکے ہیں۔ اس کے باوجود وہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ میں نے یوسف علیہ السلام کی غیر حاضری میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی ہے؟ رہی یہ بات کہ اس نے اعتراف کیا ہے، خیانت نہیں کی ہے، بالکل غیر مربوط بات ہے۔ چونکہ یہ خیانت کا اعتراف ہے جس سے خیانت ختم نہیں، ثابت ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے عزیز مصر کو پہلے ہی یوسف علیہ السلام کی بے گناہی کا علم تھا۔ یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ اگرچہ قمیض کے پیچھے سے پھٹنے کی وجہ سے جو شہادت ملی تھی اس بنا پر عزیز مصر نے اس وقت تو مان لیا اس کی بیوی خطا کار تھی لیکن یہ بات بالکل ثابت نہیں کہ یہ موقف تا آخر برقرار رہا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو زندان نہ بھیجتا اور پھر کلام سے پیغمبرانہ خوشبو آتی ہے۔ عزیز کی بیوی جیسی ایک غیر ذمہ دار عورت نہیں کہہ سکتی: وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے ساتھ معاملہ درست ہو تو بھی لوگوں میں بدگمانی دور کرنا چاہیے: لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ ....

۲۔ خیانت کو کامیابی حاصل نہیں ہوتی: لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ....

وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ اور میں اپنے نفس کی صفائی پیش نہیں کرتا کیونکہ (انسانی) نفس تو برائی پر اکساتا ہے مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے بے شک میرا پروردگار بڑا بخشنے، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

انبیاء علیہم السلام عرفان کی اس منزل پر فائز ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ہر عمل میں رب کی طرف توجہ

رکھتے ہیں۔ اگر رب کی رحمت شامل حال نہ ہو تو نفس امارہ انسان کو برائی کی طرف لے جائے۔ تقریباً اسی مضمون کی آیت (۳۳) پہلے گزر گئی: وَ اِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ کَیۡدَہُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡہِنَّ وَ اَکُنۡ مِّنَ الۡجٰہِلِیۡنَ۝ یہ جملہ آپؑ نے قَالَ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ کے بعد فرمایا اور اس آیت میں لَمۡ اَخُنۡہُ بِالۡغَیۡبِ کے بعد کہا کہ میں اپنے نفس کی برائت نہیں کرتا ہوں. نفس تو برائی پر اکساتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام ان اعمال کو اپنا کمال تصور کرنے کی جگہ انہیں مدد الٰہی سمجھتے ہیں۔

اس بیان سے ان لوگوں کے لیے شافی جواب مل گیا جو اس جملے کو حضرت یوسف علیہ السلام کے شایان شان نہیں سمجھتے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ نفس مومن کو اپنی حالت پر نہیں چھوڑتا ورنہ نفس بے لگام ہے۔ دعا کا جملہ ہے: رَبِّ لَا تَکِلۡنِی اِلَی نَفۡسِی طَرۡفَۃَ عَیۡنٍ اَبَدًا[1] اے مالک! چشم زدن کے بھی مجھے میرے نفس کے حوالے نہ فرما۔

وَ قَالَ الۡمَلِکُ ائۡتُوۡنِیۡ بِہٖۤ اَسۡتَخۡلِصۡہُ لِنَفۡسِیۡ ۚ فَلَمَّا کَلَّمَہٗ قَالَ اِنَّکَ الۡیَوۡمَ لَدَیۡنَا مَکِیۡنٌ اَمِیۡنٌ﴿۵۴﴾

۵۴۔ اور بادشاہ نے کہا: اسے میرے پاس لے آؤ، میں اسے خاص طور سے اپنے لیے رکھوں گا پھر جب یوسف نے بادشاہ سے گفتگو کی تو اس نے کہا: بے شک آج آپ ہمارے بااختیار امانتدار ہیں۔

قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ﴿۵۵﴾

۵۵۔ یوسف نے کہا: مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کریں کہ میں بلاشبہ خوب حفاظت کرنے والا، مہارت رکھنے والا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالَ الۡمَلِکُ ائۡتُوۡنِیۡ بِہٖۤ: جب بادشاہ کو اندازہ ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نفس کی طہارت اور کردار کی بلندی کے ساتھ فہم و فراست اور لیاقت و حکمت کے مالک ہیں تو ان کو زندان سے آزاد کر کے اپنے پاس اس لیے بلایا تھا کہ انہیں اپنا معتمد خصوصی اور مشیر خاص بنایا جائے۔

۲۔ فَلَمَّا کَلَّمَہٗ: لیکن جب حضرت یوسف علیہ السلام سے روبرو ہو کر گفتگو کی تو ان کا مقام ایک

---

[1] الکافی ۲: ۵۸۱ باب دعوات موجزات ....

مشیر و معتمد سے بہت بالاتر پایا اور بادشاہ کا موقف بدل گیا۔ اب معتمد خاص نہیں، سلطنت و تمکنت کا مالک بنا دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے امور مملکت میں اقتصادی معاملات کو آنے والے حالات کے پیش نظر اہمیت دی اور خزائن الارض کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ امور مملکت میں سب سے نازک مسئلہ عام حالات میں اقتصادی مسائل ہوا کرتے ہیں۔ خصوصاً قحط سالی کی صورت میں تو یہ مسئلہ زیادہ پیچیدہ اور وبال جان بن جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اقتدار برائے اقتدار قبول نہیں فرمایا بلکہ برائے عدل و انصاف اور خدمت خلق قبول فرمایا۔ یہ کافر کی حکومت کی تقویت کے لیے نہیں، انصاف کی حکومت کے قیام کے لیے، لوگوں کو غلام بنانے کے لیے نہیں جیسا کہ شاہی نظام استبداد میں ہوتا ہے بلکہ انسانیت کو ہلاکت سے نجات دلانے اور عدل و انصاف کو متعارف کرانے کے لیے تھا۔ آنے والے قحط کے سالوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کی وضع کردہ اقتصادی پالیسی اور تقسیم دولت میں عدل و انصاف اس بات پر گواہ ہے۔

واضح رہے احکام الٰہی کے لیے زمان و مکان کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ اسی لیے شریعتیں منسوخ ہوتی ہیں اور ایک ہی شریعت میں احکام منسوخ ہوتے ہیں۔ بعض احکام قاعدہ اہم و مہم کے تحت ولایت حاکم کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں اور ان میں لچک ہوتی ہے۔ ان کی تشخیص جامع الشرائط فقیہ دے سکتے ہیں۔

لہٰذا یہ سوالات پیدا ہی نہیں ہوتے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک طاغوت کو اپنی خدمات کس طرح پیش کیں اور کیا کافر حکومت کی تقویت درست ہے؟

اسی طرح ان مفاد پرستوں کی یہ توجیہ بھی غلط ہے کہ وہ ذاتی مفادات کے لیے ظالموں کے درباری اور ان کے مظالم کے دست و بازو بن کر حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کو جواز کے لیے دلیل بناتے ہیں۔

ہم نے تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات دیکھے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے اپنے ناجائز مفادات کے لیے جواز پیدا کرنے کی غرض سے بزرگان دین کے سیرت و کردار، اپنے کردار کی سطح پر اتارتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ فرمان: اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ خود نمائی نہیں ہے بلکہ اپنے منصب و ذمے داری کا تعارف ہے۔ جیسا کہ تمام انبیاء یہی تو فرماتے ہیں کہ ہم اللہ کے رسول ہیں۔ صادق القول، امین ہیں، ہادیان برحق ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اہم انتظامی امور کی اہلیت کے لیے امانت و مہارت ضروری ہے۔

۲۔ مفادات، خواہ مادی ہی کیوں نہ ہوں، ان کے حصول میں کامیابی حکمرانوں کے سامنے جھکنے اور زمین بوس ہونے میں نہیں بلکہ کرامت نفس اور غیرت و حمیت کے تحفظ میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۗ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں اقتدار دیا کہ وہ جہاں چاہے اپنا مسکن بنا لے، ہم جسے چاہتے ہیں اپنی رحمت سے نوازتے ہیں اور نیک لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کرتے۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔اور آخرت کا اجر تو ایمان اور تقویٰ والوں کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ: اللہ جب کسی کو اقتدار دینا چاہتا ہے تو اس کے سامنے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ برادران یوسف نے ان کو کنویں کی گہرائیوں میں ڈالا۔ اللہ نے عزیز مصر کے گھر پہنچا دیا۔ لوگوں نے ان کو غلام بنایا، اللہ نے انہیں زندان سے نکال کر مصر کی سلطنت دی۔ اب وہ جہاں چاہے اپنا مسکن بنائیں۔ پورا ملک ان کے دائرہ اقتدار میں آ گیا۔

۲۔ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ: یہ اقتدار و تمکنت، نیک کرداری کا دنیوی اجر ہے اور اخروی اجر اس سے بہتر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی رحمت ان لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے جو آزمائشوں کے مراحل سے گزرتے ہیں: نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا ....

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔اور برادران یوسف (مصر) آئے اور یوسف کے ہاں حاضر ہوئے پس یوسف نے تو انہیں پہچان لیا اور وہ یوسف کو پہچان نہیں رہے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ: بیان واقعہ میں چند کڑیاں مذکور نہیں ہیں جو قرینے سے ہر پڑھنے والے کے ذہن آجاتی ہیں۔ یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب کے مطابق سات سال غلے کی فراوانی رہی اور ان سالوں میں وہ تمام پیش بندیاں کیں جن کا مشورہ آپؑ نے بادشاہ کو دیا تھا۔ اس کے بعد قحط کے سات سال شروع

ہو گئے۔ یہ قحط مصر کے علاوہ دیگر قریبی علاقوں تک پھیل گیا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی دانشمندی اور حسن تدبیر کی وجہ سے صرف مصر میں قحط سالی کے باوجود غلہ کی فراوانی تھی۔ اس لیے قریبی ہمسایہ علاقوں کے لوگ غلہ خریدنے مصر آتے تھے۔

۲۔ فَعَرَفَهُمۡ وَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ: برادران یوسف بھی غلہ خریدنے مصر آگئے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاں حاضر ہوئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ یوسف علیہ السلام کو نہیں پہچان سکے۔

یہ بات قرین قیاس بھی ہے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو نوعمری میں کنویں میں ڈالا گیا تھا۔ اس کے بعد چند سال عزیز مصر کے گھر گزارے۔ زندان میں آٹھ نو سال گزارنے کے بعد امور سلطنت کو سنبھالے سات سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا۔ اس عرصے میں لڑکپن کا نقشہ بدلنے سے پختہ سال کے خد و خال بالکل مختلف تھے۔ پھر جس غلام کو قافلے والوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا اس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ عزیز مصر اور خزائن الارض کا مختار کل بن چکا ہے۔

اہم نکات

۱۔ برادران یوسف نے حسد کی بنیاد پر جسے خوار کرنا چاہا آج وہ خود اس کے در پر سائل بن کر کھڑے ہیں۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمۡ بِجَهَازِهِمۡ قَالَ ائۡتُوۡنِيۡ بِاَخٍ لَّكُمۡ مِّنۡ اَبِيۡكُمۡ ۚ اَلَا تَرَوۡنَ اَنِّيۡۤ اُوۡفِي الۡكَيۡلَ وَاَنَا خَيۡرُ الۡمُنۡزِلِيۡنَ ﴿۵۹﴾

فَاِنۡ لَّمۡ تَاۡتُوۡنِيۡ بِهٖ فَلَا كَيۡلَ لَكُمۡ عِنۡدِيۡ وَلَا تَقۡرَبُوۡنِ ﴿۶۰﴾

قَالُوۡا سَنُرَاوِدُ عَنۡهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوۡنَ ﴿۶۱﴾

۵۹۔ اور جب یوسف ان کے لیے سامان تیار کر چکے تو کہنے لگے: (دوبارہ آؤ تو) باپ کی طرف سے اپنے ایک (سوتیلے) بھائی کو میرے پاس لانا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پورا ناپتا ہوں اور بہترین مہمان نواز ہوں؟

۶۰۔ پس اگر تم اس بھائی کو نہ لاؤ گے تو میرے پاس سے نہ تو تمہیں کوئی غلہ ملے گا اور نہ ہی تم میرے نزدیک آنا۔

۶۱۔ انہوں نے کہا: ہم اس کے والد سے اسے طلب کریں گے اور ہم ایسا کر کے رہیں گے۔

تشریح کلمات

بِجَهَازِهِمۡ: (ج ھ ز) الجهاز ساز و سامان جو تیار کر کے رکھا جائے۔ التجهيز تیار کردہ سامان کا لادنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَمَّا جَهَّزَهُمۡ بِجَهَازِهِمۡ: واقعے کا تسلسل کچھ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جب وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دربار میں داخل ہوئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تو انہیں پہچان لیا لیکن بظاہر گفتگو اس طرح ہوئی ہوگی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا ہوگا: آپ کون لوگ ہیں۔ جواب دیا ہوگا: ہم ملک شام سے آ رہے ہیں اور ہم ایک باپ کی اولاد ہیں۔ ہمارے والد یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم خلیل ہیں۔ ہم دس بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک بھائی والد کے پاس ہے یا حضرت یوسف علیہ السلام نے جان بوجھ کر بات اس نہج پر چلائی ہوگی کہ اپنے بھائی بنیامین کا ذکر آئے۔

۲۔ فَاِنۡ لَّمۡ تَاۡتُوۡنِیۡ بِهٖ: جب ان کو مناسب غلہ فراہم فرمایا اور سامان تیار ہو گیا، اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اپنے اس بھائی کو ساتھ لے آؤ۔ تمہیں یہاں ہر طرح کا امن ہوگا۔ تمہاری بہترین پزیرائی ہوگی اور ضرورت کا غلہ بھی مل جایا کرے گا۔ دوسری صورت میں تمہیں غلہ نہیں ملے گا، نہ ہی میرے دربار میں آ سکو گے۔

برادران یوسف کو علم تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بنیامین کو ساتھ بھیجنے پر آسانی سے آمادہ نہ ہوں گے۔ اس لیے لفظ سَنُرَاوِدُ جو طلب کوشش کے معنوں میں ہے، استعمال کیا۔

اہم نکات

۱۔ اخلاق انبیاء ہے کہ حاسد برادران کے ساتھ بہترین سلوک کیا جائے۔ اَنَا خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ

۲۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے خاندان کو یکجا کرنے کے لیے اقتصادی دباؤ استعمال کیا۔ فَلَا کَیۡلَ

وَ قَالَ لِفِتۡیٰنِهِ اجۡعَلُوۡا بِضَاعَتَهُمۡ فِیۡ رِحَالِهِمۡ لَعَلَّهُمۡ یَعۡرِفُوۡنَهَاۤ اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَهۡلِهِمۡ لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ اور یوسف نے اپنے خدمتگاروں سے کہا: ان کی پونجی (جو غلے کی قیمت تھی) انہی کے سامان میں رکھ دو تاکہ جب وہ پلٹ کر اپنے اہل و عیال کی طرف جائیں تو اسے پہچان لیں، اس طرح ممکن ہے وہ واپس آ جائیں۔

تشریح کلمات

البضاعۃ: (ب ض ع) مال کا وافر حصہ جو تجارت کے لیے الگ کر لیا گیا ہو۔

الرحل: (ر ح ل) ہر وہ چیز جسے اونٹ پر اس لیے باندھا جائے کہ اس پر سوار ہوا جائے۔ پھر مجازاً خود اونٹ پر بولا جانے لگا۔ آگے آیت نمبر ۶۵ میں رحال کی جگہ متاع فرمایا ہے: وَلَمَّا فَتَحُوۡا مَتَاعَهُمۡ .... جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا ان کی پونجی ان کو واپس کر دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے الرحل، متاع یعنی سامان کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

برادران یوسف جو مال غلے کی قیمت کے لیے لائے تھے وہ اس زمانے میں نقدی اور کرنسی کی شکل میں نہ تھا۔ اس زمانے میں مال کا تبادلہ مال کے ساتھ ہوتا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کا مال بھی غلے کے ساتھ واپس کیا تا کہ برادران یوسف اور دیگر متعلقہ افراد مطمئن ہو جائیں، حضرت یوسف علیہ السلام کے احسان مند ہو جائیں اور دوبارہ بنیامین کو لے کر واپس آ جائیں۔

اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے پاس بلانے کے لیے کئی ذریعے استعمال کیے۔ غلہ پورا دیا۔ بہترین مہمان نوازی کی۔ آیندہ غلہ نہ دینے کی دھمکی دی اور غلے کی قیمت بھی واپس کی۔

اہم نکات

۱۔ احسان وہ بہترین حربہ ہے، جسے شرفاء استعمال کرتے ہیں۔

فَلَمَّا رَجَعُوۡۤا اِلٰۤی اَبِیۡهِمۡ قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الۡکَیۡلُ فَاَرۡسِلۡ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَکۡتَلۡ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۶۳﴾
قَالَ هَلۡ اٰمَنُکُمۡ عَلَیۡهِ اِلَّا کَمَاۤ اَمِنۡتُکُمۡ عَلٰۤی اَخِیۡهِ مِنۡ قَبۡلُ ؕ فَاللّٰهُ خَیۡرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۶۴﴾

۶۳۔ پھر جب وہ اپنے والد کے پاس واپس گئے تو کہنے لگے: اے ہمارے ابا! ہمارے لیے غلے کی بندش ہو گئی لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے تاکہ ہم غلہ حاصل کریں اور بے شک ہم بھائی کی حفاظت کریں گے۔

۶۴۔ یعقوب بولے: کیا میں اس کے بارے میں تم پر اسی طرح اعتماد کروں جس طرح اس سے پہلے اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں کیا تھا؟ اللہ بہترین محافظ ہے اور وہ سب سے بہترین رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا رَجَعُوۡۤا اِلٰۤی اَبِیۡهِمۡ: سیاق آیت سے مفہوم ہوتا ہے کہ بیٹوں نے سب سے پہلے حضرت یعقوب

علیہ السلام کو آئندہ غلہ کی بندش کی خبر سنائی اور بنیامین کو ان کے ہمراہ مصر بھیجنے پر اصرار کیا۔

۲۔ قَالَ هَلۡ اٰمَنُكُمۡ عَلَيۡهِ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یاد دلایا کہ تم نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے تم پر اعتماد ختم ہو گیا اگرچہ یوسف کا بہترین محافظ اللہ ہے لیکن تم نے اپنی بداعتمادی ظاہر کر دی ہے۔

۳۔ فَاللّٰهُ خَيۡرٌ حٰفِظًا: اگرچہ اس سے پہلے اس کے بھائی یوسف علیہ السلام کے بارے میں تمہارے عمل نے بد اعتمادی پیدا کی ہے لیکن میرا اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہے۔ وہی حفاظت دینے والا ہے۔ ہو سکتا ہے اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ یوسف علیہ السلام کو اللہ نے اپنے حفظ و امان میں رکھا ہے۔ تم نے یوسف علیہ السلام پر رحم نہیں کیا تو بہترین رحم کرنے والا اس پر رحم کرے گا۔

اہم نکات

۱۔ ایک بار کی بداعتمادی کے بعد انسان کی قیمت کم ہو جاتی ہے: كَمَاۤ اَمِنۡتُكُمۡ عَلٰۤى اَخِيۡهِ...۔

وَ لَمَّا فَتَحُوۡا مَتَاعَهُمۡ وَجَدُوۡا بِضَاعَتَهُمۡ رُدَّتۡ اِلَيۡهِمۡ ؕ قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا مَا نَبۡغِىۡ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتۡ اِلَيۡنَا ۚ وَنَمِيۡرُ اَهۡلَنَا وَنَحۡفَظُ اَخَانَا وَنَزۡدَادُ كَيۡلَ بَعِيۡرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيۡلٌ يَّسِيۡرٌ ﴿۶۵﴾

۶۵۔اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا ان کی پونجی انہیں واپس کر دی گئی کہنے لگے: اے ہمارے ابا! ہمیں اور کیا چاہیے؟ دیکھئے! ہماری یہ پونجی ہمیں واپس کر دی گئی ہے اور ہم اپنے اہل و عیال کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ غلہ زیادہ لائیں گے اور وہ غلہ آسانی سے (حاصل) ہو جائے گا۔

تشریح کلمات

نَمِيۡرُ: (ن م ر) کھانے کی چیزیں حاصل کرنا۔

تفسیر آیات

جب دیکھا یوسف علیہ السلام نے غلے کی قیمت بھی واپس کی ہے تو یہ بات مزید باعث اطمینان ہو گئی کہ ایسے مہربان شخص کے پاس بنیامین کو لے کر جانے میں کوئی باک نہیں ہے۔ اس سے اولاد یعقوب کے موقف میں تقویت آ گئی اور انہوں نے اپنے موقف کی حمایت میں مزید چند تائیدی باتوں کا اضافہ کیا۔ اول یہ کہ بنیامین کو بھیجنے سے اہل و عیال کے لیے غلہ مل جائے گا: نَمِيۡرُ اَهۡلَنَا...۔

دوم یہ کہ ایسے شخص کے پاس جانے کی وجہ سے ہم محفوظ بھی ہیں: نَحۡفَظُ اَخَانَا ....

سوم یہ کہ بنیامین کے جانے سے ایک بار شتر کا اضافہ ہو جائے گا: وَنَزۡدَادُ کَیۡلَ بَعِیۡرٍ .... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام، غلہ کی تقسیم فی کس ایک شتر کے حساب سے کرتے تھے اور راشننگ کا نظام نافذ تھا۔

چہارم یہ کہ بنیامین کے جانے سے اعتماد بحال ہوگا اور ان سب چیزوں کا حصول آسان ہو جائے گا: ذٰلِکَ کَیۡلٌ یَّسِیۡرٌ۔

اہم نکات

۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا احسانی حربہ مؤثر ثابت ہوا۔

۲۔ اعتماد بحال ہونے سے معاملات آسان ہوجاتے ہیں۔

قَالَ لَنۡ اُرۡسِلَہٗ مَعَکُمۡ حَتّٰی تُؤۡتُوۡنِ مَوۡثِقًا مِّنَ اللّٰہِ لَتَاۡتُنَّنِیۡ بِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ یُّحَاطَ بِکُمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوۡہُ مَوۡثِقَہُمۡ قَالَ اللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوۡلُ وَکِیۡلٌ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ (یعقوب نے) کہا: میں اسے ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک کہ تم اللہ کے ساتھ عہد نہ کرو کہ تم اسے میرے پاس ضرور واپس لاؤ گے مگر یہ کہ تم (کسی مشکل میں) گھیر لیے جاؤ پھر جب انہوں نے اپنا عہد دے دیا تو یعقوب نے کہا: ہم جو بات کر رہے ہیں اس پر اللہ ضامن ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ لَنۡ اُرۡسِلَہٗ مَعَکُمۡ: یہ عہد و میثاق ان باتوں کے بارے میں ہے جو انسان کے دائرۂ اختیار میں ہیں جیسا کہ ان لوگوں نے جان بوجھ کر یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔

۲۔ اِلَّاۤ اَنۡ یُّحَاطَ بِکُمۡ: اگر بامر مجبوری اس کی خلاف ورزی ہوگئی تو قابل درگزر ہوگی۔ یہ استثنیٰ ایک پیغمبری و پدری شفقت ہے کیونکہ اس زمانے میں کنعان سے مصر کا سفر خطرے سے خالی نہ تھا اور سفر بھی دراز تھا۔

۳۔ فَلَمَّاۤ اٰتَوۡہُ مَوۡثِقَہُمۡ: عہد و پیمان ملنے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اللہ پر توکل کا اظہار کیا کیونکہ توکل کا مطلب اسباب و علل سے بے نیازی نہیں ہے بلکہ توکل کا مطلب یہ ہے کہ صرف اسباب و علل کافی نہ سمجھے بلکہ ان کے ماوراء ارادہ الٰہی درکار ہوتا ہے۔ وہی قابل بھروسا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عہد و پیمان اختیاری امور میں ہوتا ہے۔

۲۔ اسباب و وسائل کے بعد توکل کیا جاتا ہے۔

وَ قَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدۡخُلُوۡا مِنۡۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادۡخُلُوۡا مِنۡ اَبۡوَابٍ مُّتَفَرِّقَۃٍ ؕ وَ مَاۤ اُغۡنِیۡ عَنۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ۚ وَ عَلَیۡہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ اور یعقوب نے کہا: بیٹو! تم سب ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا اور میں اللہ کے مقابلے میں تمہارے کچھ بھی کام نہیں آ سکتا حکم صرف اللہ ہی کا چلتا ہے، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور بھروسا کرنے والوں کو اسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَدۡخُلُوۡا مِنۡۢ بَابٍ وَّاحِدٍ: یہ ہدایات شہر پناہ کے دروازے سے داخل ہونے کے لیے دی گئی تھیں یا دربار میں داخل ہونے کے لیے؟

آیت میں اس پر کوئی خاص قرینہ نہیں ہے نیز ان ہدایات کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے؟ اس پر بھی اس آیت میں کوئی شاہد نہیں ہے۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ یہ ان کے تحفظ کے لیے تدبیر ہے۔ ممکن ہے چشم بد سے تحفظ کے لیے ہو یا حسد کرنے والوں سے یا کسی ناگہاں واقعہ سے، جس کا ایک اجمالی احساس حضرت یعقوب علیہ السلام کو ہوا ہو گا کہ کہیں اس سفر میں کچھ اور بیٹے باپ سے بچھڑ نہ جائیں۔

اس احساس خطر کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک تدبیر سوچی کہ وہ ایسی حالت میں شہر میں داخل نہ ہوں کہ نظریں ان کی طرف جذب ہو جائیں اور ان کا شہر میں آنا وہاں کے لوگوں کو محسوس ہو جائے بلکہ متفرق دروازوں سے غیر محسوس طریقے سے داخل ہو جائیں۔ بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایسا کرنے کا حکم اس لیے دیا کہ اہل مصر ان کو قبائلی لوٹ مار کرنے والے نہ سمجھیں۔

۲۔ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ: پھر فرمایا: یہ بچاؤ کی ایک تدبیر ضرور ہے مگر فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ تدبیریں اس وقت مؤثر ہوتی ہیں جب اللہ چاہے۔ لہٰذا ہمیں تدبیریں کرنی چاہئیں لیکن یہ تدبیریں مستقل مؤثر نہیں ہیں بلکہ یہ اس وقت مؤثر ہیں جب اللہ چاہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کو تدبیر بھی کرنی چاہیے توکل بھی۔ تدبیر توکل کے منافی نہیں ہے۔

۲۔ تدبیر اس وقت مؤثر ہوتی ہے جب اللہ چاہے۔ لہٰذا تدبیر میں توکل ہے۔

وَ لَمَّا دَخَلُوۡا مِنۡ حَیۡثُ اَمَرَہُمۡ اَبُوۡہُمۡ ؕ مَا کَانَ یُغۡنِیۡ عَنۡہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ اِلَّا حَاجَۃً فِیۡ نَفۡسِ یَعۡقُوۡبَ قَضٰہَا ؕ وَ اِنَّہٗ لَذُوۡ عِلۡمٍ لِّمَا عَلَّمۡنٰہُ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کے والد نے انہیں حکم دیا تھا تو کوئی انہیں اللہ سے بچانے والا نہ تھا مگر یہ کہ یعقوب کے دل میں ایک خواہش تھی جسے انہوں نے پورا کر دیا اور یعقوب یقیناً صاحب علم تھے اس لیے کہ ہم نے انہیں علم دیا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَمَّا دَخَلُوۡا مِنۡ حَیۡثُ اَمَرَہُمۡ: اولاد یعقوب اپنے والد کی ہدایات کے مطابق مختلف دروازوں سے داخل ہوئی۔ جس مقصد کے لیے یہ تدبیر اپنائی گئی تھی وہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ کوئی سانحہ پیش نہ آئے لیکن یعقوب علیہ السلام کی یہ تدبیر اگر اللہ کے فیصلے کے ساتھ متصادم ہو تو پھر تدبیر کارآمد نہیں ہوتی

۲۔ مَا کَانَ یُغۡنِیۡ عَنۡہُمۡ: کیونکہ تدبیر اللہ سے بے نیاز نہیں کرتی۔

۳۔ اِلَّا حَاجَۃً فِیۡ نَفۡسِ: پھر یہ تدبیر کیوں اختیار کی گئی؟ جواب ہے یہ تدبیر، تسکین نفس کے لیے اور اس امید سے اختیار کی گئی کہ شاید تدبیر اللہ کے فیصلے کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ممکن ہے یہ تدبیر اللہ کی مشیت کے مطابق اور مؤثر ہو۔

۴۔ وَ اِنَّہٗ لَذُوۡ عِلۡمٍ: یعقوب علیہ السلام کو اس بات کا علم تھا کہ تدبیر اللہ سے بے نیاز نہیں کرتی تاہم تدبیر اور حفاظت کے ظاہری علل واسباب اختیار نہ کرنا بھی درست نہیں ہے کیونکہ اللہ اگر چاہے تو تدبیر مؤثر ہوتی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اس نکتے کو جانتے تھے۔ (هذا ما فهمناه بعد التدبر فی الایة بینما اقوال المفسرين فيها مفطربة۔

اہم نکات

۱۔ بچاؤ کے لیے تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

وَ لَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰی یُوۡسُفَ اٰوٰۤی اِلَیۡہِ اَخَاہُ قَالَ اِنِّیۡۤ اَنَا اَخُوۡکَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ اور جب یہ لوگ یوسف کے ہاں داخل ہوئے تو یوسف نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی کہا: بے شک میں ہی تیرا بھائی ہوں پس ان لوگوں کے سلوک پر ملال نہ کرنا۔

تفسیر آیات

یقیناً حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسی تدبیر اختیار کی ہو گی کہ اپنے بھائی بنیامین کے ساتھ خلوت ہو جائے۔ روایت میں آیا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے برادران کی بہترین مہمانی کی اور کھانے کے لیے دسترخوان کو اس طرح ترتیب دیا کہ دو دو بھائی مل کر کھائیں۔ بنیامین تنہا رہ گئے جس پر وہ یوسف علیہ السلام کو یاد کر کے روئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو اپنے دستر خوان پر جگہ دی اور کہا: میں تیرا بھائی ہوں۔ اسی طرح ہر دو برادر کے لیے ایک ایک کمرہ تیار کیا گیا۔ بنیامین پھر تنہا رہ گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے حجرے میں جگہ دی اور تخلیہ ہونے پر پورا راز کھول دیا اور کہا میں ہی تیرا بھائی یوسف ہوں۔ بھائیوں کی زیادتیوں پر رنج و غم نہ کریں۔ آزمائش کے دن ختم ہو گئے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ تقدیر نے تدبیر کا ساتھ دیا۔ یوسف علیہ السلام کی تدبیر سے بچھڑے ہوئے بھائی آپس میں مل گئے۔

فَلَمَّا جَہَّزَہُمۡ بِجَہَازِہِمۡ جَعَلَ السِّقَایَۃَ فِیۡ رَحۡلِ اَخِیۡہِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُہَا الۡعِیۡرُ اِنَّکُمۡ لَسٰرِقُوۡنَ ﴿۷۰﴾

۷۰۔ پھر جب (یوسف نے) ان کا سامان تیار کر لیا تو اپنے بھائی کے سامان میں پیالہ رکھ دیا پھر کسی پکارنے والے نے آواز دی: اے قافلے والو! تم چور ہو۔

قَالُوۡا وَ اَقۡبَلُوۡا عَلَیۡہِمۡ مَّاذَا تَفۡقِدُوۡنَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے: تمہاری کیا چیز کھو گئی ہے؟

قَالُوۡا نَفۡقِدُ صُوَاعَ الۡمَلِکِ وَ لِمَنۡ جَآءَ بِہٖ حِمۡلُ بَعِیۡرٍ وَّ اَنَا بِہٖ زَعِیۡمٌ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ کہنے لگے: بادشاہ کا پیالہ کھو گیا ہے اور جو اسے پیش کر دے اس کے لیے ایک بار شتر (انعام) ہے اور میں اس کا ضامن ہوں۔

تشریح کلمات

صُوَاعَ: (ص و ع) اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کوئی مشروب ڈال کر پیا جاتا ہے اور جس سے غلہ

ناپا جاتا ہے اسے صاع کہتے ہیں۔ صُوَاعَ صاع کے معنوں میں صرف ایک لغت میں آیا ہے۔ (الصحاح)

زَعِيۡمٌ : (ز ع م) زعامه ذمه دار اور ضامن ہونے کے معنوں میں ہے۔ یہ اصل میں زعامت و ریاست سے ہے۔ کفیل اور رئیس کو زعیم اس لیے کہتے ہیں کہ ان میں زعم و گمان کا بہت دخل ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا جَهَّزَهُمۡ بِجَهَازِهِمۡ : اپنے بھائی کے سامان میں پیالہ رکھنا حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے ایک تدبیر و حیلہ تھا جو غالباً دونوں برادران نے مل کر بنایا تھا اور بنیامین وقتی خفت اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

۲۔ اِنَّكُمۡ لَسٰرِقُوۡنَ: ان کو سارق کہنا چونکہ پہلے سے بنیامین کے ساتھ طے تھا اس لیے کوئی حرج نہیں ہے۔ ثانیاً یہ کہ پیالہ عمداً رکھنے کے راز سے یہ آواز دینے والا واقف ہی نہ ہو گا لہٰذا ممکن ہے کہ آواز دینے والا ان کو فی الواقع چور گمان کرتا ہو۔

۳۔ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيۡمٌ: حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہو سکتا ہے۔ دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ واپس حضرت یوسف علیہ السلام کے دربار میں پہنچ گیا۔

اہم نکات

۱۔ ایک جائز مسئلہ کے حل کے لیے حیلہ اپنایا جا سکتا ہے۔

قَالُوۡا تَاللّٰهِ لَقَدۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا جِئۡنَا لِنُفۡسِدَ فِي الۡاَرۡضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيۡنَ﴿۷۳﴾

۷۳۔ قافلے والوں نے کہا: اللہ کی قسم تم لوگوں کو بھی علم ہے کہ ہم اس سرزمین میں فساد کرنے نہیں آئے اور نہ ہی ہم چور ہیں۔

قَالُوۡا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ كٰذِبِيۡنَ﴿۷۴﴾

۷۴۔ انہوں نے کہا: اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو اس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟

قَالُوۡا جَزَآؤُهٗ مَنۡ وُّجِدَ فِيۡ رَحۡلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِي الظّٰلِمِيۡنَ﴿۷۵﴾

۷۵۔ کہنے لگے: اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے سامان میں (مسروقہ مال) پایا جائے وہی اس کی سزا میں رکھ لیا جائے، ہم تو ظلم کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ لَقَدۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا جِئۡنَا: قافلے والوں کے جواب کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے گرد و پیش کے لوگوں کو اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ یہ لوگ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ قافلے والے اپنی اس شناخت پر تکیہ کر کے بات کر رہے ہیں کہ تمہیں خود علم ہے کہ ہم زمین مصر میں فساد کرنے نہیں آئے۔

۲۔ قَالُوۡا فَمَا جَزَآؤُہٗۤ: پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت پوچھا گیا کہ اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟

۳۔ جَزَآؤُہٗ مَنۡ وُّجِدَ فِیۡ رَحۡلِہٖ: حضرت یوسف علیہ السلام کو علم تھا کہ اس کا کیا جواب آنے والا ہے کیونکہ شریعت ابراہیمی میں چور کی سزا یہ تھی کہ صاحب مال چور کو اپنا غلام بنا لے۔

فَبَدَاَ بِاَوۡعِیَتِہِمۡ قَبۡلَ وِعَآءِ اَخِیۡہِ ثُمَّ اسۡتَخۡرَجَہَا مِنۡ وِّعَآءِ اَخِیۡہِ ؕ کَذٰلِکَ کِدۡنَا لِیُوۡسُفَ ؕ مَا کَانَ لِیَاۡخُذَ اَخَاہُ فِیۡ دِیۡنِ الۡمَلِکِ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوۡقَ کُلِّ ذِیۡ عِلۡمٍ عَلِیۡمٌ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ پھر یوسف نے اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان کے تھیلوں کو (دیکھنا) شروع کیا پھر اسے اپنے بھائی کے تھیلے سے نکالا اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی ورنہ وہ شاہی قانون کے تحت اپنے بھائی کو نہیں لے سکتے تھے مگر یہ کہ اللہ کی مشیت ہو، جس کے ہم چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں اور ہر صاحب علم سے بالاتر ایک بہت بڑی دانا ذات ہے۔

تشریح کلمات

دِیۡن: (د ی ن) الدین بمعنی اطاعت و جزا کے بھی ہے اور بمعنی شریعت بھی آتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں دین بمعنی نظام اور قانون کے آیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دین چند رسوم و عقائد کا نام نہیں ہے جیسا کہ جاہلیت نو کا خیال ہے بلکہ دین قرآنی اصطلاح میں ایک نظام حیات کا نام ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَبَدَاَ بِاَوۡعِیَتِہِمۡ قَبۡلَ وِعَآءِ: تدبیر پر نہایت ہوشیاری سے عمل کیا جا رہا ہے۔ حضرت یوسف

علیہ السلام کو علم ہے کہ پیالہ اپنے بھائی کے تھیلے میں ہے مگر تلاشی کی ابتدا دوسرے بھائیوں کے تھیلوں سے کرتے ہیں تا کہ کسی سوچی سمجھی تدبیر کا کہیں شائبہ نہ ہو جائے۔

۲۔ اس کید و تدبیر کو اللہ نے اپنی طرف نسبت دی ہے کہ ہم نے یہ تدبیر بنائی تھی۔ ممکن ہے یہ تدبیر وحی یا الہام کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام کے ذہن میں ڈالی ہو۔ لفظ کید کا لغوی معنی حیلہ سازی ہے۔ یہ اور ''مکر'' کا لفظ جب بندوں کی طرف منسوب ہوتا ہے تو فریب اور دغا بازی مراد لی جاتی ہے اور جب اللہ کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو حسن تدبیر مراد لی جاتی ہے۔

۳۔ مَا کَانَ لِیَاۡخُذَ اَخَاہُ: اس تدبیر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس اپنے بھائی کو اپنے ساتھ رکھنے کا اور کوئی بہانہ نہ تھا کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے درست ہی نہ تھا کہ وہ شاہی قانون کے مطابق عمل کریں۔ وہ پیغمبر ہیں الٰہی قانون پر ہی عمل کریں گے۔ اگرچہ یہاں بنیامین حقیقتاً چور نہیں ہے لہٰذا سزا بھی حقیقی نہیں تھی۔ تاہم ظاہری طور پر بھی ایک رسول کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ الٰہی قانون کو چھوڑ کر شاہی قانون پر عمل کرے۔

رہا یہ سوال کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حکومت میں دخل ہوتے ہوئے شاہی قانون کس طرح نافذ تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قوانین کا نفاذ اور تبدیلی نظام ہمیشہ تدریجاً ہوا کرتا ہے۔ ابتدا میں رسول اسلامؐ کے لیے بھی ممکن نہ تھا کہ بہ یک جنبش قلم تمام جاہلی قوانین کو ختم کر کے اسلامی قوانین نافذ کریں۔

۴۔ وَفَوۡقَ کُلِّ ذِیۡ عِلۡمٍ: ہر صاحب علم سے بالاتر زیادہ جاننے والا ہوتا ہے۔ علمی درجات کسی ایک حد پر نہیں رکتے۔ ہر عالم سے بالاتر ایک عالم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کی ذات پر جا کر یہ سلسلہ رک جاتا ہے۔ قصۂ یوسف علیہ السلام میں یہی بات سامنے آ رہی تھی کہ ان سبق آموز واقعات میں ہر ذی علم کو بالاتر علم رکھنے والے سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی مشیت کے اجرا کے لیے بھی طبعی اسباب استعمال کیے جاتے ہیں: کَذٰلِکَ کِدۡنَا لِیُوۡسُفَ..

قَالُوۡۤا اِنۡ یَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنۡ قَبۡلُ ۚ فَاَسَرَّہَا یُوۡسُفُ فِیۡ نَفۡسِہٖ وَلَمۡ یُبۡدِہَا لَہُمۡ ۚ قَالَ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّکَانًا ۚ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا

۷۷۔(برادران یوسف نے) کہا: اگر اس نے چوری کی ہے (تو نئی بات نہیں) اس کے بھائی (یوسف) نے بھی تو پہلے چوری کی تھی پس یوسف نے اس بات کو دل میں سہ لیا اور اسے ان پر ظاہر نہ کیا (البتہ اتنا ضرور) کہا: تم لوگ برے

تَصِفُوۡنَ﴿۷۷﴾

ہو (نہ کہ ہم دونوں) اور جو بات تم بیان کر رہے ہو اسے اللہ بہتر جانتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ہنوز ان کے دلوں میں یوسف علیہ السلام اور بنیامین کے خلاف حسد کی آگ سرد نہیں ہوئی کہ پہلے تو کہہ دیا ہم اولاد یعقوب چور نہیں ہیں۔ جب پیالہ بنیامین کے تھیلے سے برآمد ہوا تو بنیامین اور یوسف علیہ السلام کو اپنے سے الگ شمار کیا اور کہا: یہ دو بھائی جو ایک ماں سے ہیں چور ہیں۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بنیامین کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے۔ واقعہ اس طرح نقل کرتے ہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ کا انتقال ہوا تو ان کی پھوپھی نے ان کی پرورش کی۔ یوسف علیہ السلام بڑے ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے اپنے پاس لانا چاہا۔ پھوپھی چونکہ یوسف علیہ السلام کو بہت چاہتی تھی، اس نے انہیں اپنے پاس رکھنے کے لیے ایک بہانہ کیا کہ ایک کمر بند جو حضرت اسحاق علیہ السلام کے زیر استعمال رہا اور خاندانی یادگار کے طور پر اہم چیز تھی، اسے یوسف علیہ السلام کی کمر پر باندھ دیا اور دعویٰ کیا کہ یوسف علیہ السلام اسے چوری کرنا چاہتے تھے تاکہ سزا میں یوسف علیہ السلام کو اپنے پاس رکھ سکے۔

۲۔ فَاَسَرَّهَا یُوۡسُفُ فِیۡ نَفۡسِهٖ: برادران نے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینک دیا۔ غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ آج وہی یوسف علیہ السلام ان کی عزت و تکریم سے پزیرائی کرتے ہیں۔ ان کو غلہ فراہم کرتے ہیں۔ عین اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے جب ان سے چور کہتے سنا ہو گا تو طبعاً غصہ آیا ہو گا لیکن آپؑ غصہ پی گئے اور ان ساتھ پھر بھی پیغمبرانہ سلوک فرمایا۔

۳۔ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّکَانًا: صرف اتنا کہہ دیا: تم لوگ برے ہو اور میرے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہو کہ مجھے بھیڑیے نے کھایا ہے اور میں نے چوری کی ہے، اس کے بارے میں اللہ بہتر جانتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ غصہ پی جانا، انتقام نہ لینا، اخلاق انبیاء ہیں: فَاَسَرَّهَا یُوۡسُفُ فِیۡ نَفۡسِهٖ ....

قَالُوۡا یٰۤاَیُّهَا الۡعَزِیۡزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیۡخًا کَبِیۡرًا فَخُذۡ اَحَدَنَا مَکَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىکَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴿۷۸﴾

۷۸۔ وہ کہنے لگے: اے عزیز! اس کا باپ بہت سن رسیدہ ہو چکا ہے پس آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیں ہمیں آپ نیکی کرنے والے نظر آتے ہیں۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنۡ نَّاۡخُذَ اِلَّا

۷۹۔ کہا: پناہ بخدا! جس کے ہاں سے ہمارا سامان

مَنۡ وَّجَدۡنَا مَتَاعَنَا عِنۡدَہٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوۡنَ ﴿۷۹﴾

ہمیں ملا ہے اس کے علاوہ ہم کسی اور کو پکڑیں؟ اگر ہم ایسا کریں تو زیادتی کرنے والوں میں ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَیُّہَا الۡعَزِیۡزُ: یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز کہا گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں ایک ایسے منصب پر فائز تھے جسے مصری اصطلاح میں عزیز کہتے تھے جو تقریباً ''سرکار'' کے قریب المعنی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام الملک (بادشاہ) تو نہیں تھے، اس کے بعد کا منصب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس تھا جسے عزیز کہتے تھے۔

۲۔ فَخُذۡ اَحَدَنَا مَکَانَہٗ: اولاد یعقوب کو وہ عہد و میثاق یاد آتا ہے جو انہوں نے اپنے والد سے کیا ہے۔ لہٰذا وہ کسی دوسرے کو بنیامین کی جگہ رکھنے کی درخواست کرتے ہیں۔

۳۔ قَالَ مَعَاذَ اللّٰہِ اَنۡ نَّاۡخُذَ: حضرت یوسف علیہ السلام بنیامین کو چور نہیں کہتے بلکہ یہ تعبیر اختیار کرتے ہیں: جس کے ہاں سے ہمارا سامان ملا ہے اسے چھوڑ کر کسی اور کو پکڑنا ظلم ہے۔ اسے توریہ کہتے ہیں جو مصلحتاً امر واقع کو چھپانے اور صریحاً جھوٹ نہ بولنے سے عبارت ہے۔ مثلاً غیر مستحق آپ سے پیسے مانگے تو آپ توریہ کریں گے: میرا ہاتھ خالی ہے۔ اس سے سائل سمجھے گا آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں جب کہ آپ اپنے ہاتھ کا قصد کر رہے ہیں جو واقعاً اس وقت خالی ہے۔ ایسا کرنا ضرورت کے تحت درست ہے۔

اہم نکات

۱۔ جن برادران نے حضرت یوسف علیہ السلام پر ظلم کیا تھا آج وہ خود گواہی دے رہے ہیں کہ آپؑ نے ہمارے ساتھ نیکی کی ہے: اِنَّا نَرٰىکَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ۔

فَلَمَّا اسۡتَیۡـَٔسُوۡا مِنۡہُ خَلَصُوۡا نَجِیًّا ؕ قَالَ کَبِیۡرُہُمۡ اَلَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اَبَاکُمۡ قَدۡ اَخَذَ عَلَیۡکُمۡ مَّوۡثِقًا مِّنَ اللّٰہِ وَ مِنۡ قَبۡلُ مَا فَرَّطۡتُّمۡ فِیۡ یُوۡسُفَ ۚ فَلَنۡ اَبۡرَحَ الۡاَرۡضَ حَتّٰی یَاۡذَنَ لِیۡۤ اَبِیۡۤ اَوۡ یَحۡکُمَ اللّٰہُ لِیۡ ۚ وَ ہُوَ

۸۰۔ پھر جب وہ اس سے مایوس ہو گئے تو الگ ہو کر مشورہ کرنے لگے، ان کے بڑے نے کہا: کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کا عہد لیا ہے اور اس سے پہلے بھی یوسف کے بارے میں تقصیر کر چکے ہو؟ لہٰذا میں تو اس سرزمین سے ہلنے والا نہیں ہوں جب تک میرے والد مجھے اجازت نہ دیں یا اللہ میرے بارے

خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۸۰﴾ میں کوئی فیصلہ نہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

نَجِیًّا: (ن ج و) نجاء کے معنی کسی چیز سے الگ ہونے کے ہیں۔ النجی کے معنی سرگوشی کرنے کے ہیں۔

فَرَّطۡتُّمۡ: (ف ر ط) الافراط حد سے زیادہ تجاوز کرنے کو کہتے ہیں اور التفریط کوتاہی اور تقصیر کے معنوں میں ہے۔ اسی سے افراط و تفریط ہے۔ یعنی زیادتی و کوتاہی، جسے اردو میں افراتفری کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ کَبِیۡرُہُمۡ: اولاد یعقوب میں بڑا بیٹا نسبتاً ذمے دار معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے شروع میں بھی اسی نے کہا ہو: یوسف کو قتل نہ کرو، اسے کنویں میں ڈال دو۔ کسی حد تک اس بڑے لڑکے میں اس جرم کا احساس بھی زندہ تھا جو یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ لوگ کر چکے تھے اور آج بنیامین کے بغیر والد کی خدمت میں جانے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن صرف اسی کا قول ذکر فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ان لوگوں نے کل یوسف علیہ السلام کو پریشان کیا، اس کے نتیجے میں آج یہ خود پریشان ہیں۔

اِرۡجِعُوۡۤا اِلٰۤی اَبِیۡکُمۡ فَقُوۡلُوۡا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابۡنَکَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَہِدۡنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمۡنَا وَ مَا کُنَّا لِلۡغَیۡبِ حٰفِظِیۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ تم اپنے والد کے پاس جاؤ اور ان سے کہو: اے ہمارے ابا جان! آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور ہمیں جو علم ہوا اس کی ہم نے گواہی دے دی ہے اور غیب کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔

وَ سۡـَٔلِ الۡقَرۡیَۃَ الَّتِیۡ کُنَّا فِیۡہَا وَ الۡعِیۡرَ الَّتِیۡۤ اَقۡبَلۡنَا فِیۡہَا ؕ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۸۲﴾

۸۲۔ اور اس بستی (والوں) سے پوچھیے جس میں ہم ٹھہرے تھے اور اس قافلے سے پوچھیے جس میں ہم آئے ہیں اور (یقین جانیے) ہم بالکل سچے ہیں۔

تفسیر آیات

ہم نے چور کے بارے میں گواہی دی تھی کہ ہمارے ہاں اس کی سزا یہ ہے کہ چور کو غلام بنا لیا جائے۔ اس وقت ہمیں علم ہی نہ تھا کہ آپؑ کے بیٹے نے چوری کی ہے۔ چونکہ غیب تو ہم جانتے نہیں۔ اس سلسلے میں آپؑ اہل مصر سے پوچھ سکتے ہیں اور جس قافلے میں ہم تھے اس کے دیگر افراد سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد یعقوب کے قافلے میں دیگر افراد بھی شامل تھے اور یہ عین ممکن بھی ہے کہ قحط کی وجہ سے علاقے کے گوشہ و کنار سے لوگ غلہ خریدنے مصر پہنچ جاتے تھے اور اس وقت سفر کا طریقہ بھی یہی تھا کہ لوگ قافلہ بنا کر سفر کرتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ ان لوگوں نے یوسف علیہ السلام کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ اب یہ لوگ سچ بولتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔

قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَکُمۡ اَنۡفُسُکُمۡ اَمۡرًا ؕ فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ ؕ عَسَی اللّٰہُ اَنۡ یَّاۡتِیَنِیۡ بِہِمۡ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۸۳﴾

۸۳۔ (یعقوب نے) کہا: بلکہ تم نے خود اپنی طرف سے ایک بات بنائی ہے پس بہترین صبر کروں گا امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے یقیناً وہ بڑا دانا حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ: اس مرتبہ پیش آنے والے واقعہ کے ذمے دار اگرچہ یہ لوگ خود نہیں تھے لیکن یہ بھی اسی زیادتی کا نتیجہ تھا جو انہوں نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ کی تھی۔ اس لیے ان کو اس واقعہ کا بھی ذمے دار ٹھہرایا گیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے یہ بات بھی قابل باور نہ تھی کہ بنیامین جیسا نیک سیرت فرزند چوری کا مرتکب ہوا ہو۔

۲۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس جملے سے کہ امید ہے اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے، معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کو علم تھا کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہیں بلکہ یہ بھی اشارہ دیا کہ یوسف علیہ السلام، بنیامین، بڑا لڑکا، سب ایک ساتھ واپس آنے والے ہیں اور یوسف علیہ السلام کا خواب پورا ہونے والا ہے۔

۳۔ ہُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ: علامہ طباطبائیؒ اس جگہ فرماتے ہیں: عَسَی اللّٰہُ اَنۡ یَّاۡتِیَنِیۡ بِہِمۡ جَمِیۡعًا

دعائیہ جملہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آخر میں غفور رحیم جیسے جملے مذکور ہوتے۔ علیم الحکیم کی دعائیہ جملوں سے مناسبت نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ صبر کا آخری سرا کامیابی ہے: عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ....

۲۔ اللہ کے فیصلے پر راضی ہو کر صبر کرنا، صبر جمیل ہے۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾	۸۴۔ اور یعقوب نے ان سے منہ پھیر لیا اور کہا ہائے یوسف اور ان کی آنکھیں (روتے روتے) غم سے سفید پڑ گئیں اور وہ گھٹے جا رہے تھے۔

تفسیر آیات

حضرت یعقوب علیہ السلام نے غم فراق میں روتے روتے آنکھیں نابینا کر دیں لیکن شدت غم کے باوجود اللہ کے اس فیصلے کو ناپسند نہیں کیا۔ راضی برضا رہے۔ یہاں سے ایک نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اظہار حزن اور گریہ کرنا صبر کے منافی نہیں ہے اور بقول بعض اہل قلم یہ اشک فشانی کمالات نبوت کے ذرا بھی منافی نہیں ہے جیسا کہ آج کل کے بعض نافہموں نے لکھ دیا ہے بلکہ اور زیادہ شفقت اور رقت قلب کی علامت ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام تو خیر جواں تھے ہمارے حضور انورؐ تو اپنے فرزند ابراہیم کی وفات پر آنسوؤں کے ساتھ روئے ہیں جو ابھی شیر خوار ہی تھے۔[۱]

لہٰذا شدت غم سے اظہار حزن اور گریہ کرنا ایک طبعی امر ہے، صبر کے منافی نہیں ہے جیسا کہ راہ خدا میں زخم کھا کر شدت درد سے کراہنا صبر کے منافی نہیں بلکہ طبیعی امر ہے۔ صبر کے منافی یہ ہے کہ اس فیصلے کو پسند نہ کیا جائے اور جزع فزع اس لیے ہو کہ یہ فیصلہ کیوں رونما ہوا۔

رسول اللہؐ سے روایت ہے:

تَدْمَعُ الْعَيْنُ وَ يَحْزَنُ الْقَلْبُ وَ لَا نَقُولُ مَا يُسْخِطُ الرَّبَّ وَ اَنَّا بِكَ يَا اِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ ....[۲]	آنکھ آنسو بہاتی ہے دل غمگین ہوتا ہے لیکن ہم اپنے رب کی مرضی کے خلاف لب نہیں کھولتے۔ ابراہیم تیری جدائی پر غمگین ہوں۔

---

۱ تفسیر دریابادی اسی آیت کے ذیل میں ۲ الکافی ۳: ۲۶۲

اہم نکات

۱۔ مصیبت کے موقع پر اظہار حزن اور گریہ کرنا رقت قلب کی علامت ہے: وَابۡیَضَّتۡ عَیۡنٰہُ مِنَ الۡحُزۡنِ ....

۲۔ اس فیصلے کو پسند کرنا صبر و حوصلے کی علامت ہے: فَہُوَ کَظِیۡمٌ ....

قَالُوۡا تَاللّٰہِ تَفۡتَؤُا تَذۡکُرُ یُوۡسُفَ حَتّٰی تَکُوۡنَ حَرَضًا اَوۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡہٰلِکِیۡنَ ﴿۸۵﴾	۸۵۔ (بیٹوں نے) کہا: قسم بخدا! یوسف کو برابر یاد کرتے کرتے آپ جان بلب ہو جائیں گے یا جان دے دیں گے۔
قَالَ اِنَّمَاۤ اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ وَ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۶﴾	۸۶۔ یعقوب نے کہا: میں اپنا اضطراب اور غم صرف اللہ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور اللہ کی جانب سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

تشریح کلمات

حرضاً: (ح ر ض) الحرض اس چیز کو کہتے ہیں جو نکمی ہو جائے اور درخور اعتنا نہ رہے۔ اس لیے جو چیز قریب بہ ہلاکت ہو جائے اسے حرض کہا جاتا ہے۔

اَشۡکُوۡا: (ش ك و) الشكاية کے معنی اظہار غم کے ہیں۔ اصل میں شکوة یعنی چھوٹے مشکیزہ کو کھولنے اور اس کے اندر کی چیز کو ظاہر کرنے کے معنوں میں ہے۔ لہٰذا شکایت کا مطلب دل کی بات کو ظاہر کر دینا ہے۔

بَثِّیۡ: (ب ث ث) البث اصل میں یہ لفظ کسی چیز کو متفرق اور پراگندہ کرنے کے معنوں میں ہے۔ نفس کے سخت ترین غم یا بھید کو بث النفس کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ: حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے فرزندوں کی طرف سے ہونے والی سرزنش کا پیغمبرانہ جواب دے رہے ہیں: میری معروض اور شکوہ اپنے اللہ سے ہے جس کا مجھے کوئی ملال نہیں ہے۔ عبد، معبود کی بارگاہ میں جب اپنا احوال واقعی بیان کرتا ہے، دل کی حالت زار کا اظہار کرتا ہے تو یہ عین

بندگی ہے۔ یہی باتیں اگر غیر خدا سے کی جائیں تو بے صبری ہے۔ اسی لیے حضرت یعقوب علیہ السلام فرماتے ہیں: میں اپنے غم واندوہ کا اظہار کسی اور سے نہیں، صرف اپنے رب سے کرتا ہوں جس سے میری ساری امیدیں وابستہ ہیں اور اس سے میں مایوس نہیں ہوں، اس علم کی وجہ سے جو تمہارے پاس نہیں، میرے پاس ہے۔

۲۔ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ: میں یوسف علیہ السلام یا اللہ کی رحمت کے بارے میں جو جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی بارگاہ میں اپنے حزن و ملال کا اظہار کرنا عالمانہ بندگی ہے: وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ ....

یٰبَنِیَّ اذۡہَبُوۡا فَتَحَسَّسُوۡا مِنۡ یُّوۡسُفَ وَاَخِیۡہِ وَلَا تَایۡـَٔسُوۡا مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ لَا یَایۡـَٔسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کے فیض سے مایوس نہ ہونا کیونکہ اللہ کے فیض سے تو صرف کافر لوگ مایوس ہوتے ہیں۔

تشریح کلمات

فَتَحَسَّسُوۡا: (ح س س) قوت حس سے کسی چیز تک پہنچنا۔

رَّوۡحِ: (ر و ح) بفتح۔ رحمت اور رزق کے معنوں میں ہے۔ اصل میں یہ لفظ سانس کے معنوں میں آتا ہے اور راحت وسکون کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَتَحَسَّسُوۡا مِنۡ یُّوۡسُفَ وَاَخِیۡہِ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے فرزندوں کو یوسف علیہ السلام اور بنیامین کے ایک جگہ موجود ہونے کی طرف اجمالی اشارہ دیا اور بارگاہ خداوندی میں اپنے حزن و ملال کا اظہار کرنے کا فلسفہ بھی بیان فرمایا: مؤمن اللہ کے فیض و رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔

۱۔ اِنَّہٗ لَا یَایۡـَٔسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ: اللہ سے مایوس ہونے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس کی قدرت و طاقت محدود ہے اور یہ کفر ہے۔ مثلاً یہ تصور کرنا کہ بیس درہم میں فروخت ہونے والے یوسف علیہ السلام کا اتنی مدت کے بعد ملنا ممکن نہیں ہے، مایوسی ہے اور یہ کہنا کہ اللہ کے لیے یہ کام ممکن نہیں ہے، کفر ہے، اللہ کی قوت وقدرت کی نفی ہے۔

اہم نکات

۱۔ جیسا کہ اللہ کی قدرت بے پایاں ہے اس کی رحمت بھی بے پایاں ہے۔ یہاں یاس کی گنجائش ہی نہیں ہے: اِنَّهٗ لَا یَایۡـَٔسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ ....

فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلَیۡهِ قَالُوۡا یٰۤاَیُّهَا الۡعَزِیۡزُ مَسَّنَا وَاَهۡلَنَا الضُّرُّ وَجِئۡنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزۡجٰىةٍ فَاَوۡفِ لَنَا الۡکَیۡلَ وَتَصَدَّقۡ عَلَیۡنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَجۡزِی الۡمُتَصَدِّقِیۡنَ ﴿۸۸﴾

۸۸۔ پھر جب وہ یوسف کے ہاں داخل ہوئے تو کہنے لگے: اے عزیز! ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت تکلیف میں ہیں اور ہم نہایت ناچیز پونجی لے کر آئے ہیں پس آپ ہمیں پورا غلہ دیجیے اور ہمیں خیرات (بھی) دیجیے، اللہ خیرات دینے والوں کو یقیناً اجر عطا کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

مُّزۡجٰىةٍ: (م ز ج) ناقص اور ناقابل چیز کے معنوں میں ہے۔ اصل میں یہ لفظ بزور آگے کرنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلَیۡهِ: جب اپنے والد کے حکم پر سہ بارہ مصر پہنچے اور دربار یوسف علیہ السلام میں داخل ہوئے تو جس انکساری و عاجزی کے ساتھ پیش آرہے تھے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قحط سے کافی حد تک بے بس ہو چکے تھے اور غلہ خریدنے کے لیے کوئی قابل توجہ قیمت بھی نہیں لائے اور ساتھ بنیامین کی آزادی بھی ان کے لیے ایک سنگین مسئلہ تھا۔ ان کے خیال کے مطابق بنیامین نے چوری کی ہے۔ اس کی شرمساری بھی ہے۔ دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کو انہوں نے منہ پر چور کہا ہے، اس سے وہ بے خبر ہیں، تاہم حضرت یوسف علیہ السلام اس سے آزردہ ضرور ہیں۔ ان باتوں کی وجہ سے فرزندان یعقوب نہایت مشکل حالات سے دوچار ہیں اور نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کرتے ہیں:

۲۔ فَاَوۡفِ لَنَا الۡکَیۡلَ: قیمت ناچیز ہونے کے باوجود غلہ پورا دیں۔

۳۔ وَتَصَدَّقۡ عَلَیۡنَا: اس کے علاوہ خیرات بھی دیں۔ خیرات سے مراد یا تو مزید غلہ ہے یا بنیامین کی آزادی ہے۔

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام راز کو کھولنے اور حقیقت حال ان پر منکشف کرنے کی غرض سے ان سے سوال کرتے ہیں:

قَالَ هَلۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا فَعَلۡتُمۡ بِيُوۡسُفَ وَاَخِيۡهِ اِذۡ اَنۡتُمۡ جٰهِلُوۡنَ ﴿۸۹﴾

۸۹۔ یوسف نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ جب تم نادان تھے تو تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

تفسیر آیات

اس قسم کا خطاب ان لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کو ان کی غلط کاریوں کی سرزنش کرنا مقصود ہو۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ابتدائے کلام میں سرزنش کا لہجہ اختیار کیا لیکن معاً اس کی توجیہ بھی بیان فرمائی کہ یہ کام تم لوگوں نے نادانی میں کیا تھا۔ ایک ہی خطاب میں ان کو ان کا جرم یاد دلایا جو اس موقع پر ضروری تھا اور ساتھ ان کی خفت مٹانے کے لیے اس کی توجیہ بھی بیان فرمائی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی وسعت ظرفی کی عظیم مثال ہے۔ اس جملے کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ تم لوگوں کو علم ہے کہ تم نے یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا لیکن یہ اس وقت کی بات ہے کہ تم لوگ اس کام کے انجام سے بے خبر تھے اور بے خبری میں یہ نامناسب کام سرزد ہوا۔

اہم نکات

۱۔ کمال جواں مردی یہ ہے کہ خطا کار کو عذر خواہی کا موقع فراہم کیا جائے۔

قَالُوۡۤا ءَاِنَّكَ لَاَنۡتَ يُوۡسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوۡسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِىۡ ۫ قَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا ؕ اِنَّهٗ مَنۡ يَّتَّقِ وَيَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۹۰﴾

۹۰۔ وہ کہنے لگے: کیا واقعی آپ یوسف ہیں؟ کہا: میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، اللہ نے ہم پر احسان کیا ہے، اگر کوئی تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

برادران یوسف نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو پہچان لیا تو طبعی طور پر ان کے ذہنوں میں اس سلوک کا تصور گھومنا شروع ہوا ہو گا جو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا اور ساتھ وہ سلوک بھی ان کے سامنے ہے جو حضرت یوسف نے ان کے ساتھ کیا ہے۔ ان دو سلوکوں میں نمایاں فرق نے ان کو مزید شرمندہ کیا ہو گا۔

اس جگہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان عوامل کا ذکر کیا جن کی وجہ سے ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ صبر اور تقوی ہیں۔ چنانچہ قرآن کی دیگر متعدد آیتوں میں صبر اور تقویٰ کو مشکلات سے نکلنے کا ذریعہ بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۱۵۵۔

اہم نکات

۱۔ صبر و تقویٰ کے بغیر انبیاء علیہم السلام بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

قَالُوۡا تَاللّٰہِ لَقَدۡ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیۡنَا وَ اِنۡ کُنَّا لَخٰطِئِیۡنَ ﴿۹۱﴾	۹۱۔ انہوں نے کہا: قسم بخدا! اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت دی ہے اور ہم ہی خطا کار تھے۔
قَالَ لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ ؕ یَغۡفِرُ اللّٰہُ لَکُمۡ ۫ وَ ہُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۹۲﴾	۹۲۔ یوسف نے کہا: آج تم پر کوئی عتاب نہیں ہو گا، اللہ تمہیں معاف کر دے گا اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

تَثۡرِیۡبَ: (ث ر ب) التثریب کے معنی ہیں کسی کو اس کی غلطی پر سرزنش کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا تَاللّٰہِ: برادران یوسف نے اس مقام پر یوسف کو پہچانا اور ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خود کس مقام پر کھڑے ہیں۔ چنانچہ قسم کھا کر اعتراف کیا کہ یوسف علیہ السلام کو اللہ نے فضیلت دی ہے اور وہ خود خطا کار ہیں۔ جب خطا کار اپنی خطا کا اعتراف کرتا ہے تو صاحب فضیلت اپنے فضل کا ثبوت فراہم کرتا ہے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے اس اعتراف کے جواب میں فرمایا: لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ... اب تمہارے خلاف کوئی سرزنش اور عتاب نہ ہو گا۔ یہ کہہ کر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی فضیلت بیان نہ کی بلکہ اخلاق کی برتری کا عملی ثبوت فراہم کیا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے جانی دشمنوں سے درگزر فرماتے ہوئے یہی جملہ دھرایا: لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ... آج تم پر کوئی عتاب نہ ہوگا اور فرمایا: جیسے میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کہا تھا ویسے ہی میں بھی کہوں گا۔

لیکن یوسف علیہ السلام کے مخاطبین اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخاطبین میں ایک نمایاں

فرق موجود ہے۔ وہ یہ کہ یوسف علیہ السلام کے مخاطبین نے قبول کیا کہ آپؑ کو اللہ نے ہم پر فضیلت دی ہے اور اعتراف کیا کہ ہم ہی خطا کار تھے۔ اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ ...۔ لیکن حضورؐ کے مخاطبین نے نہ حضورؐ کی فضیلت کو دل سے قبول کیا، نہ ہی خطا کار ہونے کا اعتراف کیا۔ اس کے باوجود فرمایا: لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ ...۔

اہم نکات

۱۔ اعتراف گناہ کے بعد معاف کرنا اخلاق الٰہی و انبیاء ہے: لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ ؕ یَغۡفِرُ اللّٰہُ لَکُمۡ ...۔

اِذۡہَبُوۡا بِقَمِیۡصِیۡ ہٰذَا فَاَلۡقُوۡہُ عَلٰی وَجۡہِ اَبِیۡ یَاۡتِ بَصِیۡرًا ۚ وَ اۡتُوۡنِیۡ بِاَہۡلِکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۹۳﴾

۹۳۔ یہ میرا کرتا لے جاؤ پھر اسے میرے والد کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی بصارت لوٹ آئے گی اور تم اپنے تمام اہل و عیال کو میرے پاس لے آنا۔

تفسیر آیات

حضرت یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ خون آلود قمیض سے شروع ہونے والا غم، خوشبودار قمیض پر ہی اختتام پذیر ہوگا اور بینائی لوٹ آئے گی۔

چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میری یہ قمیض وہی شخص میرے والد کے پاس لے جائے جس نے میری خود آلود قمیض کو والد کے سامنے پیش کیا تھا تاکہ جس نے میرے والد کو غمگین کیا تھا وہی ان کو خوشخبری بھی دے۔

اہم نکات

۱۔ جس چیز کے ذریعے دکھ کی خبر دی گئی ہے اسی چیز کے ذریعے خوشخبری دینے میں اثر زیادہ ہے: اِذۡہَبُوۡا بِقَمِیۡصِیۡ ...۔

۲۔ بنی اسرائیل کی مصر کی طرف منتقلی کا آغاز: وَ اۡتُوۡنِیۡ بِاَہۡلِکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ۔

وَ لَمَّا فَصَلَتِ الۡعِیۡرُ قَالَ اَبُوۡہُمۡ اِنِّیۡ لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ

۹۴۔ اور جب یہ قافلہ (مصر کی سرزمین سے) دور ہوا تو ان کے باپ نے کہا: اگر تم مجھے بہکا ہوا

تُفَنِّدُوۡنِ﴿۹۴﴾ نہ سمجھو تو یقیناً مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے۔

تشریح کلمات

تُفَنِّدُوۡنِ: (ف ن د) الفند کے معنی رائے کی کمزوری کے ہیں۔ اس سے التفنید ہے جس کے معنی کسی کو کمزور رائے یا فاتر العقل بتانے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَصَلَتِ الۡعِیۡرُ: قافلہ روانہ ہوا یا مصر کی سرزمین سے دور ہوا۔ دونوں تعبیریں ممکن ہیں۔ دوسری تعبیر کے مطابق ممکن ہے اس جملے کا مطلب یہ ہو کہ جب قافلہ مصر کی حدود سے دور ہوا تو یعقوب نے یوسف علیہا السلام کی خوشبو محسوس کی۔ اس صورت میں ممکن ہے کنعان کی سرزمین میں داخل ہونے پر یہ خوشبو حضرت یعقوب علیہ السلام کے مشام تک پہنچ گئی ہو۔

۲۔ اگر ہم پہلی تعبیر اختیار کرتے ہیں کہ مصر سے روانہ ہوتے ہی یوسف علیہ السلام کی خوشبو آئی تھی تو بھی یہ بعید از امکان بات نہیں ہے اور اس بات میں کوئی اشکال پیش نہیں آتا کہ یہ بات بطور معجزہ وقوع پذیر ہوگئی ہو کیونکہ عام طبیعاتی اعتبار سے یوسف علیہ السلام کی خوشبو اتنی دور سے عام بشر کے لیے سونگھنا ممکن نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی روحانی قوت اور جذبۂ محبت کی وجہ ممکن ہوا، صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ باتیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس اس وقت بھی موجود تھیں جب یوسف علیہ السلام ابھی کنعان کی سرزمین پر موجود تھے اور قافلہ والے اسے خرید کر لے جا رہے تھے۔ لہٰذا اس وقت اتنی بعید مسافت سے خوشبو سونگھنا معجزہ ہے۔

۳۔ ممکن ہے یہ خوشبو حسی مشام نے نہیں بلکہ مشام فکر اور ماوراء حس نے درک کی ہو کہ یوسف علیہ السلام کی ملاقات نزدیک ہوگئی ہے۔ یہ بات اس لیے قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ایسا اتفاق تو انبیاء کے علاوہ بعض دیگر افراد کے لیے بھی ہوتا ہے۔ کسی کے بچے کو کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو اس کی ماں نے اسے اپنے وجود میں بھرپور طریقے سے محسوس کیا ہے۔ لہٰذا یعقوب علیہ السلام جیسے نبی کے لیے اس حس میں کوئی محل سوال باقی نہیں رہتا۔

اہم نکات

۱۔ قلبی تعلق مسافتوں کو سمیٹ لیتا ہے: لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ ...۔

۲۔ یوسف علیہ السلام کی خوشبو آنا اکثر کے لیے قابل قبول نہ تھا، خلاف معمول امر تھا: لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ ...۔

۳۔ امید و نوید کا عمل حرکت میں آیا تو یہ دوری کے باوجود محسوس ہوا، بخلاف دکھ کے۔

قَالُوۡا تَاللّٰہِ اِنَّکَ لَفِیۡ ضَلٰلِکَ الۡقَدِیۡمِ﴿۹۵﴾

۹۵۔لوگوں نے کہا:قسم بخدا!آپ اپنے اسی پرانے خبط میں (مبتلا) ہیں۔

تشریح کلمات

ضَلٰلِکَ: ضل کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانا کے ہیں اور ضلال کا لفظ ہر قسم کی گمراہی پر بولا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

سیاق آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی توقع کے مطابق خوشبوئے یوسف کی خبر کو خبطی پر محمول کیا گیا اور لفظ ضلال سے ان کی مراد واضح ہے کہ ان کے نزدیک حضرت یعقوب، یوسف علیہما السلام کے بارے میں جو موقف رکھتے ہیں وہ مبنی برحق نہیں ہے۔ اولاد کے ساتھ جو رویہ رکھنا چاہیے، اس میں راہ راست اختیار نہیں کی گئی اور صرف ایک دو بچوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

اہم نکات

۱۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے خاندان میں یوسف علیہ السلام کے سوا کوئی ان کا قدر شناس نہ تھا۔

فَلَمَّاۤ اَنۡ جَآءَ الۡبَشِیۡرُ اَلۡقٰىہُ عَلٰی وَجۡہِہٖ فَارۡتَدَّ بَصِیۡرًا ۚ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ ۚۙ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴿۹۶﴾

۹۶۔ پھر جب بشارت دینے والا آیا تو اس نے یوسف کا کرتا یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا تو وہ دفعتاً بینا ہوگئے، کہنے لگے: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے؟

تفسیر آیات

۱۔ فَارۡتَدَّ بَصِیۡرًا: بصارت یعقوب کا عود کر آنا عام طبیعی دستور کے مطابق نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ طبیعی طور پر علاج کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یوسف علیہ السلام کا کرتہ منہ پر ڈالا جانا آنکھوں کی بصارت کے لیے طبیعی علاج ہرگز نہیں ہے، نہ ہی فرط مسرت سے بصارت واپس آ سکتی ہے بلکہ یہ صرف اعجاز کی صورت ہے۔ جس سے حضرت یوسف اور حضرت یعقوب علیہما السلام آگاہ تھے۔

۲۔ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ: اس جملے سے واضح ہوگیا کہ خوشبو کا آنا مِنَ اللّٰہِ تھا۔

اہم نکات

۱۔ یوسف علیہ السلام کی قمیض ایک بار سازش کو چھپانے کے لیے جھوٹے خون کے ساتھ، دوسری بار

عورت کی سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے اور تیسری بار آزمائش کے اختتام کے لیے پیش کی گئی۔

قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا کُنَّا خٰطِـِٕیۡنَ ﴿۹۷﴾

۹۷۔ بیٹوں نے کہا: اے ہمارے ابا! ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا کیجیے ہم ہی خطاکار تھے۔

قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَکُمۡ رَبِّیۡ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۹۸﴾

۹۸۔ (یعقوب نے) کہا: عنقریب میں تمہارے لیے اپنے رب سے مغفرت کی دعا کروں گا، وہ یقیناً بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا: اولاد یعقوب خطاکار سہی لیکن خاندان نبوت کے افراد ہیں۔ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے ہیں۔ آداب بندگی سے واقف ہیں کہ اپنے گناہوں کی مغفرت کے لیے رسول خدا اپنے والد بزرگوار کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اللہ سے طلب عفو کے لیے ان کو وسیلہ بناتے ہیں: ابا ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا کیجیے۔

۲۔ قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَکُمۡ: حضرت یعقوب علیہ السلام بالفور دعا نہیں فرماتے بلکہ عنقریب دعا کرنے کا وعدہ فرماتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اَخَّرَهُمْ اِلَى السَّحَرِ لَيْلَةَ الْجُمْعَةِ.[1] ان کے لیے دعا کو شب جمعہ کی سحر تک مؤخر کر دیا۔

اہم نکات

۱۔ گناہوں کی مغفرت کے لیے انبیاء وسیلہ ہیں: یٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ ....

فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰی یُوۡسُفَ اٰوٰۤی اِلَیۡہِ اَبَوَیۡہِ وَ قَالَ ادۡخُلُوۡا مِصۡرَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ ﴿ؕ۹۹﴾

۹۹۔ جب یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھایا اور کہا: اللہ نے چاہا تو امن کے ساتھ مصر میں داخل ہو جائیے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰی یُوۡسُفَ: برسوں کی جدائی اور یوسف پر ایک زندگی گریہ و زاری کے بعد یہ

---

[1] وسائل الشیعۃ ۷: ۳۸۹ باب استحباب الاکثار من الدعا...

ملاقات کس قدر رقت آمیز ہوئی ہو گی؟ ’’مصر میں داخل ہو جایئے‘‘ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے والد بزرگوار کے استقبال کے لیے مصری حدود یا شہر کی حدود سے نکل آئے تھے۔ اس طرح اٰوٰی کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کے گلے لپٹے۔ چنانچہ اس استقبال کا ذکر توریت میں بھی ملتا ہے۔

۲۔ اٰوٰۤی اِلَیۡہِ اَبَوَیۡہِ: اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ اس جملے سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ زندہ تھیں اور جس روایت میں ذکر ہے کہ ان کی والدہ فوت ہو چکی تھیں وہ ظاہر قرآن سے متصادم ہے۔

۳۔ بعض مفسرین نے ادۡخُلُوۡا مِصۡرَ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس وقت کے رواج کے مطابق کسی اجنبی کو شاہی اجازت کے بغیر مصر میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ بعض نے کہا ہے: ادۡخُلُوۡا سے مراد اقامت پزیر ہو جایئے، ہے۔

۴۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے خاندان کو امن نامہ بھی فراہم کیا کہ یہاں امن سے رہیں گے لیکن یہ امن مشیت الٰہی سے وابستہ ہے کہ جب تک اللہ نے چاہا یہاں امن سے رہو گے گویا کہ خاندان یعقوب کا مصر میں داخل ہونا حضرت یوسف علیہ السلام کی فتح تھی۔ جیسا کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے فتح مکہ کی خوشخبری کے موقع پر ارشاد ہوا:

لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ ....[1]	اللہ نے اگر چاہا تو تم مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ ہر معاملے کو ارادۂ خدا سے مربوط کرنا آداب بندگی میں سے ہے: اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ۔

وَ رَفَعَ اَبَوَیۡہِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَ خَرُّوۡا لَہٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ یٰۤاَبَتِ ہٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ ۫ قَدۡ جَعَلَہَا رَبِّیۡ حَقًّا ؕ وَ قَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ وَ جَآءَ بِکُمۡ مِّنَ	۱۰۰۔ اور یوسف نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور وہ سب ان کے آگے سجدے میں گر پڑے اور یوسف نے کہا: اے ابا جان! یہی میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا، بتحقیق میرے رب نے اسے سچ کر دکھایا اور اس نے سچ مچ مجھ پر احسان کیا جب مجھے

----
[1] ۴۸ فتح: ۲۷

الۡبَدۡوِ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ نَّزَغَ الشَّیۡطٰنُ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَ اِخۡوَتِیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَطِیۡفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۰۰﴾	زندان سے نکالا بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈالا آپ کو صحرا سے (یہاں) لے آیا، یقیناً میرا رب جو چاہتا ہے اسے تدبیر خفی سے انجام دیتا ہے، یقیناً وہی بڑا دانا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

الۡبَدۡوِ: (ب د و) ہر وہ مقام جہاں کوئی عمارت وغیرہ نہ ہو اور تمام چیزیں ظاہر نظر آتی ہوں اسے بدو یا، بادیہ کہا جاتا ہے اور البادی کے معنی صحرا نشین کے ہیں۔

نَّزَغَ: (ن ز غ) النزغ کے معنی کسی کام کو بگاڑنے کے لیے اس میں دخل انداز ہونے کے ہیں۔

لَطِیۡفٌ: (ل ط ف) لطائف سے وہ باتیں مراد لی جاتی ہیں جن کا ادراک انسانی حواس نہ کر سکتے ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ رَفَعَ اَبَوَیۡہِ عَلَی الۡعَرۡشِ: حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کو تخت پر بٹھایا۔ اگر تخت سے مراد تخت حکومت لیا جائے تو اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ یوسف علیہ السلام مصر کے تخت نشین بادشاہ بن گئے تھے لیکن ممکن ہے کہ تخت شاہی نہ ہو، اس سے کمتر کوئی تخت ہو۔ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام اوّلاً مصر میں بادشاہ کے بعد سب سے اہم منصب پر فائز تھے۔ چنانچہ خود قرآن حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز کے نام سے یاد کرتا ہے اور ساتھ بادشاہ کا بھی ذکر کرتا ہے۔ مورخین نے بھی تاریخ مصر میں بادشاہوں کے سلسلہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ حضرت یوسف علیہ السلام کے معاصر بادشاہوں کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ وَ خَرُّوۡا لَہٗ سُجَّدًا: اور سب یوسف علیہ السلام کے آگے سجدے میں گر پڑے۔ سجدے سے مراد وہ اصطلاحی سجدہ نہیں جو شریعت اسلامی میں رائج ہے۔ یعنی ہاتھ گھٹنے اور پیشانی زمین پر رکھنا۔ یہ سجدہ کسی بھی شریعت میں غیر اللہ کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ یہاں لفظ سجدہ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لغت میں سجدہ جھکنے کے معنوں میں آتا ہے۔ صحاح میں آیا سجد خضع۔ سجد الرجل طاطا راسہ۔ سر جھکانے کو سجدہ کہتے ہیں اور لفظ خرّ سے بھی یہ نہیں سمجھا جاتا کہ زمین پر گرے ہیں۔ خرّ مطلق زمین کی طرف جھکنے کے معنوں میں ہے۔ جیسے:

وَ خَرَّ رَاکِعًا وَّ اَنَابَ [1]	اور عاجزی کرتے ہوئے جھک گئے اور (اللہ کی طرف) رجوع کیا۔

---

[1] ۳۸ ص: ۲۴

لہٰذا اس سجدے کے بارے میں کسی توجیہ و تاویل اور تکلف کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ بڑے بڑے مفسرین نے کی ہے کیونکہ یہ سجدہ ایک قسم کا تعظیمی آداب تھا جو ذرا زمین کی طرف جھک کر بجا لایا جاتا تھا اور یہ بات بہت قدیم قوموں کے آداب و رسوم میں رائج تھی۔

۳۔ وَقَالَ یٰۤاَبَتِ: برسوں کی جدائی کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام اس عرصہ میں پیش آنے والے اہم واقعات کا اپنے والد بزرگوار سے ذکر کرتے ہیں۔

الف۔ ہٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ: سب سے پہلے اس بات کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جو خواب بچپن میں دیکھا تھا اللہ نے اسے سچ کر دکھایا۔

ب۔ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ: اللہ نے مجھے قید سے آزاد کر کے مجھ پر احسان کیا۔ والد کو اپنی سرگزشت سناتے ہوئے یہ نہیں بتایا لوگوں نے مجھے قید میں ڈال دیا۔ اس واقعہ کا تلخ پہلو نہیں، شیرین پہلو بتا دیتے ہیں۔

ج۔ وَجَآءَ بِکُمۡ مِّنَ الۡبَدۡوِ: آپؑ کو صحرا سے یہاں لے آیا۔ شیطان نے میرے اور میرے برادران میں فساد ڈالنے کے بعد۔ یہاں بھی اس واقعہ کا شیرین پہلو بتا دیا اور تلخ پہلو کا ذکر کچھ اس طرح فرمایا کہ برادران کو خفت سے دوچار نہ ہونا پڑے کہ شیطان نے ہمارے درمیان فساد ڈالا ہے۔

د۔ ضمناً اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ دیہات کی بہ نسبت شہر کو، جو مرکز تہذیب و تمدن ہوتا ہے، فضیلت حاصل ہے۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے متعدد طرق سے روایت ہے۔ سات ایسے گناہان کبیرہ ہیں جن کا ارتکاب کرنے والا آتش جہنم کا مستحق ہے۔

i۔ جان بوجھ کر قتل کرنا۔

ii۔ عفیفہ عورت پر بے عفتی کا الزام عائد کرنا۔

iii۔ سود خوری۔

iv۔ جنگ سے فرار۔

v۔ شہر کی طرف ہجرت کے بعد دوبارہ صحرا نشینی اختیار کرنا۔

vi۔ والدین سے عاق ہونا۔

vii۔ یتیم کا مال کھانا۔

آخر میں فرمایا: شہر کی طرف ہجرت کے بعد صحرا نشینی اختیار کرنا اور شرک کرنا ایک ہی چیز ہے۔[1]

---

[1] اصول کافی ۲: ۲۷۷۔۲۸۱

اہم نکات

۱۔ فاتح کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے شکست کھانے والے کا دل شکستہ ہو جائے۔ یوسف علیہ السلام نے کنویں کے واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔

۲۔ دیہی زندگی سے شہری زندگی بہتر ہے: وَجَآءَ بِکُمۡ مِّنَ الۡبَدۡوِ ....

رَبِّ قَدۡ اٰتَیۡتَنِیۡ مِنَ الۡمُلۡکِ وَ عَلَّمۡتَنِیۡ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۟ اَنۡتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۚ تَوَفَّنِیۡ مُسۡلِمًا وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰۱﴾

۱۰۱۔ اے میرے رب! تو نے مجھے اقتدار کا ایک حصہ عنایت فرمایا اور ہر بات کے انجام کا علم دیا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا میں بھی میرا سرپرست ہے اور آخرت میں بھی، مجھے (دنیا سے) مسلمان اٹھا لے اور نیک بندوں میں شامل فرما۔

تفسیر آیات

۱۔ رَبِّ قَدۡ اٰتَیۡتَنِیۡ مِنَ الۡمُلۡکِ: حضرت یوسف علیہ السلام اپنے رب کی بارگاہ میں یہ مناجات عین اس وقت کر رہے ہیں کہ ان کے وہ بھائی سامنے سر جھکائے کھڑے ہیں جو کل ان کی جان کے پیاسے تھے۔ آج یوسف علیہ السلام اپنے تخت اقتدار پر متمکن ہیں لیکن اپنی اس عظیم کامیابی پر فخر و مباہات کرنے کی جگہ اپنے رب کی بارگاہ میں اس عظیم نعمت کا شکر بجالاتے ہیں۔ وہ شکایت کی جگہ شکر، ملامت کی جگہ اللہ کے احسان، فخر و مباہات کی جگہ، اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

۲۔ اَنۡتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ: اور اپنے حاسدوں کے بارے میں بد دعا کرنے کی جگہ اپنے لیے دعائے خیر کرتے ہیں اور اپنی بڑائی ظاہر کرنے کی جگہ اللہ کی ولایت مطلقہ کا ذکر کرتے ہیں۔

۳۔ تَوَفَّنِیۡ مُسۡلِمًا: انجام بخیر ہونے کی دعا انبیاء (ع) بھی کرتے ہیں۔ چونکہ حسن عاقبت نہایت اہم ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص پوری زندگی اسلام پر قائم رہے لیکن موت کے وقت کے اضطراب میں شیطان کا ہو کر مر جائے۔ اگرچہ انبیاء (ع) کے لیے ایسا ممکن نہیں ہے لیکن اسلام کی حالت میں خاتمہ بخیر ہونے کی دعا سے انبیاء (ع) غافل نہیں رہتے۔

اہم نکات

۱۔ حاسدوں پر فتح ملنے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ ان کی ملامت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس فتح پر

اللہ کے احسانات کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

۲۔ ہر کامیابی کی صورت میں بارگاہ الٰہی میں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡہِ اِلَیۡکَ ۚ وَ مَا کُنۡتَ لَدَیۡہِمۡ اِذۡ اَجۡمَعُوۡۤا اَمۡرَہُمۡ وَ ہُمۡ یَمۡکُرُوۡنَ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ یہ غیب کی خبروں کا حصہ ہیں جنہیں ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں ورنہ آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنا عزم پختہ کر کے سازش کر رہے تھے۔

تفسیر آیات

قصہ یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ سارے حقائق وحی پر مبنی ہیں ورنہ مکہ جیسے ماحول میں زندگی کرنے والے کسی شخص کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ ان حقائق تک رسائی کے دو ذرائع ہو سکتے ہیں:

اول یہ کہ آپ خود اس وقت موجود ہوں اور برادران یوسف کے اعمال کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔

دوسرا وحی کے ذریعے یہ حقائق آپ تک پہنچ گئے ہوں۔ پہلی صورت سب کے لیے عیاں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برادران یوسف کے پاس موجود نہ تھے۔ لہٰذا دوسری صورت، وحی کے ذریعے ہونا ثابت ہو جاتی ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ سوال اٹھائے کہ تیسری صورت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ان حقائق کو بائبل اور دوسری قدیم کتب کے ذریعے حاصل کیا ہو۔ جواب یہ ہے کہ قدیم کتابوں، مثلاً بائبل یا تلمود کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصے کے اہم ترین حصوں میں قرآن اور ان کتابوں میں اختلاف ہے بلکہ ان کتابوں میں تو اس قصے کا صرف واقعاتی پہلو مذکور ہے، وہ بھی اختلاف کے ساتھ لیکن اس کے رسالتی اور روحانی پہلو کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے جو اس قصے کی روح ہے۔

اہم نکات

۱۔ تاریخ کے پوشیدہ حقائق کا بیان کرنا قرآن کے وحی من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

وَ مَاۤ اَکۡثَرُ النَّاسِ وَ لَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِیۡنَ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳۔ اور آپ کتنے ہی خواہش مند کیوں نہ ہوں ان لوگوں میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں.

وَ مَا تَسۡـَٔلُہُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ؕ اِنۡ

۱۰۴۔ اور (حالانکہ) آپ اس بات پر ان سے کوئی اجرت بھی نہیں مانگتے اور یہ (قرآن) تو

هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۴﴾ عالمین کے لیے بس ایک نصیحت ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَاۤ اَکۡثَرُ النَّاسِ: یہودیوں نے حضورؐ کی نبوت کی آزمائش کے لیے سوال کیا تھا کہ اس نبی کا حال بتائیے جو شام میں رہتے تھے اور ان کا بیٹا مصر لے جایا گیا تو وہ نبی اس پر اتنا روئے کہ آنکھیں نابینا ہو گئیں۔[1]

اس سوال کے جواب میں جب پورا واقعہ بیان کر دیا گیا تو یہ توقع کرنا قرین حق معلوم ہوتا ہے کہ اس معجزہ کو دیکھ کر وہ ایمان لے آئیں گے۔ اس جگہ اللہ فرماتا ہے: خواہ آپ کتنا ہی چاہیں، یہ لوگ اب بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

۲۔ وَمَا تَسۡـَٔلُہُمۡ عَلَیۡہِ: کیونکہ ان کا ایمان نہ لانا اس لیے نہ تھا کہ وہ کسی معقول دلیل کے انتظار میں ہیں بلکہ وہ ہر صورت میں ایمان نہیں لائیں گے۔ اگر وہ کوئی سوال کرتے ہیں تو اس کا مقصد حق جوئی نہیں بلکہ بہانہ جوئی ہوتا ہے۔ ورنہ اس دعوت میں کوئی دنیاوی مفاد نہیں ہے، نہ ہی یہ دعوت کسی خاص خطے اور قوم و قبیلے کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ یہ تو تمام عالمین کے لیے ایک نصیحت ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسول خداؐ انسانوں کی نجات کے لیے شدید خواہشمند تھے: وَلَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ....

۲۔ دعوت حق کاروبار نہیں، حق تک پہنچانا مقصد ہے: وَمَا تَسۡـَٔلُہُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ....

وَکَاَیِّنۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ یَمُرُّوۡنَ عَلَیۡہَا وَہُمۡ عَنۡہَا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

۱۰۵۔ اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ بغیر اعتنا کے گزر جاتے ہیں۔

تفسیر آیات

قصہ یوسف علیہ السلام میں موجود ان زندہ نشانیوں سے چشم پوشی کرنا تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ تو ان واضح اور صریح نشانیوں کو بھی اعتنا میں نہیں لاتے جو شب و روز ان کے مشاہدے میں آتی ہیں۔ آفاقی آیات میں یہ لوگ غور و خوض کرتے ہیں اور نہ انفس کی تہ بہ تہ نشانیوں کی طرف توجہ کرتے ہیں بلکہ ان سے بڑی بے اعتنائی کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کی نشانی نہیں سمجھتے بلکہ ان کو روز کا معمول سمجھتے ہیں،

---

[1] تفسیر قرطبی ۹: ۱۳۰

ورنہ ایمان والوں کو ان میں سے ہر ایک میں اللہ نظر آتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کائنات کی ہر چیز میں غور وفکر کرتا ہے۔

۲۔ نظام کائنات کی وحدت، اس کے خالق کی وحدت پر دلیل ہے۔

وَمَا یُؤۡمِنُ اَکۡثَرُہُمۡ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ہُمۡ مُّشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۰۶﴾

۱۰۶۔ ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان لائے بھی ہیں تو اس کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں۔

اَفَاَمِنُوۡۤا اَنۡ تَاۡتِیَہُمۡ غَاشِیَۃٌ مِّنۡ عَذَابِ اللّٰہِ اَوۡ تَاۡتِیَہُمُ السَّاعَۃُ بَغۡتَۃً وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾

۱۰۷۔ کیا یہ لوگ اس بات سے بے فکر ہیں کہ اللہ کی طرف سے کوئی عذاب انہیں گھیر لے یا ناگہاں قیامت کی گھڑی آجائے اور انہیں خبر تک نہ ہو؟

تفسیر آیات

وہ یہ نہیں کہتے کہ خدا نہیں ہے بلکہ وہ خدا پر ایمان لاتے بھی ہیں تو اللہ کی ذات و صفات میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔

جس طرح ایمان کے مراتب ہیں، شرک کے بھی مراتب ہیں۔ وہ اس بات پر ایمان تو رکھتے ہیں کہ عبادت صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے مگر وہ اطاعت جابروں کی کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ نفع و نقصان اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر وہ اللہ کو ناراض کر کے اپنے مفادات کے لیے کسی ظالم کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ وہ مانتے ہیں اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ ہے مگر وہ عملاً غیر اللہ کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ مانتے ہیں قانون سازی کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے لیکن وہ غیر اللہ کے وضع کردہ قوانین کو اختیار اور اللہ کے وضع کردہ قانون کو ترک کر دیتے ہیں۔

انہی باتوں کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ الشِّرْکَ اَخْفَی مَنْ دَبِیبِ النَّمْلِ عَلَی صَفَاۃٍ سَوْدَاءَ فِی لَیْلَۃٍ ظَلْمَاءَ.[۱]

شرک چیونٹی کے اس نقش پا سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے جو سیاہ پتھر پر رات کی تاریکی میں ثبت ہو گیا ہو۔

اہم نکات

۱۔ موحد کامل ہی کامل طور پر شرک سے مبرا ہوتا ہے۔

---

[۱] وسائل الشیعۃ ۱۶: ۲۵۴۔ باب وجوب کف اللسان عن المخالفین

۲۔ اکثر کا ایمان شرک کے ساتھ ملوث ہوا کرتا ہے۔

قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ‌ ۚ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىۡ‌ ؕ وَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔ کہد یجیے: یہی میرا راستہ ہے، میں اور میرے پیروکار، پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور پاکیزہ ہے اللہ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

تفسیر آیات

ا۔ قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ: اے رسول، کہہ دیجیے خدائے واحد کی طرف دعوت دینا ہی میرا راستہ ہے۔ اس دعوت کا خاصہ یہ ہے کہ یہ دعوت علی بصیرۃ ہے۔ یقین و معرفت کی بنیاد پر ہے۔ کسی مصلحت و تقلید کی بنیاد پر نہیں ہے کیونکہ یہ دین فکر و عقل اور دلیل و برہان کا دین ہے اور پیروکاروں میں جو لوگ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ ہیں وہ بھی اس دعوت میں شریک ہیں۔

واضح رہے کہ تبلیغ و دعوت اصالتاً و ابتداء رسول اللہ کی ذمے داری ہے کہ اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس مرحلے میں رسول کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہوتا۔ یہ صرف رسول اللہ کی ذمے داری ہے۔ البتہ سورۂ برائت کی تبلیغ کے سلسلہ میں ایک موقع ایسا آیا اس مرحلے میں خود رسول اللہ (ص) یہ تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے حضرت علی علیہ السلام کو رجل منك کے عنوان سے رسول اسلامؐ کے بعد مَنِ اتَّبَعَنِىۡ کے مقام پر فائز کر دیا اور سورہ برائت کی ابتدائی تبلیغ فرمائی۔

رسول اللہؐ کی طرف سے تبلیغ ہونے کے بعد اس دعوت و تبلیغ کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ اس مرحلے میں دعوت و ارشاد کے لیے ہر وہ ہستی جو عَلٰى بَصِيۡرَةٍ کے مقام پر فائز ہو، دعوت الی اللہ کے منصب پر بھی فائز ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس دعوت کے دو ارکان ہیں:

i۔ اتباع رسولؐ: اس میں وہ شخص شامل نہیں ہے جو بظاہر اسلام قبول کرتا ہے اور ساتھ شرک کی بھی آمیزش ہے بلکہ وہ شخص اس میں شامل ہے جس نے اتباع کا حق ادا کیا ہو۔

ii۔ بصیرت و یقین: اگر داعی حق خود یقین کی منزل پر فائز نہ ہو تو وہ دوسروں کو صحیح معنوں میں دعوت نہیں دے سکتا۔

حاکم حسکانی نے شواھد التنزیل ا: ۲۸۵، شہاب الدین شافعی نے توضیح الدلائل (قلمی نسخہ) ص۱۶۱[۱]، کلینی نے الکافی میں اس روایت کا ذکر کی ہے کہ مَنِ اتَّبَعَنِىۡ سے مراد حضرت علی

---

[۱] المظفر دلائل الصدق ۲: ۲۵۳

علیہ السلام ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی دعوت بصیرت و یقین پر قائم ہے۔

۲۔ اسلامی قیادت کے لیے وہ ہستی قابل قبول ہے جو علی بصیرۃ ہو۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰی ؕ اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾

۱۰۹۔ اور آپ سے پہلے ہم ان بستیوں میں صرف مردوں ہی کو بھیجتے رہے ہیں جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے تو کیا یہ لوگ روئے زمین پر چل پھر کر نہیں دیکھتے کہ ان سے پہلے والوں کا انجام کیا ہوا؟ اور اہل تقویٰ کے لیے تو آخرت کا گھر ہی بہتر ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

تفسیر آیات

۱۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ: مشرکین کس بنیاد پر آپ (ص) کی نبوت و رسالت کے منکر ہیں؟ کیا آپ کا رسول بن کر آنا کوئی نئی اور انوکھی بات ہے۔ آپؐ سے پہلے بھی مردان حق کو ہم نے وحی دے کر بھیجا ہے۔ کبھی ہم نے کسی فرشتے کو انسانوں کے لیے رسول بنا کر نہیں بھیجا۔ نہ ہی کسی کو دیگر کرۂ ارضی سے بھیجا ہے بلکہ اسی سرزمین اور انہیں بستیوں میں سے بھیجا ہے جو آج اپنے جرائم کی علامت بنی ہوئی برباد پڑی ہیں۔

۲۔ اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ: تمہیں ان بستیوں میں چل پھر کر دیکھنا اور درس عبرت لینا چاہیے کہ ان کا انجام کیا ہوا ہے۔

اہم نکات

۱۔ آخرت کا گھر اہل تقویٰ کے لیے ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا اسۡتَیۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوۡۤا

۱۱۰۔ یہاں تک کہ جب انبیاء (لوگوں سے) مایوس ہو گئے اور لوگ بھی یہ خیال کرنے لگے کہ ان

اَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُوۡا جَآءَهُمۡ نَصۡرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنۡ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاۡسُنَا عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۱۰﴾

سے جھوٹ بولا گیا تھا تو پیغمبروں کے لیے ہماری نصرت پہنچ گئی، اس کے بعد جسے ہم نے چاہا اسے نجات مل گئی اور مجرموں سے تو ہمارا عذاب ٹالا نہیں جا سکتا۔

تفسیر آیات

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسکین قلب اور فتح و نصرت کے لیے اللہ کی سنت جاریہ کا ذکر ہے۔

دعوت الی اللہ کے لیے یقین و برہان جیسی مضبوط اور محکم اساس اس لیے درکار ہوتی ہے کہ یہ کام، کوئی ایسا عمل نہیں کہ ہر شخص اسے انجام دے سکے اور تھوڑی سی مشقت پر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائے۔ اگر کوئی نااہل اس مقام کا مدعی بن جاتا ہے تو معمولی سی مشقت پر ہار مان لیتا ہے اور حق و باطل کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ دعوت الی اللہ کے پیچھے اگر یقین محکم جیسی پشتیبانی نہیں ہے تو انسان ان مشکلات و صبر شکن مصائب کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو ہر رسول کو اپنے زمانے کی جاہلیت کی طرف سے پیش آیا کرتے ہیں۔

مشکلات اس قدر سنگین، مصائب و آلام کے دن اتنے لمبے ہوتے ہیں اور وہ اس حد تک جھنجھوڑے جاتے ہیں کہ وقت کا رسول اور اس کے اہل ایمان ساتھی چیخ اٹھتے ہیں کہ آخر اللہ کی نصرت کب آئے گی؟

حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰهِ ....[1]

(وقت کا) رسول اور اس کے مومن ساتھی پکار اٹھے کہ آخر اللہ کی نصرت کب آئے گی؟

یاس کا عالم یہ ہو جاتا ہے کہ لوگوں کے دل میں یہ خیال آنے لگتا ہے کہ مؤمنین کے لیے نصرت اور کافرین کے لیے عذاب کا جو وعدہ کیا گیا تھا اس میں کہیں خلاف وعدہ تو نہیں ہو رہا؟

کسی تاویل و توجیہ کے بغیر بظاہر سیاق آیت اس طرح ہے:

> پیغمبران جب نصرت خداوندی سے مایوس ہو جاتے اور یہ گمان کرنے لگتے کہ ان سے جھوٹ بولا گیا ہے، یکدم ہماری نصرت ان کو پہنچ جاتی ہے۔ پھر ہم جس کو چاہتے ہیں نجات دیتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا کیا جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم اور حالات پر آگاہ ہوتے ہیں تو ان کے دلوں میں یہ یاس اور وعدہ خلافی کا خیال کیونکر آ سکتا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے بعض اہل قلم نے تو یہاں تک کہدیا: لفظ کُذِبُوۡا کا حاصل اپنے تخمینے اور خیال کا غلط ہونا ہے جو ایک قسم کی اجتہادی غلطی ہے اور انبیاء علیہم السلام سے ایسی کوئی اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے۔[2] یہ تفسیر ہمارے لیے قطعاً قابل قبول نہیں ہے۔

---

[1] ۲ بقرۃ: ۲۱۴ [2] معارف قرآن ۵: ۱۶۲

اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ ظاہر آیت سے جو معنی بادی النظر میں سامنے آتے ہیں وہ مراد نہیں لیے جا سکتے کیونکہ اس سے نہ صرف عصمت انبیاء پر بلکہ ایمان پر بھی حرف آتا ہے کہ وہ وعدہ الٰہی کے کذب کا گمان کریں۔ لہٰذا اس آیت کی توجیہ و تاویل ضروری ہے۔ روایت کے مطابق آیت کی توجیہ یہ ہے:

حَتّٰۤی اِذَا اسۡتَیۡـَٔسَ جب انبیاء علیہم السلام لوگوں کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے۔ خدا کی نصرت سے نہیں، لوگوں سے مایوس ہو گئے۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے مایوسی کا اظہار فرمایا:

اِنَّکَ اِنۡ تَذَرۡہُمۡ یُضِلُّوۡا عِبَادَکَ وَ لَا یَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا ۝[1]

اگر تو انہیں چھوڑ دے گا تو وہ یقیناً تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور یہ لوگ صرف بدکار کافر اولاد ہی پیدا کریں گے۔

۲۔ وَ ظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ قَدۡ کُذِبُوۡا: اور لوگوں نے بھی یہ خیال کرنا شروع کیا کہ انبیاء علیہم السلام نے ان سے جھوٹ بولا ہے کہ اللہ کی نصرت آنے والی ہے۔ جَآءَہُمۡ نَصۡرُنَا تب ہماری نصرت آ گئی۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے مامون کے سوال کے جواب میں فرمایا:

حَتّٰۤی اِذَا اسۡتَیۡـَٔسَ الرُّسُلُ من قومھم و ظن قومھم ان الرسل قد کذبوا جاء الرسل نصرنا...۔[2]

جب مرسلین اپنی قوم سے مایوس ہو گئے اور قوم نے بھی یہ گمان کرنا شروع کیا کہ رسولوں سے جھوٹ بولا گیا ہے، رسولوں تک ہماری نصرت آ گئی۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی نصرت اتنی ارزاں نہیں ہوتی کہ ہر شخص کو ہر وقت میسر آئے۔

۲۔ اللہ کی غیبی نصرت اس وقت آتی ہے جب ظاہری اسباب و وسائل سے مایوس ہو جائے۔

۳۔ حق کی دعوت دینے والے یأس کی سرحد تک استقامت کرتے ہیں۔

لَقَدۡ کَانَ فِیۡ قَصَصِہِمۡ عِبۡرَۃٌ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ؕ مَا کَانَ حَدِیۡثًا یُّفۡتَرٰی وَ لٰکِنۡ تَصۡدِیۡقَ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ تَفۡصِیۡلَ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱۔ بتحقیق ان (رسولوں) کے قصوں میں عقل رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے، یہ (قرآن) گھڑی ہوئی باتیں نہیں بلکہ اس سے پہلے آئے ہوئے کلام کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل (بتانے والا) ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

---

[1] ۷۱ نوح: ۲۷		[2] بحار ۱۱: ۸۲ باب ۴۔ عصمت انبیأ علیہم السلام ...۔

تشریح کلمات

عِبۡرَۃٌ: (ع ب ر) العبرۃ اس حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی دیکھی چیز کی وساطت سے ان دیکھے نتائج تک پہنچا جائے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَقَدۡ کَانَ فِیۡ قَصَصِہِمۡ عِبۡرَۃٌ: قرآن میں انبیاء علیہم السلام کے علی العموم اور حضرت یوسف علیہ السلام کے علی الخصوص قصے اس مقصد کے لیے بیان ہوتے ہیں کہ داعیان راہ حق کو اس بات کا علم ہو کہ اس راہ میں پیش آنے والی ہمت شکن مشکلات کے بعد اللہ کی طرف سے غیبی فتح و نصرت آ سکتی ہے۔ اس بارے میں جو حکمت آمیز سنت و قانون رائج ہے اس کی روشنی میں استقامت و اطمینان کے بعد فتح و نصرت کی امید رکھی جاتی ہے۔

۲۔ مَا کَانَ حَدِیۡثًا یُّفۡتَرٰی: قصہ یوسف علیہ السلام کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا کہ یہ قصہ گھڑی ہوئی باتیں نہیں بلکہ سابقہ کتب شاہد ہیں کہ ان میں بھی قصہ یوسف علیہ السلام مذکور ہے۔ یہ اس کی تصدیق ہے۔

۳۔ وَ تَفۡصِیۡلَ کُلِّ شَیۡءٍ: ''اس میں ہر چیز کی تفصیل ہے'' سے مراد ہر وہ چیز جو ہدایت بشر سے مربوط ہے اس کی تفصیل موجود ہے کیونکہ قرآن کتاب ہدایت و رحمت ہے۔ لہٰذا اپنے موضوع، ہدایت و رحمت میں اللہ تعالیٰ بہت بڑا فیاض ہے۔ ہدایت کے متعلق کسی گوشے کو تشنہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ تاریخی حقائق انسان ساز ہوتے ہیں: فِیۡ قَصَصِہِمۡ عِبۡرَۃٌ ....

۲۔ قرآن میں ہدایت و رحمت سے متعلق ہر چیز کی تفصیل موجود ہے: وَ تَفۡصِیۡلَ کُلِّ شَیۡءٍ ....

سُورَةُ الرَّعۡدِ

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اپنے مضامین و اسلوب خطاب کی روشنی میں اس سورت کا مکّی ہونا واضح ہے۔ اگرچہ بعض روایات و مصاحف میں اس سورہ کو مدنی کہا ہے۔

سورۂ رعد باقی مکی سورتوں کی طرح بیشتر توحید، رسالت اور معاد پر گفتگو کرتا ہے لیکن اس سورۂ میں جو طرز کلام، آہنگ وسخن اور طریقہ استدلال اختیار کیا گیا ہے وہ باقی سورتوں سے منفرد ہے کہ ایک ہی موضوع پر کئی بار گفتگو ہوتی ہے لیکن ہر مرتبہ انداز سخن جدید اور طرز استدلال نرالا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓـمّٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ①

بنام خدائے رحمٰن رحیم

۱۔ الف لام میم را، یہ کتاب کی آیات ہیں اور جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر آیات

۱۔ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ: الکتاب سے مراد اگر قرآن ہے تو قرآن میں اللہ کی ربوبیت اور وحدانیت پر دلالت کرنے والی واضح اور غیر مبہم آیات ہیں۔ اگر الکتاب سے کائنات مراد لی جائے تو آیات سے مراد آسمان، شمس وقمر وغیرہ ہیں۔

اس سورہ مبارکہ میں آیات کا ذکر بہت زیادہ آتا ہے۔ قابل توجہ مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جہاں آیات فرماتا ہے وہاں آیات سے مراد کیا ہیں؟ اللہ کے وجود کی آیات؟ اللہ کے خالق ہونے کی آیات یا اللہ کی وحدانیت کی آیات؟ یا معبود ہونے کی آیات؟ یہ سورۃ مکی ہے اور اس کے مخاطبین اولین مشرکین ہیں جو متعدد معبودوں، اربابوں کے قائل تھے اور تدبیر کائنات کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ وہ ان کے معبودوں کے ہاتھ میں ہے۔ اسی لیے وہ ان کا پوجا کرتے ہیں۔ وہ آخرت کے منکر کسی ثواب کے قائل نہ تھے۔ اپنے

امور کی تدبیر کے لیے اپنے معبودوں کا پوجا کرتے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ ان نشانیوں کا ذکر فرماتا ہے جو اللہ کے مدبر کائنات ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا یہاں، جہاں پر آیات کا ذکر آتا ہے اس سے مراد آیات تدبیری ہیں۔

۲۔ وَالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ: رسول اللہؐ کی رسالت کی حقانیت کے اثبات سے سورہ کا افتتاح ہو رہا ہے کہ اس کتاب یعنی قرآن کے مضامین خود گواہ ہیں کہ یہ مبنی برحق ہیں۔ اس قسم کی آیتیں کسی بشر کی ساختہ و بافتہ نہیں ہو سکتیں۔ اس بات کو زندہ ضمیر کا مالک انسان سمجھ سکتا ہے، سمجھ لیتا بھی ہے اور ایمان لاتا ہے لیکن اکثر اس حقیقت کو نہیں مانتے۔

اہم نکات

۱۔ کبھی مضمون کلام خود اپنی حقانیت کی دلیل بنتا ہے: اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ ....

اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّکُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ۲

۲۔ اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں کو تمہیں نظر آنے والے ستونوں کے بغیر بلند کیا پھر اس نے عرش پر سلطنت استوار کی اور سورج اور چاند کو مسخر کیا، ان میں سے ہر ایک مقررہ مدت کے لیے چل رہا ہے، وہی امور کی تدبیر کرتا ہے وہی نشانیوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہے شاید تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں چند ایسے شواہد کا ذکر ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کے پیچھے ایک شعور کارفرما ہے جس سے اس کائنات کی تدبیر ہو رہی ہے۔

۱۔ اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ: آسمانوں کو نامرئی اور غیر محسوس ستونوں پر قائم کیا ہے۔ ستونوں کی نفی نہیں ہے بلکہ رؤیت کی نفی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آسمان غیر مرئی ستونوں پر قائم ہے۔ اب تک کے فہم کے مطابق یہ ستون جاذبہ و دافعہ میں توازن ہیں۔ اجرام فلکی دو چیزوں پر قائم ہیں: ایک ان کا حجم مادی اور اجرام کی کشش اور دوسری ان کی حرکت۔ حرکت کی وجہ سے مرکز سے دور ہو جاتے ہیں اور حجم مادی کی وجہ سے جذب و کشش وجود میں آتی ہے۔ ان دونوں میں توازن وہ غیر مرئی ستون ہیں جن پر اجرام فلکی قائم ہیں۔ لہٰذا آسمان سے مراد اجرام فلکی ہی ہو سکتے ہیں۔

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ بیان کی گئی ہے: بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا کا مطلب یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ اللہ نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے اٹھایا ہے۔ یہ تفسیر قابل قبول اس لیے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام کائناتی نظام کو اسباب و علل پر قائم رکھا ہے۔ اگر یہ ستون جاذبہ و دافعہ نہیں ہیں تو یہاں کوئی اور اسباب ہیں جن کے ذریعے کائنات کو مربوط رکھا ہے۔

۲۔ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ: آسمانوں کو غیر مرئی ستونوں پر استوار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ عرش اقتدار و سلطنت عالم پر متمکن ہوا۔ عرش سلطنت پر متمکن ہونے کے بارے میں تفصیل ملاحظہ ہو سورہ اعراف آیت ۵۴۔

۳۔ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی: سورج، چاند اور دیگر اجرام فلکی سب جاری و ساری ہیں۔ کائنات میں کوئی ایسا کرہ نہیں جو ساکن ہو۔ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ سب کے سب حرکت میں ہیں۔ البتہ ان کی یہ حرکت دائمی نہیں، ایک معین مدت کے لیے ہے۔ جیسا کہ ان اجرام کی ایک ابتدا تھی، انتہا بھی ہے۔

۴۔ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ: اس غیر محدود لامتناہی کائنات اور ان میں موجود ہر چیز کو ایک نظم و انضباط کے تحت چلانا کیا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ان تدبیروں کے پیچھے ایک شعور اور ارادہ کارفرما ہے۔ ان سب کا مدبر اللہ کی ذات ہے۔

۵۔ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ: تدبیر کائنات کی نشانیوں کو اس طرح واضح کیا ہے کہ کوئی ابہام رہ نہ جائے بلکہ حق و ناحق میں تمیز ہو جائے۔ چشم بینا رکھنے والوں کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کائنات کو اللہ نے خلق کیا ہے اور اللہ ہی اس کی تدبیر کر رہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ توازن اور تعادل ہی وہ ستون ہیں جن پر کائنات قائم ہے: بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا ....

۲۔ کائنات کی ہر شیٔ حرکت میں ہے: کُلٌّ یَّجۡرِیۡ ....

۳۔ تدبیر کائنات پر نشانیاں ایسی ہیں جن سے یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ اللہ ہی مدبّر کائنات ہے: تُوۡقِنُوۡنَ۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ مَدَّ الۡاَرۡضَ وَ جَعَلَ فِیۡہَا رَوَاسِیَ وَ اَنۡہٰرًا ؕ وَ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیۡہَا زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّہَارَ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ

۳۔ اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر طرح کے پھلوں کے دو جوڑے بنائے، وہی رات سے دن کو ڈھانپ دیتا ہے، غور و فکر کرنے والوں کے لیے

لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ۝۳ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَهُوَ الَّذِیۡ مَدَّ الۡاَرۡضَ: زمین کو اس طرح پھیلایا کہ اس کی پشت پر زندگی پھل پھول سکے۔ اس قدر سخت بنایا کہ دانہ نہ اُگ سکے اور نہ اس قدر نرم بنایا کہ عمارتیں و دیگر وزنی چیزیں اسی میں دھنس جائیں۔

۲۔ وَجَعَلَ فِیۡهَا رَوَاسِیَ: پھر اس میں پہاڑوں کو بلند کر کے زمین کی طرف دریاؤں کو جاری فرمایا کہ پہاڑوں پر برف کے ذریعے پانی کا ذخیرہ کیا اور یہ برف آہستہ آہستہ پگھل کر میدانوں کی طرف دریا بن کر روانہ ہو جاتی ہیں جن سے زمین سرسبز اور زرخیز بن جاتی ہیں۔

۳۔ وَمِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ: ہر طرح کے پھلوں میں جوڑے بنائے۔ اخیراً انسان کو پتا چلا کہ صرف عالم حیوانات نہیں جن کی بقا، رونق و حیات، نر و مادہ کے امتزاج سے ہے بلکہ نباتات کی دنیا میں بھی پھلوں پھولوں کی رعنائیاں زوجیت کی مرہون منت ہیں۔ قرآن کا تو بہت پہلے صاف لفظوں میں اعلان تھا:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝[1] پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے بنائے ان چیزوں سے جنہیں زمین اگاتی ہے اور خود ان سے اور ان چیزوں سے جنہیں یہ جانتے ہی نہیں۔

لہٰذا زوجیت نہ صرف عالم حیوانات و نباتات پر حاکم ہے بلکہ عالم مجہولات پر بھی حاکم ہے۔

۴۔ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّهَارَ: شب و روز کی آمد و رفت میں موجود بے شمار حکمتیں کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں کہ ان دونوں کا زمین میں حیات و زندگی برقرار رکھنے میں بہت بڑا دخل ہے۔

ان چیزوں کی باہمی ہم آہنگی، ربط اور نظم و ترتیب صاحبان غور و فکر کے لیے ایک بین دلیل ہے کہ ان چیزوں کا تدبیر کنندہ اللہ ہے۔

۵۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ: واضح رہے مذکورہ نشانیاں جہاں خالق کے وجود پر دلالت کرتی ہیں وہاں خالق کی تدبیر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اس کائنات میں مؤثر فی الوجود ایک ہی ہے، خواہ تخلیق ہو یا تدبیر۔

اہم نکات

۱۔ پہاڑوں کا دریاؤں کی تشکیل میں بڑا دخل ہے جس طرح زوجیت کا حیات کی تشکیل میں بڑا دخل ہے۔

وَفِی الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ ۴۔ اور زمین میں باہم متصل ٹکڑے ہیں اور انگوروں

---

[1] ۳۶ یس: ۳۶

جَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ زَرۡعٌ وَّ نَخِیۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّ غَیۡرُ صِنۡوَانٍ یُّسۡقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۟ وَ نُفَضِّلُ بَعۡضَہَا عَلٰی بَعۡضٍ فِی الۡاُکُلِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝﴿۴﴾

کے باغات ہیں نیز کھیتیاں اور کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ دوہرے تنے کے ہوتے ہیں اور کچھ دوہرے نہیں ہوتے، سب کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے لیکن پھلوں میں (لذت میں) ہم بعض کو بعض سے بہتر بناتے ہیں، عقل سے کام لینے والوں کے لیے یقیناً ان چیزوں میں نشانیاں ہیں۔

تشریح کلمات

الصنو: (ص ن و) کسی درخت کی جڑ کی مختلف شاخوں میں سے ہر ایک کو صنو کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ زمین کے ٹکڑے ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ یہ سب ٹکڑے نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے سے متصل ہیں بلکہ جن عناصر پر مشتمل ہیں ان میں بھی یہ ایک دوسرے کے قریب اور متشابہ ہیں۔ اس کے باوجود مختلف علاقوں کی زمین کی خاصیت مختلف ہے۔ بعض علاقے پھلوں کے لیے سازگار ہیں۔ وہ بھی ایک جیسے نہیں۔ کوئی علاقہ کسی پھل کے لیے، کوئی اور سرزمین کسی دوسرے پھل کے لیے سازگار ہے۔ اس طرح مختلف خاصیتوں کے پھل وجود میں آتے ہیں، ہر خاصیت کا پھل انسان کی صحت کے لیے مفید ہے۔

۲۔ صِنۡوَانٌ وَّ غَیۡرُ صِنۡوَانٍ: درخت کو شاخوں کے ذریعے گھنا کر دیا تاکہ ہر شاخ پر پھلوں کو لادا جا سکے۔ کچھ درخت صرف ایک تنے پر مشتمل ہوتے ہیں جیسے سفیدہ، جو عمارت سازی میں کام آتے ہیں۔

۳۔ صِنۡوَانٌ وَّ غَیۡرُ صِنۡوَانٍ: ان مختلف درختوں اور زراعتوں کو ایک پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ یہ ایک پانی خاک میں موجود عناصر کی ترکیب میں کام دیتا ہے۔ پھلوں اور دانہ ہائے گندم و جو مختلف عناصر کی ترکیب سے وجود میں آتے ہیں۔ عناصر کی ترکیب کے اختلاف سے زمین سے اگنے والے پودے مختلف ہوتے ہیں۔ ان سب کے لیے پانی مختلف نہیں ہے بلکہ انہیں ایک پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔

۴۔ وَ نُفَضِّلُ بَعۡضَہَا عَلٰی بَعۡضٍ: زمین، پانی ایک ہونے کے باوجود کچھ میوؤں کو دوسرے سے شکل، مقدار، خوشبو، شیرینی، ترشی اور لذت میں بہتر کر دیتی ہے۔ یہ سب اس قادر مطلق کی تدبیری آیات ہیں۔

۴۔ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ: ان باتوں سے نتیجہ اخذ کرنے والے وہی لوگ ہوں گے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُہُمۡ ءَاِذَا کُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِہِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۵﴾

۵۔ اور اگر آپ کو تعجب ہوتا ہے تو ان (کفار) کی یہ بات تعجب خیز ہے کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی پیدائش میں ہوں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے منکر ہو گئے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں اور یہی جہنم والے ہیں جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُہُمۡ: جو انسان ابتدا میں مٹی، پھر نطفے، پھر خون کے لوتھڑے، پھر گوشت کی بوٹی سے[1] پیدا کیا گیا ہے اس کے بارے میں یہ کہنا کس قدر تعجب خیز ہے کہ اسے دوبارہ مٹی سے کیسے پیدا کیا جائے گا۔ گویا وہ یہ مانتے ہیں کہ پہلی بار انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے لیکن یہ انسان مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ مٹی سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ تعجب اس پر ہے کہ دوبارہ کیوں نہیں پیدا ہو سکتا؟ جبکہ پہلی بار اللہ نے اسی مٹی سے نطفہ، پھر خون کا لوتھڑا، پھر گوشت کا ٹکڑا، پھر انسان بنایا ہے۔

۲۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ: یہ خدائے عادل و حکیم کا انکار ہے کہ اگر معاد نہیں ہے تو اللہ عادل رہتا ہے اور نہ حکیم۔ یہ عقیدہ ایک قسم کی فکری بے مائیگی ہے کہ وہ مغلول الفکر اور اسیر تقلید ہیں۔ آزادنہ غور و فکر نہیں کر سکتے۔

۳۔ اُولٰٓئِکَ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِہِمۡ: دنیا میں جہل و جمود کا طوق ان لوگوں کی گردنوں میں ہے اور آخرت میں وہ آتش جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں ان کو آخرت پر یقین آئے گا۔

اہم نکات

۱۔ عقیدہ آخرت کا منکر صرف کافر نہیں بلکہ اس کا انکار مضحکہ ہے: فَعَجَبٌ قَوۡلُہُمۡ ....

۲۔ زندگی کو صرف اسی دنیا پر منحصر جاننا، فکری بے مائیگی کی علامت ہے: اُولٰٓئِکَ الۡاَغۡلٰلُ ....

وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالسَّیِّئَۃِ قَبۡلَ الۡحَسَنَۃِ وَ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِمُ الۡمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَذُوۡ مَغۡفِرَۃٍ

۶۔ اور یہ لوگ آپ سے بھلائی سے پہلے برائی میں عجلت چاہتے ہیں جب کہ ان سے پہلے عذاب کے واقعات پیش آ چکے ہیں اور آپ کا پروردگار

---

[1] سورۃ الحج کی آیت ۵ سے اقتباس

لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلۡمِہِمۡ ۚ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَشَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۶﴾

ظلم و زیادتی کے باوجود لوگوں سے یقیناً درگزر کرنے والا ہے اور آپ کا رب یقیناً سخت عذاب دینے والا (بھی) ہے۔

تشریح کلمات

الۡمَثُلٰتُ: (م ث ل) مفرد المثلة۔ عبرتناک سزا، جس سے دوسرے بھی عبرت حاصل کر کے ارتکاب جرم سے رک جائیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالسَّیِّئَۃِ: تعجب کی دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ رحمت خدا کے طالب ہونے کی جگہ عذاب الٰہی کے بڑی شتابی کے ساتھ طالب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: اگر آپؐ سچے رسول ہیں تو ہم آپؐ کی تکذیب کر رہے ہیں، ہم پر عذاب نازل کیوں نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے۔ مغفرت و درگزر کرنے والا ہے۔ اس کی رحمت غضب سے بہت پہلے ہے۔ اس کی رحمت و مغفرت ان لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے جو ظلم میں ملوث رہے ہوں۔ مقام تعجب یہ ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ اللہ کی رحمت واسعة سے منہ موڑ کر عذاب کے خواہاں ہو گئے۔ جب عذاب کا مرحلہ آئے گا تو ان لوگوں کو معلوم ہو گا کہ اس قسم کے عذاب پہلے بھی گزر چکے ہیں۔

واضح رہے یہاں عذاب و مغفرت سے مراد دنیوی عذاب ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ دنیا میں ظالم سے بھی درگزر فرماتا ہے۔

۲۔ اگر یہ لوگ درگزر کے اہل نہ رہے تو عذاب شدید کا باعث بھی ہیں: لَذُوۡ مَغۡفِرَۃٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلۡمِہِمۡ ....

وَ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ اٰیَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّ لِکُلِّ قَوۡمٍ ہَادٍ ﴿۷﴾

۷۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں: اس شخص پر اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی نازل کیوں نہیں ہوتی؟ آپ تو محض تنبیہ کرنے والے ہیں اور ہر قوم کا ایک رہنما ہوا کرتا ہے۔

تفسیر آیات

نشانی سے ان کافروں کی مراد ایک ایسا معجزہ تھا جس سے ان کو یقین آجائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم رسول برحق ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرآن جیسے علمی وفکری دستور حیات کے معجزے کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ وہ ایسے معقول معجزوں کی جگہ محسوس معجزے مانگتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے جواب میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کر کے فرمایا: آپؐ کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ ان کفار کو متنبہ اور برے انجام سے خبردار کریں۔ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ آپؐ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ ان کے ہر نامعقول مطالبے کا جواب دیں۔ یہ اللہ کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کی ہدایت کا سامان فراہم اور حجت پوری کرے۔ اس کے بعد جس کا جی چاہے قبول کرے اور جس کا جی چاہے قبول نہ کرے۔

ابن عباس روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر فرمایا:

انا المنذر و لکل قوم هاد و او مأ بیده الی منکب علی ابن ابی طالب فقال انت الهادی یا علی بك یهتدی المهتدون بعدی۔[1]	انذار کرنے والا میں ہوں اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہوتا ہے۔ اپنا دست مبارک علی علیہ السلام کے دوش پر رکھ کر فرمایا: اے علیؑ! میرے بعد تیرے ذریعے ہدایت پانے والے ہدایت حاصل کریں گے۔

مندرجہ بالا و دیگر لفظوں میں اس حدیث کو ان اصحاب نے روایت کیا ہے: حضرات ابن عباس، ابوهریره، ابو برزه اسلمی، جابر بن عبد اللّٰه انصاری، ابو فروه السلمی، یعلی بن مرة، عبداللّٰه بن مسعود اور سعد بن معاذ۔

ملاحظہ ہو الحاکم: المستدرك علی الصحیحین ۳: ۱۲۹ اور کہا: یہ حدیث صحیح السند ہے۔ الحسکانی: شواهد التنزل ۱: ۲۸۳، الرازی: التفسیر الکبیر ۱۹: ۱۴، الطبری: التفسیر ۱۳: ۶۳، الوسی: روح المعانی ۱۳: ۱۰۸

سید ابن طاؤس علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب سعد السعود صفحہ ۹۹ میں لکھا ہے:

محمد بن العباس بن مروان نے اپنی کتاب میں اس حدیث کو پچاس طرق سے نقل کیا ہے۔

آلوسی اس حدیث اور اپنے علماء کی تاویل وتوجیہ نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

بہتر یہ ہے کہ توجیہ و تاویل کی نوبت نہ آنے دی جائے اور اصل حدیث کا انکار کیا جائے۔ ...و لا نعبأ بما قیل و نکتفی بمنع صحة الخبر۔

اقول: نعم الانکار للمنکر اسهل فی الدنیا واصعب فی الآخرة۔

اہم نکات

زمین حجت خدا سے کبھی خالی نہیں ہوسکتی: وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ....

---

[1] بحار الانوار ۵۳: ۳۹۹

اَللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ کُلُّ اُنۡثٰی وَ مَا تَغِیۡضُ الۡاَرۡحَامُ وَ مَا تَزۡدَادُ ؕ وَ کُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ ﴿۸﴾

۸۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ہر مادہ (مونث) کیا اٹھائے ہوئے ہے اور ارحام کیا گھٹاتے اور کیا بڑھاتے ہیں اور اس کے ہاں ہر چیز کی ایک (معین) مقدار ہے۔

تشریح کلمات

تَغِیۡضُ: (غ ی ض) یہ نقص کی طرح لازم و متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی کسی چیز کو کم کرنے یا از خود کم ہونے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ: اس آیت میں اللہ انسان کی تخلیق کی باریکیوں کا ذکر فرماتا ہے کہ اللہ ان باریکیوں کو جانتا ہے اور یہی دلیل ہے کہ ان کا خالق اللہ ہے۔

۲۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ہر مادہ کیا اٹھائے ہوئے ہے۔ انسانی تجربات نے اس بات کا کھوج لگا لیا کہ ماورائے رحم، عورت کے تخم اور مرد کے نطفہ میں موجود منوی جاندار کے جفت ہونے سے نطفہ ٹھہرتا ہے۔ مرد کے نطفہ میں موجود کروڑوں منوی جانداروں میں سے صرف ایک جانور تخم میں داخل ہونے میں کامیاب ہوتا ہے۔

باپ کا منوی حیوان Y کا حامل ہوتا ہے یا ایکس (X) کا اور ماں کا تخم صرف (X) کا حامل ہوتا ہے۔ اگر باپ کا (Y) ماں کے (X) کے ساتھ جفت ہو جائے تو لڑکا پیدا ہوگا اور اگر باپ کا X ماں کے X کے ساتھ جفت ہو گیا تو لڑکی پیدا ہوگی۔

اس کا بھی پتہ چلا ہے کہ ایک سینٹی میٹر مکعب نطفے میں ایک سو ملین منوی جاندار موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے صرف 500 منوی جاندار تخم تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور ان میں سے صرف ایک منوی جاندار تخم کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ بھی معلوم کر لیا گیا ہے کہ ان ایک سو ملین جانوروں میں ہر ایک کی خاصیت دوسرے سے جدا ہے لیکن:

i۔ صرف اللہ جانتا ہے کہ ان ایک سو ملین جانوروں میں سے کون سا جانور تخم مادر میں داخل ہونے میں کامیاب ہونے والا ہے۔

ii۔ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ آنے والا بچہ ان ایک سو ملین خاصیتوں میں سے کس خاصیت کا مالک ہے۔

iii۔ وہ کون سا محرک ہے جس کے تحت یہ جانور اس تخم کی طرف دوڑتے اور اس میں داخل ہونے

کی کوشش کرتے ہیں۔

iv۔ انسان تو جانداروں کی کائنات میں ہر مادہ کو جاننے سے قاصر ہے۔ وہ کیسے جان سکتا ہے کہ ہر مادہ کیا اٹھانے والی ہے؟ اگر جدید انکشافات کے ذریعے بعض جانداروں کے رحم کا کچھ جزئی حال معلوم کر لیا گیا ہے تو بھی ہر مادہ کے رحم کا حال جاننے سے انسان قاصر ہے۔ لہٰذا یہ اعتراض سرے سے وارد ہی نہ ہوگا کہ رحم کا کچھ حال تو انسان بھی جاننے لگے ہیں۔

۳۔ رحم کے عمل کو اللہ ہی جانتا ہے کہ کن چیزوں میں کمی پیدا کر دیتا ہے اور کن چیزوں میں اضافہ کرتا ہے۔

ممکن ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ رحم میں جنین کی پرورش کرنے کے لیے بعض چیزوں میں کمی اور بعض چیزوں میں اضافے کی ضرورت ہوتی ہے اور نطفہ ٹھہرنے کے بعد رحم یہ کام انجام دیتا ہے۔ جنین کی تربیت و پرورش کے لیے رحم کی فعالیت نہایت حیرت انگیز ہے جو اہل مطالعہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ممکن یہ فعالیت تَغِیۡضُ اور تَزۡدَادُ بعض مواد میں کمی اور بعض مواد میں اضافے پر مشتمل ہو۔ اس موضوع پر تفصیل کے لیے رجوع فرمائیں: الطب محراب للایمان۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مدت حمل میں کمی اور زیادتی ہے۔ امام مالک کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت حمل پانچ سال ہے[۱] شافعی کے نزدیک چار سال اور ابو حنیفہ کے نزدیک دو سال ہے۔ تجرباتی اعداد و شمار کے مطابق جنین ماں کے شکم میں ۳۰۸ دن سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔ فقہ جعفریہ کے مطابق بعض فقہاء کے نزدیک یہ مدت ۹ ماہ، بعض کے نزدیک دس ماہ اور بعض کے نزدیک ایک سال ہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہے۔

۳۔ وَکُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ: اللہ کا کائناتی نظام اندھی بانٹ نہیں، مقدر شدہ نظام ہے اور ہر چیز کے حدود اربعہ کا تعین پہلے سے ہے۔ وَکُلُّ شَیۡءٍ۔ کائنات میں ہر شیء کا تعین اور اسی کی تشکیل، عناصر کی ترکیب سے ہوتی ہے اور وہ شیء کے لیے معین ہے۔ اس معین مقدار سے کم یا زیادہ ہونے کی صورت میں وہ چیز نہیں بنے گی۔

اہم نکات

۱۔ مخلوقات کی باریکیوں کا علم، دلیل خالقیت ہے۔

۲۔ حمل اور رحم، مظاہر قدرت الٰہی ہیں۔

۳۔ رحم جن چیزوں میں کمی اور اضافہ کرتا ہے وہ اللہ کے مقررہ نظام کے تحت ہے: وَکُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ۔

عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ الۡکَبِیۡرُ ۹۔ (وہ) پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا

---

[۱] ان کو چاہیے بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اسے سکول بھیجنے کے لیے کتابیں، بستہ تیار رکھیں۔

الۡمُتَعَالِ﴿۹﴾

بزرگ برتر ہے۔

سَوَآءٌ مِّنۡکُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَ مَنۡ جَہَرَ بِہٖ وَ مَنۡ ہُوَ مُسۡتَخۡفٍۭ بِالَّیۡلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّہَارِ﴿۱۰﴾

۱۰۔ تم میں سے کوئی آہستہ بات کرے یا آواز سے اور کوئی پردہ شب میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں (سرعام) چل رہا ہو (اس کے لیے) برابر ہے۔

تشریح کلمات

سَارِبٌ: (س ر ب) کسی راستے پر چلا جانے والا۔

تفسیر آیات

غیر اللہ کے لیے جو چیزیں غیب وشہود، ظاہر و باطن ہوتی ہیں وہ سب اس اللہ کے سامنے یکساں ہیں جو کبیر و متعال ہے۔ اللہ کے مقام کبریائی کے سامنے کوئی چیز پوشیدہ رہ نہیں سکتی۔ وہ اس بلندی پر فائز ہے کہ شب کی تاریکی اور دن کی روشنی اس کے لیے برابر ہے۔ غیب و مشہود، آہستہ یا آواز سے بات کرنے میں فرق انسانوں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے سب یکساں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے لیے کائنات کی ہر شیٔ مشہود میں ہے۔

لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ مِنۡ خَلۡفِہٖ یَحۡفَظُوۡنَہٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَہٗ ۚ وَ مَا لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ وَّالٍ﴿۱۱﴾

۱۱۔ ہر شخص کے آگے اور پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے پہرے دار (فرشتے) مقرر ہیں جو بحکم خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں، اللہ کسی قوم کا حال یقیناً اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے اور جب اللہ کسی قوم کو برے حال سے دوچار کرنے کا ارادہ کر لے تو اس کے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہوتا ہے۔

تشریح کلمات

مُعَقِّبٰتٌ: (ع ق ب) یکے بعد دیگرے آنے والے۔ اس کا مفرد معقبۃ ہے۔ تانیث نہیں بلکہ

علامۃ کی تاء کی طرح مبالغہ کے لیے ہے۔
لَہٗ کی ضمیر کا مرجع وہی ہے جو یَدَیۡہِ، خَلۡفِہٖ، یَحۡفَظُوۡنَہٗ کا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی حفاظت کے لیے فرشتے مامور ہیں۔ فرشتہ ہائے شب اور فرشتہ ہائے روز یکے بعد دیگرے انسان کی حفاظت کے لیے آتے جاتے ہیں۔ نماز صبح کے موقع پر شب اور روز کے فرشتے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ یہ فرشتے انسان کو ان تمام آفات سے بچاتے ہیں جو ہمیشہ انسانی وجود و بقا کے لیے مہلک ہوتی ہیں۔ انسان کے وجود کے اندر موجود مہلک چیزوں سے بچانے والے بھی موجود ہیں اور بیرونی خطرات سے بچانے والے بھی۔ طبعی اور ناگہانی آفتوں سے بچانے والے ہر گونہ محافظ موجود ہیں کہ اگر انسان کو زخم لگ جاتا ہے تو اس ناگہانی آفت سے بچانے والے اس زخم کو مندمل کرتے ہیں۔ وَاِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ۔[1] لہٰذا ممکن ہے روز و شب کے محافظ فرشتوں کے ساتھ طبعی محافظین پر بھی مُعَقِّبٰتٌ صادق آئے۔

۲۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ: انسان کی محافظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے لیکن انسان کے اپنے اعمال و حرکات کے اثرات سے بچانے کا ذمہ نہیں لیا۔ اس میں تو اللہ از خود کسی قوم کا حال نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔ حالات میں تغیر کی دو صورتیں ممکن ہیں:

i۔ صلاح احوال کی صورت میں دوام نعمت۔
ii۔ فساد احوال کی صورت میں زوال نعمت و نزول عذاب۔

اول الذکر کے بارے میں یہ آیت ایک کلیہ قائم کرتی ہے کہ کوئی قوم جب تک صلاح احوال میں ہے تو اس حالت میں اللہ کوئی تبدیلی نہیں لاتا جب تک لوگ خود تبدیلی نہ لائیں۔ یہ مقام رحمانیت کے خلاف ہے کہ ایک قوم کے نیک سیرت ہونے کے باوجود اس کی نیک بختی کو بدبختی میں بدل دے۔ لہٰذا یہ ایک حتمی قانون الٰہی ہے کہ قوموں میں اگر اصلاح احوال اور نیک سیرتی عام ہے تو اللہ کی طرف سے مادی و معنوی نعمتوں میں فراوانی ہو گی۔ چنانچہ فرمایا:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمۡ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعۡمَۃً اَنۡعَمَہَا عَلٰی قَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ....[2]	ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ جو نعمت کسی قوم کو عنایت فرماتا ہے اس وقت تک اسے نہیں بدلتا جب تک وہ خود اسے نہیں بدلتے....
لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ ....[3]	اگر تم شکر کرو تو میں تمہیں ضرور زیادہ دوں گا۔

---

[1] ۸۲ انفطار: ۱۰۔ جب کہ تم پر نگران مقرر ہیں۔　[2] ۸۲ انفال: ۵۳　[3] ۱۴ ابراھیم: ۷

وَالَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا ...[1]	جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں ضرور اپنے راستے کی ہدایت کریں گے۔
اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ وَ یُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ ﴿۷﴾[2]	تم اگر اللہ کی مدد کرو تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔
وَ مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّ یَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ ...[3]	اور جو اللہ سے ڈرتا رہے اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے وہ سوچ بھی نہ سکتا ہو۔
یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ فُرۡقَانًا ...[4]	اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہیں (حق و باطل میں) تمیز کرنے کی طاقت عطا کرے گا....
وَ لَوۡ اَنَّ اَہۡلَ الۡقُرٰۤی اٰمَنُوۡا وَ اتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ...[5]	اور اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے ....
وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِمۡ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ لَاَکَلُوۡا مِنۡ فَوۡقِہِمۡ وَ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِہِمۡ ...[6]	اور اگر یہ اہل کتاب توریت و انجیل اور ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل شدہ دیگر تعلیمات کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر کی (آسمانی برکات) اور نیچے کی (زمینی برکات) سے مالا مال ہوتے۔

درج بالا آیات میں شکر کا نتیجہ فراوانی، جہاد و سعی کا لازمہ کشایش، اللہ کی نصرت کا نتیجہ، ثابت قدمی، تقویٰ کا لازمہ حق و باطل میں تمیز، ایمان و تقویٰ کا لازمہ برکتیں، قانون الٰہی کے نفاذ کا لازمہ نعمتوں کی ارزانی قرار دیا گیا ہے۔

فساد احوال کی صورت میں زوال نعمت: درج ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فساد احوال کی صورت میں زوال نعمت و نزول عذاب ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ اتَّقُوۡا فِتۡنَۃً لَّا تُصِیۡبَنَّ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡکُمۡ خَآصَّۃً ...[7]	اور اس فتنے سے بچو جس کی لپیٹ میں تم میں سے صرف ظلم کرنے والے ہی نہیں بلکہ (سب) آئیں گے.
وَ لَقَدۡ اَہۡلَکۡنَا الۡقُرُوۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا ...[8]	اور بتحقیق تم سے پہلی قوموں کو بھی ہم نے اس وقت ہلاک کیا جب وہ ظلم کے مرتکب ہوئے....

[1] ۲۹ عنکبوت: ۶۹ [2] ۴۷ محمد: ۷ [3] ۶۵ طلاق: ۲-۳ [4] ۸ انفال: ۲۹ [5] ۷ اعراف: ۹۶
[6] ۵ مائدہ: ۶۶ [7] ۸ انفال: ۲۵ [8] ۱۰ یونس ۱۳

وَ الَّذِیۡنَ کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَۃٍۭ بِمِثۡلِہَا ۙ وَ تَرۡہَقُہُمۡ ذِلَّۃٌ ... [1]

اور جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے تو بدی کی سزا بھی ویسی ہی (بدی) ہے اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی....

ان آیات میں ظلم کا نتیجہ فتنہ و ہلاکت، گناہوں کا نتیجہ ذلت و خواری قرار دیا ہے۔

تاہم یہ لطف خداوندی ہے کہ اس نتیجہ کو لازمی اور ضروری قرار نہیں دیا ہے۔ چنانچہ بعض حالات میں ظلم و گناہ کے باوجود عفو فرماتا ہے۔

وَ لَوۡ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِظُلۡمِہِمۡ مَّا تَرَکَ عَلَیۡہَا مِنۡ دَآبَّۃٍ ... [2]

اور اگر لوگوں کے ظلم کی وجہ سے اللہ ان کا مواخذہ کرتا تو روئے زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا.

وَ مَاۤ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَ یَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ ﴿ؕ۳۰﴾ [3]

اور تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتی ہے اور وہ بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔

لہٰذا قوموں کا انحطاط اور تنزل ان کے اپنے اعمال کے نتیجہ میں وقوع پذیر رہتا ہے اور یہاں انسان کا اپنا عمل ہی تقدیر ساز ہے اور ہر قسم کی بدبختی اور نعمتوں سے محرومیت، اغیار کے مقابلے میں ذلت و خواری، استعمار کا تسلط اور استحصال، یہ سب قوموں کے اپنی داخلی بداعمالیوں کا لازمی نتیجہ ہیں۔

اس کلیے کے تحت مسلمانوں کا انحطاط اور اغیار کے سامنے ان کی عبرتناک ذلت، ان کی اپنی داخلی بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔ انہیں بیرونی عوامل کے ذمے لگانا درست نہیں ہے کیونکہ بیرونی عوامل کے لیے داخلی عوامل زمین ہموار کرتے ہیں۔

لہٰذا زوال نعمت کے لیے انسان کے اعمال موثر ہیں، تاہم لازمی نہیں ہے اور اس کا لازمی نہ ہونا لطف الٰہی ہے۔

اسحاق بن عمار نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا: یہ بتا دیجیے کہ فجر کی نماز کے لیے بہترین وقت کون سا ہے؟ آپؑ نے فرمایا:

فَقَالَ: مَعَ طُلُوعِ الْفَجْرِ. اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَ جَلَّ یَقُوْلُ: وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا ۔ [4] یَعْنِی صَلَاۃَ الْفَجْرِ تَشْھَدُہُ مَلَائِکَۃُ اللَّیْلِ وَ مَلَائِکَۃُ النَّھَارِ فَاِذَا صَلَّی الْعَبْدُ الصُّبْحَ مَعَ طُلُوعِ

بہترین وقت طلوع فجر کا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: صبح کی نماز بھی، بے شک صبح کی نماز حضور کا وقت ہے۔ یعنی صبح کی نماز کے وقت رات اور دن کے فرشتے حاضر رہتے ہیں۔ جب بندہ طلوع فجر کے وقت نماز پڑھتا ہے تو یہ نماز دو بار ثبت ہو جائے

---

[1] ۱۰: یونس ۲۷ [2] ۱۶ نحل: ۶۱ [3] شوری ۴۲: ۳۰ [4] ۱۷ بنی اسرائیل: ۷۸

الْفَجرِ اُثْبِتَتْ لَہٗ مَرَّتَیْنِ اَثْبَتَھَا مَلَائِکَۃُ اللَّیْلِ وَ مَلَائِکَۃُ النَّھَارِ.[1]

گی۔ ایک رات کے فرشتے ثبت کریں گے اور ایک دن کے فرشتے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ مَعَ کُلِّ اِنْسَانٍ مَلَکَیْنِ یَحْفَظَانِہٖ فَاِذَا جَاءَ الْقَدَرُ خَلَّیَا بَیْنَہٗ وَ بَیْنَہٗ..۔[2]

ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں اور جب موت کا وقت آتا ہے تو وہ اس کے اور موت کے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ہماری تمام مشکلات کا سرچشمہ خود ہماری اپنی بداعمالیاں ہیں اور زوال و انحطاط کے ہم خود ذمے دار ہیں۔

۲۔ تمام مشکلات کا حل بھی خود ہمارے پاس ہے۔ امتوں کو اپنی تقدیر سازی خود کرنی ہے۔

۳۔ اصلاح احوال کی صورت میں دوام نعمت ضروری ہے۔ فساد احوال کی صورت میں زوال و انحطاط آتا ہے اور اللہ درگزر بھی فرماتا ہے۔

۴۔ اللہ کے محافظین ہر انسان کو بیرونی خطرات سے بچا لیتے ہیں لیکن داخلی خطرات جو اس کے اپنے اعمال سے پیش آتے ہیں، اس کے خود ذمے دار ہیں۔

هُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنۡشِیُٔ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَ یُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِہٖ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ مِنۡ خِیۡفَتِہٖ ۚ وَ یُرۡسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیۡبُ بِہَا مَنۡ یَّشَآءُ وَ ہُمۡ یُجَادِلُوۡنَ فِی اللّٰہِ ۚ وَ ہُوَ شَدِیۡدُ الۡمِحَالِ ﴿۱۳﴾

۱۲۔ وہی ہے جو تمہیں ڈرانے اور امید دلانے کے لیے بجلی کی چمک دکھاتا ہے اور بھاری بادلوں کو پیدا کرتا ہے۔

۱۳۔ اور (بجلی کی) گرج اس کی ثنا کے ساتھ اور فرشتے اس کے خوف سے (لرزتے ہوئے) تسبیح کرتے ہیں اور وہی بجلیوں کو روانہ کرتا ہے پھر جس پر چاہتا ہے گراتا ہے جب وہ اللہ کے بارے میں الجھ رہے ہوتے ہیں اور وہ سخت طاقت والا ہے۔

تفسیر آیات

کائنات میں غور و فکر اور کتاب آفاق کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کئی ایک ابواب قابل توجہ ہیں:

---

[1] الکافی ۳: ۲۸۲۔ الاستبصار ۱: ۲۷۵ [2] نہج البلاغۃ حکمت: ۲۰۱

۱۔ هُوَالَّذِیۡ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ: بجلی کی چمک بعض افراد کے لیے باعث خوف ہے اور دیگر لوگوں کے لیے باعث سرسبزو شادابی ہونے کی وجہ سے امیدوں کا پیغام ہے۔ بجلی کی چمک ایک، مگر اس میں بیم و امید دونوں جمع ہیں۔ یہ بجلی پیام شادابی کے علاوہ بارش کے پانی کے ذریعے زمین پر موجود زراعت کے لیے مفید ہے۔

۲۔ وَّیُنۡشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ: اللہ تعالیٰ پانی سے لدے بادلوں کو پیدا فرماتا ہے جن کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ پانی کا عظیم ذخیرہ بآسانی اور نہایت مختصر وقت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ کل انسان اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ آج معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ یہ بادل کس طرح پیدا فرماتا ہے۔

۳۔ وَیُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِہٖ: بادلوں کے آپس میں ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی گرج بھی مظاہر قدرت میں سے ہے اور اپنی زبان میں اس خالق کی حمد وثنا میں رطب اللسان ہے جس کے پیدا کردہ نظام کی یہ ایک مظہر ہے۔ کائنات کی ہر شیء تسبیح کرتی ہے:

وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ ...[1] اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو....

۴۔ وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ مِنۡ خِیۡفَتِہٖ: فرشتے خوف خدا سے لرزتے ہیں۔ عظمت و جلالت الٰہی کے مشاہدے سے فرشتے لرزتے اور تسبیح پڑھتے ہیں۔ اللہ ارحم الراحمین ہے۔ اس کے خوف سے نہیں بلکہ عظمت الٰہی کے سامنے اس عظمت کا ادراک کرنے والا لرز جاتا ہے:

وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ ۞[2] اور جو شخص اپنے رب کی بارگاہ میں پیش ہونے کا خوف رکھتا ہے اس کے لیے دو باغ ہیں۔

۵۔ وَیُرۡسِلُ الصَّوَاعِقَ: وہی ذات ہے جو ایسے لوگوں پر عین اس وقت عذاب نازل فرماتی ہے جب وہ اللہ کے بارے میں جدال میں مصروف ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی طرف سے بعض اوقات رحمت اور عذاب، دونوں کام ایک چیز سے لیے جاتے ہیں: خَوۡفًا وَّطَمَعًا....

۲۔ اللہ سے نہیں، عظمت الٰہی سے ڈرا جاتا ہے: وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ مِنۡ خِیۡفَتِہٖ....

لَہٗ دَعۡوَۃُ الۡحَقِّ ؕ وَالَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَسۡتَجِیۡبُوۡنَ لَہُمۡ بِشَیۡءٍ اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیۡہِ اِلَی الۡمَآءِ

۱۴۔ صرف اللہ کو پکارنا برحق ہے اور وہ اللہ کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہیں وہ انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتے، ایسے ہی جیسے کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہو کہ

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۴۴ [2] ۵۵ الرحمن: ۴۶

لِيَبۡلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۚ وَمَا دُعَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ اِلَّا فِيۡ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾	پانی (ازخود) اس کے منہ تک پہنچ جائے حالانکہ وہ اس تک پہنچنے والا نہیں ہے اور کافروں کی دعا (اسی طرح) محض بے سود ہی ہے۔

تفسیر آیات

غیر اللہ کو پکارنے میں جو حماقت اور سفاہت ہے اس کی طرف اشارہ ہے کہ غیر اللہ سے کسی چیز کا طلب کرنا ایسا ہے جیسا کہ پیاسا بے شعور پانی سے یہ توقع رکھے کہ وہ ازخود اس کی پیاس بجھا دے۔

اس مثال میں دو ضرورتوں کے درمیان ایک احمقانہ عمل کا ذکر ہے۔ پانی انسان کی زندگی کے لیے ایک نہایت ضروری شیٔ ہے اور پیاس کی صورت میں اس کا طلب کرنا بھی ایک قدرتی امر ہے۔ ان دونوں ضرورتوں کے درمیان اگر کوئی ایسا عمل انجام دے جس سے اس کی یہ ضرورت پوری ہونا ممکن نہیں تو یہ حرکت سفیہانہ ہوگی۔ وہ سفیہانہ سوچ یہ ہے کہ پانی سے توقع رکھے کہ ازخود اس کے منہ تک آ جائے۔

اہم نکات

۱۔ محتاج انسان اسی ذات کو پکارے جس کے ہاتھ میں اس کی حاجت کی برآوری ہے: لَهٗ دَعۡوَةُ الۡحَقِّ ....

۲۔ غیر اللہ کو پکارنا ایک سفیہانہ حرکت ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّظِلٰلُهُمۡ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ ﴿۱۵﴾	۱۵۔ اور آسمانوں اور زمین میں بسنے والے سب بشوق یا بزور اور ان کے سائے بھی صبح و شام اللہ ہی کے لیے سربسجود ہیں۔

تشریح کلمات

الغدو: غداۃ کی جمع ہے۔ دن کی ابتدا کو کہتے ہیں۔ الاصال، اصیل کی جمع ہے۔ دن کے آخری حصے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ: آسمانوں اور زمین پر موجودات میں سے ہر ایک کا اپنا سجدہ ہے۔ ان مختلف سجدوں کا جامع خضوع و انکسار ہے۔ چنانچہ کبھی سجدے کی جگہ لفظ اَسۡلَمَ استعمال فرمایا ہے:

اَفَغَیۡرَ دِیۡنِ اللّٰہِ یَبۡغُوۡنَ وَلَہٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ....[1]

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے خواہاں ہیں؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین کی موجودات نے چار و ناچار اللہ کے آگے سر تسلیم خم کیے ہیں....

۲۔ طَوۡعًا وَّ کَرۡهًا: البتہ ان میں سے بعض سے بشوق و رغبت سجدے (حکم خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا) صادر ہوتے ہیں اور بعض سے بزور صادر ہوتے ہیں۔ جیسے بیمار ہونا، مر جانا وغیرہ۔

۳۔ وَّ ظِلٰلُهُمۡ: سایہ اضافی تاریکی کو کہتے ہیں جو روشنی کی امواج میں غیر شفاف جسم کے حائل ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ غیر مہذب (وحشی) قوموں میں سائے کو عالم بالا کی کوئی چیز سمجھ کر اس سے بہت ڈرا گیا ہے۔[2] سائے بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ کے سجدے میں شامل ہیں جو صبح اور شام کے اوقات میں نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ سایہ اگرچہ کسی حقیقی وجود کا نام نہیں ہے بلکہ یہ نور نہ ہونے سے عبارت اور ایک امر عدمی ہے، تاہم یہ کسی موجود کی علامت ہے۔ رہا یہ سوال کہ سایہ امر عدمی ہے اور عدم مخلوق نہیں ہوتا، درست نہیں ہے۔ سایہ عدم نہیں، موجود چیز ہے کہ اللہ نے غیر شفاف اجسام خلق کر کے سایہ وجود میں لایا ہے۔ اگر تمام اجسام شفاف ہوتے تو سایہ وجود میں نہ آتا۔ اس لیے اس کی طرف سجدہ کی نسبت صحیح ہے نیز سایہ کا طبعی وجود زمین پر بچھا ہوا ہوتا ہے، اس لیے اس حالت کو سجدہ کہا جا سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تمام کائنات ایک عبادت خانہ ہے: وَ لِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ ....

۲۔ آسمانوں میں بھی عاقل موجودات ہیں: مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ ....

قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰہُ ؕ قُلۡ اَفَاتَّخَذۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ نَفۡعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ ۬ۙ اَمۡ ہَلۡ تَسۡتَوِی الظُّلُمٰتُ وَ النُّوۡرُ ۬ۚ اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ خَلَقُوۡا

۱۶۔ ان سے پوچھیے: آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ کہد یجیے اللہ ہے، کہد یں: تو پھر کیا تم نے اللہ کے سوا ایسوں کو اپنا اولیاء بنایا ہے جو اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں ہیں؟ کہد یجیے: کیا بینا اور نابینا برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تاریکی اور روشنی برابر ہو سکتی ہیں؟ جنہیں ان لوگوں نے اللہ کا شریک بنایا ہے کیا انہوں نے اللہ کی خلقت کی طرح کچھ خلق کیا ہے جس

[1] ۳ آل عمران: ۸۳	[2] تفسیر دریابادی

كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

کی وجہ سے پیدائش کا مسئلہ ان پر مشتبہ ہو گیا ہو؟ کہد یجیے: ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا، بڑا غالب آنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: توحید خالقیت سے توحید ولایت و ربوبیت پر استدلال ہے کیونکہ یہ بت پرست اللہ ہی کو زمین و آسمان کا خالق سمجھتے تھے۔ ان کو ربوبیت کی توحید کی طرف بلاتے ہوئے فرمایا: اگر ایسا ہے تو تم ایسوں کو اپنا ولی اور حاکم کیوں بناتے ہو جو خود اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں ہیں۔

۲۔ قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الۡاَعۡمٰى وَ الۡبَصِيۡرُ: اللہ کے ساتھ ربوبیت میں کسی اور کا شریک نہ ہونا ایسا واضح ہے جیسے نابینا اور بینا میں اور نور وظلمت میں فرق واضح ہے۔ لہٰذا ہر چشم بینا اور نور بصیرت رکھنے والا توحید کا قائل ہو جائے گا اور ہر بینائی سے محروم اور تاریکی میں رہنے والا شخص نور توحید سے بھی محروم ہو گا۔

۳۔ اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ: توحید خالقیت سے توحید ربوبیت پر استدلال کرتے ہوئے فرمایا: کہ اللہ کی ربوبیت کے ساتھ دوسروں کی ربوبیت کا شبہ ہونے کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کے ساتھ دوسروں نے بھی کچھ خلق کیا ہو حالانکہ خود مشرکین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ خالقیت میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ ...[۱]

اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے خلق کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔

۴۔ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيۡءٍ: لہٰذا کائنات کا خالق ہی رب ہے اور وہ صرف ایک ہے کیونکہ جب ہر شیٔ کا خالق اللہ ہے تو ہر شیٔ کا رب بھی اللہ ہے۔ خالق اور رب قابل تفریق نہیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ رب وہ ہوتا ہے جو خلق و ایجاد کی قدرت رکھتا ہو۔

۲۔ خالق ہی نفع و نقصان کا مالک ہے۔

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ

۱۷۔ اللہ نے آسمانوں سے پانی برسایا پھر نالے

----

[۱] ۳۱ لقمان: ۲۵

اَوۡدِیَۃٌۢ بِقَدَرِہَا فَاحۡتَمَلَ السَّیۡلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ وَ مِمَّا یُوۡقِدُوۡنَ عَلَیۡہِ فِی النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡیَۃٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُہٗ ؕ کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡحَقَّ وَ الۡبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡہَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ ﴿۱۷﴾

اپنی گنجائش کے مطابق بہنے لگے پھر سیلاب نے پھولے ہوئے جھاگ کو اٹھایا اور ان (دھاتوں) پر بھی ایسے ہی جھاگ اٹھتے ہیں جنہیں لوگ زیور اور سامان بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں، اس طرح اللہ حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے، پھر جو جھاگ ہے وہ تو ناکارہ ہو کر ناپید ہو جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے فائدے کی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے، اللہ اسی طرح مثالیں پیش کرتا ہے۔

تشریح کلمات

اَوۡدِیَۃٌ: (و د ی) مفرد الوادی، اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بہتا ہو۔

زَبَدًا: (ز ب د) جھاگ کو کہتے ہیں۔

رَّابِیًا: (ر ب و) رابیۃ و ربوۃ اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے بڑھنے کو ربا کہتے ہیں۔

یُوۡقِدُوۡنَ: (و ق د) آگ جلانا۔

جُفَآءً: (ج ف و) الجفاء کوڑا کرکٹ جو وادی کے دونوں کناروں پر رہ جاتے ہیں اور بے فائدہ، ناکارہ چیز کو بھی جفاء کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: حق اور باطل کی ایک نہایت قابل توجہ مثال بیان فرما رہا ہے کہ باطل اس جھاگ کی مانند ہے جو کسی نالے میں اس کی گنجائش کے مطابق بہنے والے پانی سے پُر ہونے کی صورت میں پورے پانی کو ڈھانپ لیتا ہے اور وقتی طور پر صرف جھاگ ہی نظر آتا ہے، وہی بظاہر اچھل کود کرتا ہے اور پانی کا حیات بخش ذخیرہ اس جھاگ کے نیچے موجود ہوتا ہے مگر وقتی طور پر نظر نہیں آتا۔

۲۔ وَمِمَّا یُوۡقِدُوۡنَ عَلَیۡہِ: اسی طرح دھات کو تپا کر جب اسے کارآمد بنایا جاتا ہے تو میل کچیل اوپر آتی ہے اور صرف وہی نظر آتی ہے جب کہ کارآمد دھات اس کے نیچے موجود ہوتی ہے۔

۳۔ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡہَبُ جُفَآءً: باطل بھی اسی جھاگ اور خس و خاشاک کی مانند وقتی اچھل کود کرتا ہے اور بسا اوقات صرف وہی نظر آتا ہے اور حق دکھائی نہیں دیتا لیکن بصیرت رکھنے والے انتظار کرتے ہیں کہ

یہ جھاگ جلد ہی ناپید ہونے والا ہے اور حق ثابت اور پائدار ہے جو باطل کے وقتی ہنگامے اور شورش کے بعد ظہور پذیر ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ حق دائمی اور پائدار ہوتا ہے اور باطل، وقتی ہنگامہ خیز ہوتا ہے۔

۲۔ کبھی باطل، حق کو ڈھانپ دیتا ہے۔ مومن حق کا انتظار کرتا ہے جب کہ غیر مؤمن باطل کے دھوکے میں آتا ہے: فَاحۡتَمَلَ السَّیۡلُ زَبَدًا ....

۳۔ حق کے مقابلے میں باطل ہمیشہ ہنگامہ خیزی کرتا ہے: زَبَدًا رَّابِیًا ....

۴۔ حق، آب حیات کی طرح حیات بخش ہے اور باطل، خس و خاشاک کی طرح نابود ہونے والا ہے: فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡهَبُ جُفَآءً ....

۵۔ حق افادیت، دوام اور بقا کی ضمانت ہے: وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ....

لِلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمُ الۡحُسۡنٰی ؕ وَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَہٗ لَوۡ اَنَّ لَہُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا وَّ مِثۡلَہٗ مَعَہٗ لَافۡتَدَوۡا بِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الۡحِسَابِ ۬ۙ وَ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمِہَادُ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ جنہوں نے اپنے رب کی دعوت مان لی ان کے لیے بہتری ہے اور جنہوں نے اس کی دعوت قبول نہیں کی وہ اگر ان سب چیزوں کے مالک بن جائیں جو زمین میں ہیں اور اتنی دولت مزید بھی ساتھ ہو تو وہ (آخرت میں) ان سب کو (اپنی نجات کے لیے) فدیہ دے دیں، ایسے لوگوں کا برا حساب ہو گا اور جہنم ان کا ٹھکانا ہو گا اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لِلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمُ: حقیقی قدروں کا مالک وہ ہے جو دعوت الٰہی کو قبول کر لے اور اصلی قیمت اس حسن عاقبت کو حاصل ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ جو لوگ اس ہستی سے محروم ہوں گے، وہ اس محرومیت کی تلافی نہیں کر سکیں گے۔ اس جہاں میں قابل فہم مثال اس طرح ہو سکتی ہے کہ ایک شخص پوری دنیا کا مالک بن جائے اور مزید اتنی دولت اس کو میسر آئے، وہ ان سب کو فدیہ دے کر تلافی کرنا چاہیں تو بھی ممکن نہ ہو گا۔

۲۔ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الۡحِسَابِ: عاقبت حسنٰی سے محروم لوگوں کا حساب بہت برا ہو گا۔ یہاں برے حساب

سے مراد انسان کی بہ نسبت برا ہو گا کہ اس سے پورا حساب لیا جائے گا۔ کسی معاملے میں عفو اور درگزر نہ ہو گا، ورنہ یہ حساب اللہ کی بہ نسبت عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ یعنی اپنے گناہوں کا حساب ان گنہگاروں کو برا لگے گا جب کہ عاقبت حسنیٰ والوں سے ہلکا حساب لیا جائے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن دنیا کی بے قیمتی عیاں ہو جائے گی۔

۲۔ قیامت کے دن حقیقی قدریں سامنے آتی ہیں۔

۳۔ قدروں کا مالک وہ ہے جو دنیا میں عاقبت بہ خیر کے لیے کام کرے۔

اَفَمَنۡ یَّعۡلَمُ اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ کَمَنۡ ہُوَ اَعۡمٰی ؕ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ کیا جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ برحق ہے، اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نابینا ہے؟ نصیحت تو بس عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَمَنۡ یَّعۡلَمُ: اس آیہ شریفہ میں علم کو عقل کے ساتھ اور جہل کو نابینائی کے ساتھ مقرون کیا گیا ہے۔ فرمایا: علم رکھنے والا نابینا کی طرح نہیں ہو سکتا کیونکہ علم عقل ہے اور عقل رکھنے والے ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔

۲۔ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ: اسلام کی حقانیت کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ اسلام عقل پر تکیہ کرتا ہے اور عقل واقع کی نشاندھی کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جو مذہب حق پر مبنی ہوتا ہے وہ ان ذرائع کو اہمیت دیتا ہے جو حق اور واقع کی نشاندھی کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حق اور واقع تک رسائی کا بہترین ذریعہ عقل ہے۔

۲۔ علم بنیش اور جہالت نابینائی ہے۔

الَّذِیۡنَ یُوۡفُوۡنَ بِعَہۡدِ اللّٰہِ وَ لَا یَنۡقُضُوۡنَ الۡمِیۡثَاقَ ﴿ۙ۲۰﴾

۲۰۔ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور پیمان کو نہیں توڑتے۔

وَالَّذِیۡنَ یَصِلُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَیَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ وَیَخَافُوۡنَ سُوۡٓءَ الۡحِسَابِ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور اللہ نے جن رشتوں کو قائم رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں قائم رکھتے ہیں اور اپنے رب کا خوف رکھتے ہیں اور برے حساب سے بھی خائف رہتے ہیں۔

وَالَّذِیۡنَ صَبَرُوا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ رَبِّہِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً وَّیَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عُقۡبَی الدَّارِ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور جو لوگ اپنے رب کی خوشنودی کی خاطر صبر کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو روزی ہم نے انہیں دی ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ طور پر خرچ کرتے ہیں اور نیکی کے ذریعے برائی کو دور کرتے ہیں آخرت کا گھر ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے۔

تشریح کلمات

یَدۡرَءُوۡنَ: (د ر ء) اَلدَّرءُ کے معنی ایک طرف مائل ہو جانے کے ہیں۔ اسی سے دور کرنے، دفع کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں درء ت عنه۔ میں نے اس سے دفع کیا۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں اُولُوا الۡاَلۡبَابِ، صاحبان عقل کے آٹھ اوصاف بیان فرمائے ہیں:

۱۔ الَّذِیۡنَ یُوۡفُوۡنَ بِعَہۡدِ اللّٰہِ: وہ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں۔ جو عہد بزبان فطرت اللہ سے کیا ہے۔ میثاق فطرت وہ میثاق ہے جو دیگر تمام فروعی عہد و میثاق کے لیے اساس کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ وہی عہد ہے جو نسل آدم سے ابتدائے فطرت میں لیا گیا تھا اور خود اس کو اپنے اوپر گواہ بنا کر پوچھا تھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا تھا: ہاں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ اعراف آیت ۱۷۲۔

۲۔ وَالَّذِیۡنَ یَصِلُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ: وہ ان رشتوں کو قائم رکھتے ہیں جن کو قائم رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ آیت کے اطلاق میں وہ تمام رشتے شامل ہیں جنہیں قائم رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ان میں صلہ رحم شامل ہے اور صلہ ولایت بھی اس کے واضح مصادیق میں سے ہے۔ یعنی صلہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

نَزَلَتۡ فِی رَحِمِ آلِ مُحَمَّدٍ عَلَیۡهِ وَ آلِهِ السَّلَامُ وَ قَدۡ تَکُوۡنُ فِی قَرَابَتِكَ ثُمَّ قَالَ فَلَا تَکُونَنَّ مِمَّنۡ یَقُولُ لِلشَّیۡءِ

یہ آیت آل محمد (ع) سے صلہ رحمی کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے اور یہ خود تیرے رشتوں کے بارے میں بھی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آیت کو تم ایک ہی مصداق

اِنَّہٗ فِی شَیْءٍ وَاحِدٍ۔[1]　　　میں بند کرو۔

۳۔ وَیَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ : وہ اپنے رب کا خوف رکھتے اور روز حساب سے بھی خائف رہتے ہیں۔ اللہ کی عظمت و جلالت سے خوف کرتے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ جو سلوک بندوں کے ساتھ فرماتا ہے اس سے خوف نہیں ہے کیونکہ وہ ارحم الراحمین ہے یا ممکن ہے ذات اللہ سے خوف نہیں بلکہ عدل الٰہی سے خائف رہتے ہیں۔ اس صورت میں برے حساب اور اللہ سے ڈرنے کا مطلب ایک ہی ہے۔

بُرے حساب سے مراد جیسا کہ احادیث میں آیا ہے، ناانصافی نہیں ہے بلکہ پورا حساب لینا ہے۔[2]

۴۔ وَالَّذِیۡنَ صَبَرُوا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ رَبِّہِمۡ : وہ اللہ کی خوشنودی کی خاطر صبر کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے گرسنگی پر صبر کرتے ہیں ۔مال حرام نہیں کھاتے۔ صبر عن المعصیۃ۔ وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے روزہ کی بھوک اور پیاس پر صبر کرتے ہیں۔ صبر علی الطاعۃ۔ وہ مال و اولاد کے ہاتھ سے جانے پر بھی صبر کرتے ہیں کہ کہیں ناشکری نہ ہو؟ صبر عند المصیبۃ۔

۵۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ: نماز قائم کرتے ہیں۔ خود بھی نماز پڑھتے ہیں اور معاشرے میں نماز کو رائج کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

۶۔ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ : رزق الٰہی سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں۔ وہ پوشیدہ اس لیے کرتے ہیں کہ ریاکاری کا شائبہ نہ آنے پائے اور علانیہ اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ دوسروں میں بھی یہ سوچ عام ہو جائے۔

۷۔ وَّیَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ: وہ نیکی کے ذریعے برائی کو دور کر دیتے ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہیں:

الف: کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اسے نیکی بجا لا کر مٹا دیتے ہیں کیونکہ ان الحسنات یذھبن السئیات۔ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

ب: کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اسے توبہ کے ذریعے دور کر دیتے ہیں کیونکہ تائب بے گناہ کی طرح ہے۔

ج: کسی اور سے برائی سرزد ہو جاتی ہے اور وہ ظلم کرتا ہے تو وہ اس برائی کے مقابلے میں احسان کر کے اسے دور کر دیتے ہیں۔

د: کسی سے کوئی برائی سرزد ہو جاتی ہے تو وہ اس منکر سے منع کرتا ہے جو ایک نیکی ہے۔ اس سے برائی دور ہو جاتی ہے۔

آیت کے اطلاق میں یہ تمام باتیں شامل ہیں۔

---

[1] اصول کافی ۲: ۱۵۶　　[2] تفسیر عیاشی

اہم نکات

۱۔ مومن وہ ہے جو محراب کا عابد، میدان کا صابر اور سخی ہو۔

۲۔ مومن سے جب گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو وہ اس سے باعزت بری الذمہ ہونے کا چارہ کار سوچتا ہے۔ وہ ہے نیکی بجا لانا: یَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ ....

۳۔ مؤمن اپنے گناہ کا تدارک نیکی سے کرتا ہے۔

جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَ اَزۡوَاجِہِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِہِمۡ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ کُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾

سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَی الدَّارِ ﴿۲۴﴾

۲۳۔ ایسی دائمی جنتیں ہیں جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے آبا اور ان کی بیویوں اور اولاد میں سے جو نیک ہوں گے وہ بھی اور فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے۔

۲۴۔ (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو یہ تمہارے صبر کا صلہ ہے، پس عاقبت کا گھر کیا ہی عمدہ گھر ہے۔

تشریح کلمات

عَدۡنٍ: (ع د ن) کے معنی کسی جگہ قرار پکڑنے کے ہیں۔ اسی سے کان کو المعدن کہتے ہیں کیونکہ کان جواہرات کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا: آخرت کا گھر وہ دائمی جنت ہوگی جس میں وہ اپنے تمام صالح اور نیک رشتہ داروں کے ساتھ رہیں گے۔ اگرچہ آیت میں باپ، دادا، بیویوں اور اولاد کا ذکر ہے لیکن ان تین رشتوں کے ذکر میں تمام رشتہ دار آ گئے کیونکہ

۲۔ وَمَنۡ صَلَحَ:

i۔ آباء میں باپ، دادا آ گئے۔

ii۔ ازواج یعنی باپ، دادا کی ازواج میں اولاد کی مائیں آ گئیں۔

iii۔ ذریات میں بھائی، بہن اور ان کی اولاد شامل ہوگئی۔

اسی طرح نہایت مختصر لفظوں میں انسان کے خاندان کے اہم ترین افراد کا ذکر آ گیا۔

۳۔ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ : وہ صاحبان عقل اُولُوا الۡاَلۡبَابِ جو مذکورہ صفات کے حامل ہوں گے، جنت عدن میں داخل ہوں گے اور ساتھ وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ ان کے صالح باپ بھی داخل ہوں گے۔ باپ صالح ہے مگر بیٹے کے درجے کا نہیں ہے۔ اس کا باپ جنت میں داخل ہونے والا ہو گا مگر جنت عدن کا سزاوار نہ ہو گا۔ بیٹے کی خاطر باپ کو بھی جنت عدن میں داخل کیا جائے گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اولاد قیامت کے دن فائدہ دے گی۔

۴۔ وَاَزۡوَاجِہِمۡ : صالح ازواج کو بھی جنت عدن میں ساتھ جانے کی اجازت مل جائے گی۔

۵۔ وَذُرِّیّٰتِہِمۡ: اگر باپ جنت عدن کا سزا دار ہے تو اس کی اولاد کو بھی باپ کے درجے پر لا کر جنت عدن میں داخل کیا جائے گا۔

مِّنۡ کُلِّ بَابٍ : سے عندیہ ملتا ہے کہ جنت کے مختلف دروازے ہیں اور ہر دروازہ اپنی جگہ درجات کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ ان سب دروازوں سے داخل ہونے میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جنت کے تمام درجات سے بہرہ مند ہوں گے۔

۶۔ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ : سابق الذکر اوصاف میں سے فرشتے صرف صبر کا ذکر اس لیے کریں گے کہ باقی تمام اعمال کے لیے صبر درکار ہے۔ صبر کے بغیر اطاعت ہو سکتی ہے نہ معصیت سے اجتناب کیا جا سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ صاحبان عقل اپنے خاندان کے افراد کو اپنے ساتھ لے کر جنت عدن میں جائیں گے: صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ ....

۲۔ آخرت میں صبر کے صلے میں امن و سلامتی نصیب ہو گی۔

وَالَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ وَیَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَیُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۙ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ اللَّعۡنَۃُ وَلَہُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جن رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں منقطع کر دیتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ایسے ہی لوگوں پر لعنت ہے اور ان کے لیے ٹھکانا بھی برا ہو گا۔

تفسیر آیات

صاحبان عقل کے مقابلے میں دنیا پرستوں کا ذکر آ گیا جو عقل سے کام نہیں لیتے اور جو نیک اعمال

صاحبان عقل انجام دیتے ہیں یہ لوگ اس کے خلاف حرکتوں کا مرتکب ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ وفا بعہد کی جگہ عہد شکنی کرتے ہیں، ان رشتوں کو قطع کرتے ہیں جن کو جوڑنے کا حکم ہے اور خوف خدا، خوف عاقبت، صبر و استقامت، اقامہ نماز، راہ خدا میں انفاق اور نیکی کے ذریعے برائی کو دور کرنے کی بجائے فساد پھیلاتے ہیں۔
مذکورہ اعمال کے مقابلے میں فساد فی الارض کے ذکر سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ صاحبان عقل کے اعمال میں اصلاح فی الارض مضمر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اعمال صالحہ سے دنیا میں اصلاح ہوتی ہے اور آخرت میں اجر ملتا ہے۔
۲۔ برے اعمال سے دنیا میں لعنت اور آخرت عذاب ملتا ہے۔
۳۔ ائمہ ھدی (ع) سے قطع تعلق موجب فساد فی الارض ہے۔

اَللّٰہُ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ وَ فَرِحُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ؕ وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اللہ جس کی چاہے روزی بڑھاتا ہے اور گھٹاتا ہے اور لوگ دنیاوی زندگی پر خوش ہیں جب کہ دنیاوی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک (عارضی) سامان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰہُ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ: آج کی طرح زمان مکہ میں بھی عام لوگوں کے ذہن میں بات تھی کہ اللہ جس کو عزت دینی چاہتا ہے، اسے فراوان رزق دیتا ہے اور جس کو خوار کرنا چاہتا ہے اس کو غریب کرتا ہے۔ انہی قدروں کے مطابق وہ قریش کے مالداروں اور مسلمان فقیروں میں امتیاز کے قائل تھے۔ جس کے جواب میں ارشاد فرمایا: رزق میں فراوانی اور تنگی اللہ کی مشیت کے مطابق ہے۔ وہ کبھی کسی کو رزق کی فراوانی کے ذریعے سزا دیتا ہے اور کبھی روزی میں تنگی کے ذریعے اجر و فضیلت میں اضافہ فرماتا ہے۔ معیار فضیلت دنیاوی مال و متاع نہیں ہے۔

۲۔ وَ فَرِحُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا: یہ کفار ہیں جو مادی قدروں کو جانتے ہیں۔ یہ لوگ انسانی اور الٰہی قدروں سے ناآشنا ہیں۔ اس لیے وہ دنیا کی دولت پر خوش رہتے ہیں اور انہیں آخرت کی فکر نہیں ہوتی حالانکہ اس دنیا کی قیمت آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں ایک عارضی سامان سے زیادہ نہیں ہے۔

واضح رہے مشیت الٰہی، علل و اسباب کے دائرے میں کارفرما ہوتی ہے۔ لہٰذا رزق کی فراوانی کے لیے اللہ اسباب فراہم فرماتا ہے اور رزق میں تنگی مشیت میں ہو تو اس کے لیے اسباب فراہم نہیں ہوتے۔

اہم نکات

۱۔ رزق میں فراوانی و تنگی مشیت الٰہی کے مطابق ہے: اَللّٰہُ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ...۔

۲۔ غیر مؤمن دنیاوی قدروں پر نازاں ہوتا ہے: وَفَرِحُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا...۔

وَ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ اٰیَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ قُلۡ اِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ اَنَابَ ﴿ۖ۲۷﴾

۲۷۔ اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں: اس (رسول) پر اپنے رب کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نازل نہیں ہوتا؟ کہد یجیے: اللہ جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے اور جو (اللہ کی طرف) رجوع کرتا ہے اپنی طرف اس کی رہنمائی فرماتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: کافر لوگ اپنے کفر کی توجیہ کے لیے کہا کرتے تھے: اگر محمدؐ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں تو گزشتہ انبیاء کی طرح معجزے دکھائیں۔ مثلاً آسمان ٹکڑے ہو کر ان پر گرے یا کوہ صفا سونا بن جائے وغیرہ۔ ان کے جواب میں دوسری جگہ فرمایا:

وَمَا تُغۡنِی الۡاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنۡ قَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝[1]

اور جو قوم ایمان لانا ہی نہ چاہتی ہو اس کے لیے آیات اور تنبیہیں کچھ کام نہیں دیتیں۔

نیز فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ حَقَّتۡ عَلَیۡہِمۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوۡ جَآءَتۡہُمۡ کُلُّ اٰیَۃٍ ...[2]

جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا فیصلہ قرار پا چکا ہے وہ یقیناً ایمان نہیں لائیں گے۔ اگرچہ ان کے پاس ہر قسم کی نشانی آ جائے ....

ان آیات کا ماحصل یہ ہے کہ ان کا ایمان نہ لانا معجزہ کے فقدان کی وجہ سے نہیں ہے۔ اتمام حجت کے لیے کافی معجزے قرآن و دیگر معجزات کی صورت میں موجود ہیں بلکہ ان کا ایمان نہ لانا ایمان کے لیے محرک کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے جو انسان کے درون میں ہوتا ہے۔

۲۔ قُلۡ اِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ: جو اللہ کی طرف متوجہ ہو کر طلب ہدایت کرتا ہے اس کو ہدایت فراہم کرنے کے لیے معجزے موجود ہیں لیکن جو عناد و عداوت کی بنا پر معجزے کا مطالبہ کرتے ہیں ان کو ایمان پر مجبور کرنے

---

[1] ۱۰ یونس: ۱۰۱ [2] ۱۰ یونس: ۹۶۔۹۷

کے لیے معجزہ نہیں ہے۔ یہاں بلا کسی جبر و اکراہ کے، ہدایت اور ضلالت کے درمیان کھڑا کر دیا جاتا ہے جو چاہے ضلالت اختیار کرے اور جو چاہے ہدایت کی راہ پر چلے۔

اہم نکات

۱۔ ہدایت نہ ملنے کا سبب معجزات کا فقدان نہیں بلکہ ہدایت طلبی کا فقدان ہے: وَیَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ۔

۲۔ معجزے کا مطالبہ ہدایت طلبی کے لیے ہے تو یہ مطالبہ قبول کیا جاتا ہے: وَیَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ۔

۳۔ ایمان کا محرک، جو انسان کے درون میں ہوتا ہے، انابت ہے: وَیَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۲۸

۲۸۔ (یہ لوگ ہیں) جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل یادِ خدا سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور یاد رکھو! یاد خدا سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔

تفسیر آیات

آیت وَیَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ: کی تفصیل ہے۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایمان لے آتے اور ذکر خدا سے اطمینان قلب حاصل کرتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ذکر خدا سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے اور وہ ہر بات پر معجزے کا مطالبہ نہیں کرتے۔

انسان کے ظاہری وجود میں ایک اور انسان ہے جسے ضمیر، فطرت، قلب، وجدان اور جبلت کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس طرح ظاہری انسان کے تقاضے ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنے سے اسے سکون و اطمینان ملتا ہے، اسی طرح داخلی انسان کے بھی تقاضے ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنے سے اسے سکون ملتا ہے۔ جس طرح مچھلی کو پانی میں سکون ملتا ہے چونکہ پانی اس کے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

کبھی ظاہری انسان اپنے باطنی انسان، ضمیر کے تقاضوں کے خلاف جرائم کا ارتکاب کرتا ہے تو باطنی انسان، ضمیر، وجدان اس ظاہری انسان کی سرزنش کرتا ہے اور ضمیر و وجدان کی عدالت میں پیش کر کے اس کا محاسبہ کرتا ہے جسے ہم ضمیر کی ملامت کہتے ہیں۔ اس صورت میں ان انسانوں میں داخلی جنگ چھڑ جاتی ہے اور انسان اضطراب و بے سکونی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ظاہری انسان اپنے داخلی انسان کے تقاضوں کے مطابق عمل کرتا ہے، مثلاً ذکر و عبادت الٰہی میں مصروف ہو جاتا ہے تو اس سے ظاہری و باطنی انسان میں ہم آہنگی اور باہمی امن و آشتی برقرار رہتی ہے۔ اسے سکون و اطمینان کہتے ہیں۔

اس لیے ہر وہ رابطہ جو غیر اللہ کے ساتھ قائم ہوتا ہے، انسان کو امن و سکون نہیں دے سکتا بلکہ اس کی بے سکونی میں اضافہ کرتا ہے۔ مثلاً انسان مال دولت کی فراوانی میں اپنا سکون تلاش کرتا ہے لیکن مال و

دولت میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے، انسان کی بے سکونی میں بھی اسی قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو کسی محدود سے سکون نہیں ملتا جب تک اللہ کی لامحدود ذات سے رابطہ نہ کرے۔

ذکر کی تفسیر محبت سے ہوئی ہے۔ اللہ کا ذکر اس وقت ہو گا جب اللہ سے محبت ہو گی۔ چنانچہ الدرالمنثور ۴: ۵۸ میں آیا ہے: ابن مردویہ نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے فرمایا:

ذاك من احب اللّٰه تعالیٰ و رسوله و احب صاهل بيتي صادقاً غير كاذب و احب المؤمنين شاهداً الا بذكر اللّٰه يتحابون۔	اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول اور میرے اہل بیت سے سچی محبت کریں اور غیبت و حضور میں تمام مؤمنین سے بھی محبت کریں۔ دیکھو اللہ ہی کے ذکر کے ذریعے یہ ایک دوسرے سے محبت کریں گے۔

اس حدیث میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جو ہستیاں اللہ کے ذکر کے لیے وسیلہ ہیں وہ بھی ذکر اللہ میں شامل ہیں۔

اعتراض: اس آیت میں فرمایا کہ ذکر خدا سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ذکر خدا سے مؤمنین کے دل خوف زدہ ہو جاتے ہیں:

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ....[1]	مؤمن تو صرف وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں....

تو کیا ان آیات میں تضاد نہیں ہے؟

جواب: جی ہاں ذکر خدا کے وقت مؤمن کو اپنی لغزشیں اور کوتاہیاں نظر آتی ہیں تو دل کانپ جاتے ہیں۔ یہ خوف انسان میں اس وقت آتا ہے جب اس کا ضمیر اور وجدان بیدار ہو اور یہ تعمیری خوف ہے۔ اس خوف کی وجہ سے دوسرے تمام خوف سے نجات مل جاتی ہے اور تعمیری خوف پروان چڑھتا ہے۔ اس خوف کی دوسری وجہ عظمت الٰہی کا تصور ہے۔ اللہ کی معرفت سے سرشار لوگ جب اللہ کی بارگاہ میں برائے عبادت حاضر ہوتے ہیں تو عظمت الٰہی کی وجہ سے لرزہ براندام ہوتے ہیں۔ اس خوف سے سکون ملتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خوف خدا نہ رکھنے والے بے سکون ہوتے ہیں، ہر جرم کا ارتکاب کرتے ہیں اور مضطرب رہتے ہیں۔ جب کہ خوف خدا سے گریہ کرنے والے سکون کی نیند سوتے ہیں۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت ہے:

و من اعظم النعم علينا جريان ذكرك على السنتنا...[2]	تیری عظیم نعمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ تیرا ذکر ہماری زبانوں پر جاری ہے۔
وَاَنَامَعَ عَبۡدِیۡ اِذَاذَکَرَنِیۡ فَمَنۡ ذَکَرَنِیۡ	جب میرا بندہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اپنے بندے کے

---

[1] ۸ انفال: ۲ [2] بحار ۹۱: ۱۵۱۔ مناجاۃ الذاکرین۔ صحیفہ سجادیہ۔

فِی نَفْسِہٖ ذَکَرْتُہٗ فِی نَفْسِی وَ مَنْ ذَکَرَنِی فِی مَلَاءٍ ذَکَرْتُہٗ فِی مَلَاءٍ خَیْرٍ مِنْہُ۔۔۔[۱]

ساتھ ہوتا ہوں۔ پس جس نے اپنے نفس میں مجھے یا کیا تو میں اسے اپنے نفس میں یاد کروں گا اور جس نے برملا مجھے یاد کیا تو میں اس سے بہتر اسے برملا یاد کروں گا۔

اہم نکات

۱۔ قلب و ضمیر کو صرف ذکر خدا سے سکون و اطمینان ملتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوۡبٰی لَہُمۡ وَ حُسۡنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیے ان کی نیک نصیبی ہے اور ان کے لیے بہترین ٹھکانا ہے۔

تشریح کلمات

طُوۡبٰی: اطیب کی تانیث ہے یعنی العیش الطیب خوشگوار زندگی، ممکن ہے یہ اس دنیا کی زندگی کے بارے میں ہو۔

تفسیر آیات

ذکر خدا سے ایمان والوں کو اطمینان ملتا ہے اور عمل صالح بجا لانے والے اہل ایمان کی دنیا میں خوشگوار زندگی اور آخرت میں خوش انجامی ہو گی۔

ذکر خدا سے زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے اور ذکر خدا سے منہ موڑنے کی صورت میں زندگی اجیرن ہو جاتی ہے جیسا کہ فرمایا:

وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا ۔۔۔[۲]

جو میرے ذکر سے منہ موڑتا ہے اس کے لیے ایک تنگ زندگی ہو گی۔

اس سے معلوم ہوا ذکر خدا میں دنیا و آخرت دونوں کی سعادت مضمر ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے: جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طُوۡبٰی لَہُمۡ وَ حُسۡنُ مَاٰبٍ ... کے بارے میں سوال ہوا تو آپؐ نے فرمایا:

شجرۃ فی الجنۃ اصلھا فی داری و فرعھا علی اھل الجنۃ۔

یہ جنت کا ایک درخت ہے جس کی جڑ میرے گھر میں ہے اور اس کی شاخیں اہل جنت پر ہیں۔

---

[۱] مستدرک الوسائل ۵: ۲۹۸ [۲] طہ: ۱۲۴

ثم سئل عنها مرة اخرى قال: شجرة فى الجنة اصلها فى دار على و فرعها فى اهل الجنة۔
فقيل له سالناك عنها: يا رسول الله فقلت اصلها فى دارى ثم سالناك عنها مرة اخرى فقلت شجرة فى الجنة اصلها فى دار على و فرعها على اهل الجنة.
فقال: ان دارى و دار على واحدة.[1]

پھر دوبارہ سوال ہوا تو فرمایا: یہ جنت کا ایک درخت ہے جس کی جڑ علی کے گھر میں ہے اور اس کی شاخیں اہل جنت پر ہیں۔
کسی نے کہا: یا رسول اللہ! پہلے ہم نے پوچھا تو آپ نے فرمایا: جڑ میرے گھر میں ہے۔ پھر سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: یہ جنت کا ایک درخت ہے جس کی جڑ علی کے گھر میں ہے اور شاخیں اہل جنت پر ہیں۔
فرمایا: میرا اور علی کا گھر ایک ہے۔

ابن ابی حاتم، ابن سیرین سے روایت کرتے ہیں:

شجرة فى الجنة اصلها فى حجرة على۔[2]

طوبیٰ جنت کا درخت ہے جس کی جڑ حضرت علی (علیہ السلام) کے گھر میں ہو گی۔

مذکورہ حدیث کے راوی متعدد اصحاب ہیں۔ ان میں ابن عباس، ابوہریرہ کے نام ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر شواهد التنزيل ذیل آیت۔

اہم نکات

۱۔ ایمان و عمل صالح سے دنیا و آخرت دونوں کی زندگی سدھر جاتی ہے۔ طُوۡبٰی لَهُمۡ وَ حُسۡنُ مَاٰبٍ

كَذٰلِكَ اَرۡسَلۡنٰكَ فِىۡۤ اُمَّةٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتۡلُوَا۟ عَلَيۡهِمُ الَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ وَهُمۡ يَكۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ‌ؕ قُلۡ هُوَ رَبِّىۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ۚ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ (اے رسول) اسی طرح ہم نے آپ کو ایسی قوم میں بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں تاکہ آپ ان پر اس (کتاب) کی تلاوت کریں جس کی ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے جبکہ یہ لوگ خدائے رحمٰن کو نہیں مانتے، کہد یجئے: وہی میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔

---

[1] شواهد التنزيل ۱: ۳۹۷۔ ۳۹۸ [2] الدر المنثور

تفسیر آیات

۱۔ اَرۡسَلۡنٰکَ فِیۡۤ اُمَّۃٍ قَدۡ خَلَتۡ: اے رسول آپ کا مبعوث کرنا کوئی انوکھی بات نہیں ہے آپ سے پہلے بھی ایسی قومیں گزری ہیں جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے۔

۲۔ لِّتَتۡلُوَاۡ عَلَیۡہِمُ الَّذِیۡۤ: آپ کی ذمے داری یہ ہے کہ جو آپ کی طرف وحی ہوئی ہے اس کی تبلیغ کریں اگرچہ وہ خدائے رحمٰن کو نہیں مانتے۔ ان کو منوانا آپ کی ذمے داری نہیں ہے۔

۳۔ یَکۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ: ممکن ہے یہاں لفظ رحمٰن کا ذکر کر کے اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ وہ اس رحمت کے منکر ہیں جس میں دین و دنیا دونوں کی سعادت مضمر ہے۔

۴۔ قُلۡ ہُوَ رَبِّیۡ: آپ ان پر یہ بات واضح کر دیں: میرا رب صرف اللہ ہے۔ اس لیے میں صرف اللہ کی عبادت کرتا ہوں چونکہ عبادت صرف رب کی ہوتی ہے۔ صرف عبادت نہیں بلکہ ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں چونکہ اس کے علاوہ کسی کے پاس کچھ ہوتا نہیں کہ میں اس کی طرف رجوع کروں۔

اہم نکات

۱۔ رسولوں کا مبعوث کرنا اللہ کی سنت ہے: کَذٰلِکَ اَرۡسَلۡنٰکَ ....

۲۔ کافر، رحمت خدا کے منکر ہوتے ہیں: یَکۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ ....

۳۔ توکل، رسالت کے ستونوں میں سے ہے: عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ....

وَ لَوۡ اَنَّ قُرۡاٰنًا سُیِّرَتۡ بِہِ الۡجِبَالُ اَوۡ قُطِّعَتۡ بِہِ الۡاَرۡضُ اَوۡ کُلِّمَ بِہِ الۡمَوۡتٰی ؕ بَلۡ لِّلّٰہِ الۡاَمۡرُ جَمِیۡعًا ؕ اَفَلَمۡ یَایۡـَٔسِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰہُ لَہَدَی النَّاسَ جَمِیۡعًا ؕ وَ لَا یَزَالُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا تُصِیۡبُہُمۡ بِمَا صَنَعُوۡا قَارِعَۃٌ اَوۡ تَحُلُّ قَرِیۡبًا مِّنۡ دَارِہِمۡ حَتّٰی یَاۡتِیَ وَعۡدُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا جس سے پہاڑ چل پڑتے یا زمین پھٹ جاتی یا مردے کلام کرتے (تو بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے) بلکہ یہ سارے امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں، کیا اہل ایمان پر یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ہدایت دے دیتا اور ان کافروں پر ان کے اپنے کردار کی وجہ سے آفت آتی رہے گی یا ان کے گھروں کے قریب (مصیبت) آتی رہے گی یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آ پہنچے، یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

تشریح کلمات

قَارِعَۃٌ : (ق ر ع) القرع ایک چیز کو دوسری چیز پر مارنے کے معنوں میں ہے۔ کھڑکھڑاہٹ کے قریب المعنی ہے۔

یأس : الیأس علم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

سلسلہ کلام محسوس معجزوں کے مطالبے کے بارے میں ہے کہ یہ لوگ معجزوں کی بنا پر ایمان لانے والے نہیں ہیں:

اِنَّ الَّذِیۡنَ حَقَّتۡ عَلَیۡہِمۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۹۶﴾ وَ لَوۡ جَآءَتۡہُمۡ کُلُّ اٰیَۃٍ ....[1]

جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا فیصلہ قرار پا چکا ہے وہ یقیناً ایمان نہیں لائیں گے۔ اگرچہ ان کے پاس ہر قسم کی نشانی آ جائے ....

۱۔ وَ لَوۡ اَنَّ قُرۡاٰنًا سُیِّرَتۡ : روئے سخن اہل ایمان کی طرف ہے جو یہ خواہش رکھتے تھے کہ کفار کے بار بار مطالبے پر مذکورہ معجزات کا ظہور ہو جاتا تو یہ لوگ ایمان لے آتے اور ان لوگوں کو شبہات پھیلانے کا بہانہ نہ ملتا۔ جواباً اہل ایمان سے فرما رہا ہے: بَلۡ لِّلّٰہِ الۡاَمۡرُ جَمِیۡعًا ....

ایسا نہیں ہے کہ ان کی ہدایت، معجزات کے ساتھ مربوط ہو اور وہ ایمان لانے کے لیے آمادہ ہوں، صرف معجزات کے ظہور کا انتظار ہو بلکہ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ ہدایت کے اہل لوگوں کو ایمان سے نوازتا اور نااہل لوگوں کو گمراہی میں دھکیل دیتا ہے۔ اگر ایمان و ہدایت کے لیے معجزہ ہی کارآمد ہوتا تو سابقہ انبیاء کے معجزوں کو جادو کہہ کر مسترد نہ کیا جاتا اور خود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش کردہ قرآن کا معجزہ ایمان کے لیے کافی تھا۔ معجزہ، اتمام حجت کے لیے ہوتا ہے، ایمان لانے پر مجبور کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ سو یہ حجت قرآن و دیگر معجزات کے ذریعہ پوری ہوگئی ہے۔ آیت کے دوسرے جملہ میں فرمایا:

۲۔ اَفَلَمۡ یَایۡـَٔسِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا : اہل ایمان پر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب کو قہراً ایمان لانے پر مجبور کر دیتا مگر اس ایمان کی کیا قیمت ہے؟ اللہ ہدایت کو طاقت کے ذریعے مسلط نہیں فرماتا۔ اللہ لوگوں کو ہدایت و ضلالت کے درمیان کھڑا کرتا ہے۔ جو چاہے ہدایت اختیار کرے اور جو چاہے ضلالت کی راہ لے۔

۳۔ وَ لَا یَزَالُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا : تیسرے جملہ میں فرمایا: ان پر عذاب نازل ہونے والا ہے یا ان کے گھروں کے نزدیک عذاب آنے والا ہے اور ساتھ یہ نوید بھی سنائی گئی کہ وعدہ الٰہی ہونے والا ہے۔

---

[1] ۱۰ یونس: ۹۶۔ ۹۷

واضح رہے مکہ میں نازل ہونے والے اس سورہ میں ایک طرف تو مسلمانوں کو یہ خبر دی جا رہی ہے کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں جیسا کہ سورہ یٰسٓ میں فرمایا:

وَسَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝ ...[1]　اور ان کے لیے یکساں ہے کہ آپ انہیں تنبیہ کریں یا نہ کریں وہ (ہر حالت میں) ایمان نہیں لائیں گے۔

۴۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ: دوسری طرف یہ خوشخبری سنائی جا رہی ہے:

الف: ان پر عذاب نازل ہونے والا ہے۔

ب: اور اللہ کا وعدۂ فتح بھی پورا ہونے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ دین کے انتخاب میں جبر نہیں ہے: لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَی النَّاسَ ....

۲۔ کفار کو دنیا میں بھی سزا ملے گی: بِمَا صَنَعُوۡا قَارِعَةٌ ....

۳۔ مسلمانوں کو فتح کی نوید: حَتّٰی یَاۡتِیَ وَعۡدُ اللّٰهِ ....

وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِیٴَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَاَمۡلَیۡتُ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ ۟ فَکَیۡفَ کَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور آپ سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا ہے پھر میں نے ان کافروں کو ڈھیل دی پھر میں نے انہیں گرفت میں لے لیا (تو دیکھ لو) عذاب کیسا شدید تھا۔

تفسیر آیات

تاریخ انبیاء اور سنت الٰہی کا ذکر ہے کہ منکرین نے ہمیشہ انبیاء (ع) کی طرف سے آنے والے وعدہ عذاب کا مذاق اڑایا اور کہا:

فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ۝ [2]　پس اگر تم سچے ہو تو ہمارے لیے وہ (عذاب) لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ ان منکرین کی تمام تر اہانتوں کے باوجود ان کو مہلت دی جاتی ہے اور عذاب نازل کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیا جاتا۔ منکروں کو مزید موقع دیا جاتا ہے کہ راہ راست پر آ جائیں۔ نہ آنے کی صورت میں ان کے جرم و عذاب میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] ۳۶ یٰسٓ: ۱۰　[2] ۷ اعراف: ۷۰

اہم نکات

۱۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلی ہے: فَاَمۡلَیۡتُ ....

۲۔ منکر کو مہلت دینا ایک قسم کی سزا ہے: فَاَمۡلَیۡتُ ....

اَفَمَنۡ ہُوَ قَآئِمٌ عَلٰی کُلِّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ ۚ وَ جَعَلُوۡا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ ؕ قُلۡ سَمُّوۡہُمۡ ؕ اَمۡ تُنَبِّئُوۡنَہٗ بِمَا لَا یَعۡلَمُ فِی الۡاَرۡضِ اَمۡ بِظَاہِرٍ مِّنَ الۡقَوۡلِ ؕ بَلۡ زُیِّنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مَکۡرُہُمۡ وَ صُدُّوۡا عَنِ السَّبِیۡلِ ؕ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ کیا وہ اللہ جو ہر نفس کے عمل پر کڑی نظر رکھتا ہے (بے حس بتوں کی طرح ہو سکتا ہے جنہیں) ان لوگوں نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے؟ کہدیجیے: ان کے نام (اور اوصاف) بیان کرو (جیسے اللہ کے اسمائے حسنیٰ ہیں)، کیا تم اللہ کو ایسی خبر دینا چاہتے ہو جسے وہ اس زمین میں نہیں جانتا یا یہ محض ایک کھوکھلی بات ہے؟ بلکہ دراصل کافروں کے لیے ان کی مکاری زیبا بنا دی گئی ہے اور ان کے لیے ہدایت کا راستہ مسدود ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے گمراہ کر دے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَمَنۡ ہُوَ قَآئِمٌ: وہ ذات جو ہر تنفس کے اعمال پر نظر رکھتی ہے اور ہدایت و ضلالت اس کے ہاتھ میں ہے، وہ حی، قادر، علیم، خالق، رازق، مالك، مدبر، قهار، رحمن، غفور، رحیم جیسے اسماء حسنی و اوصاف کی مالک ہے۔

۲۔ قُلۡ سَمُّوۡہُمۡ: وہ ان بے شعور بتوں کی طرح ہو سکتی ہے جو صرف کھوکھلے لفظوں کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ ان بتوں کو حی، قادر، قهار، خالق، علیم جیسی صفات کے ساتھ متصف نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ بِمَا لَا یَعۡلَمُ فِی الۡاَرۡضِ: ایسے کسی شریک کا اللہ تعالیٰ کو علم تک نہیں ہے۔ کیا تم اللہ کے لیے یہ خبر دے رہے ہو کہ زمین میں آپ کا کوئی شریک ہے؟ لہٰذا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ان بتوں کے لیے اللہ کے اوصاف جیسے اوصاف ہیں، نہ یہ کہنا درست ہے کہ ان بتوں اور ان کے اوصاف کا اللہ کو علم نہیں ہے۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ ان کی باتوں میں حقیقت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ مشرکین کے پاس کسی قسم کی منطق نہیں ہے: اَمۡ بِظَاہِرٍ مِّنَ الۡقَوۡلِ...۔

۲۔ شرک کو شیطان خوشنما بنا دیتا ہے: بَلۡ زُیِّنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا...۔

لَهُمۡ عَذَابٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ لَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَشَقُّ ۚ وَ مَا لَهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو زیادہ مشقت والا ہے اور انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔

تفسیر آیات

یہ دنیا میں ناکامی اور شکست وخواری اور آخرت میں جہنم کے ابدی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ بروز قیامت انہیں کوئی بچانے، شفاعت کرنے والا بھی نہ ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ کافروں کے لیے دنیا و آخرت میں کوئی پناہ نہیں ہے۔

مَثَلُ الۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ ؕ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ اُکُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا ؕ تِلۡکَ عُقۡبَی الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا ٭ۖ وَّ عُقۡبَی الۡکٰفِرِیۡنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اہل تقویٰ سے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان ایسی ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس کے میوے اور ان کا سایہ دائمی ہیں، یہ ہے اہل تقویٰ کی عاقبت اور کافروں کا انجام تو آتش ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں اہل کفر کے مقابلے میں اہل ایمان کا نہیں بلکہ اہل تقویٰ کا ذکر ہے۔ اس میں یہ لطیف اشارہ ملتا ہے کہ نیک عاقبت کے لیے صرف ایمان کافی نہیں بلکہ عمل صالح اور تقویٰ کی بھی ضرورت ہے۔

سایہ سے مراد ممکن ہے وہ فضا ہو جو جنت میں قائم ہے جس میں نہ تو دھوپ کی تپش ہے، نہ سردی:

لَا یَرَوۡنَ فِیۡهَا شَمۡسًا وَّ لَا جس میں نہ دھوپ کی گرمی دیکھنے کا اتفاق ہوگا اور نہ

زَمۡهَرِيۡرًا ۝ۚ[1] سردی کی شدت۔

اہم نکات

۱۔ جنت کے میوے دائمی اور غیر محدود ہیں۔

۲۔ جنت کی سزاواری کے لیے تقویٰ شرط ہے۔

وَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمِنَ الۡاَحۡزَابِ مَنۡ يُّنۡكِرُ بَعۡضَهٗ ؕ قُلۡ اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشۡرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيۡهِ اَدۡعُوۡا وَاِلَيۡهِ مَاٰبِ ۝۳۶

۳۶۔اور جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ آپ کی طرف نازل ہونے والی کتاب سے خوش ہیں اور بعض فرقے ایسے ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے، کہدیجیے: مجھے تو صرف یہ حکم ملا ہے کہ میں اللہ کی بندگی کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤں، میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف مجھے رجوع کرنا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ: رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت پر ایک دلیل یہ ہے کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ میں سے وہ لوگ جو حق کے طالب ہیں، بخوشی اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ اپنے گمشدہ کو اس قرآن میں پا کر خوش ہو جاتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ اہل کتاب، اس قرآن پر ایمان لائے ہیں بلکہ فرمایا: يَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وہ اس کتاب سے خوش ہیں۔ وہ جس رسولؐ کی آمد کے منتظر تھے اس کے آنے سے خوش ہیں۔ چنانچہ ابتدائے بعثت میں بہت سے اہل کتاب ایمان لائے جیسا کہ مکہ میں نازل ہونے والے سورہ عنکبوت میں فرمایا:

فَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ....[2] پس جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں....

۲۔ وَمِنَ الۡاَحۡزَابِ: اہل کتاب کے کچھ فرقے ایسے بھی ہیں جو توحید کو نہیں مانتے بلکہ اپنے تثلیثی عقیدے پر قائم ہیں۔

۳۔ قُلۡ اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ: آپ کہہ دیجیے کوئی ایمان لائے، نہ لائے، مجھے تو یہ حکم ملا ہے کہ میں صرف

---

[1] ۷۶ دھر: ۱۳ [2] ۲۹ عنکبوت: ۴۷

اللہ کی عبادت کروں، کسی کو اس کا شریک قبول نہ کروں۔ وَ اِلَیۡہِ مَاٰبِ: مجھے تو اسی کی طرف رجوع کرنا ہے جس کے پاس دنیا و آخرت دونوں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ طالب حق، قرآن کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

وَ کَذٰلِکَ اَنۡزَلۡنٰہُ حُکۡمًا عَرَبِیًّا [۱] وَ لَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَہۡوَآءَہُمۡ بَعۡدَ مَا جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

۳۷۔اور اسی طرح ہم نے اس قرآن کو عربی میں ایک دستور بنا کر نازل کیا ہے اور اگر آپ نے علم آ جانے کے بعد بھی لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں آپ کو نہ کوئی حامی ملے گا اور نہ کوئی بچانے والا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ کَذٰلِکَ اَنۡزَلۡنٰہُ حُکۡمًا: جس طرح سابقہ انبیاء علیہم السلام پر کتب نازل کی گئی ہیں اسی طرح ہم نے آپ پر یہ قرآن عربی زبان میں ایک دستور بنا کر نازل کیا ہے۔

عربی سے مراد یہاں عربی زبان ہو سکتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِہٖ ۔۔ [۱] ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی قوم کی زبان میں۔

بعض نے عربی سے مراد "واضح معنی" لیا ہے جو سیاق آیت سے بعید ہے۔

۲۔ وَ لَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَہۡوَآءَہُمۡ: علم کے ذریعے حجت پوری ہونے کے بعد لوگوں کی خواہشات کے دباؤ میں آ کر منحرف ہونے کی صورت میں اللہ کے غضب کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی حامی ملے گا نہ ہی اللہ کے غضب سے بچانے والا ملے گا۔ خود رسول معصومؑ سے خطاب کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ تمام قدروں کا پیمانہ، عمل ہے، شخصیت نہیں ہے۔ کسی مطلب کو دل نشین کرنے اور اس کی اہمیت بیان کرنے کے لیے یہ بہترین اسلوب کلام ہے۔

اہم نکات

۱۔ تمام قدروں کا پیمانہ عمل ہے، نہ شخصیت۔

۲۔ خطاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، مراد امت لینا مؤثر ترین اسلوب کلام ہے۔

---

[۱] ۱۴ ابراھیم: ۴

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِکَ وَ جَعَلۡنَا لَہُمۡ اَزۡوَاجًا وَّ ذُرِّیَّۃً ؕ وَ مَا کَانَ لِرَسُوۡلٍ اَنۡ یَّاۡتِیَ بِاٰیَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ بتحقیق ہم نے آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے اور انہیں ہم نے ازواج اور اولاد سے بھی نوازا اور کسی رسول کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی نشانی لے آئے، ہر زمانے کے لیے ایک دستور ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا: ایک عامیانہ اعتراض کا جواب ہے جو رسول کریم کے انسانی پہلو پر کیا جاتا تھا کہ یہ کیسے رسول ہیں جو بیوی اور بچے رکھتا ہے۔ اللہ کے نمائندے کا خواہشات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

جواب میں فرمایا: اللہ کی یہ سنت رہی ہے کہ اپنے انبیاء علیہم السلام کو انسانی تقاضوں کے دائرے میں رکھا ہے تاکہ تمام انسانوں کے لیے نمونہ عمل بن جائیں اور قولاً و عملاً حجت پوری ہو جائے۔

۲۔ وَ مَا کَانَ لِرَسُوۡلٍ: دوسرا اعتراض یہ تھا: سابقہ انبیاء کے معجزے واضح تھے۔ آپ (ص) کونسا معجزہ لے کر آئے ہیں؟

جواب میں فرمایا: لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ۔ ہر دور اور عصر کے لیے ایک دستور ہوا کرتا ہے۔ سابقہ امتوں کے لیے محسوس معجزوں کی ضرورت تھی، وہ عقلی بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔ اب انسان فکری بلوغت کو پہنچ گیا ہے اس لیے محسوس معجزوں کی جگہ معقول معجزوں کی ضرورت ہے۔ سابقہ ادوار کی شریعتیں محدود تھیں اس لیے محسوس معجزے دکھائے جو مشاہدہ کرنے والوں تک محدود ہیں۔ نبی آخر الزمان ؐ کی شریعت دائمی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ معجزہ بھی دائمی ہو۔ لہٰذا دور موسیٰ کا دستور، دور عیسیٰ علیہما السلام سے جدا ہے۔ دور نوح (ع) کا دستور تو اور جدا ہے کہ یہاں تو انسان ابتدائی دور میں محسوس معجزوں کے بھی اہل نہ تھے۔ اس لیے ان کو غرق کر دیا ہے۔ دور خاتم المرسلین ؐ ان سب سے جدا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تمام ادیان عصری تقاضوں کے مطابق ہیں: لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ۔

۲۔ احکام شریعت میں زمانہ دخیل ہے: لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ۔

یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ ۚۖ وَ عِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اللہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس ام الکتاب ہے۔

تشریح کلمات

یَمۡحُوا : (م ح م) المحو کے معنی کسی چیز کے اثر اور نشان کو زائل کرنے اور مٹا دینے کے ہیں۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں فرمایا: لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ ہر عصر کے لیے ایک کتاب ہوا کرتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا: اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے۔ سیاق آیت کے مفہوم سے اخذ ہو سکتا ہے کہ اس محو و اثبات کا تعلق کتاب و شریعت سے ہے۔

تاہم آیت کی تعبیر عام ہے جو ہر چیز کو شامل ہے۔ ہر اس چیز کو شامل ہے جس کا محو و اثبات مشیت الٰہی میں ہو۔

کائناتی نظام میں اللہ تعالیٰ کے دو فیصلے ہوتے ہیں:

ایک فیصلہ اٹل، حتمی اور نا قابل تغیر ہے۔

دوسرا فیصلہ قابل تغیر ہے۔

اس کائنات کے کچھ ثابت اور لا یتغیّر دستور ہیں جن پر یہ نظام قائم ہے۔ ان میں تبدیلی آنا ممکن نہیں ہے۔ ان امور کو اللہ نے اپنی سنت قرار دیا ہے:

وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۞ ....[1]   اور اللہ کے دستور میں آپ کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

لیکن اس کے ساتھ کچھ امور ایسے بھی ہیں جن میں لچک کی گنجائش رکھی ہے تا کہ انسان مجبور نہ ہو بلکہ اپنے اعمال و کردار کے نتائج و اثرات کا ذمے دار اور گروی ہو۔ اگر اللہ کے حتمی فیصلے نہ ہوتے تو اس کائنات کی کسی چیز پر بھروسہ نہ آتا اور اگر کچھ فیصلوں میں لچک کی گنجائش نہ ہوتی تو انسان مجبور ہوتا اور اپنے اعمال و کردار کا اس پر کوئی اثر مترتب نہ ہوتا۔ اسی سلسلے میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ....[2]   اللہ کسی قوم کا حال یقیناً اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے....

شیعہ و سنی مصادر میں بے شمار ایسی احادیث موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی اعمال سے اللہ کے فیصلے بدل جاتے ہیں۔

رسول اللہؐ سے روایت ہے:

لا یرد القضا الا الدعاء و لا یزید فی العمر الا البر۔[3]   اللہ کے فیصلے کو صرف دعا روک سکتی ہے اور نیکی ہی سے عمر لمبی ہوتی ہے۔

رسول اللہؐ سے روایت ہے:

---

[1] ۳۳ احزاب: ۶۲   [2] ۱۳ رعد: ۱۱   [3] صحیح ترمذی ۸: ۳۵۰

لا یزیدفی العمرالا البر ولا یرد القدر الا الدعاء و ان الرجل لیحرم الرزق لخطیئة یعملھا۔ [1]	عمر میں اضافہ نیکی سے ہی ہوسکتا ہے۔ تقدیر کو صرف دعا روک سکتی ہے اور انسان اپنی غلطی کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔

البتہ یہ ذہن میں رہے کہ اللہ کا فیصلہ ایسا نہیں بدلتا جیسے ہمارا فیصلہ بدلتا ہے۔ ہمارا فیصلہ تو اس وقت بدلتا ہے جب کوئی نئی بات سامنے آجاتی ہے جو پہلے معلوم نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کو تمام فیصلوں کا یکساں علم ہوتا ہے۔

۱۔ وَعِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ: تمام فیصلوں کا منبع و مصدر اس کے پاس ہے۔ اس کے سامنے تو وہ فیصلے بھی موجود ہیں جو بدلنے والے ہیں۔ بدلنے سے پہلے اس کے بدلنے کا بھی علم ہے۔ تمام قابل تغیر اور ناقابل تغیر فیصلوں کی ام الکتاب اللہ کے پاس ہے۔ اللہ کے پاس ایک قانون کلی ہے جس کے تحت فیصلے بدلتے ہیں اور یہ کلی قانون ناقابل تغیر ہے۔ ام الکتاب ان فیصلوں کا مجموعہ ہے جو ناقابل تغیر ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لکل امر یریده اللّٰه فهو فی علمه قبل ان یصنعه و لیس شیء یبدو له الا و قد کان فی علمه، ان اللّٰه لا یبدو له من جهل۔ [2]	وہ امر جس کا اللہ ارادہ فرماتا ہے، اس ارادے کی بجا آوری سے پہلے اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ اللہ کا کوئی نیا فیصلہ نہیں ہوتا مگر یہ کہ وہ پہلے ہی اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ اللہ کا کوئی نیا فیصلہ جہالت پر مبنی نہیں ہوتا۔

یہی مسئلہ بدا ہے جس کا ہم نے مقدمہ تفسیر میں ذرا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان اپنے اعمال کے ذریعے اپنی تقدیر بنا سکتا ہے: یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ ....

۲۔ کائنات میں آنے والی تبدیلیوں کا مرکزی مصدر اللہ کے پاس ہے: وَعِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ ....

وَ اِنۡ مَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ ﴿۴۰﴾	۴۰۔ اور جو وعدے ہم ان سے کر رہے ہیں خواہ ان کا کچھ حصہ ہم آپ کو (زندگی میں) دکھا دیں یا ہم آپ کو اٹھا لیں بہر حال آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچانا اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔

---

[1] ابن ماجه باب القدر ۱:۳۴۔ مستدرك حاکم۔ ذہبی نے اس پر اختلافی نوٹ نہیں لکھا۔ مسند احمد ۵: ۲۷۷

[2] تفسیر العیاشی ۲: ۲۱۸۔ المیزان ۱۱: ۳۸۱

تفسیر آیات

اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب میں کفار کو دھمکی دی جا رہی ہے کہ جس عذاب اور ذلت وخواری سے تم دوچار ہونے والے ہو اس میں سے کچھ حصہ خود رسول کریم کی زندگی میں وہ دیکھ لیں یا رسول کریم کا اس سے پہلے وصال ہو جائے، بہرحال دعوت حق والے نتیجہ اللہ پر چھوڑتے ہیں اور دعوت کو صرف اللہ کے لیے بجا لاتے ہیں۔ اس لیے حضورؐ سے ارشاد ہو رہا ہے کہ آپ (ص) تبلیغ کر کے اتمام حجت کرتے جائیں۔ اس کے بعد انکار وکفر کی صورت میں حساب لینا ہمارا کام ہے۔ خواہ وہ حساب آپؐ کی زندگی میں لیں یا آپؐ کی زندگی کے بعد لیں۔

اہم نکات

۱۔ دعوت الی الحق دینے والے نتیجے کی تاخیر سے ناکامی کا احساس نہیں کرتے۔

۲۔ خالص تبلیغ ودعوت یہ ہے کہ نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا ؕ وَ اللّٰہُ یَحۡکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکۡمِہٖ ؕ وَ ہُوَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ کیا ان لوگوں کو نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کا رخ کرتے ہیں تو اس کو اطراف سے کم کرتے چلے آتے ہیں؟ اللہ حکم صادر فرماتا ہے اس کے حکم کو پس پشت ڈالنے والا کوئی نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔

تفسیر آیات

کفار بار بار تمسخر کے انداز میں حضورؐ سے کہتے تھے کہ جس عذاب کی دھمکیاں مدت سے دے رہے ہو، آخر وہ کب آئے گا۔ سابقہ اور یہ دونوں آیات، ایسے سوالات کا جواب ہیں کہ اس عذاب کے آثار تم دیکھتے نہیں ہو کہ جب ہم زمین کا رخ کرتے ہیں تو اہل زمین کے اشراف اور مقتدر لوگوں کو نابود کرتے ہیں:

بَلۡ مَتَّعۡنَا ہٰۤؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَہُمۡ حَتّٰی طَالَ عَلَیۡہِمُ الۡعُمُرُ ؕ اَفَلَا یَرَوۡنَ اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا ؕ اَفَہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ۔[1]

بلکہ ہم تو انہیں اور ان کے آبا کو سامان زیست دیتے رہے یہاں تک کہ ان پر عرصہ دراز گزر گیا تو کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم عرصہ زمین ہر طرف سے تنگ کر رہے ہیں؟ تو کیا (پھر بھی) یہ لوگ غالب آنے والے ہیں۔

----

[1] ۲۱ انبیاء: ۴۴

یہ دونوں آیات مکی ہونے کی وجہ سے وہ تفسیر درست نہیں ہے کہ نقص الارض سے مراد فتوحات لیا جائے بلکہ نقص الارض سے مراد اہل ارض ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دوسری آیت کا سیاق یہی ہے کہ لمبی عمر اور عرصہ دراز گزرنے کے بعد ان کو نابود کر دیا گیا۔ منقول ہے کہ عالم کی موت زمین کی خسارت ہے۔ اسی طرح کافروں کے مقتدر لوگوں کی موت سے ان کے لیے زمین کا عرصۂ زمین تنگ ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے تکوینی حکم کی نافرمانی نہیں ہو سکتی: لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ....

۲۔ اہل ارض خواہ کتنے ہی سرکش کیوں نہ ہوں وہ حکم خدا سے نابود ہو جاتے ہیں۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۭ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اور بے شک ان سے پہلے والوں نے بھی مکاریاں کی ہیں لیکن تمام تر تدبیریں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، وہ ہر نفس کے عمل سے باخبر ہے اور کافروں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ عاقبت کا مسکن کس کے لیے ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: انسانی تاریخ میں لوگوں نے تمام انبیاء (ع) کے ساتھ مختلف چالیں چلیں۔ ان کے مکر و حیلہ اکارت رہ گئے۔

۲۔ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا: ان کے مقابلے میں اللہ کی تدبیریں ہمیشہ کارگر ثابت ہوتی رہی ہیں کیونکہ وہ اپنی مکاریاں، جہالت اور تاریکی میں کرتے رہے۔ اللہ تو ہر نفس کے عمل سے باخبر ہے۔ لہٰذا تمام تر تدبیریں اللہ کے پاس ہیں جو ہر نفس کے ہر قدم سے آگاہ ہے۔ لہٰذا تمام تر کامیاب تدبیریں اللہ کے پاس ہیں۔ ۳۰۸

اہم نکات

۱۔ علم کے ساتھ تدبیر کامیاب ہوتی ہے: فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ....

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ اور کافر کہتے ہیں: آپ رسول نہیں ہیں کہہ دیجیے: میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے اللہ اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے کافی ہیں۔

تفسیر آیات

جب کفار کا یہ مطالبہ کہ قرآن کے علاوہ کوئی معجزہ لے آؤ، مسترد ہو گیا تو انہوں نے کہا: پھر تو آپؐ پیغمبر نہیں ہیں۔ جواب میں قرآن کے معجزہ اور کلام الٰہی ہونے کی بنا پر فرمایا: گواہ کے لیے اللہ کافی ہے جس نے اپنے اعجازی کلام میں میری رسالت کی گواہی دی ہے اور وہ ذات بھی کافی ہے جس کے پاس علم الکتاب، قرآن کا علم ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ سے مراد عبد اللہ بن سلام ہے جب کہ عبد اللہ بن سلام نے ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلام قبول کیا ہے اور یہ سورہ مکی ہے۔ کچھ حضرات کو اس بات میں دلچسپی ہے کہ اس سے مراد عبداللہ بن سلام ہی ہو اور آیت مدنی ہو۔ یہی موقف جب ہم بہت سی آیات کے بارے میں اختیار کرتے ہیں جو اہل بیت علیہم السلام کی شان میں مکی سورتوں میں نازل ہوئی ہیں تو مخالفین یہ کہہ کر رد کرتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے اور واقعہ مدنی ہے۔

شیعہ سنی مصادر حدیث میں متعدد طرق سے یہ روایت ثابت ہے کہ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

مزید تحقیق کے لیے رجوع ہو: شواهد التنزیل حسکانی۔ مناقب امام علی، مغازلی۔ تفسیر الکشف والبیان ثعلبی، شافعی۔ ابن البطریق کی کتاب العمدۃ احقاق الحق ۳: ۲۸۰۔

آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں محمد بن الحنفیہ اور حضرت امام باقر علیہ السلام کی اس روایت کا ذکر کرتے ہیں کہ اس آیت میں وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ سے مراد علیؑ ہیں۔ پھر کہتے ہیں:

> مجھے اپنی زندگی کی قسم ہے کہ علی کے پاس علم الکتاب مکمل طور پر ہے لیکن اس آیت سے مراد علی نہیں ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا، نقل احادیث میں امانت کی جگہ ذاتی رجحانات کو کتنا دخل ہے۔

وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہونے پر درج ذیل راوی متفق ہیں:

i۔ ابو سعید خدری۔ ملاحظہ ہو شواهد التنزیل ذیل آیت۔

ii۔ ابن عباس۔ ان سے ابو صالح روایت کرتے ہیں۔ ابو صالح کہتے تھے:

> یہ آیت قریش کی ایک شخصیت کی شان میں نازل ہوئی ہے اور وہ علی بن ابی طالب ہیں۔ مگر ہم ان کا نام نہیں لیتے۔ ملاحظہ ہو شواهد التنزیل ۱: ۴۰۷

iii۔ ابن الحنفیۃ۔ ملاحظہ ہو شواهد التنزیل۔ خصائص الوحی المبین۔ حاشیہ شواهد الکشف و البیان ۵: ۳۰۳۔ تفسیر قرطبی زاد المسیر ابن جوزی ۲: ۵۰۲۔

iv۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام۔ ملاحظہ ہو الکشف والبیان ثعلبی ۵: ۳۰۳۔ تفسیر قرطبی ذیل آیہ۔

اہم نکات

۱۔ علم ہی رسالت کی حقانیت کی گواہی کا ذریعہ ہے۔ وَمَنۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ الۡکِتٰبِ

سُورَۃ اِبرٰاھِیم

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکی زندگی کے آخری دنوں میں نازل ہوا ہوگا چونکہ یہ سورہ بھی باقی مکی سورتوں کی طرح اصول عقائد پر زیادہ زور دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ بھی ان دنوں نازل ہو رہا تھا جب کفار قریش کی طرف سے ظلم انتہا کو پہنچ گیا تھا کیونکہ اس سورہ میں ان مشکلات کا ذکر ہے جو انبیاء علیہم السلام کو پیش آئیں۔

وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِرُسُلِہِمۡ لَنُخۡرِجَنَّکُمۡ مِّنۡ اَرۡضِنَاۤ ....[1]

اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا: ہم تمہیں اپنی سرزمین سے ضرور نکال دیں گے۔

اور انبیاء کو جو فتح و نصرت کی نوید سنائی گئی تھی اس کا ذکر ہے۔

فَاَوۡحٰۤی اِلَیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ لَنُہۡلِکَنَّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿ۙ﴾ وَلَنُسۡکِنَنَّکُمُ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ..[2]

ان کے رب نے ان پر وحی کی کہ ہم ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد اس سرزمین میں ہم ضرور تمہیں آباد کریں گے۔

اسی سورہ میں سرکشوں کے برے انجام اور انبیاء کی فتح و نصرت اور کامیابی کا ذکر ہے۔

وَاسۡتَفۡتَحُوۡا وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ ﴿ۙ﴾[3]

اور انبیاء نے فتح و نصرت مانگی تو ہر سرکش دشمن نامراد ہو کر رہ گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات میں انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کے ضمن میں اللہ کی سنت اور اس کا طریقہ عمل بیان فرمایا جا رہا ہے کہ مشکل ترین مراحل سے گزرنے کے بعد ہی اللہ کی طرف سے فتح و نصرت ملتی ہے۔

---

[1] ۱۴ ابراھیم: ۱۳ [2] ۱۴ ابراھیم: ۱۳۔۱۴ [3] ۱۴ ابراھیم: ۱۵

خالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ اِلَیۡکَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۬ۙ بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ۙ﴿۱﴾
اللّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ وَیۡلٌ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِ ۙ﴿۲﴾
الَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَۃِ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ یَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۳﴾

بنام خدائے رحمن رحیم

۱۔ الف لام را، یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کو ان کے رب کے اذن سے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں، غالب آنے والے قابل ستائش اللہ کے راستے کی طرف۔

۲۔ جس اللہ کی ملکیت میں آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات ہیں اور کافروں کے لیے عذاب شدید کی تباہی ہے۔

۳۔ جو آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی سے محبت کرتے ہیں اور راہ خدا سے روکتے ہیں اور اس میں انحراف لانا چاہتے ہیں یہ لوگ گمراہی میں دور تک چلے گئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ: قرآن ضلالت کی تاریکیوں سے ہدایت کے نور کی طرف لے جانے والی کتاب ہے۔ وہ نور خدائے ذوالجلال کا راستہ ہے جس سے ابدی منزل تک پہنچنے کا راستہ نظر آتا ہے۔

۲۔ اللّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ: اس ابدی راستے کے ذریعے اس خدائے ذوالجلال کی بارگاہ میں بازیابی ہو گی جو کل کائنات کا مالک ہے۔ دنیاوی علوم جو محدود راہنمائی کا باعث ہیں، انہیں لوگ روشنی کہتے ہیں اور صاحبان اقتدار جو محدود سلطنت پر متمکن ہوتے ہیں، ان تک پہنچنے کا ذریعہ جو بھی ہو گا اسے لوگ اہمیت دیتے ہیں۔

اس قرآن کی کتنی اہمیت ہونی چاہیے جو ابدی راستے کے لیے نور کا کام دے اور کل کائنات کے مالک کے دربار تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

۳۔ اَلَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ: اس کے مقابلے میں کافر، جو ظلمت اور تاریکی میں ہیں وہ ان ہی دنیاوی مفادات کو عزیز سمجھتے ہیں اور راہ خدا میں رکاوٹیں ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ یقیناً گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ واضح رہے دنیاوی مفادات، جب آخرت کے ساتھ متصادم ہوں تو اس وقت آخرت کو چھوڑ کر دنیاوی مفادات کو اختیار کرنا گمراہی ہے لیکن اگر متصادم نہ ہوں تو دنیا کی زندگی کے لوازم حلال ذرائع سے فراہم کرنا عبادت ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن ظلمتوں کے خلاف ایک نور ہے۔

۲۔ قرآن مالک ارض و سما تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِہٖ لِیُبَیِّنَ لَہُمۡ ؕ فَیُضِلُّ اللّٰہُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۴﴾

۴۔ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی قوم کی زبان میں تاکہ وہ انہیں وضاحت سے بات سمجھا سکے پھر اس کے بعد اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہی بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ: اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث فرماتا ہے تو سامان ہدایت میں کسی قسم کا ابہام اور اتمام حجت میں کسی قسم کا نقص نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا: ہم نے تمام رسولوں کو انہی کی قوم کی زبان میں بھیجا ہے تاکہ وضاحت سے بات سمجھا سکیں اور ہدایت کی زبان میں کسی قسم کی پیچیدگی اور ابہام نہ رہے۔

رسول اسلامؐ اگرچہ صرف عرب کی طرف نہیں بھیجا گئے لیکن اللہ نے اپنی رسالت کے لیے عرب قوم کو مخاطب اول قرار دیا تاکہ اللہ کا پیغام پوری وضاحت کے ساتھ عالمین تک پہنچ جائے۔ عرب قوم ایک بدو قوم تھی۔ یہاں کوئی تمدن تھا نہ کوئی علمی ماحول، نہ جزیرۃ العرب کبھی بھی علمی مرکز رہ چکا تھا۔ صرف عربی زبان میں قوت بیان اور فصاحت و بلاغت تھی۔ اسی لیے احکام و شریعت کے بیان اور انسان کو دائمی دستور دینے کے لیے قدرت نے اسی زبان سے کام لیا تاکہ یہ پیغام بڑی وضاحت کے ساتھ تمام انسانوں تک پہنچ سکے۔

۲۔ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ يَّشَآءُ : آسان اور سہل طریقے سے راہ راست دکھانے کے بعد جو لوگ طالب ہدایت ہیں ان کے لیے اللہ ہدایت کے راستے کھول دیتا ہے اور جو لوگ اپنے باطل پر ڈٹ جاتے ہیں ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ نتیجتاً وہ گمراہی میں چلے جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء اپنے پیغام کو سادہ مقامی زبان میں پہنچاتے رہے: بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ ....

۲۔ بیان احکام میں عام فہمی کو اہمیت حاصل ہے: لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ ....

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰيٰتِنَاۤ اَنۡ اَخۡرِجۡ قَوۡمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۙ وَذَكِّرۡهُمۡ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ ﴿۵﴾

۵۔ اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا (اور حکم دیا) کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ اور انہیں ایام خدا یاد دلاؤ، ہر صبر و شکر کرنے والے کے لیے یقیناً ان میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی : انبیاء علیہم السلام کی مسئولیت کی یکسانی کی طرف اشارہ ملتا ہے اور وہ اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جانا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملتا ہے کہ (اپنی قوم کو) اندھیروں سے نکالیں اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ملتا ہے: (لوگوں کو) اندھیروں سے نکالیں۔

۳۱۷

۲۔ وَذَكِّرۡهُمۡ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ : ایام اللّٰہ سے مراد تاریخ انسانیت کے وہ ایام ہو سکتے ہیں جن میں انسان کے لیے درسہائے عبرت، صبر و شکر کے مواقع موجود ہیں۔ مثلاً بنی اسرائیل کی فرعون کی غلامی اور اس کے ظلم و ستم کے ایام، صبر و تحمل کے ایام ہیں اور فرعون سے نجات، کشتی نوح کے ذریعے نجات، آتش نمرود سے نجات کے ایام، شکر کے ایام ہیں۔

۳۔ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ : ان ایام میں ایسی نشانیاں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات، مکافات کے ایک جامع قانون کے تحت رونما ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک شعور و ارادہ حاکم ہے اور وہ ارادہ، مشیت الٰہی ہے۔ اسی لیے ان نشانیوں کا ادراک صبر و شکر کرنے والے ہی کر سکتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ تاریخ میں اللہ کی نشانیاں موجود ہیں: اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ....

۲۔ تاریخ انسانی میں درسہائے عبرت موجود ہیں: اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ ...۔

۳۔ صبر اور شکر سے آیات الٰہی کا ادراک ہوتا ہے: لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ۔

وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہِ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ اَنۡجٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ وَ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ وَ فِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ ۪﴿۶﴾

۶۔ اور (یاد کیجیے) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ نے تمہیں جس نعمت سے نوازا ہے اسے یاد کرو جب اس نے تمہیں فرعونیوں سے نجات بخشی، وہ تمہیں بدترین عذاب دیتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑا امتحان تھا۔

تفسیر آیات

اس آیت میں ایام اللہ کا ذکر آیا ہے۔ فرعونیوں کی طرف سے ہونے والے مظالم اور ان سے خلاصی کے ایام کا۔ آیت کی مزید تشریح سورہ بقرہ آیت ۴۹ میں ملاحظہ فرمائیں۔

وَ اِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّکُمۡ لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ وَ لَئِنۡ کَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِیۡ لَشَدِیۡدٌ ﴿۷﴾

۷۔ اور (اے مسلمانو! یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے خبردار کیا کہ اگر تم شکر کرو تو میں تمہیں ضرور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو تو میرا عذاب یقیناً سخت ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ: شکر کی صورت میں زیادہ کے وعدہ میں لام اور نون کے ساتھ تاکید فرمائی ہیں۔ اس تاکید سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ شکر کی صورت میں اضافہ و فزونی اللہ کا ایک لازمی قانون ہے جو خود اپنی جگہ ایک رحمت ہے۔

جب کہ ناشکری کی صورت میں عذاب کے لیے تاکیدی تعبیر اختیار نہیں فرمائی۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ کفران نعمت کی صورت میں عذاب ایک لازمی قانون نہیں ہے۔ یہاں عفو اور درگزر کے لیے گنجائش موجود ہے۔ البتہ عذاب کے شدید ہونے پر تاکید ہے لیکن عذاب کرنے کی تاکید نہیں ہے۔ جیسے لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ فرمایا ہے، لاعذبنکم نہیں فرمایا۔ چنانچہ فرمایا:

وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ۝ [1]

اور تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتی ہے اور وہ بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔

۲۔ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ: نعمتوں پر شکر کرنا، مستقیم الفکر، متوازن سوچ اور اعلیٰ قدروں کا مالک ہونے کی دلیل ہے۔ ایسی صورت میں نعمتوں کی قدر دانی ہوتی ہے۔ قدر دانی، فراوانی وفزونی نعمت اور ناقدری، ضیاع نعمت کا باعث ہوتی ہے۔

۳۔ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ: شکر اور قدر دانی کی صورت میں فزونی نعمت کا ذکر فرمایا لیکن ناشکری اور ناقدری کی صورت میں زوال نعمت کا نہیں، عذاب کا ذکر ہے۔ ممکن ہے یہ عذاب زوال نعمت کی صورت میں ہو اور ممکن ہے یہ عذاب اخروی ہو۔ دنیا میں ناشکروں کو مہلت دی جاتی ہے کہ فزونی عذاب کا باعث بنے اور بہت سی نعمتیں عذاب کا باعث بنتی ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

شُكْرُ النِّعْمَةِ اجْتِنَابُ الْمَحَارِمِ وَ تَمَامُ الشُّكْرِ قَوْلُ الرَّجُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. [2]

حرام چیزوں سے اجتناب ہی نعمت کا شکر ہے اور شکر اس وقت پورا ہو جاتا جب کوئی شخص یہ کہہ دے: الحمد للّٰہ رب العالمین۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت ہے:

اَشْكَرُكُمْ لِلّٰهِ اَشْكَرُكُمْ لِلنَّاسِ. [3]

تم میں اللہ کا زیادہ شکر کرنے والا وہ ہے جو لوگوں کا زیادہ شکر گزار ہے۔

اہم نکات

۱۔ شکر گزاری اور قدر دانی باعث فراوانی ہے۔

۲۔ نافرمانی ناشکری ہے۔

وَقَالَ مُوۡسٰۤى اِنۡ تَكۡفُرُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ حَمِيۡدٌ ۝۸

۸۔ اور موسیٰ نے کہا: اگر تم اور زمین میں بسنے والے سب ناشکری کریں تو بھی اللہ یقیناً بے نیاز، لائق حمد ہے۔

---

[1] ۴۲ شوری: ۳۰ [2] الکافی ۲: ۹۵ [3] الکافی ۲: ۹۹ باب الشکر

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس نکتے سے بھی آگاہ کیا کہ اللہ تمہارے شکر کا محتاج نہیں ہے۔ شکر کا فائدہ اللہ کو نہیں خود تمہیں پہنچتا ہے اور ناشکری سے اللہ کو نہیں، خود تمہیں ضرر پہنچ جاتا ہے۔ اللہ ہر صورت میں قابل حمد وستائش ہے، خواہ تم اس کی حمد کرو یا نہ کرو:

وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ ...[1] اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو۔

اہم نکات

۱۔ شکر و ناشکری کے اثرات محتاج انسان پر مترتب ہوتے ہیں۔

اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ ۬ؕ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ؕ لَا یَعۡلَمُہُمۡ اِلَّا اللّٰہُ ؕ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَرَدُّوۡۤا اَیۡدِیَہُمۡ فِیۡۤ اَفۡوَاہِہِمۡ وَ قَالُوۡۤا اِنَّا کَفَرۡنَا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِہٖ وَ اِنَّا لَفِیۡ شَکٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَنَاۤ اِلَیۡہِ مُرِیۡبٍ ﴿۹﴾

۹۔ کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں (مثلاً) نوح، عاد اور ثمود کی قوم اور جو ان کے بعد آئے جن کا علم صرف اللہ کے پاس ہے؟ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ ان کے منہ پر رکھ دیے اور کہنے لگے: ہم تو اس رسالت کے منکر ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو اور جس چیز کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو اس میں ہم شبہ انگیز شک میں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا: بظاہر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ کلام جاری ہے اور اپنی قوم سے ایام اللہ کا تفصیلی ذکر فرما رہے ہیں۔ اور نوح، عاد اور ثمود کی قوم کا ذکر بعنوان مثال آیا ہے۔

۲۔ لَا یَعۡلَمُہُمۡ اِلَّا اللّٰہُ: جن کی تاریخ کا تفصیلی علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اللہ کے علاوہ ان قوموں کی تاریخ حیات کا کوئی واقف نہیں ہے اور ہم ہی وحی کے ذریعے اپنے رسول (ص) کو بیان کر رہے ہیں اور یہ قرآن کے وحی ہونے کی ایک واضح دلیل ہے۔

۳۔ فَرَدُّوۡۤا اَیۡدِیَہُمۡ فِیۡۤ اَفۡوَاہِہِمۡ: لوگوں نے اپنے پیغمبران علیہم السلام کی دعوت کا اس طرح مقابلہ

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۴۴

کیا کہ انبیاء علیہم السلام کو آزادی سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں دیتے تھے۔ اَیۡدِیَهُمۡ کی ضمیر کفار کی طرف اور اَفۡوَاهِهِمۡ کی ضمیر انبیاء علیہم السلام کی طرف لوٹنا مناسب اور سیاق کلام کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ یعنی کفار اپنے ہاتھ انبیاء کے دہن پر رکھتے اور بات کرنے نہ دیتے تھے۔ بعض مفسرین دونوں ضمیروں کے انبیاء علیہم السلام کی طرف رجوع کے قائل ہیں۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے: وہ لوگ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں کو انبیاء کے منہ میں دیتے تھے۔ یعنی بات کرنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ تاریخ اقوام کے بارے میں انسانی معلومات نہایت محدود ہیں: لَا یَعۡلَمُهُمۡ اِلَّا اللّٰهُ ....۔

۲۔ کفار انبیاء علیہم السلام کی اہانت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے: فَرَدُّوۡۤا اَیۡدِیَهُمۡ فِیۡۤ اَفۡوَاهِهِمۡ ....۔

قَالَتۡ رُسُلُهُمۡ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ یَدۡعُوۡکُمۡ لِیَغۡفِرَ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُؤَخِّرَکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ قَالُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ؕ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَصُدُّوۡنَا عَمَّا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاۡتُوۡنَا بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ ان کے رسولوں نے کہا: کیا (تمہیں) اس اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے؟ وہ تمہیں اس لیے دعوت دیتا ہے تاکہ تمہارے گناہ بخش دے اور ایک معین مدت تک تمہیں مہلت دے، وہ کہنے لگے: تم تو ہم جیسے بشر ہو تم ہمیں ان معبودوں سے روکنا چاہتے ہو جن کی ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے، پس اگر کوئی کھلی دلیل ہے تو ہمارے پاس لے آؤ۔

تشریح کلمات

فَاطِرِ: (ف ط ر) اس کے اصل معنی کسی چیز کو طول میں پھاڑنے کے ہیں۔ جوہری نے صحاح میں کہا ہے۔ والفطر الابتداء والاختراع۔ الفطر ابتدا اور ایجاد کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر حضرت ابن عباس کا یہ قول نقل کرتے ہیں: میں فاطر السموات کے معنی نہیں سمجھتا تھا کہ دو بدو کنویں کا نزاع لے کر میرے پاس آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا: انا فطرتھا۔ ابتدا میں نے کی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَتۡ رُسُلُهُمۡ: تقریباً ہر نبی کو ان مشرکین سے واسطہ پڑتا تھا جو اللہ کے وجود کو مانتے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ وہی آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔

۲۔ اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ: اس آیت میں موجد عالم کی وحدت سے معبود کی وحدت پر استدلال کیا گیا ہے کہ سینہ عدم کو چیر کر اس کائنات کا ایجاد کرنے والا اللہ ہے تو کیا اسی ذات کے قابل پرستش ہونے میں شک کرنے کی کوئی گنجائش ہے؟

آیت کا اخیری جملہ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَصُدُّوۡنَا عَمَّا .... دلیل ہے کہ اس آیت کے مخاطبین مشرکین تھے جو اللہ کے موجد کائنات ہونے کے قائل تھے۔

۳۔ یَدۡعُوۡکُمۡ لِیَغۡفِرَ لَکُمۡ: دعوت انبیاء (ع) درحقیقت اللہ کی رحمت کی طرف دعوت ہے۔ یَدۡعُوۡکُمۡ لِیَغۡفِرَ لَکُمۡ وہ تمہیں اس لیے دعوت دیتا ہے تا کہ وہ تمہارے گناہ بخش دے اور انبیاء علیہم السلام اس رحمت حق کے لیے وسیلہ ہیں۔

۴۔ وَ یُؤَخِّرَکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ: نیک عمل سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ وَ یُؤَخِّرَکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی اجل مسمی حتمی اور اجل غیر مسمی غیر حتمی کے بارے میں ہم نے سورہ انعام آیت ۳ میں تشریح کی ہے۔ آیت یہ بتانا چاہتی ہے کہ اگر تم نے اس تقدیر ساز دعوت پر لبیک کہہ دی تو تم کو حتمی اجل تک زندگی دی جائے گی۔ دوسری صورت میں قبل از وقت ہلاکت آ سکتی ہے اور بداء یہی ہے جس کے تمام مفسرین قائل ہیں۔

چنانچہ صاحب تفہیم القرآن بداء کی غیر شعوری طور پر تعریف کرتے ہیں:

> اللہ کے ہاں مدت کا تعین قوموں کے اوصاف کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ ایک اچھی قوم اگر اپنے اندر بگاڑ پیدا کرے تو اس کی مہلت عمل گھٹا دی جاتی ہے اور اسے تباہ کر دیا جاتا ہے اور ایک بگڑی ہوئی قوم اگر اپنے برے اوصاف کو اچھے اوصاف میں بدل لے تو اس کی مہلت عمل بڑھا دی جاتی ہے۔[۱]

اہم نکات

۱۔ اللہ کی وحدانیت ناقابل تشکیک ہے۔

۲۔ دعوت انبیاء مغفرت کے لیے ہے۔

۳۔ اطاعت سے زندگی لمبی ہو جاتی ہے۔

---

[۱] تفہیم القرآن ۲: ۴۷۶

قَالَتۡ لَہُمۡ رُسُلُہُمۡ اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَمُنُّ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ ؕ وَ مَا کَانَ لَنَاۤ اَنۡ نَّاۡتِیَکُمۡ بِسُلۡطٰنٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا: بے شک ہم تم جیسے بشر ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم تمہارے سامنے کوئی دلیل (معجزہ) اذن خدا کے بغیر پیش کریں اور مومنوں کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَتۡ لَہُمۡ رُسُلُہُمۡ: مشرکین انسان کو رسالت اور اللہ کی طرف سے نمائندہ ہونے کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہم جیسا بشر اللہ کا نمائندہ نہیں ہوسکتا۔ جو شخص ہماری طرح کھانے پینے کا محتاج ہو وہ اللہ کی طرف سے رسول نہیں ہوسکتا۔

۲۔ اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ: جواب میں انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں کہ ہم تمہاری طرح نظر آنے والے وجود، انسان ہیں اور انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے کہ ہمارا وجود تم کو نظر آتا ہے، اس نظر آنے میں تم جیسے ہیں۔

۳۔ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَمُنُّ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ: لیکن اس بات میں تم جیسے نہیں ہیں کہ اللہ کے ایک خاص احسان کے ہم لائق ہیں۔ ہمارے جس وجود پر اللہ کا احسان ہوتا ہے وہ تم جیسا نہیں ہے۔

۴۔ وَ مَا کَانَ لَنَاۤ: یہ نہیں فرمایا کہ ہم معجزہ نہیں دکھا سکتے بلکہ فرمایا: اس کا تعلق بھی ارادہ رب سے ہے۔ لہٰذا اسی پر توکل کرنا چاہیے۔

ہم نے پہلے بھی اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انبیاء علیہم السلام کو معجزات کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے مطالبے پر معجزات نہیں دکھائے جاتے چونکہ پہلے معجزے سے حجت پوری ہو چکی ہے۔

اہم نکات

۱۔ احسان الٰہی کے اہل ہونے سے رسول عام بشر سے ممتاز ہو جاتے ہیں: یَمُنُّ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ ....

۲۔ معجزہ باذن خدا ہوتا ہے: اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ....

وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَیْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور ہم اللہ پر توکل کیوں نہ کریں جب کہ اس نے ہمارے راستے ہمیں دکھا دیے ہیں، (منکرو) جو اذیتیں تم ہمیں دے رہے ہو اس پر ہم ضرور صبر کریں گے اور توکل کرنے والوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ: ہم توکل اور بھروسہ اس ذات پر کیوں نہ کریں جس نے ہم کو حق کا راستہ دکھایا ہے۔ ہمیں جب یقین ہے کہ اللہ ہمیں نجات اور ابدی سعادت کی طرف لے جاتا ہے تو ہم اطمینان سے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بھروسہ اور توکل اس وقت نہیں ہوتا جب انسان کو یقین نہ ہو، تردد اور شک کا شکار ہو۔

۲۔ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَیْتُمُوْنَا: حق کی معرفت کے بعد اس کا عاشق اس کی راہ میں صبر و تحمل کرتا ہے، خواہ اس راہ میں جتنی بھی اذیت برداشت کرنا اور اس کی قیمت کچھ بھی ادا کرنی پڑے۔

اہم نکات

۱۔ حق کی ہدایت کے بعد بھروسہ اور صبر ایک لازمی امر ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا: ہم تمہیں اپنی سرزمین سے ضرور نکال دیں گے یا بہرصورت تمہیں ہمارے دین میں واپس آنا ہو گا، اس وقت ان کے رب نے ان پر وحی کی کہ ہم ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے۔

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور ان کے بعد اس سرزمین میں ہم ضرور تمہیں آباد کریں گے، یہ (خوشخبری) اس کے لیے ہے جو میرے حضور کھڑے ہونے (کے دن) سے ڈرتا ہو اور اسے میرے وعدہ عذاب کا خوف بھی ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: مشرکین جب انبیاء علیہم السلام کے منطقی مقابلے سے عاجز آ گئے تو طاقت

کی منطق استعمال کرنے لگ گئے۔ اس سے انسان ہمیشہ سے قائم معرکہ حق و باطل کا جائزہ لے سکتا ہے کہ اہل باطل ہمیشہ دینداروں کو اپنے وطن سے بے وطن کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں اور اہل حق کمزور اور ہر مادی طاقت سے محروم ہوتے ہیں۔ اہل حق کی طاقت اور اسلحہ، صبر اور اللہ کی بے پایان طاقت پر بھروسہ کرنا ہے۔ باطل، حق کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہے کہ حق، باطل کے رنگ میں رنگ جائے: اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِیۡ مِلَّتِنَا ....

۲۔ لَنُہۡلِکَنَّ الظّٰلِمِیۡنَ: جب معرکہ حق و باطل اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، آزمائش کی کڑی سے کڑی منزل طے ہو جاتی ہے اور وہ اس قدر مصائب و آلام میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وقت کا رسول اور اس کے اہل ایمان ساتھی چیخ اٹھتے ہیں: مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ..[۱] آخر اللہ کی نصرت کب آئے گی؟

اس وقت فتح و نصرت کی نوید سنا دی جاتی ہے: لَنُہۡلِکَنَّ الظّٰلِمِیۡنَ۔ ہم ان ظالموں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ ظالموں کی ہلاکت کے اس وعدے کو پوری تاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

۳۔ وَلَنُسۡکِنَنَّکُمُ الۡاَرۡضَ: ہم اس سرزمین میں تمہیں آباد کریں گے۔ کفار جس سرزمین سے انبیاء علیہم السلام کو بے دخل کرنا چاہتے تھے، اللہ ان کافروں کو ہلاکت میں ڈال کر اس سرزمین پر انبیاء علیہم السلام کو آباد فرمائے گا۔

۴۔ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَافَ مَقَامِیۡ: تباہ شدہ ظالموں کی جگہ اللہ ان لوگوں کو آباد کرے گا جو مقام خدا کا خوف رکھتے ہوں۔

اہم نکات

۱۔ آخر میں فتح ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی رہی ہے: لَنُہۡلِکَنَّ الظّٰلِمِیۡنَ ....

۲۔ خوف خدا، فتح و نصرت کے عوامل میں سے ہے: ذٰلِکَ لِمَنۡ خَافَ ....

۳۔ ظالم کی شکست یقینی ہے: لَنُہۡلِکَنَّ الظّٰلِمِیۡنَ ....

وَ اسۡتَفۡتَحُوۡا وَ خَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اور انبیاء نے فتح و نصرت مانگی تو ہر سرکش دشمن نامراد ہو کر رہ گیا۔

مِّنۡ وَّرَآئِہٖ جَہَنَّمُ وَ یُسۡقٰی مِنۡ مَّآءٍ صَدِیۡدٍ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اس کے بعد جہنم ہے اور وہاں اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔

----

[۱] ۲ بقرة: ۲۱۴

يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَأْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ جسے وہ گھونٹ گھونٹ پیئے گا مگر وہ اسے نہایت ناگوار گزرے گا، اسے ہر طرف سے موت آئے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور اس کے پیچھے (مزید) سنگین عذاب ہوگا۔

تشریح کلمات

صَدِيْدٍ: (ص د د) پیپ کو کہتے ہیں۔

يُسِيْغُهٗ: (س و غ) ساغ خوشگوار۔ سائغاً للشاربین۔ پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے۔ لا یکاد یسیغہ گلے سے اتار نہ سکے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ: انبیاء نے اللہ سے فتح و نصرت مانگی:

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ ...[1] اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان برحق فیصلہ کر....

تو اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور انبیاء (ع) کے مقابلے میں آنے والے ہر سرکش کو نامراد کر دیا۔ وہ انبیاء (ع) کو شکست دینا چاہتے تھے، اس میں وہ نامراد ہو گئے۔

۲۔ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ: اس کے بعد یعنی دنیا کی نامرادی اور ذلت کے بعد عذاب جہنم ہے۔ آتش میں پیاس کی بڑی شدت ہو گی تو پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ وہ اسے مائع دیکھ کر پیئے گا مگر اس کی پیاس بجھنے کی بجائے اور بڑھ جائے گی۔

۳۔ يَّتَجَرَّعُهٗ: وہ اس پیپ کے پانی کو گھونٹ گھونٹ پیئے گا مگر یہ پانی اس کے لیے گوارا اور پیاس بجھانے والا نہ ہو گا۔

۴۔ وَيَأْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ: اس کے گرد و پیش میں موجود تمام چیزیں موت کے لیے کافی ہوں گی مگر اس کے باوجود وہ نہیں مرے گا۔

۵۔ یہ آیات مکہ میں اس وقت نازل ہو رہی ہیں جب رسول اسلام (ص) اور آپؐ پر ایمان لانے والے نہایت بے بسی میں مشرکین مکہ کی طرف سے اذیتیں برداشت کر رہے تھے۔ ان میں مسلمانوں کو تاریخ انبیاء اور سنت الٰہی کی روشنی میں یہ نوید سنائی جا رہی ہے کہ مکہ کے مشرکین خواہ کتنے جبار ہوں، نامراد رہیں گے

----

[1] ۷ اعراف: ۸۹

گے اور کامیابی مسلمانوں کی ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ ظلم جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے، انبیاء کی دعا قبول ہو جاتی ہے: وَاسۡتَفۡتَحُوۡا....

۲۔ جہنم سرکشوں کا ٹھکانا ہے۔

مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ اَعۡمَالُہُمۡ کَرَمَادِ ۣاشۡتَدَّتۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ یَوۡمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقۡدِرُوۡنَ مِمَّا کَسَبُوۡا عَلٰی شَیۡءٍ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِیۡدُ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ جن لوگوں نے اپنے رب کا انکار کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے آندھی کے دن تیز ہوا نے اڑا دیا ہو، وہ اپنے اعمال کا کچھ بھی (پھل) حاصل نہ کر سکیں گے، یہی تو بہت گہری گمراہی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: یہ مسلمہ امر ہے کہ کسی بندے کا عمل نیک ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ خود بندہ نیک ہو۔ بندے کے نیک ہونے میں جو درجہ ہوتا ہے اس کے مطابق اس کے عمل کو درجہ ملتا ہے۔ چنانچہ رکوع کی حالت میں دی گئی انگوٹھی زیادہ قیمتی نہ تھی کہ آیت ولایت نازل ہو جاتی بلکہ انگوٹھی دینے والی ہستی کا انگوٹھی دینے کا محرک اور خود اس کا درجہ ایمان قیمتی تھا۔ اس بیان سے واضح ہو گیا کہ کافر کا عمل نیک کیوں نہیں ہوتا۔ کافر میں کوئی نیکی نہیں کہ اس کا عمل نیک ہو جائے۔ چنانچہ آیت میں اسی بات کی وضاحت کی گئی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان کے بغیر عمل کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ وَ یَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿ۙ۱۹﴾

۱۹۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے؟ اگر وہ چاہے تو تمہیں تباہ کر دے اور (تمہاری جگہ) نئی مخلوق لے آئے۔

وَّ مَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیۡزٍ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اور یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ: یہاں رؤیت قلبی مراد ہے۔ کیا تم نے نہیں سمجھا کہ آسمانوں اور زمین کا خلق کرنا عبث نہیں ہے۔ ایک امر واقع اور حق کے تحت خلق ہوئے ہیں۔ اگر یہ دنیا صرف ان کافروں جیسی مخلوقات میں منحصر ہوتی تو آسمانوں اور زمین کی خلقت بے مقصد ہوتی۔

۲۔ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ: آسمانوں اور زمین کی خلقت کی حقانیت اس بات کی متقاضی ہے کہ جو لوگ اس کائناتی فطرت کے تقاضوں کے مطابق نہیں چلتے وہ نابود ہو جائیں اور ان کی جگہ نئی مخلوق آ جائے۔

۳۔ وَّ مَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیۡزٍ: اللہ کے لیے تمام امور یکساں اور آسان ہیں۔ آسان اور مشکل ان لوگوں کے لیے ہے جنہیں کسی کام کی انجام دہی کے لیے اسباب و علل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارادہ کافی ہے۔ لہٰذا اللہ کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائناتی فطرت سے انحراف کرنے والوں کا انجام نابودی ہے: اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ ....

وَ بَرَزُوۡا لِلّٰہِ جَمِیۡعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُنَّا لَکُمۡ تَبَعًا فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا مِنۡ عَذَابِ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ قَالُوۡا لَوۡ ہَدٰىنَا اللّٰہُ لَہَدَیۡنٰکُمۡ ؕ سَوَآءٌ عَلَیۡنَاۤ اَجَزِعۡنَاۤ اَمۡ صَبَرۡنَا مَا لَنَا مِنۡ مَّحِیۡصٍ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور سب اللہ کے سامنے پیش ہوں گے تو کمزور لوگ ان لوگوں سے جو (دنیا میں) بڑے بنتے تھے کہیں گے: ہم تمہارے تابع تھے تو کیا تم اللہ کے عذاب کا کچھ حصہ ہم سے ہٹا سکتے ہو؟ وہ کہیں گے: اگر اللہ نے ہمارے لیے کوئی راستہ چھوڑ دیا ہوتا تو ہم تمہیں بھی بتا دیتے، ہمارے لیے یکساں ہے کہ ہم فریاد کریں یا صبر کریں ہمارے لیے فریاد کا کوئی راستہ نہیں۔

تشریح کلمات

بَرَزُوۡا: (ب ر ز) البراز کھلی جگہ میں چلے جانا۔ اسی سے صفوف جنگ سے آگے نکل کر مقابلہ کرنے کو مبازرہ کہتے ہیں۔

مَّحِیۡصٍ: (م ح ص) رہائی پانا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ بَرَزُوۡا لِلّٰہِ: بروز قیامت جب ظالم، مفاد پرست، ان کے پیروکار اور شیطان سب اللہ کے

حضور پیش ہوں گے تو حقائق سامنے آچکے ہوں گے۔ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کریں گے تو پیروکار اپنی دنیاوی عادت کے مطابق آخرت بھی انہی رؤساء کی طرف رجوع کریں گے اور دنیا میں ان کی پیروی کو ذریعہ نجات تصور کر کے کہیں گے:

۲۔ اِنَّا كُنَّا لَكُمۡ تَبَعًا: ہم تمہارے تابع تھے۔ کیا تم اللہ کے عذاب کا کچھ حصہ ہم سے ہٹا سکتے ہو؟ جب کہ یہ تابعیت اور اطاعت نہ صرف ذریعہ نجات نہیں ہے بلکہ ذریعہ ہلاکت ہے۔

۳۔ قَالُوۡا لَوۡ هَدٰىنَا اللّٰهُ: ان کے رؤسا جواب میں کہیں گے۔ یہاں کے عذاب سے خلاصی کا کوئی راستہ ہوتا یا اللہ نے خلاصی کا کوئی راستہ دکھا دیا ہوتا تو ہم تمہیں بھی وہ راستہ بتا دیتے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں سے چھٹنے کا راستہ نہ ہمارے پاس ہے، نہ تم کو بتا سکتے ہیں۔

۴۔ سَوَآءٌ عَلَيۡنَاۤ اَجَزِعۡنَاۤ اَمۡ صَبَرۡنَا: جب نجات کے سارے راستے بند ہوگئے اور کھلنے والے بھی نہیں ہیں تو بے صبری میں سر پیٹیں یا خاموش بیٹھے رہیں، یکساں ہے۔ صبر اور بے صبری یکساں ہیں۔

۵۔ دنیا میں یہ کمزور لوگ ہمیشہ طفیلی سوچ سوچتے تھے۔ وہ اپنے عقائد و افکار میں بھی آزاد نہ تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اپنے بڑوں کی پیروی کرتے رہے۔ جب کہ وہ مادی طور پر کمزور نہ تھے کہ مجبور ہوں بلکہ ان کی مادی کمزوری، فکری کمزوری کا نتیجہ تھی۔

اس آیت کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو دنیا میں اپنے مفادات کی خاطر لیڈروں، حاکموں اور تاجروں کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلتے، خلوص کے ساتھ لوگوں کی رہنمائی کرنے والوں سے نفرت اور دوری اختیار کرتے رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ بروز قیامت انسان صرف اس شخص سے رابطہ کر سکے گا جس کی پیروی میں رہا ہے۔

۲۔ اس دن پیروکار اپنے لیڈروں سے الجھتے رہیں گے۔

وَ قَالَ الشَّيۡطٰنُ لَمَّا قُضِىَ الۡاَمۡرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمۡ وَعۡدَ الۡحَـقِّ وَوَعَدۡتُّكُمۡ فَاَخۡلَفۡتُكُمۡ‌ؕ وَمَا كَانَ لِىَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُكُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِىۡ‌ۚ فَلَا

۲۲۔ اور (قیامت کے دن) جب فیصلہ ہو چکے گا تو شیطان کہہ اٹھے گا: اللہ نے تمہارے ساتھ یقیناً سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے وعدہ کیا پھر وعدہ خلافی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہیں چلتا تھا مگر یہ کہ میں نے تمہیں صرف دعوت دی اور تم نے میرا کہنا مان لیا پس اب تم مجھے ملامت نہ

تَلُوۡمُوۡنِیۡ وَ لُوۡمُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصۡرِخِکُمۡ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُصۡرِخِیَّ ؕ اِنِّیۡ کَفَرۡتُ بِمَاۤ اَشۡرَکۡتُمُوۡنِ مِنۡ قَبۡلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۲﴾

کرو بلکہ خود کو ملامت کرو (آج) نہ تو میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو، پہلے تم مجھے اللہ کا شریک بناتے تھے میں (اب) یقیناً اس سے بیزار ہوں، ظالموں کے لیے تو یقیناً دردناک عذاب ہے۔

تشریح کلمات

مصرخکم: (ص ر خ) الصارخ مدد طلب کرنے والے کو کہتے ہیں۔ المصرخ فریاد رسی کرنے والے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الشَّیۡطٰنُ: جب بروز قیامت جابروں اور ان کے پیروکاروں کے خلاف فیصلہ سنایا جائے گا تو اس وقت شیطان اپنے پیروکاروں سے کہے گا:

اللہ نے تمہیں جنت اور ابدی نعمتوں کا وعدہ دیا تھا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پورا کر دیا اور ان کو جنت کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ میں نے تمہیں وعدہ دیا تھا کہ بروز قیامت حساب کتاب نہ ہو گا اور بتوں سے سعادتیں مل جاتی ہیں۔ ان وعدوں کی میں نے خلاف ورزی کی۔

۲۔ وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیۡکُمۡ: میرا تم پر کوئی زور نہیں چلتا تھا۔ تم پر میری بالادستی نہ تھی کہ تم میری اطاعت کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ نہ طاقت کی بالادستی تھی، نہ دلیل و برہان کی۔ میں نے تمہارا ہاتھ پکڑ کر گمراہی کی طرف نہیں دھکیلا۔

۳۔ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُکُمۡ: میں نے صرف حق کی دعوت کے مقابلے میں باطل کی دعوت تمہارے سامنے رکھ دی۔ تم نے اسے مان لیا۔ جب کہ اسے مان لینے یا رد کرنے کے اختیارات تمہارے پاس تھے۔

۴۔ فَلَا تَلُوۡمُوۡنِیۡ: لہٰذا اب اس انجام کی ذمے داری تم پر عائد ہوتی ہے کیونکہ تم نے اللہ کی دعوت کو چھوڑ کر میری دعوت قبول کی ہے۔

۵۔ مَاۤ اَنَا بِمُصۡرِخِکُمۡ: آج ہم ایک دوسرے کی فریاد رسی نہیں کر سکتے چونکہ ہم دونوں شریک جرم ہیں.

۶۔ اِنِّیۡ کَفَرۡتُ بِمَاۤ اَشۡرَکۡتُمُوۡنِ: میں آج اس بات سے بھی بیزار ہوں کہ تم نے مجھے اطاعت اور فرمان برداری میں اللہ کے ساتھ شریک کیا تھا۔ یہاں کفر سے مراد بیزاری ہے۔ جیسے: وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یَکۡفُرُوۡنَ

بِشِرۡکِکُمۡ ...'' اور قیامت کے دن وہ تمہارے اس شرک کا انکار کریں گے'' ہے۔[1]

یہ ہیں شیطان کے طعنے جو اس کے پیروکار اس وقت سنیں گے جب وقت ہاتھ سے نکل گیا ہوگا اور فیصلہ الٰہی ہو چکا ہوگا۔ ان کے پاس ان طعنوں کا کوئی جواب نہ ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ شیطان کا دخل صرف دعوت تک ہے: وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ ....۔

۲۔ انسان اپنے ارادے میں خود مختار ہے: فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِیۡ ...۔

وَ اُدۡخِلَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ ؕ تَحِیَّتُہُمۡ فِیۡہَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال بجا لائے اپنے رب کی اجازت سے وہ ان جنتوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، وہاں (آپس میں) ان کی تحیت سلام ہوگی۔

تشریح کلمات

تَحِیَّتُہُمۡ : (ح ی ی) تحیة کے معنی حیاك الله کہنے کے ہیں۔ اللہ تجھے زندہ رکھے۔ اصل میں تحیة حیات سے مشتق ہے، پھر دعائے حیات کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔

تفسیر آیات

گمراہوں اور شیطان کے پیروکاروں کے آپس میں ہونے والے طعن و تشنیع اور برائت و بیزاری پر مشتمل مکالمے کا ذکر کرنے کے بعد اہل جنت کے ماحول کا ذکر آیا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کس محبت کی فضا میں ملتے ہیں وہ ایک دوسرے کو حیات جاودانی اور امن و سلامتی کی دعائیں دیتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اہل بہشت ایک دوسرے کو دعائیں دیتے رہیں گے۔

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا

۲۴۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسی مثال پیش

----

[1] ۳۵ فاطر: ۱۴

كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿٢٤﴾ تُؤْتِيٓ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٥﴾

کی ہے کہ کلمہ طیبہ شجرہ طیبہ کی مانند ہے جس کی جڑ مضبوط گڑی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔

۲۵۔ وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دے رہا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں اس لیے دیتا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ: کلمہ طیبہ کا لفظی ترجمہ ''پاکیزہ بات'' ہے۔ اس سے مراد وہ پاکیزہ موقف و اعتقاد ہے جس کا اظہار، قول و عمل سے ہوتا ہے۔ وہ موقف جو انبیاء و رسل علیہم السلام نے اللہ کی طرف سے پیش کیا ہے وہ پاکیزہ نظام زندگی و دستور حیات ہے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے انسانیت کے لیے عنایت فرمایا ہے جس کا نقطہ آغاز و محکم اساس، کلمہ توحید ہے۔

۲۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ: یہ کلمہ حق، دلیل و برہان اور منطق کے اعتبار سے فطرت کائنات سے ہم آہنگ اور اس کے تقاضوں کے عین مطابق ہونے کے اعتبار سے مضبوط اور محکم بنیادوں پر استوار ہے۔ بالکل اس درخت کی طرح جس کی جڑیں زمین میں ایسی گڑی ہوئی ہیں کہ زمانے کی تند و تیز ہوائیں اور طوفان اس کو ہلا نہیں سکتے۔

۳۔ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ: یہ کلمہ حق ایسا پھیلے گا کہ دنیا کے جس کونے تک جانے کی گنجائش ہوگی یہ کلمہ حق وہاں پہنچ جائے گا۔ بالکل اس درخت کی شاخوں کی طرح جو آسمان تک پہنچی ہوئی ہے۔ درخت میں پھلنے پھولنے کا بہترین موقع اس وقت آتا ہے جب اس کے لیے سازگار ماحول میسر آئے۔ طبیعت زمین ہوا، پانی کے ساتھ سازگار ہو۔ کلمہ حق چونکہ نظام فطرت کے ساتھ نہایت سازگار ہو گا لہٰذا یہ مشکلات اور مخالفتوں کے باوجود پھیلے گا۔

۴۔ تُؤْتِيٓ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ: کلمہ حق ایک ایسا نتیجہ خیز اور پرفیض نظام حیات ہے جس کا پھل انسان ہر قدم پر اٹھا سکتا ہے اور زندگی کا ہر گوشہ اس پھل سے مالا مال ہو سکتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ...[1]

اور اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے...۔

---

[1] ۷ اعراف: ۹۶

۵۔ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ: کلمہ طیبۃ جو ایک غیر حسی بات ہے، کی تشبیہ اللہ تعالیٰ نے شجرہ کے ساتھ دی ہے جو محسوس چیز ہے چونکہ انسان کے لیے معقول باتوں سے زیادہ قابل فہم، محسوس باتیں ہوتی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حق کی جڑیں مضبوط اور شاخیں بارآور ہوتی ہیں: اَصْلُهَا ثَابِتٌ .... تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا....

۲۔ حق کی افادیت زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے: تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ ....۔

۳۔ ایمان وعقیدہ جڑ اور اعمال صالحہ شاخیں ہیں۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِۨ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اور کلمہ خبیثہ کی مثال اس شجرہ خبیثہ کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا گیا ہو اور اس کے لیے کوئی ثبات نہ ہو۔

تشریح کلمات

اجْتُثَّتْ: (ج ث ث) جثۃ کے معنی کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے ہیں۔

تفسیر آیات

کلمہ خبیثہ، کلمہ طیبہ کے مقابلے میں ہے۔ کلمہ حق کے مقابلے میں آنے والا کلمہ، باطل، صحیح عقائد کے مقابلے میں آنے والے عقائد، فاسد ہیں اور ہر مبنی برحقیقت نظام حیات کے مقابلے میں آنے والا نظام، فاسد ہے۔

٣٣٣

کلمہ حق کی استواری اور کلمہ باطل کی بے ثباتی سب پر واضح ہے۔ چنانچہ وہ کلمہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بلند کیا اس کی گونج آج تک پوری طاقت کے ساتھ اطراف کائنات میں موجود ہے۔ اس کے مقابلے میں آنے والے ہزاروں نمرودوں کے نام صرف صفحہ تاریخ پر چند سیاہ حروف میں باقی ہیں۔

حضرت ابن عباس راوی ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا:

انت الشجرۃ وعلی غصنها و فاطمۃ ورقها الحسن والحسين ثمارها۔[۱]

آپ شجرہ طیبہ ہیں۔ علی اس کی شاخ، فاطمہ پتے اور حسن وحسین اس کے پھل ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حق پائیدار اور باطل ناپائیدار ہے۔

---

[۱] بحار ۲۴: ۱۳۷۔ مجمع البیان۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

۲۷۔اللہ ایمان والوں کو دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی قول ثابت پر قائم رکھتا ہے اور ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ اپنی مشیت کے مطابق عمل کرتا ہے۔

تفسیر آیات

اللہ اپنی مشیت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اللہ کی مشیت اندھی بانٹ نہیں ہوتی، حکمت و عدالت کے مطابق ہوتی ہے۔ ہر مستحق کو اس کا حق اور ہر ستم کار کو سزا دیتا ہے جس کا وہ سزاوار ہے۔ چنانچہ ایمان لانے والے لوگوں نے اپنے آپ کو شجرہ طیبہ جیسے عظیم اور پائدار درخت کے ساتھ پیوستہ، اللہ کی عنایتوں کے سزاوار اور اہل ثابت کر دیا ہے۔ ایسے مومنوں کو اللہ دنیا میں ثابت قدمی بخشتا ہے کہ جو مشکلات و مصائب پہاڑوں کو پاش پاش کرنے والے ہوں وہ اس مؤمن کو متزلزل نہیں کر سکتے۔ انہوں نے جس راستے کو اختیار کیا ہے اس پر پختہ یقین ان کی ہر مشکل آسان بنا دیتا ہے۔ منزل سے عشق اور ایمان کی وجہ سے راستے میں پیش آنے والی کڑی سی کڑی آزمائش ان کو شیرین معلوم ہوتی ہے۔

ابن عباس راوی ہیں:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ .... سے مراد ولایت علی بن ابی طالب (ع) پر ثابت قدم رہنا ہے۔[1]

عبدالرحمٰن بن عوف راوی ہے: میں نے اپنے غلام سے کہا کہ میں تجھے ایک حدیث بتا دیتا ہوں قبل اس کے کہ یہ حدیث باطل باتوں کے ساتھ مخلوط ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میں نے سنا:

انا شجرة و فاطمة فرعها و علی لقاحها و حسن و حسین ثمرها و محبوهم من امتی ورقها، ثم قال هم فی جنة عدن والذی بعثنی بالحق۔[2]

میں شجرہ ہوں، فاطمہ اس کی شاخ علی اس کی بارداری اور حسن و حسین اس کے پھل اور میری امت میں سے ان کے محبین اس کے پتے ہیں۔ پھر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے مبعوث کیا ہے وہ جنت عدن میں ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان ہی مایہ استقامت ہے: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ....

۲۔ انسان دنیا و آخرت دونوں میں تائید الٰہی کا محتاج ہے: فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ....

---

[1] شواهد التنزیل ذیل آیہ [2] شواهد التنزیل ۱: ۴۰۷

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ کُفۡرًا وَّ اَحَلُّوۡا قَوۡمَہُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ ﴿۲۸﴾	۲۸۔ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اتار دیا؟
جَہَنَّمَ ۚ یَصۡلَوۡنَہَا ؕ وَ بِئۡسَ الۡقَرَارُ ﴿۲۹﴾	۲۹۔ وہ جہنم ہے جس میں وہ جھلس جائیں گے جو بدترین ٹھکانا ہے۔
وَ جَعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا لِّیُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعُوۡا فَاِنَّ مَصِیۡرَکُمۡ اِلَی النَّارِ ﴿۳۰﴾	۳۰۔اور انہوں نے اللہ کے لیے کچھ ہمسر بنا لیے تاکہ راہ خدا سے (لوگوں کو) گمراہ کریں، ان سے کہہ دیجیے: (کچھ دن) لطف اٹھا لو آخر کار تمہارا ٹھکانا آتش ہے۔

تشریح کلمات

اَحَلُّوۡا: (ح ل ل) حللت کے معنی کسی جگہ پر اترنے اور فروکش ہونے کے ہیں۔

الۡبَوَارِ: (ب و ر) اصل میں کسی چیز کے ماند پڑنے کے معنوں میں ہے اور چونکہ کساد سے فساد آتا ہے اس لیے بوار بمعنی ہلاکت استعمال ہونے لگا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ: یہ اللہ کی کتنی بڑی نعمت تھی کہ اس جاہل قوم کی طرف ایک رسول کو رحمت بنا کر بھیجا۔ طلب مغفرت کی دعوت دی۔ جنت کی طرف راہنمائی فرمائی۔ سعادت ابدی کے سامان فراہم کیے۔

۲۔ وَّ اَحَلُّوۡا قَوۡمَہُمۡ: لیکن کفر و شرک کے رہنماؤں نے اس عظیم نعمت کو کفران نعمت سے بدل دیا۔ خود بھی تباہ ہو گئے اور اپنی قوم کو بھی تباہی کے گھر میں جھونک دیا۔ ذکر سرداران کفر و ضلالت کا ہے۔

۳۔ جَہَنَّمَ ۚ یَصۡلَوۡنَہَا: وہ ہلاکت کا گھر جہنم ہے جس میں یہ لوگ جھلس جائیں گے اور ان کے لیے جہنم ان کے تصورات سے زیادہ برا ٹھکانا ہے۔

۴۔ وَ جَعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا: ان کافروں کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی شان میں اس حد تک گستاخی کی، ایسی چیزیں اللہ کے مقابلے میں لائے جو خود اپنے نفع و نقصان کی مالک نہیں ہیں۔ یہ سب اس لیے کیا تاکہ راہ حق، جو توحید پروردگار ہے، سے لوگ منحرف ہو جائیں۔

اہم نکات

۱۔ ایک راہنما کے گمراہ ہونے سے ایک قوم گمراہ ہو جاتی ہے: وَّ اَحَلُّوۡا قَوۡمَہُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ۔

۲۔　سرداران کفر نے اپنے مفاد کے لیے لوگوں کو شرک میں مبتلا کیا: وَجَعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا ....

قُلۡ لِّعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡہِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ میرے ایمان والے بندوں سے کہہ دیجیے: نماز قائم کریں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ طور پر خرچ کریں، اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ سودا ہو گا اور نہ دوستی کام آئے گی۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ لِّعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: عبادی، میرے بندے۔ یہ تعبیر کس قدر شیرین ہے اور کس قدر اللہ نے اپنے بندوں کو عزت و شرف سے نوازا ہے۔ کافروں اور مشرکوں کو اپنی درگاہ سے دھتکارنے کے بعد رحمت و شفقت کے لہجے میں اپنے مؤمن بندوں کی طرف کلام کا رخ فرماتا ہے:

۲۔ یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ: میرے مؤمن بندوں سے کہد یجیے کہ وہ نماز قائم کریں تاکہ معراج مومن کی منزل کو پہنچ جائیں اور اللہ کی عطا کردہ روزی اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔

پوشیدہ طور پر خرچ کریں جس سے لینے والوں کے وقار کو تحفظ ملتا ہے، محتاجوں کی انسانی کرامت کو بچایا جا سکتا ہے اور دینے والوں کے اخلاص عمل کو ریاکاری سے بھی بچانے کا موقع ملتا ہے۔

علانیہ طور پر خرچ کریں، جہاں انفاق فی سبیل اللہ کے عمل کو نمونہ عمل بنانا اور معاشرے میں اس سوچ کو عام کرنا مقصود ہو۔ اگر لوگ اسے بخیل سمجھتے ہیں تو لوگ اس کی غیبت نہ کریں۔

۳۔ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ: اس دن کے آنے سے پہلے جہاں نماز اور انفاق کام آئے گا۔ اگر نماز و انفاق نہیں ہے تو کسی سے معاملہ کر کے اس دن کو ٹال سکتے ہیں نہ ہی کسی دوست کی دوستی کام آسکتی ہے۔ واضح رہے کہ اگر مؤمن نمازی ہے اور انفاق کرتا ہے تو شفاعت اور دوستی فائدہ دیتی ہے:

اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ ۟[1]　اس دن دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے سوائے پرہیزگاروں کے۔

اہم نکات

۱۔　مومن نماز کے ذریعے خالق سے اور انفاق کے ذریعے مخلوق سے مربوط رہتا ہے۔

۲۔　اقتصادی اقدار سے زیادہ اہم، انسانی قدریں ہیں: مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا....

---

[1] ۴۳ زخرف: ۶۷

اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الۡفُلۡكَ لِتَجۡرِیَ فِی الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الۡاَنۡهٰرَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اللہ ہی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے تمہاری روزی کے لیے پھل پیدا کیے اور کشتیوں کو تمہارے لیے مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے سمندر میں چلیں اور دریاؤں کو بھی تمہارے لیے مسخر کیا۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ دَآئِبَیۡنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیۡلَ وَ النَّهَارَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور اسی نے ہمیشہ چلتے رہنے والے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا اور رات اور دن کو بھی تمہارے لیے مسخر بنایا۔

تشریح کلمات

دَآئِبَیۡنِ: (د ء ب) الدائب کے معنی مسلسل چلنے کے ہیں۔ اسی سے دأبٌ عادت مستمرہ پر بھی بولا جاتا ہے: كَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ...[1]

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں مقام توحید اور مقام انسان کا ذکر ہے۔

۱۔ **توحید۔** اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ: قابل ستائش صرف وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ ان کو خلق کرنے میں کوئی اور شریک نہیں ہے۔ آسمان سے پانی نازل کرنا اور زمین سے مختلف پھلوں کا اگانا بھی کسی اور کا نہیں، صرف اللہ کا کام ہے۔

۲۔ **انسان۔** وَ سَخَّرَ لَكُمُ الۡفُلۡكَ: اس کائنات میں انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جو اللہ کی بندگی کے علاوہ کسی اور مخلوق کے لیے مسخر نہیں۔ چنانچہ ہم نے کئی بار پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ یہ کائنات بنیادی طور پر حیات و زندگی کے لیے سازگار نہیں ہے۔ ہمارے شمسی نظام میں کرۂ ارض پر زندگی پیدا کرنے اور اسے بحال رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سامان زندگی فراہم کیے۔ پھر ان زندوں میں انسان کو مخدوم اور باقی حیوانات کو انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیا:

i۔ آسمان سے نازل ہونے والی بارش، انسان و دیگر حیوانات کی زندگی کے لیے اور دیگر حیوانات

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۱

انسان کے لیے۔
ii۔ پانی میں روانی اور ہوا کی تیز رفتاری جہاں دیگر امور میں انسان کے مفاد کے لیے ہے وہاں کشتی کی روانی اور تجارت کے فروغ کے لیے بھی ہے۔
iii۔ دریاؤں سے شق ہو کر نکلنے والی نہروں سے بھی انسان اپنی ضرورت کے لیے فائدہ اٹھاتا ہے۔
iv۔ سورج معبود نہیں کہ انسان اس کی پوجا کرے بلکہ یہ انسان کی خدمت کے لیے ہے۔
v۔ چاند مظاہر قدرت کا خوبصورت نمونہ ہے اور انسان کے لیے تقویم و روشنی کا کام دیتا ہے۔
vi۔ رات آرام وسکون اور انرجی کی چارجنگ کے لیے ہے۔
vii۔ انسانی زندگی کے وسائل کی فراہمی، قافلہ حیات کی روانی کے لیے ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلام بحری تجارت کی ترغیب دیتا ہے: وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ....
۲۔ ترقی وتمدن کے لیے طبیعیات سے فائدہ اٹھانا، طبیعت کی وجہ تخلیق اور فطرت کے مطابق ہے۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور اسی نے تمہیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو شمار نہ کر سکو گے، انسان یقیناً بڑا ہی بے انصاف، ناشکرا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ: سابقہ آیت میں انسانی ضرورت کی بعض اہم چیزوں کا ذکر تھا اور اس آیہ شریفہ میں ایک جامع عبارت میں فرمایا: ہر وہ چیز تم کو دے دی گئی ہے جس کا تم نے سوال کیا۔ یہ سوال ہماری فطرت یا ہماری ارتقا اور زندگی کی بقا کے تقاضوں اور ہماری ضروریات کی طرف سے تھا یا ہماری خواہشات کی طرف سے۔ چونکہ اللہ نے صرف ضرورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ خواہشات کی بنیاد پر نعمتیں عنایت فرمائی ہیں۔ چنانچہ دانہ جو یا دانہ گندم سے انسان زندہ رہ سکتا ہے اس کے باوجود مختلف دانوں اور طرح طرح کے میوں اور سینکڑوں غذائی اشیاء کی فراہمی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے ہر وہ نعمت عطا کی ہے جس کا تصور انسان کر سکتا ہے اور اس کے ذہن و خیال میں آ سکتی ہے۔

۲۔ رہی زبانی سوال کی بات تو اللہ کی درگاہ سے کوئی دعا رد نہیں ہوتی۔ جو دعائیں بظاہر قبول نہیں ہوتیں اس کی یہ وجوہات ہیں:

i۔ سرے سے دعا ہوتی ہی نہیں، صرف زبان ہلائی جاتی ہے اور حلق سے آواز نکلتی ہے۔

ii۔ قبولیت دعا میں مصلحت نہیں۔ نادانی کی وجہ سے بندہ سوال کرتا ہے ورنہ اگر اسے علم ہوتا تو اس چیز کا سوال نہ کرتا۔

لیکن اگر حقیقتاً دعا دل سے نکل جائے اور بندے کی دینی و دینوی مصلحت میں ہو تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ دعا قبول فرمائے گا:

فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ ....[1] میں (ان سے) قریب ہوں، دعا کرنے والا جب مجھے پکارتا ہے....

ادۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ ....[2] مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا....

۳۔ وَ اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ: یقیناً اللہ کی غیر محدود نعمتیں، محدود انسان شمار نہیں کر سکتا کیونکہ شمار کے لیے نعمتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ انسان ان نعمتوں کا علم تک نہیں رکھتا تاکہ شمار کرے۔ چنانچہ کل کے انسان سے آج کا انسان اس کائنات کی کچھ باریکیوں کا زیادہ علم رکھتا ہے لیکن اس کی معلومات، مجہولات کے مقابلے میں ہنوز ہیچ ہیں۔

۴۔ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ کَفَّارٌ: انسان کو مخدوم بنایا۔ اس کی خواہشات پوری کیں۔ بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ اس کے باوجود یہ انسان کس قدر ناانصاف اور ناشکرا ہے۔ ان نعمتوں پر اکتفا نہیں کرتا اور دوسروں کے حقوق غصب کرتا ہے۔ ان کی قدر بھی نہیں کرتا بلکہ منعم کی شان میں شرک و معصیت سے گستاخی کرتا ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذلك۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی تمام ضروریات اور خواہشات پوری کی گئی ہیں۔

۲۔ کفران نعمت خود اپنی جگہ ظلم ہے۔

وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہِیۡمُ رَبِّ اجۡعَلۡ ہٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجۡنُبۡنِیۡ وَ بَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اور (وہ وقت یاد کیجیے) جب ابراہیم نے دعا کی: پروردگارا! اس شہر کو پر امن بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔

رَبِّ اِنَّہُنَّ اَضۡلَلۡنَ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡ ۚ

۳۶۔ پروردگارا! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے پس جو شخص میری پیروی

---

[1] ۲ بقرۃ: ۱۸۶ [2] ۴۰ غافر: ۶۰

وَمَنۡ عَصَانِیۡ فَاِنَّکَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۶﴾	کرے وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو یقیناً بڑا معاف کرنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔سورہ بقرہ آیت ۱۲۶ میں امن مکہ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہے ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔حضرت خلیل علیہ السلام کی یہ دعا: مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ ظاہر ہے گمراہی سے بچ کر راہ راست پر آنے کے لیے اللہ کی طرف سے توفیق اور ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے اور ہدایت کی ضرورت ہر آن رہتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ میں ذکر کیا کہ ہدایت ایسی چیز نہیں کہ ایک بار اللہ سے وصول کر کے بے نیاز ہو جائے بلکہ ہدایت برقی کنکشن کی طرح ہے کہ ہر آن ملتی رہتی ہے۔ حضرت خلیل علیہ السلام کی یہ دعا یقیناً قبول ہوئی ہے۔ لہٰذا اولاد ابراہیم میں سے کوئی فرد بت پرستی نہیں کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں جس نے بتوں کی پرستش نہیں کی وہ فرزند ابراہیم ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے کبھی بھی بت پرستی نہیں کی۔ چنانچہ عبد اللہ بن مسعود راوی ہیں:

قال رسول اللّٰہ (ص): انا دعوۃ ابراھیم.	رسول اللہؐ نے فرمایا: میں دعائے ابراہیمؑ ہوں۔
قلنا: یا رسول اللّٰہ (ص) کیف صرت دعوۃ ابیک ابراھیم؟	ہم نے کہا: یا رسول اللہؐ! آپ دعائے ابراہیم کیسے ہوئے؟
قال: اوحی اللّٰہ عز و جل الی ابراھیم اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا.	فرمایا: اللہ نے ابراہیمؑ کی طرف وحی کی: اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔
فاستخف ابراھیم الفرح. فقال: یا رب! وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ائمۃ مثلی؟	ابراہیمؑ بہت خوش ہوئے اور عرض کیا: اے ربّ! کیا میری ذریت میں بھی مجھ جیسے امام ہوں گے؟
فاوحی اللّٰہ عز و جل الیہ: ان یا ابراھیم انی لا اعطیک عھداً لا افی لک بہ.	اللہ نے وحی کی: اے ابراہیم میں آپ سے ایسا عہد نہیں کروں گا جسے میں پورا کرنے والا نہیں ہوں۔
قال: یارب وماالعھدالذی لاتفی لی بہ؟	ابراہیمؑ نے عرض کیا: اے ربّ! وہ عہد کیا ہے جسے آپ پورا نہیں کریں گے؟
قال: لا اعطیک لظالم من ذریتک.	فرمایا: آپ کی اولاد میں سے ظالم کو یہ عہد نہیں دوں گا۔
قال: یارب! و من الظالم من ولدی الذی لا ینالہ عھدک؟	عرض کیا: میری اولاد میں ظالم کون ہے جس تک آپ کا عہد نہیں پہنچ سکتا؟
قال: من سجد لصنم دونی لا اجعلہ	فرمایا: جس نے مجھے چھوڑ کر بت کو سجدہ کیا ہو میں

اماماًابداًولا یصلح ان یکون اماما. اسے امام نہیں بناؤں گا۔ وہ امام بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا.

قال ابراھیم عندھا: وَّاجۡنُبۡنِیۡ وَبَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ۔ رَبِّ اِنَّہُنَّ اَضۡلَلۡنَ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ۔ اس پر ابراہیمؑ نے کہا: مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ اے ربّ! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔

قال النبی (ص) فانتھت الدعوۃ الیّ و الی اخی علی (ع) لم یسجد احد منا لصنم قط فاتخذنی اللّٰہ نبیاً و علیا وصیاً. پھر نبیؐ نے فرمایا: یہ دعوت مجھ تک اور میرے بھائی علی تک پہنچی۔ ہم میں سے کسی نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ پھر اللہ نے مجھے نبی اور علی کو وصی بنایا۔

ملاحظہ ہو: مناقب مغازلی شافعی صفحہ ۲۷۶۔ شواھد التنزیل ذیل آیہ۔ امالی طوسی ۱: ۳۸۸۔

۴۔ ملت خلیل میں داخل ہونے کے لیے اتباع ہی بنیاد ہے۔ اتباع نہ کرنے سے اولاد بھی ملت خلیل سے خارج ہو جاتی ہے اور اتباع سے دوسرے لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جیسا کہ سورہ آل عمران آیت ۶۸ میں بھی ذکر ہوا کہ اس نبی آخر الزمان (ص) کی ملت کے لیے بھی اتباع بنیاد ہے۔

۵۔ جو شخص نافرمانی کرے گا تو تو درگزر کرنے والا مہربان ہے۔ اس جملے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ جو نافرمانی کر کے بت پرستی اختیار کرتا ہے، اس کے لیے خلیل (ع) دعائے مغفرت کر رہے ہیں بلکہ خلیل (ع) ان بت پرستی کرنے والوں کے لیے دعائے ہدایت فرما رہے ہیں کہ ان کو شرک سے بچا اور اپنی رحمت کا اہل بنا دے۔ چنانچہ جو لوگ اس بات کے اہل تھے، ان کے لیے دعائے خلیل (ع) قبول ہو جاتی ہے اور جو لوگ سرے سے اہل ہی نہ تھے وہ رحمت الٰہی کے شامل حال نہیں ہوئے۔ جب کہ

وَرَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ ... [1] اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء بھی ہمیشہ توفیق الٰہی کے محتاج ہوتے ہیں۔

۲۔ ملت انبیاء میں داخل ہونے کے لیے اتباع بنیاد ہے۔

رَبَّنَاۤ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ ... الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ

۳۷۔ اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے محترم گھر کے نزدیک ایک بنجر وادی میں بسایا، اے ہمارے پروردگار! تاکہ

---

[1] ۷ اعراف: ۱۵۶

اِلَیۡہِمۡ وَ ارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۷﴾

یہ نماز قائم کریں لہٰذا تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں پھلوں کا رزق عطا فرما تاکہ یہ شکرگزار بنیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ: میں لفظ مِنۡ تبعیضی ہے۔ اس سے ''بعض اولاد'' سمجھا جاتا ہے جس سے مراد حضرت اسماعیل (ع) اور ان کی اولاد ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل (ع) اور ان کی اولاد کو یہاں بسایا تھا۔

۲۔ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ: بیت سے مراد کعبہ ہے جو اس وقت بیت یعنی گھر کی شکل میں آگیا تھا۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عمر کے آخری حصے میں بیت اللہ کی تعمیر کے وقت مانگی ہے کیونکہ حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام آپ (ع) کے عالم پیری میں پیدا ہوئے ہیں:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ ...[۱]

ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے عالم پیری میں مجھے اسماعیل اور اسحٰق عنایت کیے...

اور بیت اللہ کی تعمیر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جوانی کے وقت عمل میں آئی:

وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ ...[۲]

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم و اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے ....

۳۔ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ: یہ وادی پتھریلی اور ریتلی ہونے کی وجہ سے آج تک قابل زراعت نہیں ہے۔ یہاں اپنی اولاد کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لیے بسایا کہ وہ نماز قائم کریں۔ کیا نماز قائم کرنے کے لیے بے آب و گیاہ خشک بیابان کی ضرورت تھی؟ حضرت علی علیہ السلام اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں کہ اس گھر کو سخت چٹانوں اور گہری ریت کے درمیان کیوں قرار دیا؟

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَخْتَبِرُ عِبَادَہُ بِاَنْوَاعِ الشَّدَائِدِ وَ یَتَعَبَّدُھُمْ بِاَنْوَاعِ الْمُجَاھِدِ وَ یَبْتَلِیْھِمْ بِضُرُوبِ الْمَکَارِہِ، اِخْرَاجاً لِلتَّکَبُّرِ مِنْ قُلُوبِھِمْ وَ اِسْکَاناً لِلتَّذَلُّلِ فِی نُفُوسِھِمْ....[۳]

لیکن اللہ سبحانہ اپنے بندوں کو گوناگوں سختیوں سے آزماتا ہے اور ان سے ایسی عبادت کا خواہاں ہے کہ جو طرح طرح کی مشقتوں سے سے بجا لائی گئی ہو اور انہیں قسم قسم کی ناگواریوں سے جانچتا ہے تاکہ ان کے دلوں سے تکبر کو نکال باہر کرے اور ان کے نفوس میں عجز و فروتنی کو جگہ دے....

---

[۱] ۱۴ ابراھیم: ۳۹　[۲] ۲ بقرۃ: ۱۲۷　[۳] نہج البلاغۃ ص ۲۹۲۔ خطبہ قاصعہ　[۲] تفہیم القرآن ۴: ۵۰۳

۴۔ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ : لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل بنا دے۔ فاجعل میں فا برائے تفریع ہے۔ جیسے ہم اردو میں ایک مطلب بیان کرنے کے بعد نتیجے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں تو ''لہٰذا'' کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں: میں نے اپنی ذریت کو تیرے گھر کے پاس بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں لہٰذا صلہ کے طور پر لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا دے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ سے لوگوں کے دلوں میں اپنی اولاد کی محبت کی درخواست کر رہے ہیں۔

اس جگہ ہم آپ کے لیے تفہیم القرآن کی عین عبارت لکھ دیتے ہیں جو انہوں نے آیۃ المودۃ کے اہل بیت اطہار (ع) کی شان میں ہونے کو بڑی شدّ ومد سے رد کرتے ہوئے لکھی ہے:

> تیسری بات جو ان سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے، اس مقام سے اس کارعظیم پر یہ اجر مانگنا تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو، اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحب ذوق سلیم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔[1]

صاحب تفہیم القرآن کا ذوق اس قدر سلیم ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل (ع) کا ذوق سقیم معلوم ہوتا ہے جو اپنے کارنامے کے صلے میں اولاد کی محبت مانگتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اولاد کی ہر دلعزیزی چاہتے تھے: فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ ....

۲۔ مادی ناداری میں اللہ کی بندگی کی دارائی مل جاتی ہے: وَارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ ....

رَبَّنَاۤ اِنَّکَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِیۡ وَ مَا نُعۡلِنُ ؕ وَ مَا یَخۡفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ ہمارے رب! جو کچھ ہم پوشیدہ رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم ظاہر کرتے ہیں تو اسے جانتا ہے، اللہ سے کوئی چیز نہ تو زمین میں چھپ سکتی ہے اور نہ آسمان میں۔

تفسیر آیات

دعائے خلیل کے جملے ہیں: جو دعائیں ہم زبان پر لا کر ظاہر کر رہے ہیں، صرف ان کو نہیں، تو دلوں میں پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے۔ تجھ سے لفظوں میں التجا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہم لفظوں میں دعا اور مناجات کرتے ہیں جو عبادت ہے اور تجھ سے مانگنے سے سکون حاصل ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ دعائیں اس لیے نہیں ہوتیں کہ اللہ ہماری حاجتوں کو جان لے بلکہ دعا، عبادت اور بندگی ہے۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَسَمِیۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ٭ۖ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلۡ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

۳۹۔ ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے عالم پیری میں مجھے اسماعیل اور اسحق عنایت کیے، میرا رب تو یقیناً دعاؤں کا سننے والا ہے۔

۴۰۔ پروردگار مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی، اے ہمارے پروردگار اور میری دعا قبول فرما۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ: توریت کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام ۸۶ سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے اور حضرت اسحٰق (ع) کی ولادت کے وقت آپ کی عمر ۱۰۰ سال تھی۔ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق حضرت اسماعیل (ع) کی ولادت کے وقت آپ کی عمر ننانوے سال تھی اور حضرت اسحاق (ع) کی ولادت کے وقت ایک سو بارہ سال تھی۔ (قرطبی)

پیرانہ سالی میں اولاد نرینہ بڑی نعمت ہے اور خصوصاً دعاؤں اور تمناؤں کے بعد ملی ہو۔

۲۔ اقامۃ صلوۃ۔ رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ: معاشرے میں نماز کا رواج قائم کرنا انبیاء و ائمہ علیہم السلام کا فرض اولین بھی ہے اور ان کی دعا و تمنا بھی۔ چنانچہ فرزند خلیل حضرت امام حسین علیہ السلام کی زیارت میں ہم کہتے ہیں:

اشھد انک قد اقمت الصلوۃ .... میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؑ نے نماز قائم کی۔

اہم نکات

۱۔ اسماعیل و اسحاق، دعائے ابراہیم علیہم السلام سے عطا ہوئے۔

۲۔ نماز کی توفیق، دعائے ابراہیمؑ کا صلہ ہے۔

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اے ہمارے رب مجھے اور میرے والدین اور ایمان والوں کو بروز حساب مغفرت سے نواز۔

تفسیر آیات

اس آیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین کا ایمان قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش موجود نہیں ہے کہ حضرت خلیل علیہ السلام نے اپنے والدین کی وفات کے بعد ان کی مغفرت کے لیے یہ دعا کی ہے کیونکہ یہ دعا حضرت اسماعیل و اسحٰق علیہما السلام کی ولادت کے بعد کی ہے اور ان کی ولادت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیرانہ سالی میں ہوئی ہے۔ جیسا کہ آیت کی صراحت ہے: وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ....آیت کی صراحت کے باوجود صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:

بناء علی زعمهم ان هذا الدعاء کان بعد الکبر وهبة اسماعیل واسحاق۔[1]

شیعوں کے گمان کے مطابق (حضرت ابراہیمؑ کی) یہ دعا ان پر بڑھاپا آنے اور انہیں اسماعیل و اسحاق عطا ہونے کے بعد کی ہے۔

ان کے مطابق قرآن کی صراحت شیعوں کا گمان ہے۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ....[2]

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ آزر کے لیے لفظ ابٌ باپ استعمال ہوا ہے جو حقیقی باپ اور چچا دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں دعائے مغفرت کے لیے لفظ "والدین" استعمال ہوا ہے جو صرف حقیقی باپ کے لیے مخصوص ہے۔

اس کے باوجود یہاں اس قدر ناانصافی ہوئی ہے کہ لوگ ابٌ سے حقیقی باپ مراد لیتے ہیں اور اس جگہ والد سے مراد حضرت نوح علیہ السلام لیتے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں والد سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ کچھ لوگ کہتے والدی نہیں، ولدی دونوں بیٹے اسماعیل و اسحاق علیہما السلام مراد ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں یہ لفظ ولدی اولاد مراد ہے۔

۳۴۵

البتہ علامہ جلال الدین سیوطی سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ اس جگہ والدین سے مراد حقیقی والدین ہی ہیں اور وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ ....[3] میں ابٌ سے مراد چچا ہے کیونکہ عرب چچا کو اَبٌ اور چچی کو اُمٌ کہتے ہیں۔[4]

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ الانعام آیت ۷۴۔

اہم نکات

۱۔ والدین اور مؤمنین کی مغفرت کے لیے دعا کرنا سیرت انبیاء علیہم السلام ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ　۴۲۔ اور ظالم جو کچھ کر رہے ہیں آپ اس سے

۱؎ روح المعانی ۱۳: ۲۴۳۔ طبع بیروت　۲؎ ۱۸ کہف: ۵　۳؎ ۹ توبة: ۱۱۴　۴؎ تفسیر روح البیان ۴: ۴۳۰

الظّٰلِمُوۡنَ ۬ؕ اِنَّمَا یُؤَخِّرُہُمۡ لِیَوۡمٍ تَشۡخَصُ فِیۡہِ الۡاَبۡصَارُ ﴿ۙ۴۲﴾	اللہ کو غافل تصور نہ کریں، اللہ نے بے شک انہیں اس دن تک مہلت دے رکھی ہے جس دن آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔
مُہۡطِعِیۡنَ مُقۡنِعِیۡ رُءُوۡسِہِمۡ لَا یَرۡتَدُّ اِلَیۡہِمۡ طَرۡفُہُمۡ ۚ وَ اَفۡـِٕدَتُہُمۡ ہَوَآءٌ ﴿ؕ۴۳﴾	۴۳۔ وہ سر اٹھائے دوڑ رہے ہوں گے، ان کی نگاہیں خود ان کی طرف بھی لوٹ نہیں رہی ہوں گی اور ان کے دل (خوف کی وجہ سے) کھوکھلے ہو چکے ہوں گے۔

تشریح کلمات

تشخص: (ش خ ص) شخص بصرہ اس کی آنکھ پتھرا گئی۔

مُہۡطِعِیۡنَ: (ھـ ط ع) گردن اٹھا کر چلنے کے معنوں میں ہے۔

مُقۡنِعِیۡ: (ق ن ع) اقنع رأسہ اس نے سر اونچا کیا۔

ہَوَآءٌ: (ھـ و ی) اندر سے خالی، بے قرار اور کچھ سمجھ نہ آنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

ظالم اور جابر لوگوں کو دنیا میں ہر قسم کے ظلم و بربریت اور ناز و نعمت میں زندگی گزارنے کی جو کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے اس سے ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ظالموں کو پوچھنے اور ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے؟

جواب میں فرمایا: اللہ ان کے مظالم و بربریت سے غافل نہیں ہے۔ ان کو قیامت کے سخت ترین عذاب میں اضافے کے لیے مہلت دے رکھی ہے تاکہ یہ بیشتر عذاب کے سزاوار بن جائیں۔ یہ مہلت خود اپنی جگہ ایک عذاب ہے۔

اہم نکات

۱۔ دنیا میں مہلت ملنا، ظالمین کے لیے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔

وَ اَنۡذِرِ النَّاسَ یَوۡمَ یَاۡتِیۡہِمُ الۡعَذَابُ فَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا رَبَّنَاۤ اَخِّرۡنَاۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ نُّجِبۡ دَعۡوَتَکَ	۴۴۔ اور لوگوں کو اس دن کے بارے میں تنبیہ کیجیے جس دن ان پر عذاب آئے گا تو ظالم لوگ کہیں گے: ہمارے رب ہمیں تھوڑی مدت کے

وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَ لَمۡ تَکُوۡنُوۡۤا اَقۡسَمۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ مَا لَکُمۡ مِّنۡ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾

لیے ڈھیل دے دے اب ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور رسولوں کی اتباع کریں گے، (انہیں جواب ملے گا) کیا اس سے پہلے تم قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تمہارے لیے کسی قسم کا زوال وفنا نہیں ہے؟

تفسیر آیات

یہاں روز عذاب سے مراد عذاب دنیا ہے جیسے قوم عاد وثمود پر نازل ہوا۔ اس پر اَخِّرۡنَاۤ تاخیر کرو، کچھ مدت کے لیے ڈھیل دے دو، قرینہ ہے۔ اگر قیامت کے روز کے لیے ہوتا تو تاخیر کا لفظ استعمال نہ ہوتا بلکہ اس کے لیے تو رد واپس کرنے کا لفظ استعمال ہوا ہے:

یٰلَیۡتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُکَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا ... [1]

کاش ہم پھر (دنیا میں) لوٹا دیے جائیں اور ہم اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں....

اہم نکات

۱۔ ظالم ہمیشہ متکبر اور اپنے کو ناقابل تسخیر سمجھتا ہے: مَا لَکُمۡ مِّنۡ زَوَالٍ ....

۲۔ عذاب کے مشاہدے سے ندامت بے فائدہ ہے۔

وَّ سَکَنۡتُمۡ فِیۡ مَسٰکِنِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ وَ تَبَیَّنَ لَکُمۡ کَیۡفَ فَعَلۡنَا بِہِمۡ وَ ضَرَبۡنَا لَکُمُ الۡاَمۡثَالَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ حالانکہ تم ان لوگوں کے گھروں میں آباد تھے جو اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے اور تم پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا اور تمہارے لیے مثالیں بھی بیان کی تھیں۔

تفسیر آیات

تم انہی ظالموں کی جگہ رہائش پذیر ہو۔ ان کی تباہی کے بعد ان کی جگہ تم آباد ہو گئے ہو اور اس بات کا بھی تمہیں علم ہو گیا کہ ظالم لوگ کیسے ہلاک و نابود ہو گئے، ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا اور ہم نے ان ہلاکتوں اور ان ظالموں کے انجام کی مثالیں دے کر تم کو بھی برے انجام سے خبردار کیا مگر تم نے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔

----

[1] ۶ انعام: ۲۷

وَ قَدۡ مَکَرُوۡا مَکۡرَہُمۡ وَ عِنۡدَ اللّٰہِ مَکۡرُہُمۡ ؕ وَ اِنۡ کَانَ مَکۡرُہُمۡ لِتَزُوۡلَ مِنۡہُ الۡجِبَالُ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ اور انہوں نے اپنی مکاریاں کیں اور ان کی مکاریاں اللہ کے سامنے تھیں اگرچہ ان کی مکاریاں ایسی تھیں کہ جن سے پہاڑ بھی ٹل جائیں۔

تفسیر آیات

دعوت انبیاء علیہم السلام کے خلاف ان کی مکاریاں کم نہ تھیں لیکن اللہ ان کی مکاریوں سے آگاہ تھا۔ اس لیے ان کی ساری مکاریاں خواہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہوں اکارت رہ جاتی ہیں۔ خواہ ان کی مکاریوں میں پہاڑوں کو ہٹانے کی طاقت ہوتی تو بھی یہ اللہ کے سامنے ہیں اور ان کی یہ ساری مکاریاں بے اثر رہ جائیں گی۔

اہم نکات

۱۔ حق کے خلاف ظالموں کی مکاریاں ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔

فَلَا تَحۡسَبَنَّ اللّٰہَ مُخۡلِفَ وَعۡدِہٖ رُسُلَہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ پس آپ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا، اللہ یقیناً بڑا غالب آنے والا، انتقام لینے والا ہے۔

تفسیر آیات

ظالموں پر نزول عذاب میں تاخیر سے یہ خیال کسی کو نہ آئے کہ اللہ نے اپنے رسولوں سے جو وعدے کیے ہیں ان کو پورا نہ کیا جائے گا۔ اللہ نے تمام رسولوں کے ساتھ جو وعدے کیے ہیں ان سب کو پورا کیا۔ ان کے خلاف اٹھنے والے ہر قدم کو ناکام بنا دیا۔ ہر ظالم کو تباہ کر دیا، رسولوں کا بول بالا رہا اور ظالم نابود ہو گئے۔ وعدہ خلافی کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حالات ایسے پیش آگئے جن کے وجہ سے سابقہ وعدے پر عمل نہ ہو سکا۔ اللہ تو ہر حالت پر غالب آنے والا ہے لہٰذا وعدہ خلافی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ عدل الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ظالم سے انتقام لیتا ہے۔

۲۔ اپنے رسولوں سے جو وعدے کیے ہیں انہیں وہ پورا کرتا ہے۔

یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوۡا لِلّٰہِ الۡوَاحِدِ

۴۸۔ یہ (انتقام) اس دن ہو گا جب یہ زمین کسی اور زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی اور

الۡقَھَّارِ﴿۴۸﴾ سب خدائے واحد و قہار کے سامنے پیش ہوں گے۔

وَ تَرَی الۡمُجۡرِمِیۡنَ یَوۡمَئِذٍ مُّقَرَّنِیۡنَ فِی الۡاَصۡفَادِ﴿ۚ۴۹﴾ ۴۹۔ اس دن آپ مجرموں کو ایک ساتھ زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھیں گے۔

سَرَابِیۡلُھُمۡ مِّنۡ قَطِرَانٍ وَّ تَغۡشٰی وُجُوۡھَھُمُ النَّارُ ﴿ۙ۵۰﴾ ۵۰۔ ان کے لباس گندھک کے ہوں گے اور آگ ان کے چہروں پر چھائی ہوئی ہو گی۔

لِیَجۡزِیَ اللّٰہُ کُلَّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ﴿۵۱﴾ ۵۱۔ تاکہ اللہ ہر نفس کو اس کے عمل کی جزا دے، اللہ یقیناً بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

الۡاَصۡفَادِ: (ص ف د) الصفد کے معنی لوہے کی زنجیر یا طوق کے ہیں۔ جمع اصفاد ہے۔

سَرَابِیۡلُھُمۡ: (س ر ب ل) السربال کرتہ قمیص۔ خواہ کسی چیز سے بنی ہوئی ہو۔

قَطِرَانٍ: (ق ط ر ن) پگھلی ہوئی تارکول یا گندھک کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ: قیامت کے دن اس زمین و آسمان کا موجودہ نظام دگرگون ہو جائے گا اور موجودہ نظام طبیعت بدل جائے گا۔ جیسا کہ ہم نے اس قسم کی تبدیلی کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔

مثلاً ایک جرثومے کا اپنے عالم جرثومہ میں زندہ رہنے کا ایک نظام حیات ہے۔ جب وہ نطفہ بن جاتا ہے تو اس کا نظام حیات بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد جنین بننے کے بعد قوانین زندگی بدل جاتے ہیں اور یہ جنین جب شکم مادر سے اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کا طریقہ حیات و شرائط زندگی بدل جاتے ہیں۔ اسی طرح عالم آخرت کا نظام اگرچہ ایک طبیعی نظام ہو گا لیکن وہ دوسرا مختلف نظام طبیعت ہو گا۔ اس نظام طبیعت کا نفخ صور کے ساتھ کوئی تعلق ہو گا جس کے تقاضوں کے مطابق سب مردے زندہ ہو جائیں گے وَ بَرَزُوۡا لِلّٰہِ الۡوَاحِدِ الۡقَھَّارِ ... سب اللہ کے حضور پیش ہو جائیں گے۔

اسی نظام طبیعت میں مجرمین اگرچہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے، ان کے جسم پر تارکول یا گندھک جیسا آتش گیر مادہ بطور لباس ہو گا اور ان کے جسم پر آگ چھائی ہوئی ہو گی، اس کے باوجود وہ زندہ اور عذاب سہتے رہیں گے۔

اسی نظام کے تحت یہ زمین تُحَدِّثُ اَخۡبَارَھَا[1] اپنی خبریں بیان کرے گی۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن موجودہ نظام طبیعت بدل جائے گا۔

۲۔ اس دن سارے راز منکشف ہو جائیں گے: وَبَرَزُوۡا لِلّٰہِ ....

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنۡذَرُوۡا بِهٖ وَلِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ یہ (قرآن) لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے تا کہ اس کے ذریعے لوگوں کی تنبیہ کی جائے اور وہ جان لیں کہ معبود تو بس وہ ایک ہی ہے نیز عقل والے نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر آیات

یہ قرآن پوری انسانیت ” لِلنَّاسِ “ کے لیے ایک پیغام ہے۔ اس پیغام کی روح تین چیزوں پر مشتمل ہے:

۱۔ لوگوں کی تنبیہ ہو جائے۔ خطرات میں گھرے ہوئے انسان کے لیے سب سے زیادہ ضرورت تنبیہ و ہدایت کی ہوتی ہے۔ مہربان ماں، باپ سب سے پہلے اپنے ناداں بچے کو خطرات سے بچانے کے لیے تنبیہ کرتے ہیں۔

۲۔ توحید: خدائے واحد کی پرستش، ایک ہی خدا کی حاکمیت کو قبول اور ایک ہی قانون دہندہ کو تسلیم کرنا صرف ایک عقیدہ نہیں ہے بلکہ ایک نظام زندگی ہے جس کے تحت موحد انسان، انسان کی بندگی سے آزاد ہو کر انسانی قدروں سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کی حقانیت پر ایک بین دلیل یہ ہے کہ یہ تعلیمات ہمیشہ عقل و خرد کو دعوت فکر دیتی ہیں اور عقول سلیمہ کو سوچنے اور حقائق کا کھوج لگانے کی دعوت دیتی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ توحید پیام قرآن کی روح ہے: اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ....

۲۔ عقل سلیم ہی قرآن سے استفادہ کر سکتی ہے: وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ۔

سُورۃ الحجر

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورہ میں قوم ثمود اور قوم حجر کا ذکر آیا ہے اس لیے سورہ کا نام الحجر ہے۔
بعض آیات کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورہ اوائل بعثت میں نازل ہوا ہے۔
چنانچہ آیہ

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿﴾ اِنَّا کَفَیۡنٰکَ الۡمُسۡتَہۡزِءِیۡنَ ﴿﴾ [1]

آپ کو جس چیز کا حکم ملا ہے اس کا واشگاف الفاظ میں اعلان کریں اور مشرکین کی اعتنا نہ کریں۔ آپ کے واسطے ان تمسخر کرنے والوں سے نپٹنے کے لیے یقیناً ہم کافی ہیں.

تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادق علیہ السلام اور تفسیر قرطبی میں عبد اللہ بن عبید سے روایت ہے کہ اس آیت کے نزول سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیر اعلانیہ تبلیغ کرتے تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد آپؐ نے علانیہ طور پر تبلیغ شروع فرمائی۔

اوائل بعثت میں لوگ آپ کو مجنون کہتے تھے:

وَ قَالُوۡا یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡ نُزِّلَ عَلَیۡہِ الذِّکۡرُ اِنَّکَ لَمَجۡنُوۡنٌ ﴿﴾ [2]

اور (کافر لوگ) کہتے ہیں: اے وہ شخص جس پر ذکر نازل کیا گیا ہے یقیناً تو مجنون ہے۔

اس پر اور مسلسل استہزاء و مذاق اڑانے پر اللہ تسلی دیتا ہے:

وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ﴿﴾ [3]

اور بتحقیق ہمیں علم ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے آپ یقیناً دل تنگ ہو رہے ہیں۔

---

[1] ۱۵ حجر: ۹۴، ۹۵   [2] ۱۵ حجر: ۶   [3] ۱۵ حجر: ۹۷

پہلا مضمون رسولوں، ان پر ایمان لانے اور ان کی تکذیب کرنے والوں کے بارے میں اللہ کے طریق عمل اور اس کی سنت کے ذکر مشتمل ہے۔

دوسرا مضمون کائناتی مطالعہ سے متعلق ہے۔

تیسرا مضمون قصہ آدم و ابلیس اور اس کے پیروکاروں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

چوتھا مضمون مختلف قوموں جیسے لوط، ثمود، عاد کی تباہی سے متعلق ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
بنام خدائے رحمن رحیم

الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ وَ قُرۡاٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱﴾
۱۔ الف لام را، یہ کتاب اور قرآن مبین کی آیات ہیں۔

تفسیر آیات

اس سورہ مبارکہ کے تعارفی جملے ہیں کہ یہ سورہ کتاب الٰہی اور صریح البیان قرآن کی آیات پر مشتمل ہے۔ بعض کے نزدیک کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔

اہم نکات

۱۔ عصر رسالت ہی میں قرآن پر کتاب کا اطلاق ہوتا تھا۔

رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ کَانُوۡا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۲﴾
۲۔ ایک وقت ایسا ہو گا کہ کافر لوگ آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں کفر پر قائم رہنے والوں کے لیے شدید تنبیہ کے ساتھ ایمان لانے کی تشویق بھی ہے اور اس استہزاء کی طرف اشارہ بھی ہے جس کا قیامت کے دن کافروں کو سامنا کرنا ہے۔

روایت ہے کہ امام باقر علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ کَانُوۡا مُسۡلِمِیۡنَ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

ینادی منادیوم القیامۃ یسمع الخلائق انہ لا یدخل الجنۃ الا مسلم ثم یود سائر الخلق انھم کانوا مسلمین۔[1]

روز قیامت ایک ندا دینے والا ندا دے گا جسے تمام لوگ سنیں گے: جنت میں سوائے مسلمانوں کے کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ اس وقت دوسرے لوگ کہیں گے: کاش ہم مسلمان ہوتے۔

---

[1] تفسیر العیاشی ۲: ۲۳۹

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

جب مسلمان جنت اور کفار جہنم میں داخل ہوں گے تو کفار کہیں گے: کاش ہم مسلمان ہوتے۔

اہم نکات

۱۔ کافر کے لیے بدترین عذاب یہ ہے کہ ان کے دشمنوں یعنی مسلمانوں کا مقام قابل رشک ہو: لَوۡ کَانُوۡا مُسۡلِمِیۡنَ۔

ذَرۡہُمۡ یَاۡکُلُوۡا وَ یَتَمَتَّعُوۡا وَ یُلۡہِہِمُ الۡاَمَلُ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ﴿۳﴾

۳۔ انہیں چھوڑ دیجیے کہ وہ کھائیں اور مزے کریں اور (طویل) آرزوئیں انہیں غافل بنا دیں کہ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

تشریح کلمات

یُلۡہِہِمُ: (ل ھ و) اَلۡھَاہُ۔ اسے غافل بنا دیا۔ لاھیۃ قلوبھم۔ ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ ذَرۡہُمۡ یَاۡکُلُوۡا وَ یَتَمَتَّعُوۡا: ان کافروں پر حجت پوری ہو گئی ہے اور یہ قابل ہدایت نہیں ہیں۔ انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیجیے۔ یہ دنیا کی لذتوں میں مگن رہیں۔ یہ کھانے پینے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ مال و متاع، جاہ و سلطنت اور لمبی زندگی جیسی آرزوؤں نے انہیں غافل بنا دیا ہے۔

۲۔ وَ یُلۡہِہِمُ الۡاَمَلُ: ان کافروں کی دو باتوں کا ذکر ہے: خواہشات میں مگن اور لمبی آرزوئیں، جو خدا فراموش قوموں کی خاصیتیں ہیں۔ جو فرد یا قوم ناز و نعمتوں میں مگن ہوتی ہے وہ خدا و آخرت سے غافل ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم مسلم معاشروں کے خوشحال افراد اور مغربی اقوام میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ اَخۡوَفَ مَا اَخَافُ عَلَیۡکُمُ اثۡنَتَانِ اتِّبَاعُ الۡھَوَی وَطُولُ الۡاَمَلِ فَاَمَّا اتِّبَاعُ الۡھَوَی فَیَصُدُّ عَنِ الۡحَقِّ وَ اَمَّا طُولُ الۡاَمَلِ فَیُنۡسِی الۡآخِرَۃَ ...[1]

مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے۔ ایک خواہشوں کی پیروی اور دوسرے امیدوں کا پھیلاؤ۔ خواہشوں کی پیروی وہ چیز ہے جو حق سے روک دیتی ہے اور امیدوں کا پھیلاؤ آخرت کو بھلا دیتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغۃ ص ۸۳ خ ۴۲

اہم نکات

۱۔ زندگی کی ناز و نعمت خدا فراموشی کے اسباب ہیں۔ یَاۡکُلُوۡا وَ یَتَمَتَّعُوۡا

۲۔ جو لوگ لمبی آرزوں میں رہتے ہیں وہ آخرت سے غافل ہوتے ہیں۔ وَ یُلۡہِہِمُ الۡاَمَلُ

وَ مَاۤ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا وَ لَہَا کِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۴﴾

۴۔ اور ہم نے کسی بستی کو ہلاکت میں نہیں ڈالا مگر یہ کہ اس کے لیے ایک معینہ مدت لکھی ہوئی تھی۔

مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّۃٍ اَجَلَہَا وَ مَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ﴿۵﴾

۵۔ کوئی قوم اپنی معینہ مدت سے نہ آگے نکل سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

تفسیر آیات

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاندین کو نابود اس لیے نہیں کیا جا رہا ہے کہ ابھی ان کا اجل موعود نہیں آئی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ اعراف، آیت: ۳۴

اہم نکات

۱۔ ہر قوم کا ایک صحیفہ عمل ہوتا ہے جس میں اس کی مدت حیات درج ہوتی ہے۔

۲۔ مہلت برائے عمل۔ عمل کے مطابق اجل ہوتی ہے۔

وَ قَالُوۡا یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡ نُزِّلَ عَلَیۡہِ الذِّکۡرُ اِنَّکَ لَمَجۡنُوۡنٌ ؕ﴿۶﴾

۶۔ اور (کافر لوگ) کہتے ہیں: اے وہ شخص جس پر ذکر نازل کیا گیا ہے یقیناً تو مجنون ہے۔

لَوۡ مَا تَاۡتِیۡنَا بِالۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۷﴾

۷۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو کیوں نہیں لاتا؟

مَا نُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ مَا کَانُوۡۤا اِذًا مُّنۡظَرِیۡنَ ﴿۸﴾

۸۔ (کہد یجیے) ہم فرشتوں کو صرف (فیصلہ کن) حق کے ساتھ ہی نازل کرتے ہیں اور پھر کافروں کو مہلت نہیں دیتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالُوۡا یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡ نُزِّلَ: قرآن کو ذِکر اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اساساً نصیحت کی کتاب

ہے۔ مشرکین از روئے طنز و استہزاء کہتے ہیں: اے وہ شخص! جس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس پر نصیحتوں والی کتاب نازل کی گئی ہے، تو مجنون ہے۔ چونکہ ان کی عقل یہ ہے کہ باپ دادا کی روایات پر قائم رہا جائے۔ وہ اس اندھی تقلید کو عقل کہتے اور عقل سے کام لینے والوں کو مجنون کہتے تھے۔

۳۔ لَوۡمَا تَاۡتِیۡنَا بِالۡمَلٰٓئِکَۃِ: اکثر رسولوں سے ان کی امتوں نے یہی مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے دعوائے نبوت کی تصدیق کے لیے فرشتوں کو حاضر کریں۔

جب کہ فرشتوں کا وجود عالم امتحان و آزمائش سے متعلق نہیں ہے کہ ان کے ذریعے حجت پوری کی جائے بلکہ فرشتے نتیجۂ آزمائش کے لیے اترتے ہیں، پھر مہلت کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الانعام آیت ۹۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اتمام حجت کے لیے فوق الفطرت طاقت استعمال نہیں فرماتا بلکہ خود مختار رکھتا ہے۔

۲۔ جو منطق نہیں رکھتا وہ طاقت یا الزام تراشی کا سہارا لیتا ہے: اِنَّکَ لَمَجۡنُوۡنٌ۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴿۹﴾

۹۔ اس ذکر کو یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

تفسیر آیات

مشرکین نے نُزِّلَ عَلَیۡہِ الذِّکۡرُ، جس پر یہ ذکر نازل کیا گیا ہے، کی تعبیر بہ صیغہ مجہول اختیار کی ہے اور نازل کرنے والے کا ذکر نہ کر کے یہ استہزاء کیا ہے: یہ نصیحتوں والی کتاب نہ معلوم کس کی طرف سے اس مجنون پر نازل ہو رہی ہے۔

۱۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ: اس آیت میں پورے تاکیدی لفظوں کے ساتھ تین متکلم کی ضمیروں میں فرمایا: اِنَّا، نَحۡنُ، نَزَّلۡنَا۔ اس ذکر کو ہم نے خود ہی نازل کیا ہے۔ رہا دوسرا نکتہ کہ جس پر نازل ہوا ہے وہ دیوانہ ہے تو سن لو! یہ ایک ایسا ذکر ہے جس کے ہم خود محافظ ہیں۔ یہ ذکر دیوانے پر نازل نہیں ہو رہا، ایک امین سینے پر نازل ہو رہا ہے جہاں اس کی پوری محافظت ہو گی۔ نہ تم اسے مٹا سکو گے اور نہ قیامت تک اس کے کسی حرف عبارت اور جملے میں تبدیلی و تحریف ہو سکتی ہے۔

۲۔ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ: اللہ تعالیٰ خود قرآن کا محافظ ہے۔ چونکہ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ ہے، ممکن نہیں ہے کہ یہ معجزہ محفوظ نہ رہے اور اسے بیرونی و داخلی دشمن غیر محفوظ بنا دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا جب معجزے کے طور پر دیا گیا ہے تو ممکن نہیں ہے کہ فرعون کے جادوگروں کے مقابلے کے

وقت اس عصا کو بیرونی دشمن فرعون اور داخلی دشمن سامری کوئی نقصان پہنچا سکے۔ لہٰذا قرآن تحریف ناپذیر ہے۔ اس میں تحریف ممکن نہیں ہے۔

۳۔ چنانچہ آج ہم اس محافظت کو واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ آسمانی کتابوں میں صرف قرآن مجید لفظ بہ لفظ محفوظ ہے۔ قرآن کے الفاظ، حروف بلکہ طرز و طریقہ تحریر تک میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کوئی جابر اس کا راستہ روک سکا اور نہ کوئی سازش اس کے اثرات کو کم کر سکی۔ نہ کوئی اعتراض و تشکیک اس کی قدر و قیمت کو گھٹا سکی بلکہ دشمنوں کی تمام سازشوں، حاسدوں کے تمام طعنوں اور جابروں کی تمام طاقتوں کے باوجود آج یہ قرآن، دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

قرآن مسلمانوں کے ہاتھوں یداً بیدٍ تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے جیسا کہ جنگ احد و بدر اور فتح مکہ کے وقائع تواتر سے ہم تک پہنچے ہیں۔

قرآن مجید کے تحریف سے محفوظ ہونے پر ہم مقدمہ میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ یہ قرآن ہر قسم کی تحریفوں سے محفوظ ہے: اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔

۲۔ اس ذکر کا نازل کنندہ اللہ ہونا، اس کی محافظت کی ضمانت ہے: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا ....

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ شِیَعِ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ اور بتحقیق ہم نے آپ سے پہلے بھی گزشتہ قوموں میں رسول بھیجے ہیں۔

وَ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ اور ان کے پاس کوئی رسول ایسا نہیں آیا جس کا انہوں نے استہزاء نہ کیا ہو۔

کَذٰلِکَ نَسۡلُکُہٗ فِیۡ قُلُوۡبِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿ۙ۱۲﴾

۱۲۔ اسی طرح ہم اس ذکر کو مجرموں کے دلوں میں سے گزارتے ہیں،

لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ وَ قَدۡ خَلَتۡ سُنَّۃُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ کہ وہ اس (رسول) پر ایمان نہیں لائیں گے اور بے شک پہلوں کی روش بھی یہی رہی ہے۔

تشریح کلمات

شیع: العین میں آیا ہے: شیعة الرجل اصحابه و اتباعة۔ کسی شخص کا شیعہ ہونے کا مطلب یہ ہے

کہ اس کا ساتھی اور تابعدار ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ: انبیاء و رسل کو استہزاء کا نشانہ بنانا کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تو ہمیشہ ان لوگوں کا حربہ رہا ہے جو منطق نہیں رکھتے۔ تاریخ انبیاء میں کوئی رسول ایسا نہیں گزرا جس کا استقبال لوگوں نے بے تابی سے کیا ہو۔

۲۔ وَمَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ: یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے کوئی نبی مستثنیٰ نہیں ہے کہ اس کی قوم نے اس رسول کا مذاق نہ اڑایا ہو، طعنے نہ دیے ہوں اور تحقیر آمیز رویہ اختیار نہ کیا ہو۔ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو سب سے زیادہ اذیت دی گئی۔ چنانچہ اسی سورہ کی آیت ۹۷ میں ارشاد ہوا:

وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ○	اور تحقیق ہمیں علم ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے آپ یقیناً دل تنگ ہو رہے ہیں۔

۳۔ کَذٰلِکَ نَسۡلُکُہٗ فِیۡ قُلُوۡبِ: مجرم کے دل میں قساوت اس حد تک ہے کہ ذکر کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا یا اس کے دل میں ذکر کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ از روئے مجازات اس ذکر کو ان کے دلوں سے اتمام حجت کے لیے ایسے گزار دیتا ہے کہ اس ذکر کی برکتوں سے محروم رہے اور ایمان کی نعمت سے بھی۔

اہم نکات

۱۔ یہ قرآن قلب مؤمن کے لیے ٹھنڈک اور قلب مجرم کے لیے آتش ہے۔

وَلَوۡ فَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوۡا فِیۡہِ یَعۡرُجُوۡنَ ﴿۱۴﴾	۱۴۔ اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں اور وہ روز روشن میں اس پر چڑھتے چلے جائیں۔
لَقَالُوۡۤا اِنَّمَا سُکِّرَتۡ اَبۡصَارُنَا بَلۡ نَحۡنُ قَوۡمٌ مَّسۡحُوۡرُوۡنَ ﴿۱۵﴾	۱۵۔ تو یہی کہیں گے: ہماری آنکھوں کو یقیناً مدہوش کیا گیا بلکہ ہم پر جادو کیا گیا ہے۔

تفسیر آیات

ان کا ایمان نہ لانا دلیل و برہان یا معجزات کے فقدان کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اگر ہم فرشتوں کے حاضر کرنے سے زیادہ مؤثر قدم اٹھاتے کہ ان کو آسمان کی طرف اٹھا کر لے جاتے، یہ خدائی اسرار ملکوت و

عجائب آسمانی کا روز روشن، عالم بیداری میں بہ چشم خود مشاہدہ کر بھی لیتے تو بھی یہ ایمان نہ لاتے اور اسے جادو قرار دیتے۔ چنانچہ ایسا ہوا بھی ہے کہ روسی خلانوردوں نے جب فضائے بالا میں پہلی پرواز کی تو انہوں نے کہا: یوں لگ رہا تھا کہ ہماری آنکھوں پر جادو کیا گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عناد والا کافر مشاہدات و محسوسات کا بھی منکر ہوتا ہے۔

۲۔ آسمان کے بھی دروازے ہوتے ہیں: بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ ....

۳۔ آسمان کی طرف عروج ممکن امر ہے: فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اور بتحقیق ہم نے آسمانوں میں نمایاں ستارے بنا دیے اور دیکھنے والوں کے لیے انہیں زیبائی بخشی۔

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اور ہم نے ہر شیطان مردود سے انہیں محفوظ کر دیا ہے۔

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ ہاں اگر کوئی چوری چھپے سننے کی کوشش کرے تو ایک چمکتا ہوا شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

تشریح کلمات

بروج: (ب ر ج) بروج قصور کو کہتے ہیں۔ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ....[1] اصل میں مادۂ ب ر ج ظہور و نمایاں کے معنوں میں ہے۔ اسی لیے عورت کی طرف سے اظہار زینت کو تبرج کہتے ہیں۔ قصور اور ستاروں کو بروج اسی ظہور و نمایاں ہونے کے اعتبار سے کہتے ہیں۔

شِهَابٌ: (ش ھ ب) شعلہ آتش کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

قدیم علم ہیئت، فلکیات میں برج ان بارہ منزلوں کو کہتے ہیں جن پر سورج کے مدار کو تقسیم کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ قرآن کا بھی اشارہ انہی بروج کی طرف ہے حالانکہ فلکیاتی اصطلاح سے قرآن کا کوئی ربط نہیں ہے۔ آیت میں بروج سے مراد آسمان میں نمایاں نظر آنے والے ستارے ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا:

وَحَفِظۡنٰہَا مِنۡ کُلِّ شَیۡطٰنٍ رَّجِیۡمٍ ۙ﴿﴾ اِلَّا مَنِ اسۡتَرَقَ السَّمۡعَ فَاَتۡبَعَہٗ شِہَابٌ مُّبِیۡنٌ ﴿﴾ [1]

اور ہم نے ہر شیطان مردود سے انہیں محفوظ کر دیا ہے۔ ہاں اگر کوئی چوری چھپے سننے کی کوشش کرے تو ایک چمکتا ہوا شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

سورہ جن میں جنوں کی زبانی بیان ہوا:

وَّ اَنَّا لَمَسۡنَا السَّمَآءَ فَوَجَدۡنٰہَا مُلِئَتۡ حَرَسًا شَدِیۡدًا وَّ شُہُبًا ۙ﴿﴾ وَّ اَنَّا کُنَّا نَقۡعُدُ مِنۡہَا مَقَاعِدَ لِلسَّمۡعِ ؕ فَمَنۡ یَّسۡتَمِعِ الۡاٰنَ یَجِدۡ لَہٗ شِہَابًا رَّصَدًا ﴿﴾ [2]

اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسے سخت پہرے داروں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا۔ اور یہ کہ پہلے ہم سننے کے لیے آسمان کے مقامات میں بیٹھا کرتے تھے، اب اگر کوئی سننا چاہتا ہے تو وہ ایک شعلے کو اپنی کمین میں پاتا ہے۔

سورہ الملك میں فرمایا:

وَ لَقَدۡ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ وَ رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ ... [3]

اور بیشک ہم نے قریب ترین آسمان کو (ستاروں کے) چراغوں سے آراستہ کیا اور انہیں شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بنایا۔

وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ ٭ۖ وَ حِفۡظًا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿﴾ [4]

اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا اور محفوظ بھی بنایا یہ سب بڑے غالب آنے والے، دانا کی تقدیر سازی ہے۔

ایک اہم سوال: یہ پیدا ہو رہا ہے کہ انسان نے فضا کو تسخیر کر لیا اور دیکھ لیا ہے کہ آسمانوں سے فرشتوں کی کوئی آواز نہیں آتی، نہ ہی کوئی ایسے اسرار موجود ہیں جو چرائے جا سکیں۔ ان میں فرشتوں کا کوئی وجود محسوس ہوا نہ ہی قابل سرقت اسرار کا پتہ چلا ہے۔

اس کے جواب میں بعض مفسرین نے آیت کی توجیہات و تاویلات کی ہیں۔ بعض نے احتمال دیا ہے کہ بطور مثال یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے کہ غیر حسی حقائق واضح کرنے کے لیے انہیں حسی لباس میں پیش کیا گیا ہے۔[5]

بعض دیگر مفسرین کے نزدیک سمآء کا یہاں مفہوم حق، ایمان اور روحانیت کے آسمان کی طرف اشارہ ہے۔ شیطانوں کی ہر وقت یہ کوشش ہے کہ وہ اس چاردیواری میں داخل ہونے کے لیے راہ پالیں اور سچے مؤمنین اور حامیان حق کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسوں کے ذریعے نفوذ پیدا کر لیں لیکن مردان الٰہی اپنے علم و تقویٰ کی طاقتور موجوں کے ساتھ ان پر حملہ کرتے اور انہیں آسمان کے قریب ہونے سے ہانکتے ہیں۔[6]

---

[1] ۱۵ حجر: ۱۷۔ ۱۸ [2] ۷۲ جن: ۸۔ ۹ [3] ۶۷ ملك: ۵
[4] ۴۱ حٰمٓ سجده: ۱۲ [5] المیزان، تفسیر سورۂ صافات [6] تفسیر نمونه ۱۱: ۶۳

اس تاویل کے مطابق آسمان سے روحانیت و ایمان اور شہاب ثاقب سے علم و تقویٰ مراد ہے جو سباق و سیاق آیت سے بہت دور ہے نیز تاویل کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب آیت کا ظاہری مفہوم کسی امر مسلم سے متصادم ہو۔ ہم آگے بتائیں گے کہ یہاں آیت کا ظاہری مفہوم کسی مسلمہ سے متصادم نہیں ہے۔ اس تاویل کی وجہ وہ انکشافات ہیں جو انسان کو فضائے ارضی کے نہایت محدود علاقے میں ہوئے ہیں۔

آسمان اول: سورہ ملک اور سورہ حٰمٓ سجدہ میں فرمایا:

وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ....　اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا....

اس آیت کی رو سے معلوم ہوا کہ جو ستارے اب تک انسان کے مشاہدے میں آئے ہیں وہ سات آسمانوں میں سے آسمان اول یعنی السَّمَآءَ الدُّنْيَا سے مربوط ہیں۔ اس صورت میں سمائے دنیا کی وسعتوں کا اندازہ لگانا اب تک انسان کے لیے ممکن نہیں ہوا ہے۔ جس حد تک انسان کے علم و مشاہدے میں آیا ہے وہ بھی عظیم اور وسیع ہے کہ بعض ستارے ہم سے کئی ارب نوری سال کے فاصلے پر ہیں اور بعض ستارے ایسے بھی ہیں جن کی روشنی ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ اس فضائے بیکراں میں اس ارضی فضا کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں ہے جسے انسان نے مسخر کیا ہے اور جس کی بنا پر آیت کی تاویل کی جاتی ہے۔

مصابیح و رجوم: سورۃ الملک کی آیت میں ان ستاروں کو دو عنوان دیے گئے ہیں: اول یہ کہ ان ستاروں کو چراغ بنایا اور دوم یہ کہ ان کو شیاطین کو مارنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ سورہ حٰمٓ سجدہ کی آیت میں فرمایا: ہم نے ان ستاروں کو چراغ اور تحفظ کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی ستارے شیطان کو دھتکارنے کا ذریعہ بھی ہیں۔

شہاب ثاقب: شہاب سے مراد درج بالا آیات کے استعمال کے اعتبار سے وہی ستارے ہیں جن سے آسمان اول کو آراستہ کیا ہے اور اس بات پر کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ شہاب سے مراد وہ آسمانی پتھر ہیں جو ہر روز اوسطاً دس کھرب ہوتے ہیں اور ان میں سے دو کروڑ زمین کی فضا میں داخل ہوتے ہیں اور کبھی ستر کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف آتے ہیں۔ اسی تیز رفتاری کی وجہ سے جب وہ زمین کے گرد موجود ہوائی غلاف سے ٹکراتے ہیں تو شعلہ آتش میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور زمین پر بسنے والوں کو آتشیں گولی چلنے کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔

قدیم یونانی فلاسفروں کا ان شہابوں کے بارے میں یہ نظریہ تھا کہ آفتاب کی تمازت سے جو بخارات زمین سے اٹھتے ہیں ان میں کچھ آتش گیر مادے بھی ہوتے ہیں۔ اوپر جا کر جب ان کو آفتاب یا کسی اور چیز سے مزید گرمی ملتی ہے تو وہ سلگ اٹھتے ہیں اور دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ستارہ ٹوٹا ہے۔

تعجب کا مقام ہے کہ ہمارے معاصر مؤلف معارف قرآن نے اس فرسودہ نظریے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا ہے۔

لہٰذا آسمان سے مراد نہ فضائے ارضی کا نہایت محدود علاقہ ہے، نہ ہی شہاب سے مراد وہ آسمانی پتھر ہیں جو ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں۔ البتہ بعض احادیث میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ شہاب سے مراد شہاب ثاقب ہیں جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں لیکن قرآن کی تعبیر اس کے خلاف ہے۔ قرآن کی تعبیر کے مطابق جو ستارے آسمان اول کے لیے چراغ و زینت بنائے گئے ہیں وہی شہاب ثاقب کا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ انہیں ستاروں کو قرآن نے رُجُوۡمًا اور حفظاً سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

کان ابلیس یخرق السماوات السبع فلما ولد عیسی (ع) حجب عن ثلاث سماوات و کان یخرق اربع سماوات، فلما ولد رسول اللّٰہ (صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم) فی عام الفیل فی شہر ربیع الاول حین طلع الفجر حجب عن السبع کلہا و رمیت الشیاطین بالنجوم ....[1]

ابلیس سات آسمانوں کو پھلانگتا تھا۔ جب عیسیٰ ع کی ولادت ہوئی تو اسے تین آسمانوں سے روک دیا گیا اور وہ چار آسمانوں کو پھلانگنے لگا۔ جب عام الفیل ربیع الاول میں طلوع فجر کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی تو پورے سات آسمانوں سے روک دیا گیا اور ستاروں سے شیطانوں کو نشانہ بنایا گیا۔

اس روایت اور دیگر روایات میں بھی ستاروں کو شیاطین کو نشانہ بنانے کا ذریعہ بنایا گیا ہے اور آسمان سے مراد بھی آسمان کی فضائے بیکراں ہے جہاں فرشتگان کا مسکن اور محل راز ہائے قدرت ہے۔

علامہ طباطبائیؒ کی توجیہ بھی اسی بات کے نزدیک ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

وعلی ہذا یکون المراد من السماء التی تسکنہا الملائکۃ عالماً ملکوتیاً... والمراد باقتراب الشیاطین.. اقترابہم من عالم الملائکۃ.. و رمیہم بما لا یطیقونہ من نور الملکوت ....[2]

لہٰذا ہوسکتا ہے فرشتوں کی سکونت والے آسمان سے مراد کوئی عالم ملکوت ہو اور شیطانوں کا نزدیک ہونے کی کوشش سے مراد یہی عالم ملائکہ سے نزدیک ہونا ہو اور ان شیطانوں کو نور ملکوت سے نشانہ بنایا جاتا ہو۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی صنعت میں جمالیاتی عنصر غالب ہے: وَّ زَیَّنّٰہَا لِلنّٰظِرِیۡنَ ....

۲۔ راز ہائے قدرت کو کوئی جن نہیں چرا سکتا۔ وَ حَفِظۡنٰہَا ....

---

[1] الخرائج و الجرائح ۱: ۲۱ [2] المیزان ذیل آیہ۔

وَالۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰہَا وَاَلۡقَیۡنَا فِیۡہَا رَوَاسِیَ وَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ مَّوۡزُوۡنٍ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ گاڑ دیے اور ہم نے زمین میں معینہ مقدار کی ہر چیز اگائی۔

تشریح کلمات

مَّوۡزُوۡنٍ: (و ز ن) الوزن کسی چیز کی مقدار معلوم کرنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰہَا: زمین کو اس طرح پھیلایا کہ اس کی پشت پر بسنے والوں کو زندگی کی ہر سہولت میسر آئے۔ نہ پوری زمین کو کوہستان بنایا کہ زراعت و سکونت کے قابل نہ ہو، نہ ہی پوری زمین کو میدان بنایا۔ اگر ایسا ہوتا تو ان میدانوں کو سیراب کرنے کے لیے پہاڑوں سے دریا نہ بہتے۔

۲۔ وَاَلۡقَیۡنَا فِیۡہَا رَوَاسِیَ: ان پہاڑوں سے بہنے والے دریاؤں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے میدانوں میں ہر قسم کی سبزی اگائی۔

۳۔ وَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ: زمین سے اُگنے والی ہر چیز موزوں و معین مقدار میں ہے۔ یہ موزونیت اس قدر دقیق اور عمیق ہے کہ اس توازن میں ذرہ برابر فرق آجائے تو وہ پودا وجود میں نہیں آ سکتا۔ یہ موزوں عناصر کے توازن سے وجود میں آتا ہے اور عناصر کی ترکیب سے نباتات میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ دانہ جب زمین میں جاتا ہے تو اس دانے کو علم ہے کہ مطلوبہ چیز اگانے کے لیے کن عناصر کو جذب کرنا ہے۔ چنانچہ جڑوں کو یہ ہدایات جاری کی جاتی ہے۔ مطلوبہ چیز، مثلاً ٹماٹر کو لازم عناصر کے علاوہ دیگر عناصر کو جذب نہیں کرنا ہے چونکہ دیگر عناصر ٹماٹر کے لیے موزوں نہیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ کوہ و دمن انسان کو وسائل حیات فراہم کرتے ہیں۔

۲۔ ایک وزن و مقدار کی حدود میں نباتات اُگتے ہیں: وَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ....

۳۔ نباتات کی نشوونما میں توازن کو دخل ہے۔

وَجَعَلۡنَا لَکُمۡ فِیۡہَا مَعَایِشَ وَمَنۡ لَّسۡتُمۡ لَہٗ بِرٰزِقِیۡنَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اور ہم نے تمہارے لیے زمین میں سامان زیست فراہم کیا اور ان مخلوقات کے لیے بھی جن کی روزی تمہارے ذمے نہیں ہے۔

تفسیر آیات

اس زمین میں جیسا کہ انسانوں کے لیے سامان حیات فراہم کیا گیا ہے ایسے ہی ان جانداروں، پرندوں، چرندوں اور بری و بحری حیوانات کے لیے بھی سامان زیست فراہم کیے گئے ہیں جن کی روزی کسی غیر اللہ کے ذمے نہیں ہے۔

اس آیت کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے: جن کی روزی تمہارے ذمے نہیں ہے سے مراد تمہارے نوکر، عیال، بچے، جانور وغیرہ ہیں جن کے بارے میں تمہارا خیال یہ ہے کہ تم روزی دیتے ہو لیکن حقیقۃً ان کی روزی بھی ہم دیتے ہیں تم نہیں۔

اہم نکات

۱۔ زمین کی خلقت کی غرض و غایت صرف انسان تک محدود نہیں ہے: وَ مَنۡ لَّسۡتُمۡ لَہٗ بِرٰزِقِیۡنَ ۔

وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ ۫ وَ مَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۲۱﴾

۲۱۔اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں پھر ہم اسے مناسب مقدار کے ساتھ نازل کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

خَزَآئِنُہٗ: (خ ز ن) الخزن کے معنی کسی چیز کو ایک جگہ محفوظ کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا: خزانہ خدا ایسا تو نہیں کہ اس میں چیزیں محفوظ ہوں بلکہ خزانہ خدا سے مراد وہ نعمتیں ہیں جنہیں خلق و ایجاد کرنا اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ لہٰذا جس طرح اللہ کی قدرت لامتناہی ہے اس کا خزانہ بھی لامتناہی و لامحدود ہے۔

۲۔ وَ مَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ: مقام قدرت سے گزر کر مقام خلقت و فعلیت میں آنے کو نزول سے تعبیر فرمایا ہے۔ لہٰذا تمام اشیاء خزینہ الٰہی میں بالقوہ موجود ہوتی ہیں اور جب خزانہ قدرت سے نزول کر کے مرحلہ ایجاد و تخلیق میں آتی ہیں تو ایک تقدیر و توازن کے ساتھ آتی ہیں کیونکہ خزانہ قدرت سے مرحلہ خلقت میں نزول اندھی بانٹ نہیں ہے بلکہ بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ایک مقررہ حد، ایک معین دستور اور ایک حکیمانہ تقدیر کے مطابق ہے۔

اہم نکات

۱۔ نظام وجود، ایک حکیمانہ تقدیر پر قائم ہے: نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ۔

۲۔ ہر چیز کا سرچشمہ اللہ کے پاس ہے: عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ ....

وَ اَرۡسَلۡنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسۡقَیۡنٰکُمُوۡہُ ۚ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ لَہٗ بِخٰزِنِیۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور ہم نے باردار کنندہ ہوائیں چلائیں پھر ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے تمہیں سیراب کیا (ورنہ) تم اسے جمع نہیں رکھ سکتے تھے۔

تشریح کلمات

لَوَاقِحَ: (ل ق ح) لقحت الناقۃ کے معنی اونٹنی کے حاملہ ہونے کے ہیں۔ اسی طرح درخت کے پھلدار ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ یہاں لَوَاقِحَ لاقح کی جمع ہے۔ بارآور کرنے والا۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہوائیں نباتات کی بارآوری کا ذریعہ اور لقاح کا لفظ بارآوری کے معنوں بھی میں استعمال ہوتا ہے لیکن سیاق آیت کا اشارہ اس مطلب کی طرف نہیں ہے۔ آیت یہ بتانا چاہتی ہے: ہم پرنم ہواؤں کو چلاتے ہیں اور ان سے بادلوں کو باردار بناتے ہیں: فَاَنۡزَلۡنَا۔ پھر ہم آسمان سے پانی نازل کرتے ہیں۔ یہاں فانزلنا الماء کو لَوَاقِحَ کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

وَ اِنَّا لَنَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ وَ نَحۡنُ الۡوٰرِثُوۡنَ ﴿۲۳﴾

وَ لَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَقۡدِمِیۡنَ مِنۡکُمۡ وَ لَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَاۡخِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾

وَ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ یَحۡشُرُہُمۡ ؕ اِنَّہٗ حَکِیۡمٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۵﴾

۲۳۔ اور بے شک ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں۔

۲۴۔ اور بتحقیق ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔

۲۵۔ اور آپ کا رب ہی ان سب کو (ایک جگہ) جمع کرے گا، بے شک وہ بڑا حکمت والا، علم والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنَّا لَنَحۡنُ نُحۡیٖ: زمین و آسمان سے وسائل حیات فراہم کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی کا ان پر انحصار ہے بلکہ فی الواقع زندگی دینے والے ہم ہی ہیں۔ ان وسائل حیات کو بھی ہم ہی فراہم کرتے ہیں۔ پھر جن کو ہم زندگی دیتے ہیں، ایک مقررہ مدت کے لیے دیتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں موت کی آغوش

میں چلے جانا ہے۔ ہمیشہ زندہ رہنے والے ہم ہیں اور ہم ہی وارث ہوں گے۔

الۡمُسۡتَقۡدِمِیۡنَ اور الۡمُسۡتَاۡخِرِیۡنَ کے بارے میں متعدد اقوال ہیں۔ سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا متعلق موت و حیات اور معاد ہے۔ البتہ تقدم و تأخر فی العمل بھی مراد ہوسکتا ہے۔ ہم تم میں سے ان لوگوں کو بھی جانتے ہیں جو اعمال صالحہ میں پیش پیش رہتے ہیں اور ہر کار خیر میں سب سے آگے آگے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو بھی جانتے ہیں جو ہر میدان میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

کتب صحاح، صحیح نسائی، ترمذی، ابن ماجه میں حضرت ابن عباس سے ایک روایت موجود ہے:

> ایک نہایت حسین عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتی تھی۔ کچھ لوگ صف اول میں اس لیے نماز پڑھتے تھے کہ اس عورت پر نظر نہ پڑے اور کچھ لوگ آخری صفوں میں نماز پڑھتے تھے اور حالت رکوع میں بغل کے نیچے سے اس پر نظر کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

قرطبی و حقی وغیرہ نے صحاح کی روایت کی بنا پر اس تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

مگر یہ سورہ بالاتفاق مکہ میں نازل ہوا ہے اور مکہ میں ایسی جماعت قائم نہیں ہوتی تھی جس میں مرد و زن کی متعدد صفیں ہوتی ہوں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت منقول ہے جو سیاق آیت کے ساتھ مناسب ہے۔

ان الۡمُسۡتَقۡدِمِیۡنَ اصحاب الحسنات	مستقدمین سے مراد نیکی بجا لانے والے اور مستاخرین
و الۡمُسۡتَاۡخِرِیۡنَ اصحاب السیئات۔[1]	سے مراد گناہوں کا ارتکاب کرنے والے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ موت و حیات صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ ظاہری عمل کو نہیں اس عمل کے محرک کو قیمت حاصل ہے۔

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۲۶﴾	۲۶۔ بتحقیق ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے سے تیار شدہ خشک مٹی سے پیدا کیا۔

تشریح کلمات

صَلۡصَالٍ: (ص ل ل) اصل میں صَلۡصَالٍ کے معنی کسی خشک چیز سے آواز آنا کے ہیں۔ یہاں اس

---

[1] تفسیر البرھان ذیل آیہ

سوکھے گارے کے لیے استعمال ہوا ہے جو خشک ہونے کی وجہ سے کھنکھناہٹ کی آواز پیدا کرتا ہے۔

حَمَاٍ: (ح م ی) سیاہ کیچڑ مٹی کو کہتے ہیں جس میں بو پیدا ہو گئی ہو۔ خمیر بن گئی ہو۔

مَّسۡنُوۡنٍ: (س ن و) سڑے ہوئے گارے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

یہ آیت اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کر رہی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے براہ راست خاکی عناصر سے بنایا ہے اور خاک کو اس میں خمیر اٹھنے کے بعد خشک کیا۔ پھر اس میں روح پھونک دی۔

متعدد آیات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ تخلیق آدم کے کئی مراحل تھے۔ پہلا مرحلہ تھا خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ کا، دوسرا خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ کا، تیسرا مرحلہ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ کا اور چوتھا مرحلہ مِنۡ صَلۡصَالٍ کا تھا۔

اہم نکات

۱۔ انسان ارضی عناصر کی مخلوق ہے۔

وَالۡجَآنَّ خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور اس سے پہلے ہم لو (گرم ہوا) سے جنوں کو پیدا کر چکے تھے۔

تشریح کلمات

السَّمُوۡمِ: (س م م) سموم لو، گرم ہوا جو زہر کی طرح بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔

تفسیر آیات

جِن ایک مخفی، عاقل اور مکلّف مخلوق ہے جو آتشیں ہوا نَّارِ السَّمُوۡمِ سے تخلیق ہوئی ہے۔ کرہ ارض کی ابتدا میں موجود آتشیں گیس جو اجزائے کثیفہ سے خالی تھی، ممکن ہے اسی سے جِن کی تخلیق ہوئی ہو۔ شہید مطہری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ جس طرح انسان باشعور مادہ ہے، جنات باشعور انرجی ہیں۔ جِن کی خلقت کے بارے میں یہ بہترین تعریف ہے۔ زمان جاہلیت میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جنات کو خدائی اسرار معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ جنات کی پوجا کرتے تھے۔ قرآن نے یہ عقیدہ باطل ثابت کر دیا۔

اس آیت اور آنے والی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جِن کی تخلیق انسان سے پہلے ہو چکی تھی۔

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیۡ

۲۸۔ اور (وہ موقع یاد رکھو) جب آپ کے رب نے

خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۲۸﴾

فرشتوں سے کہا: میں سڑے ہوئے گارے سے تیار شدہ خشک مٹی سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔

فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ پھر جب میں اس کی تخلیق مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ۔

تشریح کلمات

بَشَرًا: (ب ش ر) البشرۃ و البشر انسان کی ظاہری جلد کو کہتے ہیں۔ بشرۃ الارض، زمین سے نمایاں ہونے والی نبات کو کہتے ہیں۔ (صحاح) لہٰذا بشر ظہور کے معنوں میں ہے اور جن پوشیدہ اور مخفی کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں تخلیق آدم کے تین مراحل کا ذکر ہے: پہلا مرحلہ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا میں ایک بشر بنانے والا ہوں۔ دوسرا فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ میں نے اس کی تخلیق مکمل کر دی۔ تیسرا مرحلہ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ اس میں اپنی روح پھونکوں۔

نفخ کسی چیز کے اندر ہوا بھرنے کو کہتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے اور ہم آیندہ تفصیلاً ذکر کریں گے کہ روح غیر مادی چیز ہے لہٰذا یہاں نفخ سے مراد جسم مادی سے روح کا تعلق ہے۔ یہ تعلق ارادہ خدا سے وجود میں آیا ہے۔ اسی ارادے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس روح کو اپنی طرف نسبت دی ہے۔ اس طرح ہم روح کو الٰہی توانائی کہہ سکتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ انسان تدریجاً خلق ہوا ہے۔

۲۔ انسان روح و مادہ سے مرکب ہے۔

فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّہُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ پس تمام کے تمام فرشتوں نے سجدہ کر لیا،

اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ مَعَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

قَالَ یٰۤاِبۡلِیۡسُ مَا لَکَ اَلَّا تَکُوۡنَ

۳۲۔ اللہ نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ تو

مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٣٢﴾

سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٣٣﴾

۳۳۔ کہا: میں ایسے بشر کو سجدہ کرنے کا نہیں ہوں جسے تو نے سڑے ہوئے گارے سے تیار شدہ خشک مٹی سے پیدا کیا ہے۔

ان آیات کی تفسیر کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف آیت ۱۱۔ سورۃ البقرہ

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿٣٤﴾

۳۴۔ اللہ نے فرمایا: نکل جا! اس مقام سے کیونکہ تو مردود ہو چکا ہے۔

وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٣٥﴾

۳۵۔ اور تجھ پر تا روز قیامت لعنت ہو گئی۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿٣٦﴾

۳۶۔ کہا: پروردگارا! پھر مجھے لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن (قیامت) تک مہلت دے دے۔

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿٣٧﴾

۳۷۔ فرمایا: تو مہلت ملنے والوں میں سے ہے۔

اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿٣٨﴾

۳۸۔ معین وقت کے دن تک۔

تشریح کلمات

رَجِيْمٌ : (ر ج م) الرجام پتھر کو کہتے ہیں۔ اسی سے الرجم ہے جو سنگ باری کرنے کے معنوں میں ہے۔ پھر بطور استعارہ رجم توہین، سب وشتم اور کسی کو دھتکارنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اللَّعْنَةَ : (ل ع ن) اللعن کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینا اور دھتکار دینا۔ اللہ کی طرف سے کسی پر لعنت سے یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں تو اللہ کی رحمت اور توفیق سے محروم اور آخرت میں عقوبت کا مستحق قرار پائے۔

تفسیر آیات

ابلیس کو اپنی درگاہ سے راندہ کرنے کے بعد فرمایا تا روز قیامت تم پر لعنت ہے۔ شاید ابلیس نے ”تا روز قیامت“ سے یہ مفہوم اخذ کیا ہو کہ اسے قیامت تک انسان سے واسطہ پڑنے کا امکان ہے۔ یہاں سے اس نے اللہ سے مہلت مانگی۔ یہ مہلت قیامت تک کے لیے مانگی تھی مگر ایک معلوم وقت تک کے لیے مہلت دے دی گئی۔

ابلیس کو مہلت دینے پر یہ سوال پیدا کیا جاتا ہے کہ ابلیس کو مہلت اور موقع دے کر قدرت نے خود

اسباب ضلالت فراہم کیے۔

جواب یہ ہے کہ اولاً ابلیس کو انسانوں پر اتنا تسلط حاصل نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ ہونے پر مجبور کرے۔ وہ صرف سبز باغ دکھا سکتا ہے۔ ثانیاً اللہ نے اگر ابلیس کو مہلت دی ہے اور گمراہی پھیلانے کا موقع دیا ہے تو اس کے مقابلے میں رشد و ہدایت کے بھی بہت سے اسباب فراہم کیے ہیں۔ اللہ نے انسان کو توحید کی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اس کی جبلت میں حق کی معرفت کی استعداد و دیعت فرمائی ہے:

فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۝ [1] پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی۔

انبیاء بھیجے ہیں۔ ملائکہ بھی انسان کو راہ راست پر ڈالنے کے لیے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ان دونوں مواقع کی موجودگی میں امتحان لیا جا سکتا اور آزمائش کی جا سکتی ہے۔ اگر معاملات یکطرفہ ہوتے تو امتحان نامعقول ہوتا اور ثواب و عقاب کا نظام ممکن نہ ہوتا۔ اس لیے انسان کو خیر و شر کے درمیان کھڑا کیا گیا کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہے انتخاب کرے۔

اہم نکات

۱۔ رب کہہ کر پکارنے سے ابلیس تک کی دعا قبول ہو جاتی ہے: رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡ ....

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَلَاُغۡوِیَنَّهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ۝۳۹

۳۹۔ (ابلیس نے) کہا: میرے رب! چونکہ تو نے مجھے بہکایا ہے (لہٰذا) میں بھی زمین میں ان کے لیے (باطل کو) ضرور آراستہ کر کے دکھاؤں گا اور سب کو ضرور بالضرور بہکاؤں گا۔

اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ۝۴۰

۴۰۔ ان میں سے سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔

تشریح کلمات

الغی: (غ و ی) گمراہ کے معنوں میں ہے اور اس جہالت کو بھی کہتے ہیں جو غلط اعتقاد پر مبنی ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ: ابلیس نے اپنے بہکانے کی نسبت اللہ کی طرف دی کہ ''جیسا کہ تو نے مجھے بہکایا'' اور اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی اس بات کو رد بھی نہیں فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہی نے ابلیس کو گمراہ کیا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اللہ نے اس کو گمراہ کیا ہے، خود تو نہیں ہوا۔

جواب یہ ہے کہ اللہ نے ابلیس کو گمراہ کیا ہے لیکن یہ گمراہی اس نافرمانی کا لازمی نتیجہ ہے جو ابلیس

---

[1] ۹۱ شمس: ۸

سے سرزد ہوئی نیز اللہ کی طرف سے گمراہی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے اور جس سے اللہ اپنی رحمت کا ہاتھ اٹھا لے اور اپنے حال پر چھوڑ دے وہ گمراہی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتا ہے۔

۲۔ اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡہُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ: اللہ کے خالص بندے وہ ہیں جن کو خود اللہ نے خالص بنایا ہو اور اللہ ہر کس کو خالص نہیں بناتا بلکہ ان لوگوں کو خالص بناتا ہے جنہوں نے اپنی ذات کو اللہ کے لیے خالص بنایا ہو۔ اپنی ذات کو بلا شرکت غیرے صرف اللہ کی بندگی کے لیے خاص کیا ہو۔

اہم نکات

۱۔ شیطان کارہائے بد کو آراستہ کر کے دکھاتا ہے۔

۲۔ ابلیس مخلص بندوں کو بہکانے سے مایوس ہے۔

قَالَ ہٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسۡتَقِیۡمٌ ﴿۴۱﴾
اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ ﴿۴۲﴾

۴۱۔ اللہ نے فرمایا: یہی راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے۔

۴۲۔ جو میرے بندے ہیں ان پر یقیناً تیری بالادستی نہ ہوگی سوائے ان بہکے ہوئے لوگوں کے جو تیری پیروی کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ ہٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسۡتَقِیۡمٌ: ابلیس نے کہا: میں سب لوگوں کو بہکا دوں گا تیرے مخلص بندوں کے سوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہی راستہ ہے۔ یہی قانون ہے یہی وہ پل ہے جسے عبور کر کے ہر ایک نے مجھ تک پہنچنا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس سے حق و باطل جدا ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ امتحان ہے جس سے شیطان کے پیروکاروں اور مخلصین میں فرق نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے:

۲۔ اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ: جو میرے بندے ہیں ان پر تیری بالادستی نہ ہوگی۔ تیرے قابو میں وہ لوگ آئیں گے جو پہلے ہی بہک جانے کے لیے آمادہ ہیں۔ تو ان زمینوں میں اپنا بیج بوئے گا جو پہلے سے گمراہی کے لیے ہموار ہیں۔ بھیڑیا اس جانور کو اپنا لقمہ بناتا ہے جو ریوڑ سے الگ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ عبادی کی صفوں سے علیحدہ ہو جائیں گے، ان پر تیرا تسلط قائم ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ ہر شخص کو اللہ کی بارگاہ میں جواب دینا ہے: ہٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسۡتَقِیۡمٌ۔

۲۔ عبودیت شیطان کی بالا دستی کے لیے رکاوٹ ہے: عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ ...۔
۳۔ شیطان کی اطاعت اس کی بالادستی کے لیے زینہ ہے: مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ۔
۴۔ انسان اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہے۔

وَ اِنَّ جَہَنَّمَ لَمَوۡعِدُہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۴۳﴾
۴۳۔ ان سب کی وعدہ گاہ جہنم ہے۔

لَہَا سَبۡعَۃُ اَبۡوَابٍ ؕ لِکُلِّ بَابٍ مِّنۡہُمۡ جُزۡءٌ مَّقۡسُوۡمٌ ﴿۴۴﴾
۴۴۔ جس کے سات دروازے ہیں ہر دروازے کے لیے ان کا ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔

تفسیر آیات

جہنم شیطان کے پیروکاروں کی وعدہ گاہ ہے۔ شیطان کے پیروکاروں کے لیے ایک ہی سطح کا عذاب نہ ہوگا بلکہ ہر مجرم کو اس کے جرم کے مطابق جہنم میں جگہ دی جائے گی۔ ممکن ہے مجرمین کے سات گروہ بنتے ہوں۔ اس لیے جہنم کے سات طبقات ہوں اور ہر طبقہ کو دروازہ کہا گیا ہو۔

چنانچہ تفسیر الدر المنثور ۴: ۱۸۶ میں آیا ہے کہ ابن مردویہ نے اسی آیت کی ذیل میں حضرت ابوذرؓ کی روایت بیان کی ہے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ و سلم: لجھنم باب لا یدخل منہ الامن اخفرنی فی اھل بیتی واراق دمائھم بعدی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جہنم کا ایک دروازہ ایسا ہے جس میں صرف وہی لوگ داخل ہوں گے جنہوں نے میرے اہل بیت کے حق میں مجھے اذیت دی (عہد شکنی کی) اور میرے بعد ان کے خون بہائے۔

اہم نکات

۱۔ گناہ اور سزا میں تناسب ہوتا ہے۔

اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿ؕ۴۵﴾
۴۵۔ (ادھر) اہل تقویٰ یقیناً باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔

اُدۡخُلُوۡہَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیۡنَ ﴿۴۶﴾
۴۶۔ (ان سے کہا جائے گا) سلامتی و امن کے ساتھ ان میں داخل ہو جاؤ۔

وَ نَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ ﴿۴۷﴾
۴۷۔ اور ان کے دلوں میں جو کینہ ہوگا ہم نکال دیں گے

لَا یَمَسُّهُمۡ فِیۡهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمۡ مِّنۡهَا بِمُخۡرَجِیۡنَ ﴿۴۸﴾

وہ برادرانہ طور پر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔
۴۸۔ جہاں نہ انہیں کوئی تکلیف پہنچے گی نہ انہیں وہاں سے نکالا جائے گا۔

تشریح کلمات

غِلّ: (غ ل ل) کینہ اور پوشیدہ دشمنی کے معنوں میں ہے۔

نَصَبٌ: (ن ص ب) کے معنی تکلیف و مشقت کے ہیں۔

الۡمُتَّقِیۡنَ: (و ق ی) تقویٰ کا ترجمہ عموماً پرہیز گار، اگر فعل امر کی شکل میں آئے تو "خوف کرو" کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ تقویٰ کا لازمہ ضرور ہے لیکن ترجمہ نہیں ہے۔ یہ لفظ مادہ، وق ی وقی سے ہے جس کے معنی محافظت اور بچانے کے ہیں۔ وَوَقٰهُمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ [۱] اللہ نے ان کو جہنم کے عذاب سے بچایا۔ لہٰذا التقویٰ کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے اسے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

تفسیر آیات

گزشتہ تقویٰ کی لغوی تشریح کی روشنی میں تقویٰ کا شرعی اصطلاح میں مفہوم یہ بنتا ہے: اسلام نے زندگی کے لیے جو اصول متعین کیے ہیں اس کے دائرے میں رہنا اور جن چیزوں کو گناہ اور پلیدی قرار دیا ہے ان سے اپنے آپ کو بچانا۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

عِبَادَ اللّٰهِ اِنَّ تَقْوَی اللّٰهِ حَمَتْ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ مَحَارِمَهُ وَ اَلْزَمَتْ قُلُوبُهُمْ مَخَافَتَهُ۔ [۲]

اللہ کے بندو! تقویٰ ہی نے اللہ کے دوستوں کو منہیات سے بچایا ہے اور ان کے دلوں میں خوف پیدا کیا ہے۔۔۔۔

لہٰذا تقویٰ اپنے آپ کے لیے تحفظ فراہم کرنا ہے۔ اگر ایک انسان نے انسانی قدروں کے ساتھ زندگی گزارنا ہے تو یہ تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ تقویٰ کے بغیر زندگی کا مطلب بے اصولی اور عملی انحراف سے عدم تحفظ ہے۔

اس آیہ شریفہ میں تقویٰ والوں کے لیے فرمایا:

i۔ فِیۡ جَنّٰتٍ وہ جنت میں داخل ہوں گے۔

---

[۱] ۴۴ دخان: ۵۶   [۲] نہج البلاغۃ۔ خطبہ ۱۱۲

ii۔ وَّعُيُوۡنٍ جہاں چشمے ہوں گے۔
iii۔ بِسَلٰمٍ سلامتی حاصل ہو گی۔
iv۔ اٰمِنِيۡنَ امن و امان کی زندگی ملے گی۔
v۔ وَنَزَعۡنَا ان کے دل ہر قسم کے کینہ و حسد سے پاک ہوں گے۔ کینہ و حسد والے داخلی سکون سے محروم ہوتے ہیں۔ جنت میں کامل سکون میسر آئے گا اس لیے قلبی اور نفسیاتی سکون کے لیے کینہ و حسد جیسی خصلتوں سے پاک ہونا ضروری ہے۔
vi۔ لَا يَمَسُّهُمۡ فِيۡهَا نَصَبٌ یہاں انہیں کسی قسم کی تکلیف و مشقت نہ ہو گی۔ اس دائمی زندگی سے تنگ ہوں گے نہ ہی وسائل زندگی کی فراہمی میں کوئی مشقت اٹھانا پڑے گی۔
vii۔ وَّمَا هُمۡ مِّنۡهَا بِمُخۡرَجِيۡنَ: ان کو دائمی زندگی ملے گی جہاں سے نکل جانے کا خیال ان کو نہیں ستائے گا۔

اہم نکات

۱۔ دلوں کا کینہ و حسد سے پاک ہونا اور پاک دل دوستوں کی محفل میسر آنا جنت کی نعمتوں میں سے ہے۔

نَبِّئۡ عِبَادِيۡۤ اَنِّيۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۴۹﴾	۴۹۔ (اے رسول) میرے بندوں کو بتا دو کہ میں بڑا درگزر کرنے والا، مہربان ہوں۔
وَاَنَّ عَذَابِيۡ هُوَ الۡعَذَابُ الۡاَلِيۡمُ ﴿۵۰﴾	۵۰۔ اور یہ کہ میرا عذاب بھی یقیناً بڑا دردناک عذاب ہے۔

تفسیر آیات

عِبَادِيۡ (میرے بندے) سے مراد صرف مخلصین یا متقین نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ گنہگار بندے بھی اس میں شامل ہیں۔ چنانچہ سورہ زمر میں گنہگار بندوں کو يٰعِبَادِيَ کہہ کر پکارا ہے:

قُلۡ يٰعِبَادِيَ الَّذِيۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِيۡعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ۝ ۱	کہد یجیے: اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، یقیناً اللہ تمام گناہوں کو معاف فرماتا ہے، وہ یقیناً بڑا معاف کرنے والا، مہربان ہے۔

کس قدر رحمت و شفقت ہے یہ حکم۔ نَبِّئۡ عِبَادِيۡ میرے بندوں کو بتا دو کہ میں غفور ہوں۔ بتا

----
۱ ۳۹ زمر: ۵۳

دو میں رحیم ہوں۔ کس قدر شیرین ہے یہ خطاب " میرے بندوں کو بتا دو"۔ کس قدر مہر و محبت ہے اس لہجے میں۔ گنہگار کے لیے کس قدر امید افزا اور سرمایہ امید و رجا ہے یہ جملہ: اَنِّیۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ میں نہایت درگزر کرنے والا مہربان ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غفوریت اور رحیمیت کا ذکر پہلے فرمایا اور عذاب کا ذکر بعد میں اور یہ بات مشیت الٰہی کے عین مطابق ہے:

یا من سبقت رحمته غضبه ....[1] وہ ذات جس کی رحمت اس کے غضب سے بہت پہلے ہے۔

نوید مغفرت و رحمت کو تاکیدی الفاظ "اَنِّیۡۤ" "اَنَا" کے ساتھ بڑے اہتمام کے ساتھ بیان فرماتا ہے۔

اللہ کی رحمت کے شامل حال ہونے کے لیے سوائے ظرفیت کے اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ ....[2] میری رحمت ہر شے پر محیط ہے....

لہٰذا یہاں رحمت الٰہی، امید و رجا کے لیے بہت گنجائش موجود ہے۔

اس کے بعد فرمایا: اللہ کی بندگی سے خارج ہونے والوں کو عذاب کی خبر بھی سنا دو کہ میرا عذاب بڑا دردناک ہے تاکہ لوگ بیم و رجا، خوف و امید کے درمیان اعتدال میں رہیں۔ ورنہ اگر صرف یاس و نومیدی ہو تو گمراہ ہو جائیں۔ مؤمن وہ ہے: جب اللہ کی رحمت کی طرف نگاہ کرتا ہے تو امیدوں کی پُرکیف فضاؤں میں محو ہو جاتا ہے اور ساتھ اپنے اعمال کی کوتاہیوں پر نظر پڑتی ہے تو اس پر خوف و لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی رحمت و مغفرت بے پایاں ہے۔

۲۔ مؤمن کو خوف و رجاء کے اعتدال میں رہنا چاہیے۔

وَ نَبِّئۡہُمۡ عَنۡ ضَیۡفِ اِبۡرٰہِیۡمَ ﴿۵۱﴾ ۵۱۔ اور انہیں ابراہیم کے مہمانوں کا حال بھی سنا دو۔

اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَیۡہِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنۡکُمۡ وَجِلُوۡنَ ﴿۵۲﴾ ۵۲۔ جب وہ ابراہیم کے ہاں داخل ہوئے تو انہوں نے کہا: سلام! ابراہیم نے کہا: ہم تم سے خوفزدہ ہیں.

قَالُوۡا لَا تَوۡجَلۡ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمٍ عَلِیۡمٍ ﴿۵۳﴾ ۵۳۔ کہنے لگے: آپ خوف نہ کریں ہم آپ کو ایک دانا لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں۔

---

[1] بحار ۹۱: ۲۳۹ [2] اعراف: ۱۵۶

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ کہا: کیا تم مجھے اس وقت خوشخبری دیتے ہو جب بڑھاپے نے مجھے گرفت میں لے لیا ہے؟ کس بات کی خوشخبری دیتے ہو؟

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ کہنے لگے: ہم نے آپ کو سچی خوشخبری دی ہے آپ مایوس نہ ہوں۔

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ ابراہیم بولے: اپنے رب کی رحمت سے تو صرف گمراہ لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ سورہ ھود آیت ۶۹۔ ۷۰ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو گیا ہے۔ یہاں سابقہ آیات میں امید و بیم، خوف و رجا کا ذکر آیا تو اسی سلسلے میں تاریخ انبیاء میں وقوع پذیر ہونے والے اہم واقعات میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امید کا ذکر اور اس کے بعد قوم لوط کے بارے میں خوف کا ذکر ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ پھر فرمایا: اے فرستادگان! تمہاری مہم کیا ہے؟

قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ کہنے لگے: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ مگر آل لوط کہ ان سب کو ہم ضرور بچا لیں گے۔

اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَاۤ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ البتہ ان کی بیوی کے بارے میں ہم نے یہ طے کیا ہے کہ وہ ضرور پیچھے رہ جانے والوں میں ہو گی۔

تشریح کلمات

خطب: (خ ط ب) اہم معاملہ جس کے بارے میں کثرت سے تخاطب ہو۔

الغابر: (غ ب ر) اس سے کہتے ہیں جو ساتھیوں کے چلے جانے کے بعد پیچھے رہ جائے۔

تفسیر آیات

ممکن ہے فرشتوں کو انسانی شکل میں دیکھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اندازہ ہو گیا ہو کہ وہ غیر معمولی مہم کے لیے مامور ہوئے ہیں۔ فرشتوں نے جواب میں کہا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں کہ اس کو ہلاک کر دیں، سوائے آل لوط کے۔ البتہ حضرت لوط ع کی زوجہ ہلاک والوں میں شامل ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ ذاتی کردار ہی معیار فضیلت ہے۔ ورنہ انبیاء کی ہمسری بھی فائدہ مند نہیں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوۡطِ ِۨ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۶۱﴾

قَالَ اِنَّکُمۡ قَوۡمٌ مُّنۡکَرُوۡنَ ﴿۶۲﴾

قَالُوۡا بَلۡ جِئۡنٰکَ بِمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَمۡتَرُوۡنَ ﴿۶۳﴾

وَ اَتَیۡنٰکَ بِالۡحَقِّ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۶۴﴾

۶۱۔ جب یہ فرستادگان آل لوط کے ہاں آئے۔

۶۲۔ تو لوط نے کہا: تم تو ناآشنا لوگ ہو۔

۶۳۔ کہنے لگے: ہم آپ کے پاس وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے بارے میں لوگ شک کر رہے تھے۔

۶۴۔ اور ہم تو آپ کے پاس امر حق لے کر آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔

تفسیر آیات

جیسا کہ سورہ اعراف و ہود میں اس واقعہ کا ذکر آ گیا۔ حضرت لوط علیہ السلام کو ان ناشناس لڑکوں کو دیکھ کر پریشانی ہوئی کہ کہیں ان نہایت حسین لڑکوں کو دیکھ یہ بدمعاش قوم ان مہمانوں کے سامنے مجھے شرمسار نہ کرے۔

فَاَسۡرِ بِاَہۡلِکَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ وَ اتَّبِعۡ اَدۡبَارَہُمۡ وَ لَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ وَّ امۡضُوۡا حَیۡثُ تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۵﴾

وَ قَضَیۡنَاۤ اِلَیۡہِ ذٰلِکَ الۡاَمۡرَ اَنَّ دَابِرَ ہٰۤؤُلَآءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِیۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۵۔ لہٰذا آپ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے کسی حصے میں یہاں سے چلے جائیں اور آپ ان کے پیچھے چلیں اور آپ میں سے کوئی شخص مڑ کر نہ دیکھے اور جدھر جانے کا حکم دیا گیا ہے ادھر چلے جائیں۔

۶۶۔ اور ہم نے لوط کو اپنا فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہی ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔

تشریح کلمات

فَاَسۡرِ : (س ر و) السری کے معنی رات کو سفر کرنے کے ہیں اور اس معنی میں سری اور اَسریٰ دونوں استعمال ہوتے ہیں۔

تفسیر آیات

حضرت لوط علیہ السلام کو حکم ملا کہ گھر والوں کے پیچھے چلیں تا کہ کوئی پیچھے رہ نہ جائے کیونکہ آنے والے واقعہ کا علم تو صرف حضرت لوط علیہ السلام کو ہے۔ دوسروں کو یا تو علم نہیں ہے، اگر ہو تو بھی ایک نبی کی طرح قطعی علم نہیں ہوتا۔ اس لیے ممکن ہے تساہل برتیں اور پیچھے رہ جائیں۔

مڑ کر نہ دیکھنے کا حکم ممکن ہے اس لیے ہو کہ نازل ہونے والا عذاب دیکھنے نہ پائیں کیونکہ وہ عذاب اس قدر شدید تھا کہ اسے دیکھنے کا بھی انسان متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

اہم نکات

۱۔ حضرت لوط علیہ السلام کے اہل بیت، اللہ کے نزدیک اس قدر عزیز ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کو ان کے پیچھے چلنے کا حکم فرماتا ہے۔

وَجَآءَ اَهۡلُ الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۶۷﴾	۶۷۔ ادھر شہر کے لوگ خوشیاں مناتے (لوط کے گھر) آئے۔
قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۤءِ ضَيۡفِىۡ فَلَا تَفۡضَحُوۡنِۙ ﴿۶۸﴾	۶۸۔ لوط نے کہا: بلا شبہ یہ میرے مہمان ہیں لہٰذا تم مجھے رسوا نہ کرو۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ ﴿۶۹﴾	۶۹۔ اور اللہ سے ڈرو اور مجھے بدنام نہ کرو۔
قَالُوۡۤا اَوَلَمۡ نَنۡهَكَ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۷۰﴾	۷۰۔ کہنے لگے: کیا ہم نے تمہیں ساری دنیا کے لوگوں (کی پذیرائی) سے منع نہیں کیا تھا؟
قَالَ هٰٓؤُلَاۤءِ بَنٰتِىۡۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ﴿۷۱﴾	۷۱۔ لوط نے کہا: یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو۔

تفسیر آیات

ترتیب آیات واقعہ کی ترتیب کے مطابق اس لیے نہیں ہے کہ قرآن اپنے غرض بیان کے مطابق

واقعات بیان کرتا ہے۔

قوم لوط کے بارے میں تلمود میں کچھ ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> کوئی مسافر ان علاقوں سے بخیریت نہ گزر سکتا تھا۔ کوئی غریب ان بستیوں سے روٹی کا ٹکڑا نہ پا سکتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ باہر کا آدمی ان کے علاقے میں پہنچ کر فاقوں سے مر جاتا اور یہ اس کے کپڑے اتار کر اس کی لاش کو برہنہ دفن کر دیتے تھے۔

اس طرح اس قوم کا یہ معمول تھا کہ مسافروں کو لوٹ لیا جائے یا ان سے اپنی ہوس پورا کریں۔ حضرت لوط علیہ السلام کے مہمانوں کے ساتھ یہی کچھ ہونے کا خطرہ تھا چنانچہ قوم لوط کے اس بات سے ان کی اخلاق کی پستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا: ہم نے تمہیں ساری دنیا کے لوگوں کی پزیرائی سے منع نہیں کیا تھا۔ گویا کہ مہمانوں کی پزیرائی ان کے اخلاق میں جرم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ خوبصورت لڑکوں کو دیکھ خوشیاں منانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر اخلاقی پستی میں مبتلا تھے۔

چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام ان کو جائز طریقے سے خواہشات پوری کرنے کی پیشکش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کی مزید تشریح سورہ ہود میں ہو چکی ہے۔

اہم نکات

۱۔ مہمانوں کی پزیرائی نہ کرنا بدخصلتی کی علامت ہے۔

۲۔ حضرت لوط علیہ السلام کی پیشکش سے اندازہ ہوتا ہے۔ مہمان کا احترام کس قدر عزیز ہے۔

لَعَمۡرُكَ اِنَّهُمۡ لَفِىۡ سَكۡرَتِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ (اے رسول) آپ کی زندگی کی قسم! یقیناً وہ بدمستی میں مدہوش تھے۔

فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُشۡرِقِيۡنَ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ پھر سورج نکلتے وقت انہیں خوفناک آواز نے گرفت میں لے لیا۔

فَجَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ پھر ہم نے اس بستی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا اور ہم نے ان پر کنکریلے پتھر برسائے۔

اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِيۡنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ اس واقعہ میں صاحبان فراست کے لیے نشانیاں ہیں.

وَاِنَّهَا لَبِسَبِيۡلٍ مُّقِيۡمٍ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ اور یہ بستی زیر استعمال گزرگاہ میں (آج بھی)

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۷۷﴾

موجود ہے۔
۷۷۔اس میں ایمان والوں کے لیے یقیناً نشانی ہے۔

تشریح کلمات

متوسمین: (و س م) التوسم کے معنی آثار و قرائن سے کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرنا کے ہیں اور اسے علم ذکاوت، فراست اور فطانت بھی کہا جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

اتَّقُوا فِرَاسَۃَ الۡمُؤۡمِنِ فَاِنَّہٗ یَنۡظُرُ بِنُوۡرِ اللّٰہِ....[1] مومن کی فراست سے ڈرتے رہو۔ وہ اللہ کے عطا کردہ نور سے دیکھتا ہے۔

سبیل مقیم: غیر متروک راستے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

سورہ اعراف آیت ۸۱ اور سورہ ہود آیت ۷۷ میں ملاحظہ ہو قوم لوط کے انجام میں ایسی نشانیاں ہیں جنہیں فہم و فراست رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں: وَ اِنَّہَا لَبِسَبِیۡلٍ مُّقِیۡمٍ .... اور یہ بستی زیر استعمال گزرگاہ میں (آج بھی) موجود ہے۔ مکہ سے شام جاتے ہوئے راستے میں یہ تباہ شدہ علاقہ آج بھی قابل دید ہے اور بعض جغرافیہ دانوں کے مطابق یہاں اس درجہ ویرانی پائی جاتی ہے جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی۔[2]

اہم نکات

۱۔ ایمان کا فہم و فراست سے تعلق ہے: لَاٰیَۃً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔

وَ اِنۡ کَانَ اَصۡحٰبُ الۡاَیۡکَۃِ لَظٰلِمِیۡنَ ﴿۷۸﴾

۷۸۔اور ایکہ والے یقیناً بڑے ظالم تھے۔

فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡہُمۡ ۘ وَ اِنَّہُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیۡنٍ ﴿ؕ۷۹﴾

۷۹۔تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور یہ دونوں بستیاں ایک کھلی شاہراہ پر واقع ہیں۔

تشریح کلمات

الایک: (ا ی ک) درختوں کے جھنڈ اور گھنے جنگل کے معنوں میں ہے۔ امام، لبامام: امام، اَمّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی قصد کے ہیں۔ اسی وجہ سے شارع عام کو بھی امام کہتے ہیں۔

---

[1] الکافی ۱: ۲۱۸ [2] تفہیم القرآن

تفسیر آیات

بعض احادیث کے مطابق حضرت شعیبؑ دو قوموں مدین اور ایکہ کی طرف مبعوث ہوئے۔ ایکہ، مدین کے نزدیک بسنے والی ایک قوم تھی۔ اس کا علاقہ نہایت سرسبز تھا۔ بعض کے مطابق ایکہ، تبوک کا قدیم نام تھا اور بعض فرنگی مورخین کے مطابق ایکہ اور مدین ایک ہی بستی کے نام ہیں۔

۱۔ اَصۡحٰبُ الۡاَیۡکَۃِ لَظٰلِمِیۡنَ: ایکہ کے رہنے والوں کی طرف حضرت شعیبؑ کو مبعوث کیا مگر ان لوگوں نے آپؑ کی تکذیب کی۔

۲۔ فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡہُمۡ: اللہ کے رسول کی تکذیب اور ان کی دعوت مسترد کرنے کی سزا میں ایک بستی کو تباہ کر دیا۔

۳۔ لَبِاِمَامٍ مُّبِیۡنٍ: مدین اور ایکہ کا علاقہ حجاز سے فلسطین اور شام جاتے ہوئے راستے میں واقع ہے۔

اہم نکات

۱۔ قوم لوط اور قوم شعیب کے علاقوں میں عبرت کے آثار عام گزرگاہوں میں موجود ہیں۔

وَ لَقَدۡ کَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۸۰﴾	۸۰۔ اور بتحقیق حجر کے باشندوں نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔
وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ اٰیٰتِنَا فَکَانُوۡا عَنۡہَا مُعۡرِضِیۡنَ ﴿۸۱﴾	۸۱۔ اور ہم نے انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں لیکن وہ ان سے منہ پھیرتے تھے۔
وَ کَانُوۡا یَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا اٰمِنِیۡنَ ﴿۸۲﴾	۸۲۔ اور وہ پہاڑوں کو تراش کر پر امن مکانات بناتے تھے۔
فَاَخَذَتۡہُمُ الصَّیۡحَۃُ مُصۡبِحِیۡنَ ﴿۸۳﴾	۸۳۔ اور انہیں صبح کے وقت ایک خوفناک آواز نے گرفت میں لے لیا۔
فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۸۴﴾	۸۴۔ پس جو وہ کیا کرتے تھے ان کے کام نہ آیا۔

تفسیر آیات

حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کی طرف مبعوث ہوئے۔ قوم ثمود کے دار الحکومت کا نام الحجر تھا۔ اسی مناسبت سے قوم ثمود کو اصحاب الحجر کہا ہے۔ مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف

آیت ۷۳،۷۹۔

پہاڑوں کے شکم کے اندر محفوظ ترین گھروں میں ہی ان کو ایک دھماکے کی آواز نے تباہ کر دیا اور ان کے محفوظ ترین مکان ان کی حفاظت نہ کر سکے۔

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ وَ اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ ﴿۸۵﴾

اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۶﴾

۸۵۔ اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان موجودات کو برحق پیدا کیا ہے اور قیامت یقیناً آنے والی ہے لہٰذا (اے رسول) ان سے باوقار انداز میں درگزر کریں۔

۸۶۔ یقیناً آپ کا رب خالق اور بڑا دانا ہے۔

تفسیر آیات

تخلیق کائنات ایک واہمہ اور خیال نہیں ہے، نہ ہی عبث اور بے مقصد وجود ہے بلکہ اس کی تخلیق کے سامنے ایک حکمت، مقصد اور دستور ہے۔ اگر یہ کائنات عبث اور فضول وجود میں آئی ہو تو اسے بے مقصد ختم ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ روز قیامت آنے والا ہے۔ وہاں اس کائنات کی تخلیق کا نتیجہ سامنے آئے گا۔ لہٰذا اے رسول! آپؐ ان کی طرف سے ہونے والے استہزاء اور آزار کے ساتھ خوبصورتی کے ساتھ درگزر فرمائیں۔

فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ: ایسا خوبصورت درگزر جس میں سرزنش اور غم و غصے کا اظہار نہ ہو۔ ان کے ساتھ نہ الجھیں اور ان کی طرف سے ہونے والی اذیتوں کو اعتنا میں نہ لائیں۔ آپ کا پروردگار خلاق ہے۔ پورا تسلط رکھتا ہے۔ علیم ہے۔ ان کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔ وہ ایسی ذات کی گرفت سے چھٹ کر کہاں جائیں گے جو طاقت بھی رکھتی ہے اور علم بھی۔ کسی کمزور اور نادان سے ممکن ہے راہ فرار مل جائے مگر اللہ سے نہیں۔

اہم نکات

۱۔ عفو اور درگزر کرنا پیغمبری خصلت ہے۔

۲۔ عقیدۂ آخرت سے مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَ الۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ اور بتحقیق ہم نے آپ کو (بار بار) دہرائی جانے والی سات (آیات) اور عظیم قرآن عطا کیا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ: سے مراد سورہ فاتحۃ ہے جو سات آیات پر مشتمل ہے۔ یہ سورہ فاتحۃ کی بہت بڑی فضیلت ہے کہ اسے قرآن کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام و دیگر ائمہ علیہم السلام کی متعدد روایات میں پوری صراحت کے ساتھ ہے کہ السبع المثانی سے مراد سورہ فاتحۃ ہے اور بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ بھی ایک آیت بلکہ افضل آیت ہے۔

صحیح بخاری میں دو مرفوع روایات موجود ہیں کہ اس سے مراد سورہ فاتحۃ ہے۔ اکثر مفسرین کا بھی یہی موقف ہے۔ چنانچہ اصحاب میں سے ابو سعید خدری، عبد اللّٰہ بن مسعود، ابن عباس، ابی بن کعب اور ابوھریرہ کا بھی یہی موقف ہے۔

اس آیت کا سیاق و لہجہ بتاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت اس وقت نازل ہوئی ہے جب آپؐ مکہ میں نامساعد ترین حالات میں تھے۔ مٹھی بھر مسلمان ہر طرف سے تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ اقتصادی طور پر بھی نہایت فقر و تنگدستی میں بسر اوقات کرتے تھے۔ ایسے حالات میں یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے لیے نازل ہوئی کہ مظالم اور سختیاں خواہ کتنی ہی گھمبیر کیوں نہ ہوں، جس عظیم دولت و نعمت کی راہ میں ان مصائب سے دوچار ہو رہے ہو، وہ مصائب پھر بھی ہیچ ہیں۔ وہ دولت السبع المثانی یعنی سورہ حمد اور قرآن عظیم ہے۔ ایک لازوال نعمت ایک ابدی دولت جو رہتی دنیا تک کے تمام انسانوں کے لیے سعادت کا پیغام اور دستور زندگی ہے۔

مِّنَ الۡمَثَانِیۡ: دہرائی جانے والی کتاب۔ یعنی قرآن سے ہے۔ یعنی یہ سَبۡعًا سات آیات پر مشتمل سورہ، مِّنَ الۡمَثَانِیۡ دہرائی جانے والی کتاب قرآن سے ہے۔ سات آیات پر مشتمل اس سورہ کی عظمت اس بات میں ہے کہ یہ قرآن کے مطالب پر مشتمل ہے۔ قرآن کو مثانی اس لیے کہا گیا ہے کہ قرآن نے مطالب کو مکرر بیان کیا ہے لیکن مختلف اسلوب، ترکیبوں، طرز خطاب اور انداز سخن میں:

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِہًا مَّثَانِیَ ....[1]　　اللہ نے ایسی کتاب کی شکل میں بہترین کلام نازل فرمایا ہے جس کی آیات باہم مشابہ اور مکرر ہیں....

مثلاً اعادۂ حیات کے مسئلے کو مکرر بیان فرمایا مگر انداز کلام ایک سے بڑھ کر شیرین ہے۔ منکرین پوچھتے ہیں:

قَالَ مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَ ہِیَ رَمِیۡمٌ ۝ قُلۡ یُحۡیِیۡہَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَہَاۤ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ....[2]　　اور کہنے لگتا ہے: ان ہڈیوں کو خاک ہونے کے بعد کون زندہ کرے گا؟ کہہ دیجیے: انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔

دوسری جگہ فرمایا:

---

[1] ۳۹ زمر: ۲۳　　[2] ۳۶ یسین: ۷۸۔ ۷۹

وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَۃَ الۡاُوۡلٰی ...[1] اور بتحقیق پہلی پیدائش کو تم جان چکے ہو....

تیسری جگہ فرمایا:

اَفَعَیِیۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۞[2] کیا ہم پہلی بار کی تخلیق سے عاجز آ گئے تھے؟ بلکہ یہ لوگ نئی تخلیق کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں.

ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات ہیں۔ سورۃ الفاتحہ میں ان تمام مطالب کو ایک آیت میں بیان فرمایا: مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ۔

اہم نکات

۱۔ سورہ حمد قرآن کا ہم پلہ ہے۔

۲۔ سورہ حمد دنیا کے ہر مال دولت اور ہر مادی نعمت سے بالاتر ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡكَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡہُمۡ وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۸﴾

وَ قُلۡ اِنِّیۡۤ اَنَا النَّذِیۡرُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۸۹﴾

۸۸۔ (اے رسول) آپ اس سامان عیش کی طرف ہرگز نگاہ نہ اٹھائیں جو ہم نے ان (کافروں) میں سے مختلف جماعتوں کو دے رکھا ہے اور نہ ہی ان کے حال پر رنجیدہ خاطر ہوں اور آپ مومنوں کے ساتھ تواضع سے پیش آئیں۔

۸۹۔ اور کہد یجیے: میں تو صریحاً تنبیہ کرنے والا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡكَ: مادی اعتبار سے اہل ایمان اور سرداران کفر میں طبقاتی تفاوت بہت زیادہ تھا۔ سرداران کفر نعمتوں سے مالا مال تھے اور مسلمان نہایت خستہ حالی میں مبتلا تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبری کا سرمایہ بھی اسلام پر خرچ ہو چکا تھا۔ اقتصادی بائیکاٹ کی وجہ سے مسلمانوں میں کسی کو اپنی گزر اوقات کے لیے ذریعہ تلاش کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کو آداب پیغمبری بیان فرماتا ہے جس میں بالواسطہ طور پر تمام مؤمنین کے لیے دستور زندگی ہے: اس بات پر توجہ ہی نہ رکھو کہ کفر کی مختلف جماعتوں کے پاس مال و دولت اور دنیا کی تمام تر نعمتوں کی فروانی ہے۔ یہ مال دولت اس قابل نہیں کہ آپ کی توجہ کا مرکز بنے۔

۲۔ وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ: اور نہ ہی ان لوگوں کے کفر اختیار کرنے پر تاسف کریں۔ یہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے گمراہ ہونے پر آپؐ کو تاسف ہو۔

۳۔ وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ: اہل ایمان آپؐ کے لیے قابل توجہ اور آپؐ کی عنایتوں کے

---

[1] ۵۶ واقعہ: ۶۲ [2] ۵۰ ق: ۱۶

مستحق ہیں۔ ان سے تواضع سے پیش آئیں اور ان کی تربیت و تعلیم پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ قابل توجہ ہے کہ قرآن کی تعبیر وَاخۡفِضۡ کے معنی ہیں نیچے کریں، جَنَاحَكَ اپنے پروں کو، لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ مومنین کے لیے۔ جس طرح پرندے اپنے چوزوں کو نہایت پیار و محبت کے ساتھ اپنے پروں کے نیچے لیتے ہیں، اے رسولؐ! آپؐ بھی اپنے مومنوں کے ساتھ اسی طرح پیش آئیں۔

اہم نکات

۱۔ مخالف جماعت کے منفی حالات پر نظر رکھنے جگہ اپنی جماعت پر زیادہ توجہ دینی چاہیے: لَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ ...، وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ ...۔

كَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَى الۡمُقۡتَسِمِيۡنَ ۙ﴿۹۰﴾

۹۰۔ جیسا (عذاب) ہم نے دھڑے بندی کرنے والوں پر نازل کیا تھا۔

الَّذِيۡنَ جَعَلُوا الۡقُرۡاٰنَ عِضِيۡنَ ﴿۹۱﴾

۹۱۔ جنہوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسۡـَٔـلَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۙ﴿۹۲﴾

۹۲۔ پس آپ کے رب کی قسم ہم ان سب سے ضرور پوچھیں گے۔

عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۳﴾

۹۳۔ ان اعمال کی بابت جو وہ کیا کرتے تھے۔

تشریح کلمات

عِضِيۡنَ: (ع ض ض) عضة کی جمع۔ حصے اور ٹکڑوں کے معنی میں ہے۔ اسی سے اعضاء، جسم کے حصوں کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

ولید بن مغیرہ نے حج کے دنوں میں سولہ افراد کو مکہ کی طرف آنے والے راستوں پر تقسیم کر کے بھیجا کہ کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچنے نہ پائے اور ایمان نہ لائے۔ ان میں سے بعض کہتے تھے قرآن جادو ہے، بعض کہتے تھے قرآن صرف داستانیں ہے اور کچھ کہتے تھے قرآن خود ساختہ ہے۔ چنانچہ ان لوگوں پر ایسا عذاب نازل ہوا کہ بدترین حالت میں مرگئے۔[۱]

حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے روایت ہے:

الۡمُقۡتَسِمِيۡنَ سے مراد قریش ہیں۔[۲]

البتہ قرآن کی تعبیر عام ہے۔ ان لوگوں کے لیے بھی جو قرآن کو عملی اعتبار سے تقسیم کرتے ہیں۔ کچھ پر عمل

---

۱ مجمع البیان ۲ تفسیر عیاشی

کرتے اور کچھ پر عمل نہیں کرتے۔ قرآن کو اپنے مفادات کے تابع بنا دیتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ ہے: لَنَسۡـَٔلَنَّهُمۡ ....

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۹۴﴾

۹۴۔ آپ کو جس چیز کا حکم ملا ہے اس کا واشگاف الفاظ میں اعلان کریں اور مشرکین کی اعتنا نہ کریں۔

اِنَّا کَفَیۡنٰکَ الۡمُسۡتَہۡزِءِیۡنَ ﴿۹۵﴾

۹۵۔ آپ کے واسطے ان تمسخر کرنے والوں سے نمٹنے کے لیے یقیناً ہم کافی ہیں۔

الَّذِیۡنَ یَجۡعَلُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ۚ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۶﴾

۹۶۔ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بنا لیتے ہیں عنقریب انہیں (اپنے انجام کا) علم ہو جائے گا۔

تشریح کلمات

فَاصۡدَعۡ: (ص د ع) صدع الامر، محاورہ ہے جس کے معنی کسی امر کو ظاہر اور واضح کر دینے کے ہیں۔ اصل میں الصدع کے معنی ٹھوس اجسام، جیسے شیشے، لوہے وغیرہ میں شگاف ڈالنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ: نہایت نامساعد حالات میں تبلیغ رسالت کو ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل کرنے کا حکم مل رہا ہے۔ اس آیت کے نزول سے پہلے حضورؐ غیر اعلانیہ طور پر تبلیغ فرماتے تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد آپؐ نے اعلانیہ طور پر تبلیغ شروع فرمائی۔ جب کہ قریش کی طرف سے تمسخر و استہزاء کا ایک طوفان برپا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ آ گیا کہ تمسخر اڑانے والوں کے لیے ہم کافی ہیں۔ آپؐ ان مشرکین کی پرواہ کیے بغیر اپنا پیغام صاف صاف لفظوں میں بیان کرنا شروع کریں۔

روایات کے مطابق جن لوگوں نے آپؐ سے تمسخر کیا تھا وہ ایک ایک کر کے مختلف عذاب سے دوچار ہو کر مر گئے۔ ان میں ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل سرفہرست ہیں۔

۲۔ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ: آپؐ اذیت دینے اور استہزاء کرنے والے مشرکین کو اعتنا میں نہ لائیں۔ ان سے نہ الجھیں۔ ان کی وقتی اوچھل کود اس قابل نہیں ہے کہ آپؐ متاثر ہوں۔

۳۔ اِنَّا کَفَیۡنٰکَ الۡمُسۡتَہۡزِءِیۡنَ: یہ لوگ صرف آپؐ کے نہیں، اللہ کے مقابلے میں بھی ہیں۔ اگرچہ قریش کی طرف سے تمسخر اور استہزاء کا ایک طوفان برپا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حکم خدا کی بے لاگ تعمیل کی جائے تو دشمن نابود ہو جاتا ہے۔

وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ﴿ۙ۹۷﴾

۹۷۔ اور بتحقیق ہمیں علم ہے کہ یہ جو کچھ کہ رہے ہیں اس سے آپ یقیناً دل تنگ ہو رہے ہیں۔

فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ کُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿ۙ۹۸﴾

۹۸۔ پس آپ اپنے رب کی ثنا کے ساتھ تسبیح کریں اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔

وَ اعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ ﴿۹۹﴾

۹۹۔ اور اپنے رب کی عبادت کریں یہاں تک کہ آپ کو یقین (موت) آ جائے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ: اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کی دل جوئی فرماتا ہے: ہمیں علم ہے ان کافروں کی باتوں سے آپ دل تنگ ہو رہے ہیں۔ رسول اللہؐ آگاہ ہیں کہ ہر بات اللہ کے علم میں ہے لیکن محض آپؐ کی تسلی اور اظہار شفقت کے لیے فرمایا: ہمیں علم ہے۔ ہم آپ کے حامی ہیں۔ آپ ہمارے حفظ و امان میں ہیں۔ آپ پر جو کچھ گزرتا ہے اس پر ہماری نظر ہے اور آپ کو ضرب لسان سے یہ لوگ جو اذیتیں دے رہے ہیں وہ ہم سن رہے ہیں۔ اپنے مقصد کی راہ میں جن مصیبتوں اور ذہنی پریشانیوں سے دوچار ہو رہے ہیں، ہم ان سے آگاہ ہیں۔

۲۔ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ: ان تکلیفوں اور مصیبتوں کے مقابلے کے لیے اپنے رب کی تسبیح و تحمید اور سجدہ کریں۔ نماز پڑھیں اور اسی عبادت اور بندگی کو تاحیات جاری رکھیں۔

تسبیح و عبادت سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس کائنات کے مصدر طاقت سے اتصال پیدا کرنے سے طاقت مل جاتی ہے۔ خالق سے دل لگانے سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔ جس نے اس دل و جان کی بافتگی کی ہے اس سے یہ دل زیادہ مانوس ہے۔ اس انس کے کیف و سرور کے عالم میں دنیا کی مصیبتیں اور مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں۔

چنانچہ ابتدائے بعثت میں ایسے ہی نہایت نامساعد حالات میں نازل ہونے والے سورہ مزمل میں ارشاد ہوا ہے:

یٰۤاَیُّہَا الۡمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۙ﴿۲﴾ [1]　اے کپڑوں میں لپٹنے والے! رات کو اٹھا کیجیے مگر کم،

---

[1] ۷۳ مزمل: ۱

نِّصۡفَہٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡہُ قَلِیۡلًا ۙ﴿۱﴾ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیجیے....

اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے نماز اور عبادت کے ذریعے تیار فرما رہا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد فرمایا:

اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ﴿۲﴾ عنقریب آپ پر ہم ایک بھاری حکم (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں۔

عبادت ہر بے سہارا انسان کے لیے سہارا اور ہر کمزور کے لیے طاقت ہے۔ عبادت سے انسان کے پائے استقامت میں لغزش ولرزش نہیں آتی۔ چنانچہ سورہ المعارج آیت ۱۹ میں فرمایا:

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ ہَلُوۡعًا ﴿ۙ﴾ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ﴿ۙ﴾ وَّ اِذَا مَسَّہُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ﴿ۙ﴾ اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿ۙ﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ دَآئِمُوۡنَ ﴿۳﴾ انسان یقیناً کم حوصلہ خلق ہوا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے، اور جب اسے آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، سوائے نماز گزاروں کے، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔

نماز گزار، تکلیف کے وقت اضطراب اور جزع فزع کا شکار نہیں ہوتا۔

۳۔ وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ: بعض اہل ضلال ایک گمراہ کن نظریہ پیش کرتے ہیں کہ سلوک میں کوئی مرتبہ ایسا آتا ہے کہ جہاں انسان یقین کی منزل پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس مرتبے پر فائز ہونے کے بعد تکلیف شرعی ساقط ہو جاتی ہے۔ جہالت و ضلالت پر مبنی اپنے نظریہ کی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں: وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ۔ اپنے رب کی عبادت کرو، یہاں تک کہ یقین آ جائے۔

یہاں بالاتفاق یقین سے مراد موت ہے۔ اس کو یقین اس لیے کہا گیا ہے چونکہ اس کا آنا حتمی اور یقینی ہے یا اس لیے کہ موت آنے کے بعد انسان عالم شہود وعیاں میں جاتا ہے اور ہر اس بات پر یقین آتا ہے جس پر دنیا میں ایمان بالغیب رکھتا تھا۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ "یقین" کو موت کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور چونکہ یہ لفظ جہنمیوں نے استعمال کیا ہے، لہٰذا یقین سے مراد سلوک وعرفان کی منزل یقیناً نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ جہنمیوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کون سی چیز جہنم میں لے آئی؟ وہ جواب میں کہیں گے:

لَمۡ نَکُ مِنَ الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿ۙ﴾ وَ لَمۡ نَکُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡکِیۡنَ ﴿ۙ﴾ وَ کُنَّا نَخُوۡضُ مَعَ الۡخَآئِضِیۡنَ ﴿ۙ﴾ وَ کُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿ۙ﴾ حَتّٰۤی اَتٰىنَا الۡیَقِیۡنُ ﴿۴﴾ ہم نماز گزاروں میں سے نہ تھے، اور ہم مسکین کو کھلاتے نہیں تھے، اور ہم بیہودہ بکنے والوں کے ساتھ بیہودہ گوئی کرتے تھے، اور ہم روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمیں موت آ گئی۔

۱؎ ۷۳ مزمل: ۲۔۳ ۲؎ ۷۳ مزمل: ۵ ۳؎ ۷۰ معارج: ۱۹ تا ۲۳ ۴؎ ۷۴ مدثر: ۴۳ تا ۴۷

حقیقت یہ ہے کہ یقین کی منزل پر آنے والے اپنے معبود کے اس قدر عاشق ہوتے ہیں کہ وہ ایک دن میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھنے کے بعد مناجات میں اللہ کی بارگاہ سے عذر خواہی کرتے ہیں کہ بندگی کا حق ادا نہ ہوا۔ چنانچہ لو کشف الغطاء ما ازددت یقینا[1] اگر (عبد اور معبود میں) پردہ ہٹ جائے تو بھی میرے یقین میں اضافہ نہ ہو۔ یہ فرمان ارشاد فرمانے والی ذات رات کو محراب عبادت گڑگڑا کے فرماتی ہے: آه من قلة الزاد و بعد السفر۔[2] ہائے! زاد راہ کتنا تھوڑا اور سفر کتنا لمبا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مشکل کی گھڑیوں میں پریشان حال انسان کے لیے عبادت سہارا ہے۔

---

[1] غرر الحکم ص ۱۱۹　[2] المناقب ۲: ۱۰۳

خالی

سُورَۃُ النَّحۡلِ

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورہ میں نحل (شہد کی مکھی) کا ذکر آیا ہے۔اسی مناسبت سے اسے سورہ نحل کہتے ہیں۔

بعض آیات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سورہ اس وقت نازل ہوا جب کفار مکہ کی طرف سے ظلم وستم اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ آیت:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ ...[1]

جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ کا انکار کرے (اس کے لیے سخت عذاب ہے) بجز اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو....

حضرت عمار یاسرؓ کے بارے میں نازل ہوئی جب ان کے والدین شہید کر دیے گئے اور ان کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مکی ہے اور ہجرت الی الحبشہ کے بعد نازل ہوا ہے چونکہ اس سورہ میں ہجرت کا ذکر ہے۔ ٣٩٥

بعض مفسرین نے ذکر ہجرت کو دلیل قرار دیا ہے کہ اس سورہ کا ایک حصہ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوا ہے جب کہ ہجرت کے ذکر سے ہجرت مدینہ ثابت نہیں ہوتی۔ اسی طرح جہاد کے ذکر سے بھی جنگ ثابت نہیں ہوتی۔

نیز اسی سورۃ کی آیت نمبر ١١٨ میں فرمایا:

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ...

اور جنہوں نے یہودیت اختیار کی ہے ان پر وہی چیزیں ہم نے حرام کر دیں جن کا ذکر پہلے ہم آپ سے کر چکے ہیں.

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ، سورۃ الانعام کے بعد نازل ہوا ہے۔

---

[1] ١٦ نحل: ١٠٦

دیگر سورہ ہائے مکی کی طرح یہ سورۃ بھی الٰہیات، وحی، معاد جیسے موضوعات پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔

معاملات کے بارے میں بھی احکام ملتے ہیں جیسے عدالت، احسان، انفاق، وفا بعہد۔

اللہ کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں کا اس سورہ میں کثرت سے ذکر ملتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے سورۃ النعم، نعمتوں کا سورہ بھی کہا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ۝۱

بنام خدائے رحمن رحیم
۱۔ اللہ کا امر آ گیا پس تم اس میں عجلت نہ کرو وہ پاک اور بالاتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ: مشرکین بار بار از راہ طعن وطنز کہتے تھے: اگر تم اللہ کے رسول ہو تو وہ عذاب کیوں نہیں آتا جس کی ہمیں دھمکی دی جا رہی ہے۔

اس کے جواب میں فرمایا: جس عذاب و تباہی کا وعدہ تھا اس کا فیصلہ آ گیا۔

رہا یہ سوال کہ وہ کون سا فیصلہ تھا جو اس وقت کفار مکہ کے خلاف آ گیا تھا۔

جواب دیا جاتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین کی رسوائی کا وقت آ گیا ہے اور جب کوئی واقعہ قریب الوقوع اور متیقن الوقوع ہو تو صیغہ ماضی استعمال کیا جاتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی اور مشرکین کی رسوائی کا فیصلہ آ ہی گیا اور اس فیصلے کے مطابق ہجرت شروع ہو گئی جس سے اسلام کی کامیابی اور کفر کی رسوائی کی ابتدا ہو گئی۔

۲۔ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی: کفر کی نابودی میں تاخیر کا سبب یہ نہیں کہ ان کا مشرکانہ عقیدہ صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ مشرکین کے اس زعم سے بالاتر ہے کہ اللہ ان کو شرک کے مرتکب ہونے کے باوجود سزا نہیں دے رہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کا امر اپنے وقت پر ضرور آتا ہے۔

یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ

۲۔ وہ اپنے حکم سے فرشتوں کو روح کے ساتھ اپنے

عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ۝۲

بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے (اس حکم کے ساتھ) کہ انہیں تنبیہ کرو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا تم میری مخالفت سے بچو۔

تفسیر آیات

۱۔ یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ: اللہ ہر قسم کے شرک سے بالاتر ہے۔ وہ فرشتوں کو الروح من امرہ کے ساتھ نازل فرماتا ہے۔ وہ روح جس کا تعلق امر خدا سے ہے۔ اللہ فرشتوں کو اس روح کے ساتھ نازل فرماتا ہے جس کا تعلق عالم امری سے ہے، وحی لے کر نازل ہوتے ہیں۔ واضح رہے عالم خلق اور عالم امر دو چیزیں ہیں۔ تمام خلق کا تعلق ایجاد نظام سے ہے اور عالم امر کا تعلق بقائے نظام سے ہے۔ خلقت کے بعد کائنات کے نظام کو برقرار رکھنے کے لیے امر خدا کارفرما ہوتا ہے۔

الروح سے وہی روح مراد ہے جس سے زندگی اور حیات ملتی ہے۔ فرشتے عالم امری سے متعلق حیات آفرین چیزیں لے کر انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتے ہیں۔ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ کی مشیت اندھی بانٹ نہیں ہے۔ اللہ کی چاہت اور مشیت حکیمانہ ہوتی ہے۔ جو اس کا اہل ہے اسی کو چاہتا ہے:

اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ ...[1] — اللہ (ہی) بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے.

۲۔ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا: یہ جملہ قرینہ ہے کہ یہ فرشتے جس حیات آفرین حکم کے ساتھ نازل ہوتے ہیں وہ حیات آفرین حکم لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ...[2] پر مشتمل تنبیہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ فرشتے انبیاء پر حیات آفرین امور لے کر اترتے ہیں: بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ ....

۲۔ توحید اور تقویٰ انسان کے لیے حیات آفرین ہے: لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ۔

۳۔ تمام عقائد توحید میں اور تمام احکام تقویٰ میں مضمر ہیں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ۝۳

۳۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور جو شرک یہ لوگ کرتے ہیں اللہ اس سے بالاتر ہے۔

---

[1] ۶ انعام: ۱۲۴ [2] ۴۷ محمد: ۱۹

تفسیر آیات

اس کائنات کا بیہودہ نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کائنات ایک حکیمانہ نظام کے تحت ایک حکیمانہ مقصد کی طرف رواں دواں ہے اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ نظام دھندہ ایک ہی ذات ہے۔ اگر یہاں اللہ کے ساتھ کوئی شریک ہوتا تو یہ نظام حکیمانہ نہ رہتا بلکہ

اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ....[1]　اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوقات کو لے کر جدا ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا،

واضح رہے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کرنے کا مطلب یوم حساب، یوم عدالت، قیامت ہے۔ یوم عدالت وانصاف نہ ہونے کی صورت میں کائنات کی خلقت عبث ہو جاتی ہے، بِالْحَقِّ نہیں ہوتی۔ چنانچہ سورۃ الحجر آیت۸۵ میں وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ کے بعد فرمایا: وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ ....۔ اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان موجودات کو برحق پیدا کیا ہے اور قیامت یقیناً آنے والی ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کی ساخت گواہی دیتی ہے کہ اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝۴　۴۔ اس نے انسان کو ایک بوند سے پیدا کیا پھر وہ یکایک کھلا جھگڑالو بن گیا۔

تفسیر آیات

باوجودیکہ انسان کو ایک نطفے جیسی بوند سے پیدا کیا گیا ہے، اس کی سرکشی اور گستاخی کا یہ حال ہے کہ وہ اللہ سے جھگڑنے لگ گیا۔ اس انسان کے آغاز وانجام میں تفاوت، کہاں نطفہ اور کہاں اللہ کے مقابلہ میں جھگڑا، کہاں اس کی حقیقت:

اَوَّلُهُ نُطفَةٌ وَ اٰخِرُهُ جِيْفَةٌ وَ لَا يَرْزُقُ نَفْسَهُ وَلَا يَدْفَعُ حَتْفَهُ ۔[2]　اس کی ابتدا نطفہ اور انتہا مردار ہے۔ وہ نہ اپنے لیے روزی کا سامان کر سکتا ہے، نہ موت کو اپنے سے ہٹا سکتا ہے۔

---

[1] ۲۳ مومنون: ۹۱　[2] نہج البلاغۃ کلمات قصار: ۴۵۴

اللہ کی خالقیت کے مقابلے میں یہ حقیر انسان بول اٹھتا ہے: مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَہِیَ رَمِیۡمٌ ۔[1] ان ہڈیوں کو خاک ہونے کے بعد کون زندہ کرے گا؟

اہم نکات

۱۔ شرک اور نافرمانی، انسانی ساخت کے منافی ہے۔

وَ الۡاَنۡعَامَ خَلَقَہَا ۚ لَکُمۡ فِیۡہَا دِفۡءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ۪﴿۵﴾

۵۔ اور اس نے مویشیوں کو پیدا کیا جن میں تمہارے لیے گرم پوشاک اور فوائد ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو۔

وَ لَکُمۡ فِیۡہَا جَمَالٌ حِیۡنَ تُرِیۡحُوۡنَ وَ حِیۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ ۪﴿۶﴾

۶۔ اور ان میں تمہارے لیے رونق بھی ہے اور جب تم انہیں شام کو واپس لاتے ہو اور صبح کو چرنے کے لیے بھیجتے ہو۔

تشریح کلمات

دِفۡءٌ: (د ف ء) الدف گرمی، حرارت۔ یہ برد (سردی) کی ضد ہے۔ آیت میں جاڑے کا سامان مراد ہے۔

تُرِیۡحُوۡنَ: (ر و ح) الاراحۃ چوپاؤں کا شام کے وقت واپس لانا۔

تَسۡرَحُوۡنَ: (س ر ح) سرحت الابل کے اصل معنی تو اونٹ کے سرح، درخت چرانے کے ہیں۔ بعد میں چراگاہ میں چرنے کے لیے کھلا چھوڑ دینے کے معنوں میں استعمال ہوا۔

تفسیر آیات

ان آیات میں یہ بتانا مقصود ہے: اے مشرکو! تمہاری زندگی کا سامان فراہم کرنے والا اللہ ہے، نہ تمہارے ارباب۔

۱۔ وَ الۡاَنۡعَامَ خَلَقَہَا: چوپائے انسان کے لیے مسخر ہیں اور ان کی وجہ تخلیق انسان ہیں:

خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ٭[2] روئے زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے لیے خلق کیا ہے....

چوپائے بہت بڑی نعمت ہیں۔ دیہی زندگی ہو یا شہری، ابتدائی انسان ہو یا تمدن یافتہ، سب ان چوپاؤں

---

[1] ۳۶ یٰسین: ۷۸ [2] ۲ بقرہ۔ ۲۹

سے بے نیاز نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کی اون، جلد اور ان کے دودھ سے بننے والی چیزیں انسان کی اہم ضروریات پوری کرتی ہیں۔

۲۔ وَلَكُمۡ فِيۡهَا جَمَالٌ: ان سے نہ صرف انسانی مصارف کا سامان فراہم ہوتا ہے بلکہ ان سے انسان کا جمالیاتی ذوق وشوق بھی پورا ہوتا ہے۔ اس بات کو دیہات وقصبات کے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ان حیوانات کو جب چرنے کے لیے چھوڑتے ہیں اور شام کو جب واپس لاتے ہیں کیا دلفریب منظر سامنے آتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ انسان کے لیے صرف مصارفی نہیں بلکہ جمالیاتی لوازم بھی فراہم فرماتا ہے: وَلَكُمۡ فِيۡهَا جَمَالٌ ....

وَتَحۡمِلُ اَثۡقَالَكُمۡ اِلٰى بَلَدٍ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا بٰلِغِيۡهِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ۙ﴿۷﴾

وَّالۡخَيۡلَ وَالۡبِغَالَ وَالۡحَمِيۡرَ لِتَرۡكَبُوۡهَا وَزِيۡنَةً ؕ وَيَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸﴾

۷۔اور وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر ایسے علاقوں تک لے جاتے ہیں جہاں تم جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے، تمہارا رب یقیناً بڑا شفیق، مہربان ہے۔

۸۔ اور (اس نے) گھوڑے خچر اور گدھے بھی (اس لیے پیدا کیے) تاکہ تم ان پر سوار ہو اور تمہارے لیے زینت بنیں، ابھی اور بھی بہت سی چیزیں پیدا کرے گا جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔

تفسیر آیات

ان آیات کا بھی تعلق تدبیر حیات انسان کے بیان سے ہے کہ اللہ تمہاری زندگی کی تدبیر کرتا ہے، نہ کہ تمہارے شریک۔

۱۔ وَتَحۡمِلُ اَثۡقَالَكُمۡ اِلٰى بَلَدٍ: یہ حیوانات انسان کے کن مقاصد کے لیے مسخر ہیں؟ ان کا ذکر ہو رہا ہے کہ ان سے حمل ونقل کا کام انجام پاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ان کی تخلیق کی غرض و غایت یہ بتائی ہے کہ انسان کو نقل وحمل میں مشقت پیش نہ آئے۔ اس سے اللہ کی بندوں کے ساتھ شفقت ومہربانی کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے انسان کے آرام وسہولت کے لیے ان حیوانات کو خلق فرمایا ہے۔

۲۔ لِتَرۡكَبُوۡهَا وَزِيۡنَةً: اور سواری میں کام آنے والے حیوانات کے بھی دو مقاصد بیان کیے۔ ایک یہ کہ سواری کے کام آئے اور دوسرا یہ کہ زیب وزینت کا کام دیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کو اللہ تعالیٰ نے اہمیت دی ہے اور اسے زندگی کے لوازم میں قرار دیا ہے چونکہ

جمالیات کو اللہ نے فطرت میں ودیعت فرمایا ہے۔

۳۔ وَیَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ: اللہ ایسی چیزیں خلق فرمائے گا جو تم نہیں جانتے۔ حمل و نقل اور سواری کے سلسلے میں صرف نزول قرآن کا زمانہ اور اسی ماحول کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ کی جامع تعبیر سے ہر اس چیز کی طرف اشارہ مل گیا جو اس سلسلے میں رہتی دنیا تک پیدا ہونے والی ہیں۔ تمدن و ترقی میں حمل و نقل کو اہمیت حاصل ہے اور دنیا اس میں جو ایجادات کر رہی ہے۔ وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ آج کی ایجادات عصر قرآن کی مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ تھیں اور کل ہونے والی ایجادات آج ہمارے لیے مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ہیں۔ اس طرح ہر نسل کے لیے آیت کا خطاب مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ زندہ رہے گا۔

یہ ایجادات تو انسانوں کی ہیں۔ انہیں اللہ کی طرف کیوں نسبت دی جاتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ جس طرح کشتی کی صنعت کو اللہ کی طرف نسبت دی جاتی ہے، یہ بھی اس لیے ہے کہ انسان، اس کی صلاحیت اور جس مواد کا استعمال ہوا اسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ انسان نے صرف ان رازہائے قدرت کا انکشاف کیا ہے، لہٰذا خلقت اللہ کی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کو اپنے بندوں سے محبت ہے، ان کی مشقت پسند نہیں: اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ ....

۲۔ حمل و نقل میں ایجادات کی طرف اشارہ: وَیَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ۔

وَعَلَی اللّٰہِ قَصۡدُ السَّبِیۡلِ وَمِنۡہَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوۡ شَآءَ لَہَدٰىکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ۝۹

۹۔ اور سیدھا راستہ (دکھانا) اللہ کے ذمے ہے اور بعض راستے ٹیڑھے بھی ہیں اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کرتا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَعَلَی اللّٰہِ قَصۡدُ السَّبِیۡلِ: قَصۡدُ السَّبِیۡلِ میں مضاف محذوف ہے۔ بیان قَصۡدُ السَّبِیۡلِ ہے اور قصد وہ راستہ ہے جو منزل تک پہنچا دے۔ کہا جاتا ہے: طریق قاصد۔ اگر راستہ منزل تک پہنچانے والا ہو (قرطبی)۔

وَعَلَی اللّٰہِ: مادی نعمتوں کے ذکر کے بعد روحانی نعمت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم قرار دیا کہ سیدھا راستہ دکھایا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فطرت اور شریعت دونوں کے ذریعے انسان کی ہدایت کا سامان فراہم فرمایا۔ فطرت کے ذریعے خود انسان کے وجود، اس کی ساخت و بافت میں ہدایت

ودیعت فرمائی:

رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ هَدٰی۔ [1] ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت دی۔

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىہَا ۪ۙ فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَتَقۡوٰىہَا ۪ۙ [2] اور قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اسے معتدل کیا پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی۔

اسی طرح راستہ دکھا کر اس انسان کو آزاد چھوڑ دیا کہ خود مختارانہ طریقہ پر یہ اپنے راستے کا خود انتخاب کرے:

اِنَّا هَدَیۡنٰہُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا۔ [3] ہم نے اسے راستے کی ہدایت کر دی خواہ شکر گزار بنے اور خواہ ناشکرا۔

اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡہُدٰی ۫ۖ [4] راستہ دکھانا یقیناً ہماری ذمہ داری ہے۔

ثُمَّ السَّبِیۡلَ یَسَّرَہٗ ۙ [5] پھر اس کے لیے راستہ آسان بنا دیا۔

۲۔ وَلَوۡ شَآءَ لَہَدٰىکُمۡ: چنانچہ امتحان اور استحقاق کے لیے ضروری تھا کہ انسان خود مختار ہو۔ اگر جبری ہدایت، منشائے خداوندی ہوتی تو سب کی ہدایت ہو جاتی مگر اس جبری ہدایت کی قیمت کچھ نہ ہوتی۔ جیسے بے حس پتھر، جسے آپ جہاں چاہے رکھ دیں یا ایک گدھا، جسے جہاں چاہیں باندھ دیں۔ صاحب تفسیر مراغی وَلَوۡ شَآءَ لَہَدٰىکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> اگر اللہ چاہتا تو تمہیں اپنی اجتماعی زندگی میں چیونٹی اور شہد کی مکھی کی طرح بنا دیتا یا فرشتوں کی طرح صرف عبادت کی صلاحیت دے کر خلق فرماتا۔ پھر تم معصیت کی طرف رخ کرتے نہ ہی شر تم سے صادر ہوتا۔ اللہ نے چاہا ہے کہ تم خود مختاری کے ساتھ اپنے اعمال انجام دو۔ واضح رہے انسان کا اپنے عمل میں خود مختار ہونا، نہ جبر ہے، نہ تفویض۔ یہ شیعہ مسلمہ عقیدہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ راہ راست پر لانے کے لیے اللہ جبر نہیں کرتا۔

۲۔ ہدایت و رہنمائی کو اللہ نے اپنے ذمے لیا ہے۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۱۰۔ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جس

---

[1] ۲۰ طہٰ: ۵۰ [2] ۹۱ شمس: ۷۔۸ [3] ۷۶ دھر: ۳ [4] ۹۲ لیل: ۱۲ [5] ۸۰ عبس: ۲۰

لَّكُمۡ مِّنۡهُ شَرَابٌ وَّ مِنۡهُ شَجَرٌ فِيۡهِ تُسِيۡمُوۡنَ ﴿۱۰﴾
سے تمہیں پینے کو ملتا ہے اور اس سے درخت اگتے ہیں جن میں تم جانور چراتے ہو۔

يُنۡۢبِتُ لَـكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّيۡتُوۡنَ وَالنَّخِيۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ وَمِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۱۱﴾
۱۱۔ جس سے وہ تمہارے لیے کھیتیاں، زیتون کھجور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے، غور و فکر سے کام لینے والوں کے لیے ان چیزوں میں یقیناً نشانی ہے۔

تشریح کلمات

تُسِيۡمُوۡنَ: (س و م) السوم کے معنی کسی چیز کی طلب میں جانے کے ہیں۔ پس اس کا مفہوم دو اجزاء سے مرکب ہے۔طلب اور جانا۔ سَامَتِ الۡاِبِل۔ اونٹ چراگاہ میں چرنے کے لیے چلے گئے۔

تفسیر آیات

۱۔ هُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ: مذکورہ پھلوں کی فراہمی اہل فکر کو بتاتی ہے کہ یہ اندھے اتفاق اور ناداں، بے شعور طبیعت کا کام نہیں ہے بلکہ ان چیزوں کی فراہمی کے پیچھے ایک شعور، ارادہ کارفرما ہے۔ ورنہ آسمان سے برسنے والا پانی، انسان اور روئے زمین پر موجود باقی چیزوں کے لیے مفید و مناسب نہ ہوتا۔ زمین سے اُگنے والی چیزوں کا انسان اور باقی جانوروں کے مزاج اور طبیعت کے عین مطابق اور مفید ہونا بھی ضروری نہ تھا۔ لہٰذا ان مختلف چیزوں کا ایک دوسرے کے لیے ضروری ہونا اور باہم موافق طبع ہونا بتاتا ہے کہ ان چیزوں کی تخلیق کے پیچھے ایک حکیمانہ ذہن کارفرما ہے جو اس نظام کی تدبیر کر رہا ہے۔

۲۔ يُنۡۢبِتُ لَـكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ: کھیتی کی افادیت اور زیتون، کھجور اور انگور کے انسانی جسم کی ساخت و بافت کے ساتھ نہایت سازگار ہونے کی وجہ سے ممکن ہے ان کا خاص طور پر ذکر کیا ہو۔

۳۔ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً: ان چیزوں میں صاحبان فکر کے لیے دلیل موجود ہے کہ انسان کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں۔ مشرکین کے نزدیک بھی خالق اللہ ہے۔ اللہ نے انسان کی تدبیر حیات کے لیے درج بالا چیزیں خلق فرمائیں تو تدبیر، خلق سے جدا چیز نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ آیات الٰہی سے استفادہ کرنے کے لیے غور و فکر شرط ہے۔

وَسَخَّرَ لَـكُمُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَ
۱۲۔ اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور

الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوۡمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمۡرِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۲﴾

سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں، عقل سے کام لینے والوں کے لیے ان چیزوں میں یقیناً نشانیاں ہیں۔

وَمَا ذَرَاَ لَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہٗ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور تمہارے لیے زمین میں رنگ برنگ کی جو مختلف چیزیں اگائی ہیں نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے ان میں یقیناً نشانی ہے۔

تشریح کلمات

ذَرَاَ: (ذ ر ء) الذرء کے معنی ہیں، اللہ نے جس چیز کا ارادہ کیا اسے ظاہر کر دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ تعالیٰ کے رب اور مدبر کائنات ہونے پر آیات ۱۱، ۱۲، ۱۳ میں تین دلائل دیے گئے ہیں۔ پہلی دلیل نباتات سے دی گئی۔ یہ اہل فکر کے لیے ہے۔ دوسری دلیل فلکیات سے اہل عقل کے لیے دی گئی۔ تیسری دلیل انواع و اقسام کی موجودات ارضی، اہل نصیحت کے لیے ہے۔ حضرت علامہ طباطبائیؒ اس جگہ فرماتے ہیں:

> پہلی دلیل، سادہ مقدمات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے عام انداز فکر سے نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے۔ جب کہ دوسری دلیل کا علمی مقدمات پر مشتمل ہونے کی وجہ سمجھنا صرف ان لوگوں کے لیے ممکن ہے جو اجرام فلکی میں غور کرتے ہیں اور ان کی حرکت و انتقال پر عقل کو بروئے کار لاتے ہیں۔ تیسری دلیل کے کلی مقدمات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس کی تہ تک وہ لوگ پہنچ سکتے ہیں جو وجود اور اس کے کلی معاملات کو ذہن میں رکھیں۔ مثلاً ایک تغیر پذیر پیدائش کے لیے مادے کی ضرورت ہے۔ (المیزان ذیل آیت)

ان آیات میں مذکور باتوں میں صاحبان فکر و عقل اور ذکر و نصیحت کے لیے دلائل اور نشانیاں ہیں کہ اس کائنات کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی نے مذکورہ چیزیں تمہاری زندگی کے لیے بنائی ہیں۔

۲۔ وَالنُّجُوۡمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمۡرِہٖ: سورج چاند اور دن رات کے لیے فرمایا: لَکُمۡ تمہارے لیے مسخر ہیں لیکن النجوم کی تسخیر کے لیے لَکُمۡ تمہارے لیے نہیں فرمایا بلکہ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمۡرِہٖ فرمایا۔ اس

سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ستارے انسانوں کے لیے مسخر نہیں ہیں۔ بعض کے نزدیک ستارے بھی مسخر ہیں کہ ستاروں کے ذریعہ سمندری اور صحراؤں کے سفر میں ستاروں سے سمت اور راستے کا علم ہو جاتا ہے جو ایک قسم کی تسخیر ہے۔

اقول: ستارے کلی نظام عالم کے لیے چاند سورج کی طرح اہم ہیں۔ اگر ستارے درہم برہم ہو جائیں تو صرف چاند سورج سے نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا نجوم بھی ہمارے نظام وجود کے لیے مسخر ہیں۔

۳۔ مُخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہٗ: بعض فرماتے ہیں رنگوں کے اختلاف سے مراد انواع و اقسام ہو سکتے ہیں۔ مُخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہٗ کا مطلب مختلفاً انواعہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ رنگ کے اختلاف سے چیز کی نوعیت میں بھی اختلاف آ جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ آیات الٰہی سے استفادے کے لیے تعقل، تفکر اور تذکر شرط ہے۔

۲۔ اختلاف انواع اللہ کی نشانی ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیۡ سَخَّرَ الۡبَحۡرَ لِتَاۡکُلُوۡا مِنۡهُ لَحۡمًا طَرِیًّا وَّ تَسۡتَخۡرِجُوۡا مِنۡهُ حِلۡیَۃً تَلۡبَسُوۡنَهَا ۚ وَ تَرَی الۡفُلۡکَ مَوَاخِرَ فِیۡهِ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور اسی نے (تمہارے لیے) سمندر کو مسخر کیا تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنہیں تم پہنتے ہو اور آپ دیکھتے ہیں کہ کشتی سمندر کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے تاکہ تم اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو اور شاید تم شکر گزار بنو۔

تشریح کلمات

طَرِیًّا: (ط ر ی) الطری تر و تازہ۔

مَوَاخِرَ: (م خ ر) مخرت السفینۃ۔ کشتی کا اپنے سینے سے پانی کو چیرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ هُوَ الَّذِیۡ سَخَّرَ الۡبَحۡرَ: خشکی نعمتوں کے بعد بحری نعمتوں کا ذکر ہے۔ ان نعمتوں میں تازہ گوشت سرفہرست ہے۔ مچھلی کا گوشت تازہ ہی کھایا جاتا ہے کیونکہ اگر یہ سڑ جائے تو بہت مضر ہوتا ہے۔

۲۔ حِلۡیَۃً تَلۡبَسُوۡنَہَا: دوسری نعمت، زیب و زینت کے لیے سمندری موتیاں اور مونگے ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جمالیاتی ذوق انسانوں میں ودیعت فرمایا ہے۔ اس کی تسکین بھی خود اسی کی طرف سے ہونی چاہیے۔ البتہ اس ذوق کی تسکین کے لیے دوسروں یا اپنے نفس پر زیادتی نہ ہو۔

۳۔ وَتَرَی الۡفُلۡکَ مَوَاخِرَ فِیۡہِ: تیسری نعمت کشتیاں ہیں۔ جن کی حمل ونقل میں حاصل اہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ تمام نعمتیں، جن پر انسان کی زندگی قائم ہے، اللہ نے عنایت فرمائی ہیں تو اللہ کے علاوہ معبودوں نے تمہاری تدبیر حیات کے لیے کون سی نعمت فراہم کی ہے؟

اہم نکات

۱۔ گوشت کی تازگی کو بہت اہمیت حاصل ہے: لَحۡمًا طَرِیًّا ...۔

۲۔ جمالیاتی ذوق کی تسکین اپنے حدود میں درست ہے: حِلۡیَۃً تَلۡبَسُوۡنَہَا ...۔

وَاَلۡقٰی فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِکُمۡ وَاَنۡہٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اور اس نے زمین میں پہاڑوں کو گاڑ دیا تاکہ زمین تمہیں لے کر ڈگمگا نہ جائے اور نہریں جاری کیں اور راستے بنائے تاکہ تم راہ پاتے رہو۔

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجۡمِ ہُمۡ یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اور علامتیں بھی (بنائیں) اور ستاروں سے بھی لوگ راستہ معلوم کر لیتے ہیں۔

تشریح کلمات

تَمِیۡدَ: (م ی د) المیدان۔ مضطرب، ڈگمگانے اور ڈھلک جانے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَلۡقٰی فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ: قرآن مجید متعدد آیات میں اس نکتہ کو بڑی وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ پہاڑ کی تخلیق کا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے زمین میں اضطرابی حالت ختم ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے قرآن مجید کا اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ زمین کے اندرونی طبقات میں موجود لاوا آتش فشانی کے ذریعے سطح زمین پر آتا ہے اور پہاڑ بن جاتا ہے۔ اگر یہ سلسلہ نہ ہوتا تو زیر زمین موجود لاوا اور آتشین مواد سے

زمین ڈھلک جاتی اور ڈگمگانے لگتی:

وَ وَتَّدَ بِالصُّخُورِ مَیَدَانَ اَرْضِهٖ....[1] تھرتھراتی ہوئی زمین پر پہاڑوں کی میخیں گاڑیں....

مزید وضاحت کے لیے سورۃ الانبیاء آیت ۷ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ وَاَنۡهٰرًا: پہاڑوں کا دوسرا اہم فائدہ پہاڑوں سے بہنے والے پانی سے متشکل ہونے والی نہریں ہیں جن سے نشیبی علاقے سیراب ہوتے ہیں۔

۳۔ وَّسُبُلًا: پہاڑوں کے درمیان ندی نالوں کے بہنے سے بننے والے راستے جن کا مشاہدہ پہاڑی علاقوں میں زیادہ ہوتا ہے۔

۴۔ وَعَلٰمٰتٍ: اس نے زمین کی ساخت اس طرح رکھی ہے کہ ہر علاقہ دوسرے علاقے سے ممتاز ہوتا ہے اور لوگ مختلف علاقوں کو اس کے نشانیوں سے پہچان لیتے ہیں۔

۵۔ وَبِالنَّجۡمِ هُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ: جہاں اس قسم کی کوئی علامت نہ ہو اور پورا علاقہ یکساں ہو۔ جیسے صحرا اور سمندر ہیں۔ ان میں انسان قدیم سے آج تک اپنا راستہ ستاروں سے معلوم کر رہے ہیں۔

شیعہ مصادر کے علاوہ شواهد التنزیل میں حسکانی نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے دو روایات بیان کی ہیں: بِالنَّجۡمِ علی علیہ السلام ہیں۔ دوسری روایت میں ہے: بِالنَّجۡمِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور وَعَلٰمٰتٍ ان کے اوصیاء علیہم السلام ہیں۔

اہم نکات

۱۔ پہاڑوں کو زمین کے استقرار اور شادابی میں بڑا دخل ہے۔

اَفَمَنۡ يَّخۡلُقُ كَمَنۡ لَّا يَخۡلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ﴿۱۷﴾

۱۷۔ کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اس جیسا ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟

تفسیر آیات

ایک واضح حقیقت اور ایک نہایت سادہ سی بات جو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ جو خلق کرتا ہے وہ اس کی طرح تو نہیں ہو سکتا جو خلق نہیں کرتا۔ خطاب مشرکوں سے ہے کہ تم ایسی واضح باتیں بھی نہیں سمجھ سکتے ہو اور دونوں کے ایک جیسے اختیارات کے قائل ہو۔ اللہ اور بت، دونوں کی صفات کیسے ایک جیسی ہو سکتی ہیں کہ اس کائنات کو چلانے کے لیے بتوں کو بھی اللہ کے برابر اختیار ہے۔

---

[1] نہج البلاغۃ خ ۱

وَ اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو انہیں شمار نہ کر سکو گے، اللہ یقیناً بڑا درگزر کرنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

اللہ کی بے پایاں نعمتوں کا احاطہ یہ انسان نہیں کر سکتا۔ یہ غافل انسان تو ان نعمتوں میں سے موٹی موٹی نعمتوں کی طرف صرف اس وقت متوجہ ہوتا ہے جب اس سے یہ نعمت چھن جاتی ہے۔ اس کے باوجود اللہ غفور و رحیم ہے۔ اللہ کا غفران اور درگزر دیکھیے کہ انسان ان بے شمار نعمتوں سے مالا مال ہونے کے باوجود اللہ کے حق میں اس قدر گستاخ اور نافرمان ہوتا ہے کہ کبھی تو اللہ کے وجود ہی کا منکر ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اللہ درگزر فرماتا ہے اور رحم کا یہ عالم ہے کہ ایسے ناشکرے انسان کو بھی برابر نعمتوں کی ارزانی فرماتا رہتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ نہایت گستاخ انسان پر بھی اللہ کی ذات نہایت مہربان ہے جو اسے بھی بے شمار نعمتیں عطا فرماتی ہے۔

وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اور اللہ سب سے باخبر ہے جو تم پوشیدہ رکھتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو۔

وَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ ﴿ؕ۲۰﴾

۲۰۔ اور اللہ کو چھوڑ کر جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو خلق نہیں کر سکتے بلکہ خود مخلوق ہیں۔

اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ ۚ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ۙ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ وہ زندہ نہیں مردہ ہیں اور انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ: اللہ ان مشرکین کے حال سے بے خبر ہونے کی بنیاد پر تو نعمتیں فراہم نہیں کرتا ہے بلکہ وہ ان کے دلوں کی بات سے بھی واقف ہے۔

۲۔ وَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ: نیز ربوبیت کے لائق تو صرف وہ ذات ہے جو خالق، منعم ہے اور انسان کے اندرونی حالات کا علم و آگہی رکھتی ہے۔

۳۔ اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ: جب کہ جن بتوں کی یہ لوگ پرستش کرتے ہیں، نہ تو وہ خالق ہیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں، منعم ہیں نہ انہیں انسان کے حالات سے آگہی ہے۔ حتیٰ خود زندہ بھی نہیں اور حیات بھی نہیں رکھتے۔

۴۔ وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ: اور اس بات کا شعور بھی نہیں رکھتے کہ ان بتوں کی پوجا کرنے والے کب اٹھائے جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ ربوبیت کے لیے خالق، منعم اور عالم باسرار ہونا ضروری ہے۔

اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ مُّنۡکِرَۃٌ وَّ ہُمۡ مُّسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۲۲﴾

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡتَکۡبِرِیۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۲۔ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے لیکن جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل (قبول حق کے لیے) منکر ہیں اور وہ تکبر کر رہے ہیں۔

۲۳۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ جو کچھ پوشیدہ رکھتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ اسے جانتا ہے، وہ تکبر کرنے والوں کو یقیناً پسند نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ: گزشتہ تمام آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ہی معبود کی طرف دعوت دی جائے۔ گزشتہ آیات میں مذکور تمام نشانیوں کا تعلق بھی صرف ایک رب، ایک معبود اور نفی شرک کی نشانیوں سے ہے۔

۲۔ فَالَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ: اس کے بعد آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کا ذکر آیا۔ قیامت کے انکار کی صورت میں کائنات کا وجود عبث ہو جاتا ہے۔ چونکہ اگر کوئی جزا سزا نہیں ہے تو اس دنیا کا وجود بے مقصد، حکمت سے خالی ہو جاتا ہے۔ اگر اس دنیا میں ہونے والی ناانصافیوں کے ازالے کے لیے کوئی عدالت نہ ہو اور خونخوار ظالم اور محروم مظلوم دونوں کا انجام ایک ہے تو یہ نظام، یہ دنیا بیہودہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے ایسے منکرین کے بارے میں فرمایا: قُلُوۡبُہُمۡ مُّنۡکِرَۃٌ ان کے دل قبول حق نہیں، حق کا منکر ہونے کے لیے سازگار ہیں۔

۳۔ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ: لَاجَرَمَ، لَا اور جَرَمَ دونوں ایک لفظ ہیں۔ بعض کہتے ہیں یہ کلمۂ تحقیق ہے لابد اور لامحالہ کی طرح۔ یہ بات قابل تردید نہیں کہ اللہ ان کے دلوں کا حال جانتا ہے کہ قیامت کے

انکار کے پیچھے کیا محرک ہے؟ کیا واقعاً ان کو قیامت سمجھ میں نہیں آئی یا سمجھنے میں کوئی مفاد آڑے آیا یا سمجھنے کے باوجود انکار کر رہے ہیں۔ آخری جملے لَا یُحِبُّ الۡمُسۡتَکۡبِرِیۡنَ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصل انکار کی وجہ تکبر ہے کہ ہم بنی ہاشم کے ایک یتیم کی بات مان لیں؟

اہم نکات

۱۔ آخرت کے انکار سے دل مردہ ہو جاتے ہیں۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ مَّاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّکُمۡ ۙ قَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿ۙ۲۴﴾

۲۴۔ جب ان سے کہا جاتا ہے: تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے؟ تو کہتے ہیں: داستانہائے پارینہ۔

لِیَحۡمِلُوۡۤا اَوۡزَارَہُمۡ کَامِلَۃً یَّوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۙ وَ مِنۡ اَوۡزَارِ الَّذِیۡنَ یُضِلُّوۡنَہُمۡ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ (گویا) یہ لوگ قیامت کے دن اپنا سارا بوجھ اور کچھ ان کا بوجھ بھی اٹھانا چاہتے ہیں جنہیں وہ نادانی میں گمراہ کرتے ہیں دیکھو! کتنا برا بوجھ ہے جو یہ اٹھا رہے ہیں۔

تشریح کلمات

اَسَاطِیۡرُ: (س ط ر) اسطورۃ کی جمع ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ مَّاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّکُمۡ: ممکن ہے یہ مکہ کے اطراف میں رہنے والے خالی الذہن لوگ ہوں جو اہل مکہ سے پوچھتے ہیں: تمہارے ہاں اللہ کی طرف سے کوئی نبی آیا ہے، اس پر اللہ کیا نازل کر رہا ہے؟ جواب میں مشرکین کہتے تھے: کہاں اللہ کی طرف سے نازل ہو رہا ہے، صرف اگلوں کی من گھڑت داستانیں ہیں۔

۲۔ لِیَحۡمِلُوۡۤا اَوۡزَارَہُمۡ: اس طرح یہ لوگ اپنے گناہوں کے بوجھ کے علاوہ ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھا رہے ہیں جنہیں یہ نادانی میں گمراہ کر رہے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

من سن سنة سيئة كان عليه وزرها و وزر من عمل بها...۔[1]

جو ایک برے کام کو رواج دے گا اس پر اس کا بوجھ اور اس پر عمل کرنے والوں کا بوجھ ہوگا۔ گناہ کا بوجھ۔

---

[1] بحار الانوار ۷۱: ۲۰۴

۳۔ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوۡنَ: اپنے گناہوں کے علاوہ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھانے والے نہایت بدقسمت ہیں۔ قیامت کی ابدی زندگی میں وہ اس قدر عذاب کا مستحق ہوں گے جس قدر ان کے ذریعے لوگ گمراہ ہوئے ہیں۔ فرض کر لیتے ہیں اگر اس کی وجہ سے ستر افراد گمراہ ہوئے ہیں تو اس کے عذاب میں ستر گنا اضافہ ہوگا۔ کتنا بُرا اور کتنا بڑا بوجھ یہ بدقسمت لوگ اٹھا رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حق کے خلاف پروپیگنڈہ مہم استکبار کی قدیم روایت ہے: اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ۔

۲۔ جو لوگ دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں ان پر اپنی گمراہی کے بوجھ علاوہ ان کا بوجھ بھی پڑے گا جن کو گمراہ کیا ہے: وَ مِنۡ اَوۡزَارِ الَّذِیۡنَ ....

قَدۡ مَکَرَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَاَتَی اللّٰہُ بُنۡیَانَہُمۡ مِّنَ الۡقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیۡہِمُ السَّقۡفُ مِنۡ فَوۡقِہِمۡ وَ اَتٰىہُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ ان سے پہلے لوگوں نے مکاریاں کی ہیں لیکن اللہ نے ان کی عمارت کو بنیاد سے اکھاڑ دیا، پس اوپر سے چھت ان پر آ گری اور انہیں وہاں سے عذاب نے آ لیا جہاں سے انہیں توقع نہ تھی۔

تفسیر آیات

اسلامی تحریک کے خلاف کفر کی مکاریاں اور سازشیں قدیم سے اسی طرح رہی ہیں جس طرح آج مشرکین مکہ کی طرف سے ہو رہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان کی سازش کو خود ان کے خلاف کر دیتا ہے۔ چنانچہ دینی تحریکوں کے خلاف جو عمارت انہوں نے کھڑی کی تھی، یہی عمارت ان کی ہلاکت کا سبب بن گئی۔ اس آیت میں رسول اللہؐ کے لیے نوید فتح کی نوعیت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ چنانچہ ان مشرکین نے اسلام کے خلاف جو جنگیں لڑیں وہی جنگیں ان کی تباہی کا سبب بن گئیں۔

اہم نکات

۱۔ اسلام کے خلاف جو سازش کرتے ہیں وہ خود اسی سازش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ثُمَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُخۡزِیۡہِمۡ وَ یَقُوۡلُ اَیۡنَ شُرَکَآءِیَ الَّذِیۡنَ کُنۡتُمۡ تُشَآقُّوۡنَ

۲۷۔ پھر اللہ انہیں قیامت کے دن رسوا کرے گا اور (ان سے) کہے گا: کہاں ہیں میرے وہ شریک

فِيْهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْۗءَ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۷

جن کے بارے میں تم جھگڑتے تھے؟ (اس وقت) صاحبان علم کہیں گے: آج کافروں کے لیے یقیناً رسوائی اور برائی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ: قیامت کے دن جب مشرکین عالم شہود میں آ چکے ہوں گے، ان پر اپنے شرک کا بطلان عیاں ہو چکا ہوگا، اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال ہوگا:

۲۔ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيَ: کہاں ہیں وہ شریک جن کے حق میں تم اہل توحید سے جھگڑتے تھے۔

ظاہر ہے مشرکین کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا:

لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ اور کوئی بات نہیں کر سکے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور جو درست بات کرے۔[1]

۳۔ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ: جب مشرکین کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا تو اہل علم آگے آئیں گے اور ان مشرکین کے بارے میں جس طرح دنیا میں اعلان برائت کیا تھا اسی طرح قیامت کے دن اعلان رسوائی کریں گے۔

تفسیر قمی کے مطابق وہ اہل علم ائمہ اہل بیت علیہم السلام ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن علماء کا بول بالا ہوگا: الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ....

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْۗءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۲۹

۲۸۔ فرشتے جن کی روحیں اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہوں تب وہ کافر تسلیم کا اظہار کریں گے (اور کہیں گے) ہم تو کوئی برا کام نہیں کرتے تھے، ہاں! جو کچھ تم کرتے تھے اللہ یقیناً اسے خوب جانتا ہے۔

۲۹۔ پس اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ جہاں تم ہمیشہ رہو گے، تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا نہایت برا ہے۔

---

[1] ۷۸ نباء: ۳۸

تفسیر آیات

یہ آیت اور دیگر بعض آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کافروں کا عذاب، نزع روح کے وقت سے شروع ہوتا ہے اور حالت نزع میں ان کو ان کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔

۱۔ الَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰىہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیۡۤ: ان کافروں کا ذکر جاری ہے جو دینی تحریک کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ ان کی حالت احتضار اور جان کنی کے وقت کی بات ہے۔ ابھی زندگی کی چند رمق باقی ہیں۔ ان پر حقیقت کھل گئی، ابھی وہ زیر زمین نہیں گئے، حق و باطل کا راز منکشف ہو گیا۔ البتہ فرصت ان کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔

۲۔ فَاَلۡقَوُا السَّلَمَ: فرشتے ان کی روح قبض کر رہے ہیں اور وہ حالت ظلم و کفر میں تھے۔ جان کنی سے پہلے توبہ کی نہ کفر چھوڑا۔ اس وقت وہ سر تسلیم خم کرتے ہیں لیکن فرصت ان کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ اب اس تسلیم و اطاعت کا کوئی فائدہ نہ ہو گا اور دنیا سے جانے سے پہلے ہی جہنم میں داخل ہونے کا حکم مل جاتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ان کو جہنم میں داخل ہونے کا حکم دینے والے اولوالعلم یعنی علماء ہوں گے۔ یہ قول آیت اعراف کے مطابق ہے۔

اہم نکات

۱۔ کافروں کو مرنے سے پہلے حق کا علم ہو جائے گا۔
۲۔ کافروں کو جان کنی کی حالت میں داخل جہنم ہونے کا حکم ملے گا۔
۳۔ جان کنی کی حالت میں ہی کافر ما بعد الموت حالات کا مشاہدہ کرتا ہے۔

وَ قِیۡلَ لِلَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا مَاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّکُمۡ ؕ قَالُوۡا خَیۡرًا ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ ؕ وَ لَدَارُ الۡاٰخِرَۃِ خَیۡرٌ ؕ وَ لَنِعۡمَ دَارُ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اور متقین سے پوچھا جاتا ہے: تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں: بہترین چیز، نیکی کرنے والوں کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو بہترین ہے ہی اور اہل تقویٰ کے لیے یہ کتنا اچھا گھر ہے۔

جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ لَہُمۡ فِیۡہَا مَا یَشَآءُوۡنَ ؕ کَذٰلِکَ یَجۡزِی اللّٰہُ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ یہ لوگ دائمی جنت میں داخل ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں ان کے لیے جو چاہیں گے موجود ہو گا، اللہ اہل تقویٰ کو ایسا اجر دیتا ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ قرآن کو داستان ہائے پارینہ کہنے والوں کے مقابلے میں اہل تقویٰ ہیں جو قرآن کو خیر محض جانتے ہیں۔ کافروں کی پروپیگنڈا مہم کے جواب کے لیے اہل تقویٰ میدان عمل ہوتے ہیں، لوگوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرتے ہیں اور یہ نکتہ بھی سمجھاتے ہیں کہ اس قرآن میں خیر الدینا و الآخرة ہے۔ دارین کی سعادت ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابتدائے بعثت میں دعوت ذوالعشیرة کے موقع پر فرمایا:

انی قد جئتکم بخیر الدینا والآخرة.[۱]　میں تمہارے پاس دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی لے کر آیا ہوں۔

۲۔ وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَیۡرٌ: آخرت کا گھر چونکہ ابدی زندگی کے لیے ہو گا لہٰذا آخرت کے گھر کے مقابلے میں کوئی اور بھلائی نہیں ہو سکتی۔

۳۔ وَلَنِعۡمَ دَارُ الۡمُتَّقِیۡنَ: چونکہ قبول اعمال کا دار و مدار تقویٰ پر ہے:

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ۝[۲]　اللہ تو صرف تقویٰ رکھنے والوں سے قبول کرتا ہے۔

لہٰذا متقین وہ لوگ ہوں گے جن کے اعمال قبول ہوگئے ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

لَا یَقِلُّ عَمَلٌ مَعَ التَّقْوىٰ وَ كَیْفَ یَقِلُّ مَا یُتَقَبَّلُ.[۳]　جو عمل تقویٰ کے ساتھ انجام دیا جائے وہ تھوڑا نہیں سمجھا جا سکتا اور مقبول ہونے والا عمل تھوڑا کیونکر ہو سکتا ہے؟

۴۔ لَہُمۡ فِیۡہَا مَا یَشَآءُوۡنَ: انہیں جنت میں نعمتوں کی وصولی، دنیا کی طرح علل و اسباب کے ذریعے نہیں ہو گی۔ اس کے لیے کوئی محنت کرنی نہیں پڑے گی بلکہ اہل جنت کا ارادہ نافذ ہو گا۔ مَا یَشَآءُوۡنَ، چاہنے کی دیر ہے کہ نعمت آمادہ ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ اس دنیا کی خوشحالی بھی دینی مقاصد میں شامل ہے: فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ ....

۲۔ نیکی، سعادت دارین کا ذریعہ ہے: لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا ....

الَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیۡنَ ۙ یَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمُ ۙ ادۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ جن کی روحیں فرشتے پاکیزہ حالت میں قبض کرتے ہیں (اور انہیں) کہتے ہیں: تم پر سلام ہو! اپنے (نیک) اعمال کی جزا میں جنت میں داخل ہو جاؤ۔

۱۔ بحار الانوار ۳۸: ۲۲۳　۲۔ ۵ المائدة ۲۷　۳۔ نہج البلاغة۔ کلمات قصار: ۹۵

تفسیر آیات

۱۔ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ: وہ تقویٰ والے جو شرک وظلم کی خباثت سے پاک ہیں۔ ان کی روح قبض کرنے والے فرشتے ان پر سلام کریں گے۔

۲۔ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ: روح قبض کرنے والے فرشتوں کی طرف سے سلام کا مطلب ہر قسم کے رنج وغم اور درد والم سے سلامتی کی نوید ہے۔

۳۔ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ: اور حالت احتضار میں جنت میں داخل ہونے کا حکم ملنے کا مطلب یہ ہوا کہ موت سے پہلے ما بعد الموت کا حال مؤمن کے مشاہدے میں آتا ہے۔ جیسا کہ کافر کے لیے بھی ایسا ہی ہے کہ حالت نزع میں ہی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔

اس جگہ ایک درس آموز روایت کا خلاصہ ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ حضرت ابو بصیر جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد خاص اور علم ومعرفت میں بلند پایہ شخصیت ہیں، راوی ہیں:

> میرا ایک ہمسایہ مے نوشی کی محفلیں جماتا تھا۔ میں نے ہر چند نصیحت کی، وہ باز نہیں آیا۔ ایک دن اس نے کہا: اگر آپ اپنے مولا (امام جعفر صادق علیہ السلام) سے میرا تعارف کرا دیں تو ممکن ہے آپؑ کے ذریعے اللہ مجھے بچالے۔ میں جب امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس شخص کا حال بیان کیا۔ آپؑ نے فرمایا: اس شخص سے کہنا: جعفر بن محمد (علیہما السلام) کہتے ہیں: تو مے نوشی ترک کر دے، میں اللہ کے حضور تیرے لیے جنت کا ضامن بنتا ہوں۔ واپس جا کر میں نے یہ پیغام اس کو سنایا تو وہ رویا اور چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد اس نے مجھے بلایا تو دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے عقب میں عریاں بیٹھا ہے۔ وہ بولا: اے ابوبصیر! میں نے اپنے گھر سے تن کا لباس تک سب کچھ نکال دیا ہے اور میرا یہ حال ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد وہ بیمار ہوگیا اور احتضار کا وقت آ گیا۔ اس پر غشی طاری تھی۔ ہوش میں آیا تو کہنے لگا: اے ابوبصیر قد وفی صاحبك لنا آپ کے مولا نے میرے ساتھ وعدہ پورا کر دیا۔ پھر اس کی روح پرواز کر گئی۔ چنانچہ حج کے موقع پر جب میں نے امام علیہ السلام کے گھر میں داخل ہونے کے اجازت مانگی تو مجھے دیکھتے ہی مولا (ع) نے فرمایا: قد وفینا صاحبك ہم نے تمہارے ساتھی کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کر دیا۔[۱]

اس موضوع پر مزید تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں: سورۃ یونس آیت ۶۴۔

اہم نکات

۱۔ حالت نزع میں ہی تمام پردے اٹھ جاتے ہیں۔

---

[۱] الکافی ۱: ۴۷۴

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔کیا یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ فرشتے (ان کی جان کنی کے لیے) ان کے پاس آئیں یا آپ کے رب کا فیصلہ آئے؟ ان سے پہلوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا، اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ یہ خود اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔آخرکار انہیں ان کے برے اعمال کی سزائیں ملیں اور جس چیز کا یہ لوگ مذاق اڑاتے تھے اسی نے انہیں گھیر لیا۔

تفسیر آیات

۱۔ هَلْ يَنْظُرُوْنَ: اس دین توحید کو سمجھانے کا جو بھی طریقہ ہو سکتا تھا، وہ اختیار کیا گیا۔ منطق میں کمی ہے نہ استدلال میں نقص، نہ ہی حجت و برہان میں ضعف ہے۔ یہ لوگ پھر کس چیز کے انتظار میں ہیں؟ کیا یہ فرشتہ موت کے انتظار میں ہیں کہ حالت نزع میں حقیقت حال ان پر منکشف ہو جائے یا یہ نزول عذاب کے منتظر ہیں؟

۲۔ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ: جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے: دلیل و منطق کے ساتھ آیات الٰہی پیش کی جاتی ہیں، انجام بد سے آگاہ کیا جاتا ہے اور مہلت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد خود ان کے اپنے ظلم کی پاداش میں ان کو تباہ کیا جاتا ہے۔

۳۔ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ: آخرکار ان کو ان کے اپنے برے اعمال نے گرفت میں لے لیا اور جن باتوں کا وہ مذاق اڑاتے تھے انہی باتوں نے انہیں اس طرح اپنے حصار میں لے لیا کہ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہا۔

اہم نکات

۱۔ کافر لوگ جس چیز کا مذاق اڑاتے تھے، وہ خود اسی کا شکار ہو گئے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ

۳۵۔ اور مشرکین کہتے ہیں: اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے علاوہ کسی اور چیز

وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ کَذٰلِکَ فَعَلَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۚ فَہَلۡ عَلَی الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۳۵﴾

کی پرستش نہ کرتے اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام قرار دیتے، ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا تو کیا رسولوں پر واضح انداز میں تبلیغ کے سوا کوئی اور ذمہ داری ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا: مشرکین اپنے شرک کے جواز کے لیے یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پوجا نہ کریں تو غیر اللہ کی پوجا کرنا ہمارے لیے ممکن ہی نہ ہوتا۔

واضح رہے اللہ تعالیٰ کے دو ارادے ہیں: ارادۂ تخلیق اور ارادۂ تشریع۔ عالم خلق و ایجاد میں صرف اللہ کا ارادہ نافذ ہے:

اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۝[1]

جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے کہ اسے یہ کہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

ارادۂ تخلیق میں اللہ کے ارادے کے علاوہ کسی اور کا ارادہ نہیں چلتا۔ ارادہ تشریع میں ایسا نہیں ہے کہ اللہ جو حکم دے اس پر ساری دنیا عمل کرے۔ ارادۂ تشریع میں جب اللہ فرماتا ہے: وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ تو کوئی نماز پڑھتا ہے اور کوئی نہیں پڑھتا۔ یہ اس لیے کہ انسان کو اللہ نے اختیار و انتخاب کی آزادی دی ہے کیونکہ آزادی کے بغیر آزمائش، مکلّف اور سزا و جزا کا قانون بنانا ممکن نہیں ہے۔

اس جگہ ایک علمی المیہ یہ ہوا کہ ایک اسلامی مکتب نے ارادۂ تکوینی اور تشریعی میں امتیاز نہیں کیا، نظریہ جبر قائم کیا اور کہا نماز پڑھنا بھی اللہ کی طرف سے ہے اور نہ پڑھنا بھی اللہ کی طرف سے ہے اور کہتے ہیں: اللہ کی مملکت میں صرف اللہ کا ارادہ نافذ ہے۔ غیر خدا کا ارادہ نافذ نہیں ہے۔ ارادہ تکوینی کی بات، ارادہ تشریع میں بھی لاتے ہیں۔ مشرکین بھی عیناً نظریہ جبر سے اپنے شرک کے جواز پر استدلال کرتے ہیں اور انسان کو مجبور تصور کرتے ہیں۔ جب کہ اپنے ارادے اور انتخاب میں آزادی، انسان کی انسانیت کی بنیادی اینٹ ہے جس کے بغیر انسان، انسان نہیں رہتے، کوئی اور مخلوق، جیسے گدھے اور جمادات و نباتات کی طرح ہو جاتے ہیں۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الانعام آیت ۱۴۸۔

۲۔ فَہَلۡ عَلَی الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ: مشرکین کے نظریہ جبر کے جواب میں فرمایا: رسولوں کے ذریعے اللہ اپنا ارادہ صرف پہنچانے کا حکم دیتا ہے۔ اس پر عمل کرنا، نہ کرنا، خود مکلّف سے مربوط ہے۔ رسول

---

[1] ۳۶ یٰسٓ: ۸۲

سے مربوط نہیں ہے کہ وہ ان پر طاقت اور جبر استعمال کرے اور ہر صورت میں ایمان لے آئیں۔

اہم نکات

۱۔ انسان کو عقیدہ اور عمل میں خود مختار چھوڑا ہے: فَهَلۡ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ ...۔

۲۔ بندوں کے عقیدہ و عمل میں مشیت تشریعی نافذ ہے، تکوینی نہیں: اِلَّا الۡبَلٰغُ ...۔

وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِىۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ‌ ۚ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ هَدَى اللّٰهُ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ حَقَّتۡ عَلَيۡهِ الضَّلٰلَةُ‌ ؕ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ اور بتحقیق ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی بندگی سے اجتناب کرو، پھر ان میں سے بعض کو اللہ نے ہدایت دی اور بعض کے ساتھ ضلالت پیوست ہو گئی، لہٰذا تم لوگ زمین پر چل پھر کر دیکھو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا تھا۔

تفسیر آیات

اس منطق کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے کہ اللہ نے شرک سے نہیں روکا ہے۔ اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ہم نے تو ہر قوم میں ایک رسول کو اسی پیغام کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے دوری اختیار کرو۔ ہر سرکش اور حدود الٰہی کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے سے بیزاری اختیار کرو۔

رسولوں کے ذمے پیغام توحید پہنچانا اور لوگوں پر حجت پوری کرنا تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے اپنے اختیار سے ہدایت کی راہ اختیار کرنی ہے یا ضلالت کی راہ۔ عیناً آج کے مشرکین مکہ کی طرح کہ ان پر بھی رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے حجت پوری ہو رہی ہے۔ ان میں سے کچھ ہدایت پر آ گئے اور کچھ ضلالت پر ثابت رہے۔

ہدایت اختیار کرنے اور ضلالت ترک کرنے پر، نہ سابقہ رسولوں کے ذریعے طاقت استعمال کی گئی، نہ آج۔ رسالت کا مطلب حق کا راستہ دکھانا ہے، طاقت کے ذریعے چلانا نہیں ہے جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو۔

اہم نکات

۱۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے شرک کے خلاف جہاد کیا ہے۔

۲۔ ادیان آسمانی بندوں کی خودمختاری اور آزادی عمل کی بنیاد پر قائم ہیں۔

اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰی هُدٰىهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِیۡ مَنۡ یُّضِلُّ وَ مَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اگر آپ کو ان کی ہدایت کی شدید خواہش ہو بھی تو اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا جنہیں وہ ضلالت میں ڈال چکا ہو اور نہ ہی کوئی ان کی مدد کرنے والا ہو گا۔

تفسیر آیات

اگرچہ رسول کی شفقت اور عطوفت ہے کہ لوگوں کی ہدایت کے حریص اور متمنی ہوتے ہیں لیکن ہدایت و ضلالت کا ایک قاعدہ ہے اور دستور ہے۔ وہ یہ کہ ہدایت اللہ کی طرف سے اسے ملتی ہے جس میں اہلیت اور ظرف ہو اور جس میں ہدایت اور اللہ کی رحمت کے لیے ظرف نہ ہو اسے اللہ اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ جسے اللہ اپنے حال پر چھوڑ دے وہ ضلالت کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتا ہے۔ جب اللہ کسی کو اسے کے حال پر چھوڑ کر گمراہ ہونے دیتا ہے، قرآن اس کے لیے ''اللہ نے گمراہ کیا'' کی تعبیر اختیار کرتا ہے۔ ورنہ اللہ از خود کسی کو گمراہ نہیں کرتا بلکہ اس کی ہدایت کے سامان فراہم فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عدم ظرفیت کی بنا پر جسے اللہ اپنے حال پر چھوڑ دے اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَیۡمَانِهِمۡ ۙ لَا یَبۡعَثُ اللّٰهُ مَنۡ یَّمُوۡتُ ؕ بَلٰی وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور یہ لوگ اللہ کی سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں: جو مر جاتا ہے اسے اللہ زندہ کر کے نہیں اٹھائے گا، کیوں نہیں (اٹھائے گا)؟ یہ ایک ایسا برحق وعدہ ہے جو اللہ کے ذمے ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

لِیُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِیۡ یَخۡتَلِفُوۡنَ فِیۡهِ وَ لِیَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّهُمۡ کَانُوۡا کٰذِبِیۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ تاکہ اللہ ان کے لیے وہ بات واضح طور پر بیان کرے جس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں اور کافر لوگ بھی جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔

تفسیر آیات

حیات بعد الموت تخلیق، تکلیف اور آزمائش کا عقلی لازمہ ہے۔ اگر جزا و سزا کا کوئی دن نہ ہوتا

تو مومن اور کافر، ظالم اور مظلوم میں کوئی فرق نہ ہوتا:

اَفَمَنۡ كَانَ مُؤۡمِنًا كَمَنۡ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسۡتَوٗنَ ۝ [1] — بھلا جو مومن ہو وہ فاسق کی طرح ہو سکتا ہے؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

جس نے انسانیت کے خون سے ہولی کھیلی ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے انسانیت کی خدمت کی ہے۔ اگر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے تو اس زندگی کا کھلونا ہونا لازم آتا ہے۔ اسی لیے قیامت میں جزا و سزا کا نظام اللہ کے ذمے ہے نیز اللہ نے وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

روز قیامت کی حکمتوں میں سے ایک اہم حکمت یہ ہے کہ اس دن حق و باطل خیر و شر اور ہدایت و ضلالت کے سلسلے میں حقائق سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔ دنیا میں لوگ ان چیزوں میں اختلاف کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے ان اختلافی باتوں میں سے حق کو کھول کر بیان فرماتا ہے لیکن اسے دنیا میں دلیل و برہان کے ساتھ بیان کیا ہے، آخرت میں شہود و عیان کے ساتھ بیان ہو گا:

لَقَدۡ كُنۡتَ فِىۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا فَكَشَفۡنَا عَنۡكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الۡيَوۡمَ حَدِيۡدٌ ۝ [2] — بے شک تو اس چیز سے غافل تھا چنانچہ ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے لہٰذا آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔

اہم نکات

۱۔ حیات بعد الموت ایسا لازمی امر ہے جو اللہ کے ذمے ہے: وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا ....

۲۔ قیامت کے دن حقائق سے پردہ اٹھ جائے گا: وَ لِيَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا ....

اِنَّمَا قَوۡلُنَا لِشَىۡءٍ اِذَاۤ اَرَدۡنٰهُ اَنۡ نَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝

۴۰۔ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کر لیتے ہیں تو بے شک ہمیں اس سے یہی کہنا ہوتا ہے: ہو جا! پس وہ ہو جاتی ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کے دو ارادے ہیں: ایک ارادہ تشریعی۔ قانون اور دستور سازی کے ذریعے لوگوں سے چاہتا ہے کہ وہ اس قانون اور دستور کی پابندی کریں۔ اللہ کے اس ارادے کی اطاعت بھی ہوتی ہے اور نافرمانی بھی ہوتی ہے۔

دوسرا ارادہ تکوینی۔ عالم خلق و ایجاد سے مربوط ارادہ۔ یہاں اللہ کا ارادہ فوراً نافذ العمل ہوتا ہے بلکہ یہاں ارادہ اور ایجاد دو چیزیں بھی نہیں ہیں۔ ادھر اللہ کا ارادہ ہو گیا، خلق و حقیقت وجود میں آ گئی۔ یہی

---

[1] ۳۲ سجدہ: ۱۸ [2] ۵۰ ق: ۲۲

حقیقت واقعی اللہ کا ارادہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ نے ارادہ کیا پھر اس کو کن کہا اور پھر وہ ہو گیا بلکہ کاف و نون ایک تعبیر ہے ورنہ ارادہ اور مراد میں دوئی نہیں ہے۔ دونوں ایک ہیں۔ لہٰذا قیامت کے دن مردوں کو زندہ اٹھانے کے لیے کاف و نون کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس اللہ نے ارادہ کر لیا مردے زندہ ہو گئے۔

اہم نکات

۱۔ ارادہ و مقصود الٰہی میں تفریق نہیں ہے۔

۲۔ مقصود کا وجود میں آنا ہی ارادہ تکوینی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اور جنہوں نے ظلم کا نشانہ بننے کے بعد اللہ کے لیے ہجرت کی انہیں ہم دنیا ہی میں ضرور اچھا مقام دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، اگر وہ جانتے ہوتے۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

بعض مفسرین نے کہا ہے: یہ آیت مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کی شان میں ہے۔

ان کا یہ موقف ہو گا کہ اس سورت کی یہ آیتیں مدنی ہیں۔ جو لوگ اس پورے سورہ کو مکی قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک یہ آیت حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

ہجرت اگر فی اللّٰہ، لوجہ اللّٰہ صرف رضایت الٰہی کی غرض سے ہو، ہجرت سے پہلے ظلم سہ چکے ہوں تو ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں اس کی جزا کا ذکر ہے۔ دنیا میں اجر یہ ہو گا کہ جس وطن کو راہ خدا میں خیر باد کہہ دیا ہے، اس سے بہتر وطن عنایت ہو گا اور آخرت کا اجر تو دنیوی سے کہیں بہتر و بالاتر ہو گا۔ اس کا اندازہ اس دنیا، عالم بشر میں نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لیے فرمایا: آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے اگر یہ جانتے ہوتے۔ آخر آیت ان مہاجرین کے لیے دو شرطوں کا اور ذکر فرمایا: صبر اور توکل۔

اہم نکات

۱۔ ان مہاجرین کے لیے دارین کی سعادت ہے جو مظلوم واقع ہوئے، راہ خدا میں ہجرت کی اور صبر و توکل سے کام لیا۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔اور ہم نے آپ سے پہلے صرف مردان (حق) رسول بنا کر بھیجے ہیں جن پر ہم وحی بھیجا کرتے ہیں، اگر تم لوگ نہیں جانتے ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔

بِالۡبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ وَ لَعَلَّهُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ (جنہیں) دلائل اور کتاب دے کر بھیجا تھا اور (اے رسول) آپ پر بھی ہم نے ذکر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو وہ باتیں کھول کر بتا دیں جو ان کے لیے نازل کی گئی ہیں اور شاید وہ (ان میں) غور کریں۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ نے جب بھی اہل ارض کی طرف کسی رسول کو بھیجا ہے تو انہی آدمیوں کو وحی دے کر بھیجا ہے جن کے پاس اگر کوئی طاقت تھی تو وہ بینات و زبر کی طاقت تھی، دلیل و منطق کی طاقت۔ ان کو مافوق البشر طاقت کی اجازت دے کر نہیں بھیجا کہ اس طاقت کے ذریعے وہ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کریں۔ اگر اللہ کی سنت اس قسم کی طاقت استعمال کرنے کی ہوتی تو آج کے مشرک یہ کہہ سکتے تھے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرسکتے۔ اس بارے میں یہ حکم ہوا: گزشتہ انبیاء کے بارے میں اگر تم جاننا چاہتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو کیا وہ انسان تھے یا کوئی مافوق البشر تھے؟

فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ: یہاں شان نزول کے اعتبار سے فَسۡـَٔلُوۡۤا کے مخاطب مشرکین ہیں کہ اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو جو گزشتہ انبیاء کے بارے میں جانتے ہیں۔ وہ بنا بقول مفسرین اہل کتاب ہیں۔

تفسیر میں ایک مسلمہ کلیہ ہے جسے تمام مسالک کے مفسرین مانتے ہیں: العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص المورد۔ لفظ کے عموم کا لحاظ کیا جاتا ہے، خصوص کے نزول کا نہیں۔ لہٰذا اگر آیت کسی خاص مورد کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو اسی مورد کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی بلکہ لفظ میں اگر گنجائش ہے تو اس مورد کے علاوہ دیگر تمام موارد شامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہاں آیت اگرچہ گزشتہ انبیاء کا حال جاننے والوں سے پوچھنے کے بارے میں ہے لیکن آیت کا عموم ہر نہ جاننے والے کے لیے جاننے والوں کی طرف رجوع کرنا واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے کہ اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔ ظاہر ہے جیسا کہ سابقہ کتب کو بھی الذکر کہا گیا، قرآن کو بھی کئی جگہ الذکر کہا ہے۔ لہٰذا قرآن جاننے والوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم اسی آیت سے ثابت ہوسکتا ہے۔

اسی سے جابر کی یہ روایت سمجھ میں آ جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لا ینبغی للعالم ان یسکت علی علمه ولا ینبغی للجاهل ان یسکت علی جهله و قد قال اللّٰہ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ فینبغی للمؤمن ان یعرف عمله علی هدی ام علی ضلال.[1]

عالم کو اپنے علم اور جاہل کو اپنی جہالت پر سکوت اختیار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ لہٰذا مؤمن کو چاہیے کہ وہ اپنے عمل کے بارے میں جان لے کہ ہدایت پر ہے یا ضلالت پر۔

چنانچہ ابن عباس کے نزدیک اَہۡلَ الذِّکۡرِ سے مراد، اہل قرآن ہیں۔

یہاں سے ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول روایات بھی قابل فہم ہو جاتی ہیں۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام و حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے روایت ہے:

نحن اَہۡلَ الذِّکۡرِ و نحن المسئولون.[2] ہم اہل ذکر ہیں اور ہم ہی سے سوال کیا جانا چاہیے۔

اس سلسلے میں اہل سنت کے مصادر کے لیے رجوع ہو: احقاق الحق ۳: ۴۱۲

اسی سے نزدیک انس کی یہ روایت ہے:

سمعت رسول اللّٰہ یقول: ان الرجل لیصلی و یصوم و یحج و یعتمر و انه لمنافق قیل: یارسول بماذا دخل علیه النفاق؟ قال یطعن علی امامه و امامه من قال اللّٰہ تعالیٰ فی کتابه فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ[3]

میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا: آدمی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، حج و عمرہ بجا لاتا ہے اور وہ منافق ہوتا ہے۔ سوال کیا گیا: یارسول اللہ! اس میں نفاق کیسے داخل ہو گیا؟ فرمایا: وہ اپنے امام کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا جب کہ اس کے امام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ

ہمارے اس بیان سے اس اعتراض کا جواب بھی آ گیا کہ خطاب مشرکین سے ہے۔ وہ خود رسولؐ کو نہیں مانتے تھے، ان کے اہل بیت (ع) کو کیسے مان لیں گے؟

اہم نکات

۱۔ تمام انبیاء علیہم السلام انسان تھے۔

۲۔ نہ جاننے والوں کو جاننے والون کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

۳۔ اثبات رسالت کے لیے اہل کتاب سے رجوع کرنا چاہیے تو حفظ رسالت کے لیے اہل قرآن

---

[1] تفسیر الدار المنثور ۴: ۲۲۲ [2] تفسیر المیزان بحوالہ تفسیر عیاشی [3] روح المعانی ۱۴: ۱۴۷۔ الدر المنثور ۴: ۲۲۲

اس موضوع پر مزید تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر شواهد التنزیل ۱: ۴۳۴ ذیل آیہ۔

(ائمہ اہل بیتؑ) سے رجوع کرنا چاہیے۔

اَفَاَمِنَ الَّذِیۡنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّخۡسِفَ اللّٰہُ بِہِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ یَاۡتِیَہُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ جو بدترین مکاریاں کرتے ہیں کیا وہ اس بات سے بے خوف ہیں کہ اللہ انہیں زمین میں دھنسا دے یا ان پر ایسی جگہ سے عذاب آئے کہ جہاں سے انہیں خبر ہی نہ ہو؟

اَوۡ یَاۡخُذَہُمۡ فِیۡ تَقَلُّبِہِمۡ فَمَا ہُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ یا انہیں آتے جاتے ہوئے (عذاب الٰہی) پکڑ لے؟ پس وہ اللہ کو عاجز تو کر نہیں سکتے۔

اَوۡ یَاۡخُذَہُمۡ عَلٰی تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ یا انہیں خوف میں رکھ کر گرفت میں لیا جائے؟ پس تمہارا رب یقیناً بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

تشریح کلمات

تَخَوُّفٍ: (خ و ف) کسی انسان کا اظہار خوف کرنا۔ بعض نے تَخَوُّفٍ کے معنی تنقص سے کیا ہے۔ اس صورت میں آیت کا ترجمہ اس طرح بنے گا: یا ان کو (مال و دولت کے) گھٹانے کے ذریعے گرفت میں لیا جائے۔

تقلب: (ق ل ب) آمد و رفت کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَاَمِنَ الَّذِیۡنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ: کیا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایذاء کے لیے بدترین سازش کرنے والے یہ خیال نہیں کرتے کہ اللہ ان کو کسی زمینی آفت میں مبتلا کر دے۔

۲۔ اَنۡ یَّخۡسِفَ اللّٰہُ: ان پر نزول عذاب کے لیے کسی خاص وقت مقام اور ذرائع کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھے بیٹھے زمین میں دھنس سکتے ہیں۔ غیر متوقع جگہ سے عذاب آ سکتا ہے۔ جیسا کہ جنگ بدر میں بالکل غیر متوقع جگہ سے ان پر عذاب آیا۔

۳۔ اَوۡ یَاۡخُذَہُمۡ فِیۡ تَقَلُّبِہِمۡ: یا کسی تجارت وغیرہ کے سفر میں جاتے آتے ہوئے عذاب آ سکتا ہے۔

۴۔ اَوۡ یَاۡخُذَہُمۡ عَلٰی تَخَوُّفٍ: کچھ نہ ہوا اور اللہ نے اپنی شفقت و رحمت سے کام لیا تو خوف و ہراس میں تو مبتلا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری تشریح کے مطابق اللہ نے اگر رحم کیا تو مال و دولت کو گھٹا کر تم کو کم سے کم

سزا دے سکتا ہے۔

۵۔ فَاِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ : ذکر عذاب کے بعد اللہ کی رأفت و رحمت کا ذکر کیسے آیا؟ جواب یہ ہے کہ مجرمین کے جرم کی سزا میں سے کم تر سزا کے ذکر فرمایا۔ پھر فرمایا: کمتر سزا اس لیے ہے کہ اللہ شفیق مہربان ہے۔

اہم نکات

۱۔ کافر کسی طرح بھی امن کا مستحق نہیں ہے: اَفَاَمِنَ الَّذِيۡنَ ....۔

۲۔ سازشی زمین میں دھنس سکتا ہے: اَنۡ يَّخۡسِفَ ....۔

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمۡ دٰخِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ کیا انہوں نے اللہ کی مخلوقات میں ایسی چیز نہیں دیکھی جس کے سائے دائیں اور بائیں طرف سے عاجز ہو کر اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے جھکتے ہیں؟

تشریح کلمات

يَّتَفَيَّؤُا: الفیئی کے معنی اچھی حالت کی طرف آنے کے ہیں۔ اسی سے فاء الظل ہے جس کے معنی سایہ لوٹ آنے کے ہیں اور مال غنیمت جو بلا مشقت حاصل ہو جائے اسے بھی فیئی کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

سایہ کے سجدے کے بارے میں سورہ الرعد آیت ۱۵ میں تفصیل گزر چکی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

وَ لِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ مِنۡ دَآبَّةٍ وَّالۡمَلٰٓئِكَةُ وَهُمۡ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اور آسمانوں اور زمین میں ہر متحرک مخلوق اور فرشتے سب اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

يَخَافُوۡنَ رَبَّهُمۡ مِّنۡ فَوۡقِهِمۡ وَيَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ وہ اپنے رب سے جو ان پر بالا دستی رکھتا ہے ڈرتے ہیں اور انہیں جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ دَآبَّۃٍ: رینگنے اور چلنے والے جانداروں کو کہتے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ آسمانوں میں فرشتوں کے علاوہ چلنے والے جاندار ہیں جو اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔ یہ مخلوق فرشتوں کے علاوہ اس لیے ہے کہ فرشتوں کا الگ ذکر ہوا ہے۔ یہ چلنے والی مخلوق اور فرشتے اللہ کے لیے سجدہ کرنے سے تکبر نہیں کرتے اور اپنے رب کا خوف دل میں رکھتے ہیں۔

۲۔ مِّنۡ فَوۡقِہِمۡ: وہ رب جو ان پر بالا دستی اور فوقیت رکھتا ہے۔

اہل سنت کے علمائے سلف کا یہ موقف رہا ہے کہ آیات قرآنی میں کسی قسم کی تاویل و توجیہ جائز نہیں ہے۔ الفاظ قرآن سے جو بھی معنی بظاہر سامنے آتے ہیں اسی پر محمول کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ یَخَافُوۡنَ رَبَّہُمۡ مِّنۡ فَوۡقِہِمۡ سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ اللہ ''اوپر'' ہے اور اللہ کے لیے بالانشینی ثابت ہے۔ چنانچہ علامہ شام قاسمی نے محاسن التاویل، علامہ ذہبی نے کتاب العلو، ابن قیم نے الجیوش الاسلامیۃ اور حکیم ابن رشد نے مناھج الدولۃ میں طویل بحث کی ہے اور سب کی رائے سے ثابت کیا ہے کہ اللہ ''اوپر'' ہے۔ تفصیل کے لیے مقدمہ ملاحظہ فرمائیں۔

وَ قَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اِلٰـہَیۡنِ اثۡنَیۡنِ ۚ اِنَّمَا ہُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ اور اللہ نے فرمایا: تم دو معبود نہ بنایا کرو، معبود تو بس ایک ہی ہے پس تم صرف مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

وَ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لَہُ الدِّیۡنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ تَتَّقُوۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کی ملکیت ہے اور دائمی اطاعت صرف اسی کے لیے ہے تو کیا تم اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرتے ہو؟

تشریح کلمات

وَاصِبًا: (و ص ب) الوصب کے معنی دائمی مرض کے ہیں: وَّ لَہُمۡ عَذَابٌ وَّاصِبٌ۔[۱] آیت میں دین بمعنی اطاعت ہے اور واصب بمعنی دائم ہے۔ صحاح میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی بات کا ہمیشہ پابند رہتا ہے تو کہتے ہیں: وصب الرجل علی الامر۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اِلٰـہَیۡنِ اثۡنَیۡنِ: معبود ایک ہی ہے، ایک سے زائد معبود باطل ہے لہٰذا دو معبود بنانے

---

[۱] ۳۷ صافات: ۹

سے باطل شروع ہو جاتا ہے۔ آگے وہ ان کی تعداد جس قدر بھی بڑھائیں سب کفر و شرک اور باطل ہے۔ مقصود یہ ہے کہ غیر خدا کو معبود نہ بناؤ۔ آگے غیر خدا ایک ہو یا کئی ایک سب اس میں آ گئے۔

دوسری تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ مشرکین کے معبود دو قسم کے ہوتے تھے: ایک معبود خالق ہے اور دوسرا معبود رب اور مدبر ہے۔ آگے مدبر ایک ہو یا کئی، یہ سب ایک نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے معبود دو میں منحصر ہوتے تھے: الہ الخلق اور الہ التدبیر۔

آسمانوں اور زمین میں اسی الٰہ واحد کی سلطنت ہے۔ اس میں کسی اور کی شرکت نہیں۔ لہٰذا عبادت و اطاعت میں بھی کسی کی شرکت نہیں ہے۔

۲۔ وَلَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ: اس کائنات کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ مالک وہ ہوتا ہے کہ مملوک اس کے تصرف میں ہو تو کل کائنات اللہ کے تصرف میں ہے۔ لہٰذا وہی اس کائنات کی تدبیر کر سکتا ہے۔ دوسرے جو اس کائنات میں کسی چیز کے مالک نہیں ہیں بلکہ خود مملوک ہیں، وہ کیسے تدبیر کر سکتے ہیں؟

۳۔ وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا: دین کا مطلب خواہ دستور دنیا ہو، خواہ اطاعت یا جزاء، ہر صورت میں دین صرف اللہ کے لیے ہے چونکہ مالک دستور زندگی دے سکتا ہے اور اطاعت بھی مالک کی ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ صرف اللہ پوری کائنات کا مالک ہے۔ خلق اور تدبیر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾	۵۳۔ اور تمہیں جو بھی نعمت حاصل ہو وہ اللہ کی طرف سے ہے پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو تم اس کے حضور زاری کرتے ہو۔
ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾	۵۴۔ پھر جب اللہ تم سے تکلیف دور کر دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتے ہیں۔
لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾	۵۵۔ اس طرح وہ ان نعمتوں کی ناشکری کرنا چاہتے ہیں جو ہم نے انہیں دے رکھی ہیں سو ابھی تم مزے کر لو، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

تشریح کلمات

الجؤار: (ج ء ر) کے اصل معنی وحشی جانوروں کے گھبراہٹ کے وقت زور سے آواز نکالنے اور چیخنے

کے ہیں۔ پھر تشبیہ کے طور پر دعا اور تضرع میں افراط اور مبالغہ کرنے پر بولا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا بِکُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ: بیرونی عوامل کے انسانی فطرت پر بہت سے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ مثلاً علم دوستی، جمالیات پرستی اور احسان کرنے کا جذبہ، بالاتفاق انسانی فطری امور ہیں۔ اس کے باوجود برے ماحول اور بری تربیت کی وجہ سے انسان ان فطری تقاضوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح خدا پرستی ہے کہ وہ بھی انسان کی فطرت اور جبلت میں رچی بسی ہوتی ہے لیکن بیرونی عوامل کی وجہ سے انسان اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

۲۔ ثُمَّ اِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ: جب انسان کسی مشکل میں مبتلا ہوتا ہے تو بیرونی عوامل کا دباؤ ہٹ جاتا ہے اور انسان اپنی فطرت سلیم کے ساتھ سرگوشی کرنے لگتا ہے تو فطرت بنیادی طور پر اپنے خالق سے مانوس ہے۔ اسے فوراً پکارتا ہے اور صرف اسی سے لو لگاتا ہے۔

۳۔: جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو پھر بیرونی عوامل کے دباؤ میں آتا ہے اور دیگر مشرکوں کی طرح یہ بھی اللہ کو بھول جاتا ہے اور شرک کرنے لگتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ معبود وہ ہے جس کو انسان مصیبت کے وقت پکارتا ہے: فَاِلَیۡہِ تَجۡـَٔرُوۡنَ۔

وَ یَجۡعَلُوۡنَ لِمَا لَا یَعۡلَمُوۡنَ نَصِیۡبًا مِّمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ ؕ تَاللّٰہِ لَتُسۡـَٔلُنَّ عَمَّا کُنۡتُمۡ تَفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ اور یہ لوگ ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے ان کے لیے حصے مقرر کرتے ہیں جنہیں یہ جانتے بوجھتے تک نہیں، اللہ کی قسم اس افترا کے بارے میں تم سے ضرور پوچھا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَیَجۡعَلُوۡنَ لِمَا لَا یَعۡلَمُوۡنَ نَصِیۡبًا: وہ ایسی چیزوں کے لیے نیاز و بھینٹ چڑھاتے ہیں جن کے بارے میں انہیں کوئی علم نہیں ہے کہ ان چیزوں کو بھی خدائی امور میں مداخلت کا حق ہے یا ان چیزوں کا اللہ کی سلطنت میں حصہ اور شرکت ہے بلکہ اپنے ظن و تخمین کے مطابق ان بتوں کے سامنے اپنے نذرانے پیش کرتے ہیں۔

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ مشرکین ان بتوں کے لیے بھینٹ چڑھاتے ہیں جو یہ تک نہیں جانتے کہ ان کے لیے کوئی نذرانہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق لَا یَعۡلَمُوۡنَ سے مراد بت ہیں۔

۲۔ تَاللّٰہِ: اللہ تعالیٰ خود اپنی ذات کی قسم کھا کر فرماتا ہے کہ ان لوگوں نے جو افترا کیا ہے، غلط نسبت دی ہے، اس کے بارے میں ان سے پوچھا جائے گا۔ اس آیت سے یہ بات صراحت کے ساتھ واضح ہوگئی:

i۔ جو علم و شعور نہیں رکھتے ان کے لیے نذرانہ پیش کرنا جیسے بے شعور بتوں کے لیے،

ii۔ جن کے بارے میں علم نہ ہو کہ وہ خدائی امور میں مداخلت کا حق رکھتے ہیں ان کے لیے نذرانہ پیش کرنا افتراء، اللہ کی طرف جھوٹی نسبت ہے۔ لَتُسۡـَٔلُنَّ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس قدر بڑی جسارت ہے۔

اگر کوئی مال اللہ کے نام خرچ کرتا ہے، اس کا ثواب اھدا کرتا ہے تو یہ افتراء علی اللّٰہ نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ کو رب سمجھ کر اس کے تقرب کے لیے مال خرچ کرنا سنگین افتراء ہے۔

وَ یَجۡعَلُوۡنَ لِلّٰہِ الۡبَنٰتِ سُبۡحٰنَہٗ ۙ وَ لَہُمۡ مَّا یَشۡتَہُوۡنَ ﴿۵۷﴾

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُہُمۡ بِالۡاُنۡثٰی ظَلَّ وَجۡہُہٗ مُسۡوَدًّا وَّ ہُوَ کَظِیۡمٌ ﴿۵۸﴾

یَتَوَارٰی مِنَ الۡقَوۡمِ مِنۡ سُوۡٓءِ مَا بُشِّرَ بِہٖ ؕ اَیُمۡسِکُہٗ عَلٰی ہُوۡنٍ اَمۡ یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۵۹﴾

۵۷۔ اور انہوں نے اللہ کے لیے بیٹیاں قرار دے رکھی ہیں جس سے وہ پاک و منزہ ہے اور (یہ لوگ) اپنے لیے وہ (اختیار کرتے ہیں) جو یہ خود پسند کرتے ہیں (یعنی لڑکے)۔

۵۸۔ اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خبر دی جاتی ہے تو مارے غصے کے اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے۔

۵۹۔ اس بری خبر کی وجہ سے وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کیا اسے ذلت کے ساتھ زندہ رہنے دے یا اسے زیر خاک دبا دے؟ دیکھو! کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کر رہے ہیں؟

تفسیر آیات

عرب جاہلیت کے مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور ساتھ دیویوں کا تصور بھی تھا جنہیں اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے اور اپنی بیٹیوں کو جب زندہ درگور کرتے تو کہتے تھے: الحقوا البنات بالبنات۔ ان بیٹیوں کو ان بیٹیوں کے ساتھ ملا دو۔

مشرکین اپنے لیے اپنی پسند کی اولاد بیٹے چاہتے تھے اور اللہ کے لیے بیٹیاں۔ دوسری جگہ فرمایا:

اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَ لَہُ الۡاُنۡثٰی ۝ تِلۡکَ اِذًا قِسۡمَۃٌ ضِیۡزٰی ۝ [1] — کیا تمہارے لیے تو بیٹے اور اللہ کے لیے بیٹیاں ہیں؟ یہ تو پھر غیر منصفانہ تقسیم ہے۔

خود ان کی اپنی پسند کے مطابق اپنے لیے بیٹے اور اللہ کے لیے بیٹیاں قرار دیتے تھے ورنہ اللہ کے لیے تو اولاد قرار دینا خود اپنی جگہ بہت بڑی جسارت ہے۔

مشرکین لڑکی کو عار و ننگ تصور کرتے تھے۔ غیرت کے نام پر اسے زندہ درگور کر دیتے اور اقتصادی طور پر بھی اسے بوجھ تصور کرتے تھے۔ قحط کے خوف سے بھی اپنی اولاد، خاص کر بیٹیوں کو مار ڈالتے تھے۔

ایسے ماحول میں مبعوث ہونے والے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انقلاب کس قدر عظیم ہے کہ اپنی بیٹی کو اپنا ٹکڑا قرار دیتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ جس قوم کی طرف رسولؐ مبعوث ہوئے وہ بے شعوری کی اس منزل پر تھی کہ اپنی اولاد کو زندہ درگور کرتی تھی۔

۲۔ مشرکین جس چیز کو اپنے لیے عار سمجھتے تھے اسے اللہ کے ساتھ منسوب کرتے تھے۔

لِلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ مَثَلُ السَّوۡءِ ۚ وَ لِلّٰہِ الۡمَثَلُ الۡاَعۡلٰی ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لیے بری صفات ہیں اور اللہ کے لیے تو اعلیٰ صفات ہیں اور وہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لِلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ: انسان ایک ارتقا پذیر مخلوق ہونے کی وجہ سے مکلّف واقع ہوا ہے اور تکلیف کے لیے آزمائش اور امتحان ضروری ہے۔ آزمائش و امتحان کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود مختار اور اپنے ارادے کا خود مالک ہو۔ خود مختاری کے لیے ضروری ہے کہ منفی اور مثبت دونوں پہلو انسان کے قبضہ قدرت میں ہوں۔ چنانچہ یہ انسان اعلیٰ ترین قدروں کا مالک بھی ہو سکتا ہے اور نہایت ہی پست ترین اوصاف سے متصف بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً انسان میں جذبہ انتقام بھی ہے اور رحم و درگزر کا جذبہ موجود ہے۔ ایثار و قربانی کا جذبہ بھی انسانی سرشت میں موجود ہے۔ اس جذبے کے تحت وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتا ہے۔

وَ یُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَ لَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ ... [2] — اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود محتاج ہوں۔

---

[1] ۵۳ نجم: ۲۱۔۲۲ [2] ۵۹ حشر: ۹

دوسروں کا استحصال کرنے کا مادہ بھی اسی انسان میں موجود ہے جس کے تحت انسان اپنے مفادات کو ترجیح دیتا اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔

اس دوراہے میں کھڑے انسان میں یہ محرک کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے جس کے تحت وہ اعلیٰ ترین قدروں کا مالک بنے اور پست ترین اوصاف سے بچے۔ ظاہر ہے یہ محرک خود انسان کے اندر پیدا ہونا چاہیے ورنہ بیرونی محرک اس سلسلے میں کافی نہیں ہے۔

آخرت پر ایمان وہ محرک ہے جو انسان کو برے اعمال سے روکتا اور نیک اعمال کی ترغیب دیتا ہے کیونکہ عقاب و ثواب پر ایمان سے انسان اپنی ابدی زندگی کو اچھے اعمال سے سدھارتا ہے اور اس دنیا میں جتنے جرائم اور مظالم موجود ہیں وہ ایمان بالآخرہ نہ ہونے یا اس پر ایمان کمزور ہونے کی وجہ سے ہیں۔

لٰہذا آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کی صفات ہمیشہ بری ہوتی ہیں۔

۲۔ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى: اور خوبتر اوصاف اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ بے نیازی، پاک و منزہ، عزت وکبریاء، اولاد کا محتاج نہ ہونا وغیرہ۔ دوسری جگہ فرمایا:

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ...[1]　اور آسمانوں اور زمین میں اس کے لیے اعلیٰ شان و منزلت ہے...

اہم نکات

۱۔ انکار آخرت تمام جرائم کا سرچشمہ ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ اور اگر لوگوں کے ظلم کی وجہ سے اللہ ان کا مواخذہ کرتا تو روئے زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا لیکن اللہ انہیں ایک مقررہ وقت تک مہلت دیتا ہے پس جب ان کا مقررہ وقت آجاتا ہے تو وہ نہ گھڑی بھر کے لیے پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔

تفسیر آیات

کرہ ارض میں کون سا خطہ ہے جس میں ہر گھڑی بدترین جرائم کا ارتکاب نہیں ہوتا، انسانیت کا

----

[1] ۳۰روم: ۲۷

خون نہیں ہوتا۔ ہر طاقتور، کمزوروں کے ساتھ درندگی نہیں کرتا۔ عصمتیں نہیں لٹتیں۔ احکام الٰہی پامال نہیں ہوتے۔ ان جرائم کا اگر فوری مؤاخذہ کیا جاتا تو روئے زمین پر کوئی ظالم زندہ نہ بچتا۔ ظالم کے نہ ہونے سے کوئی مظلوم بھی نہ ہوتا۔ مظلوم کے نہ ہونے کی وجہ سے انصاف کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ انحراف نہ ہونے کی وجہ سے ہدایت دہندہ کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ نتیجتاً زمین کی پشت پر کوئی انسان مکلّف نہ ہوتا۔ اگر دَآبَّۃٍ سے مراد انسان لیا جائے۔ اگر دَآبَّۃٍ سے مراد تمام جاندار لیے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ تمام حیوانات انسان کے لیے مسخر ہیں۔ جب انسان ہی نہیں ہے تو حیوان بھی بے معنی ہو جائیں گے۔

لیکن اللہ تعالیٰ حلیم ہے۔ ان تمام جرائم و مظالم کے باوجود اپنی حکمت کے تحت ان کو ایک مقررہ مدت تک مہلت دیتا ہے۔ یہ مہلت توبہ کرنے والوں کے لیے رحمت اور نافرمانی کرنے والوں کے لیے مزید عقوبت کا موجب ہے اور جب مہلت کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو اس میں تقدیم و تاخیر ممکن نہیں ہے۔

بعض مفسرین دَآبَّۃٍ سے مراد صرف ظالم انسان لیتے ہیں۔ یعنی مَّا تَرَکَ عَلَیۡہَا مِنۡ ظالم ہے اور ظالم کو انسان کہنے کی جگہ دَآبَّۃٍ کہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان ظلم و زیادتی کی وجہ سے بنیادی طور پر ہلاکت کا مستحق ہے۔
۲۔ ظلم کے باوجود مہلت دینا اللہ کی رحمت اور حکمت ہے۔

وَ یَجۡعَلُوۡنَ لِلّٰہِ مَا یَکۡرَہُوۡنَ وَ تَصِفُ اَلۡسِنَتُہُمُ الۡکَذِبَ اَنَّ لَہُمُ الۡحُسۡنٰی ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَہُمُ النَّارَ وَ اَنَّہُمۡ مُّفۡرَطُوۡنَ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ اور یہ لوگ وہ چیزیں اللہ کے لیے قرار دیتے ہیں جو خود (اپنے لیے) پسند نہیں کرتے اور ان کی زبانیں جھوٹ کہتی ہیں کہ ان کے لیے بھلائی ہے جب کہ ان کے لیے یقیناً جہنم کی آگ ہے اور یہ لوگ سب سے پہلے پہنچائے جائیں گے۔

تشریح کلمات

مُّفۡرَطُوۡنَ: (ف ر ط) فرط کے معنی قصداً آگے بڑھ جانے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَجۡعَلُوۡنَ لِلّٰہِ مَا یَکۡرَہُوۡنَ: بیٹیاں جو خود انہیں ناپسند ہیں وہ اللہ کے لیے قرار دیتے ہیں

اور اللہ کی ذات کے خلاف نہایت گستاخی اور جسارت کرتے ہیں۔ پھر ساتھ یہ جھوٹ بھی زبانوں پر لائے ہیں کہ

۲۔ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى: اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ سچے ہیں اور آخرت موجود ہے تو جنت ہمارے لیے ہے۔ یا یہ مقصود ہے کہ شرک سے ہماری دنیوی حالت خراب نہ ہوگی بلکہ ہمارے معبودوں کے خوش ہونے کی وجہ سے بھلائی ہمارے حصے میں آئے گی، نہ مسلمانوں کے۔

۳۔ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ: اللہ تعالیٰ نے اس بات کے جواب میں فرمایا: یہ لوگ جہنم کی طرف سب سے پہلے پہنچائے جائیں گے۔ ان کو نہ صرف بھلائی نصیب نہ ہوگی بلکہ جہنم جانے والے والوں میں ہراول دستہ ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ مشرکین اللہ کی شان میں گستاخی اور جسارت کر کے جنتی ہونے کے دعویٰ کرتے ہیں۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ اللہ کی قسم! آپ سے پہلے بہت سی امتوں کی طرف ہم نے (رسولوں کو) بھیجا لیکن شیطان نے ان کے اعمال انہیں آراستہ کر کے دکھائے پس آج وہی ان لوگوں کا سرپرست ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ: اے رسول آپ سے پہلی امتوں کے لیے شیطان نے جیسا کہ ان کے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا کر دکھائے ہیں یہی شیطان آج بھی ان کا رفیق ہے۔ ضلالت و گمراہی ان کے لیے آراستہ کر کے دکھا رہا ہے۔

۲۔ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ: شیطان ان کا ولی، سرپرست اور صاحب اختیار ہے۔ فَهُوَ وَلِيُّهُمْ میں ولی کے معنی اکثر مفسرین نے ای متولی امورھم یا او متولی انحوائم لکھے ہیں۔ بعض نے وَلِيُّهُمْ کے معنی ناصرھم لکھے ہیں جب کہ شیطان کسی کی مدد نہیں کرتا، وہ گمراہ کرتا ہے۔ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ میں الْيَوْمَ سے مراد قیامت ہے تو ناصر کا معنی مراد لینا یقیناً درست نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء علیہم السلام کی رسالت کے بارے میں تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَہُمُ الَّذِی اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ ۙ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ اور ہم نے صرف اس لیے آپ پر کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ وہ باتیں ان کے لیے واضح طور پر بیان کریں جن میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ثابت ہوں۔

تفسیر آیات

جو لوگ حقیقت امر سے ناواقف نہیں ہوتے ہیں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اس اختلاف کو صرف وہ شخص ختم کر سکتا ہے جو حقیقت امر سے واقف ہو۔ لِتُبَیِّنَ لَہُمۡ وہ حقیقت اور امر واقع بیان کریں گے۔ اس کے بعد جو لوگ اس بیان پر ایمان لاتے ہیں ان کے لیے یہ بیان ہدایت اور رحمت بن جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن مومنوں کے لیے رحمت و ہدایت ہے۔
۲۔ حقائق بیان کرنا انبیاء علیہم السلام کی ذمہ داری ہے۔

وَ اللّٰہُ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ اور اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو زندہ کیا اس کے مردہ ہونے کے بعد، سننے والوں کے لیے یقیناً اس میں نشانی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اللّٰہُ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: خاموش اور مردہ زمین پر جب بارش کا پانی برستا ہے تو یکایک اس کی روئیدگی فعال ہو جاتی ہے اور نباتاتی و حشراتی زندگیوں کی رونق دو بالا ہو جاتی ہے۔ ایک زمین سالوں کی خشک سالی سے کیسے بنجر ہو جاتی ہے، اس میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور زندگی کے آثار مٹ جاتے ہیں

۲۔ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ: لیکن جب دو تین بارشیں ہوتی ہیں تو زندگی کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ سرسبز کھیتیاں لہرانے لگتی ہیں۔ زمین پر حشرات اور فضا میں پرندوں کی چہل پہل ہو جاتی ہے۔ حیات بعد الموت کا یہ نظارہ ہمیشہ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد حیات نو کا ایک روشن نمونہ ہمیشہ دکھایا جاتا ہے۔

۳۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً: اس میں گوش شنوا رکھنے والوں کے لیے معاد جسمانی پر ایک واضح نشانی ہے

کیونکہ نباتات وحیوانات، حیاتیاتی رشتے میں دونوں برابر ہیں۔ صرف شکل و اثر میں باہم مختلف ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حیات بعد الموت کا نظارہ ہم ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔

۲۔ جو ذات پانی کے ذریعے مردہ زمین کو حیات نو بخشتی ہے وہ مردہ انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ اور تمہارے لیے مویشیوں میں یقیناً ایک سبق ہے، ان کے شکم میں موجود گوبر اور خون کے درمیان سے ہم تمہیں خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے۔

تشریح کلمات

الفرث: (ف ر س) جو کچھ جانور کی اوجڑی میں ہوتا ہے اسے فرث کہتے ہیں۔

سَآئِغًا: (س و غ) ساغ الشراب فی الحلق کے معنی شراب آسانی سے حلق سے نیچے اتر جانا کے ہیں۔

تفسیر آیات

آج کے ماہرین کے مطابق بھی دودھ کی یہی ترکیب ہے:

دودھ نہ صاف شدہ خون ہے، نہ ہضم شدہ غذا۔ فرث، گوبر سے بالاتر اور خون سے کم تر ایک چیز ہے۔ دودھ کے بعض عناصر خون میں نہیں ہوتے وہ پستان کی غدود میں بنتے ہیں۔ مثلاً کازوئین....خون کے کچھ عناصر جو دودھ میں موجود ہیں وہ بغیر کسی تغیر کے خون کے پلازما سے دودھ میں داخل ہوتے ہیں۔ مثلاً مختلف وٹامن، خوردنی نمک اور مختلف فاسفیٹ۔ کچھ اور مواد بھی خون سے حاصل ہوتا ہے، مثلاً دودھ میں موجود شکر، خون میں موجود شکر سے حاصل ہوتی ہے۔[1]

اہم نکات

۱۔ جو ذات گوبر اور خون کے درمیان سے شیرین دودھ نکالتی ہے،

۱؎ تفسیر نمونہ ۱۱: ۲۳۸۔ بحوالہ اولین دانشگاہ آخرین پیامبر۔ ۶: ۷۱ تا ۷۷

۲۔　وہ زمین کے منتشر ذرات میں سے انسان کو دوبارہ نکال سکتی ہے۔

وَ مِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِیۡلِ وَ الۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡہُ سَکَرًا وَّ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم نشے کی چیزیں بناتے ہو اور پاک رزق بھی بنا لیتے ہو، عقل سے کام لینے والوں کے لیے اس میں ایک نشانی ہے۔

تفسیر آیات

کھجور اور انگور جسم انسانی کے لیے نہایت مفید اور اس کی ساخت کے ساتھ نہایت موزون غذا ہے۔ ان کا باہمی تناسب اور موزونیت اس پر دلیل ہے کہ ان چیزوں کے خلق کے پیچھے ایک شعور اور ارادہ کارفرما ہے مگر یہ کہ انسان خود اپنے عمل سے غیر موزوں اور ناپاک رزق بناتا ہے۔ اس آیت میں نشے کی چیزوں کو رزق حسن کے مقابلے میں ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ نشہ آور چیزیں پاک رزق نہیں ہے۔

صاحب تفسیر روح المعانی اس جگہ لکھتے ہیں:

> یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی۔ اس وقت شراب حلال تھی۔ نیک و بد سب لوگ پیتے تھے۔ اس کی حرمت کا حکم مدینے میں آیا ہے۔[۱]

اہل تحقیق کے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ شراب کی حرمت کا حکم مکہ ہی میں نازل ہوا تھا اور بعض نے یہ کوشش بھی کی ہے:

> السکر سے مراد نبیذ ہے اور آیت میں السکر کا ذکر مقام احسان میں کیا ہے: تم انگور اور کھجور سے السکر بناتے ہو۔ اس سے نبیذ کی حلیت ثابت ہو جاتی ہے۔[۲]

حقیقت یہ ہے کہ یہاں سکر کا ذکر رزق حسن کے مقابلے میں آنے کی وجہ سے اس کا ناپاک ہونا ثابت ہوتا ہے اور ان کے نظر میں جو لوگ نیک تھے وہ شراب پیتے تھے یا نبیذ آخر عمر تک پیتے تھے تو اس سے شراب و نبیذ کی حلیت ثابت نہیں ہوتی۔

اہم نکات

۱۔　یہ ناشکرا انسان نعمت الٰہی کو ناپاک رزق میں تبدیل کرتا ہے۔

---

[۱] و [۲] روح المعانی ۱۴: ۱۸۰

وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی پر وحی کی کہ پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں گھر (چھتے) بنائے۔

ثُمَّ کُلِیۡ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ؕ یَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِہَا شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ فِیۡہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ پھر ہر (قسم کے) پھل (کا رس) چوس لے اور اپنے پروردگار کی طرف سے تسخیر کردہ راہوں پر چلتی جائے، ان مکھیوں کے شکم سے مختلف رنگوں کا مشروب نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں ایک نشانی ہے۔

تفسیر آیات

زندہ موجودات میں بالعموم اور انسان میں بالخصوص عقل و شعور کے ماوراء ایک شعور اور اس خود آگاہ ضمیر کے پیچھے ایک ضمیر اور بھی ہے جسے ہم الہام، وجدان، ضمیر، القاء، اشراق، فراست اور غریزہ کا نام دیتے ہیں جو کم و بیش ہر انسان میں موجود ہوتا ہے اور اسے ایسی معلومات فراہم کرتا ہے جو عقل و حواس کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔

جدید ماہرین نفسیات بھی اس چیز سے آگاہ ہو گئے ہیں۔ اسے ''غیر شعوری من'' کا نام دیا ہے اور کہتے ہیں:

> کبھی انسان اپنے ''من'' سے نکل کر اس ''غیر شعوری من'' میں قدم رکھتا ہے تو اس پر وہ باتیں کھل جاتی ہیں جو ظاہری عقل و ادراک کے لیے ناقابل فہم ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طبیعی انسان کے ماوراء ایک اور انسان ہے جس کا ذریعہ ادراک، الہام و اشراق ہے جیسا کہ اس طبیعی انسان کا ذریعہ ادراک عقل و حواس ہیں۔

مناسب ہے کہ اس کی مزید کچھ وضاحت ہو: انسان جب کوئی ایسا عمل انجام دیتا ہے جو اپنی طبیعت کے خلاف اور وجدان و ضمیر کے تقاضوں کے مطابق ہو، مثلاً ہوس رانی کی بری عادت ترک کر دیتا ہے تو اس کو ایسا احساس فتح ہوتا ہے جیسا کہ کسی دشمن کے مقابلے میں فتح مل گئی ہو۔ جب انسان اپنے وجدان و ضمیر کے خلاف اور طبعی انسان کی ہوسرانی کے مطابق کام کرتا ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کسی دشمن

مبین کے مقابلے میں شکست کھائی ہو۔

اسی طرح جب انسان ایک نیک عمل انجام دیتا ہے تو ضمیر اس کو شاباش دیتا ہے اور ظاہری انسان و باطنی انسان، انسان اور اپنے ضمیر میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ اس طرح انسان میں ایک پرسکون فضا قائم ہو جاتی اور دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔ جب انسان اپنے ضمیر کے خلاف کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس مجرم کو ضمیر کی عدالت سے فوراً قرار واقعی سزا مل جاتی ہے ۔ چنانچہ جس پائلٹ نے ہیروشیما پر ایٹمی بم گرایا تھا آخر میں اسے پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا تھا۔

حیوانات میں یہ باطنی شعور جس کو کہتے ہیں، زیادہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انسان عقل اور رشد فکری میں برتر ہے جب کہ حیوانات میں عقل اور رشد فکری کی جگہ غریزہ اور حس باطنی ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ کیا ان حیوانات کی جسمانی ساخت و بافت ان کی رہنمائی کے لیے کافی ہے؟ یہ باتیں ان کی فطرت اور جبلت میں ودیعت ہیں؟ یا کوئی پراسرار طاقت ان کی رہنمائی کرتی ہے؟ بعض اہل نظر کا نظریہ یہ ہے کہ ایک پراسرار طاقت ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس پر دلیل کے طور پر سیلز (Cells) کے تخلیقی کارناموں کو پیش کرتے ہیں کہ ان میں تقسیم کار اور ذمے داری کے انتخاب کا شعور حیرت انگیز ہے کہ سیلوں کا انبوہ کس طرح منقسم اور تقسیم کار کا کاربند ہوتا ہے۔ کوئی دماغ بنانے لگتا ہے، کوئی ہڈی، کوئی اعصاب، جب کہ ان سب کی اصل ایک ہے۔ ذمے داری کے انتخاب کا عمل اور زیادہ حیرت انگیز ہے کہ ان سیلوں کو علم ہے کہ ہم نے بچے کو ماموں یا چچا، کس کی شکل میں بنانا ہے۔ جس کا بھی انتخاب ہو گا، ان کو اس کا علم ہے۔ مثلاً ماموں کی ناک کیسی ہے، منہ اور آنکھیں کتنی بڑی ہیں۔ اسی کے مطابق تصویر سازی کرتے ہیں۔

آیت کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے کہ یہ تعلیم و رہنمائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ اس پراسرار رہنمائی کو وحی سے تعبیر فرماتا ہے۔ جیسا کہ آیت میں ہے: وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ ...[1]
اور کبھی اسے الہام سے تعبیر فرمایا ہے: فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَ تَقۡوٰىہَا ۔[2]

البتہ اصطلاح میں وحی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے اور الہام خاص بندوں کے ساتھ۔ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اور الہام کا سلسلہ جاری ہے کیونکہ الہام ایک اشراقی عمل ہے جس کا تعلق باطنی شعور سے ہے۔

الہام ماہر نفسیات کے دائرہ تجربہ میں آ سکتا ہے جب کہ
وحی تجربے میں نہیں آتی۔
الہام تحت الشعور میں ہوتا ہے۔

---

[1] ۲۸ قصص: ۷۔ اور ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ انہیں دودھ پلائیں۔
[2] ۹۱ شمس: ۸۔ پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی۔

وحی شعور میں ہوتی ہے۔
الہام کا مصدر باطنی ہے۔
وحی کا مصدر خارجی ہے۔
الہام کشف معنوی ہے۔
وحی مشاہداتی حقیقت ہے۔ کیونکہ
وحی میں کلام وصوت کے ذریعے مطالب اخذ ہوتے ہیں۔ جب کہ
الہام اشراقی لہروں کے ذریعے ذہن کے تصورات میں آنے والے بغیر حروف و اصوات کے مطالب ہیں۔

آگے اس وحی کا مضمون بیان ہوتا ہے:

۱۔ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا: تو گھر بنا لے پہاڑوں میں۔ ان مکھیوں کا گھر (چھتا) معماری کا ایک حیرت انگیز شاہکار ہے۔ مسدس شکل کے ان چھتوں کی دقیق پیمانوں میں پیائش کی جائے تو ان میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں رہتا۔ مسدس شکل اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ ان کا کوئی کونہ بیکار نہیں رہتا۔

۲۔ ثُمَّ کُلِیۡ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ: پھر ہر قسم کے پھلوں کا رس چوس۔ شہد کی مکھیاں پھولوں کی جڑوں میں موجود شکر کا خاص مادہ بلکہ پھلوں کے ابتدائی مراحل کا جوہر چوستی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ اس چوسنے سے نہ صرف پھل پر منفی اثر نہیں پڑتا بلکہ پھلدار پودوں کی بارداری، پھلوں کی پرورش میں بھی اس قدر مفید ہے کہ ماہرین کہتے ہیں کہ اگر شہد کی مکھیاں ختم ہو جائیں تو لاتعداد پھل اور پھول نابود ہو جائیں۔

۳۔ فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا: اور اپنے رب کی طرف سے تسخیر کردہ، راہوں پر چلتی جا۔ ایک نہایت تمدنی نظم ونسق کے لیے اس مخلوق کی راہیں ہموار کی گئی ہیں۔ یہ ان کے پروردگار کی طرف سے ہے۔ چنانچہ مکھیوں کا نظام درج ذیل دستوں پر مشتمل ہے جو ایک ملکہ کی زیر سلطنت کام کرتے ہیں۔ ۴۴۰

i۔ دربان۔ یہ دستہ غیر متعلقہ فرد کو چھتے کے اندر آنے نہیں دیتا ہے۔ اگر کوئی مکھی گندگی پر بیٹھ گئی ہے تو دربان اسے چھتے کے باہر روک لیتے ہیں اور ملکہ اس کو قتل کر دیتی ہے۔ قدرت نے مکھیوں کو آنے والے مواد کا تجزیہ کرنے کی ایسی صلاحیت دی رکھی ہے کہ انسان بڑی بڑی لیبارٹریوں میں کر سکے۔

ii۔ ایک دستہ انڈوں کی حفاظت پر مامور ہوتا ہے۔

iii۔ بچوں کی تربیت کے لیے ایک دستہ متعین ہے۔

iv۔ ایک نہایت ماہر دستہ معماری پر متعین ہے جو مسدس کی شکل میں چھتے بناتا ہے۔

v۔ ایک دستے کی ذمہ داری یہ ہے کہ نباتات پر جمے ہوئے سفوف سے موم حاصل کر کے معماروں

کو پہنچا دے تا کہ چھتوں کی تعمیر میں استعمال کریں۔

vi۔ پھلوں، پھولوں سے رس چوسنے والا دستہ جو شہد بنانے پر مامور ہے۔ ان کا آپس میں ایسا مواصلاتی نظام قائم ہے جس کی مدد سے ہزاروں مکھیاں نہایت خوش اسلوبی سے اپنے اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔

غذا کی تلاش میں نکلنے والی مکھی کو غذا کا ذخیرہ کہیں نظر آتا ہے تو چھتے میں واپس آتی ہے اور ایک خاص قسم کے رقص کے ذریعے دائرہ بناتی ہے اور اس دائرے کو مخصوص زاویے سے کاٹتی ہے جس سے دوسری مکھیوں کو پتہ چلتا ہے کہ غذا کس سمت اور کتنے فاصلہ پر موجود ہے۔ یہ مکھیاں خوشبو کو دو میل دور سے سونگھ سکتی ہیں۔ انسانی آنکھوں میں صرف دو عدسے ہوتے ہیں لیکن شہد کی مکھی کی ہر آنکھ میں چھ ہزار عدسے ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ بے شمار زاویوں سے اور باریک سے باریک جراثیم اور گرد و غبار بھی دیکھ سکتی ہے۔ یہ ہیں وہ راہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان مکھیوں کے لیے تسخیر فرمایا ہے۔

۴۔ فِیۡہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ: شہد کے شفا بخش ہونے کے سلسلے ماہرین نے بہت سے قابل توجہ خواص بیان کیے ہیں۔

۵۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ: شہد کی مکھی میں یہ سوجھ بوجھ اس کی جسمانی ساخت و بافت کے ماوراء موجود ہے۔ یہاں قرآن فکر کی دعوت دیتا ہے کہ اگر شہد کی مکھی کی خلقت دفعتاً اور اتفاقی طور پر ہوئی ہوتی، تخلیق میں تدبیر نہ ہوتی تو مشین کی طرح خلقت پر بات ختم ہو جاتی اور خلقت کے ماوراء کچھ نہ ہوتا۔ لہٰذا خلقت کے پیچھے اس حیرت انگیز شعور کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس مکھی کو ایک شعور اور ارادے نے پیدا کیا اور اسی نے اسے شعور دیا جس سے اس کی زندگی کی تدبیر ہوتی ہے اور اس کی مہارت سے شہد جیسی شفا بخش چیز وجود میں آتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ شہد کی مکھی انسان کی خدمت کے لیے کام کرتی ہے: فِیۡہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ....

۲۔ شہد کی مکھی میں موجود شعور، خالق شعور کی آیت ہے: لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ۔

وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمۡ ثُمَّ یَتَوَفّٰىکُمۡ ۟ۙ وَ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ لِکَیۡ لَا یَعۡلَمَ بَعۡدَ عِلۡمٍ شَیۡـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ قَدِیۡرٌ ﴿۷۰﴾

۷۰۔ اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے اور تم میں سے کوئی نکمی ترین عمر کو پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے، اللہ یقیناً بڑا جاننے والا، قدرت والا ہے۔

تشریح کلمات

اَرۡذَلِ : (رذل) الرذل و الرذال۔ وہ چیز جس سے اس کے ردی ہونے کی وجہ سے بے رغبتی کی جائے۔

تفسیر آیات

انسان کی بے بسی اس بات کی علامت ہے کہ کسی طاقت کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور ہے۔ چنانچہ وہی انسان کو خلق کرتا ہے، وہی مارتا ہے۔ وہ انسان جو علم کی وجہ سے دوسروں پر برتری رکھتا ہے، اس پر پیرانہ سالی کا ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ جسمانی اور دماغی طاقت سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ شخص جسے اپنے علم و ہنر پر ناز تھا، آج بڑھاپے کی وجہ سے اسے اپنی ناک کی چھینک کا بھی علم نہیں ہوتا کہ اسے صاف کرے۔ حقیقی علم و قدرت کا مالک اللہ ہے۔ دوسروں میں جو جزئی علم و قدرت ہوتی ہے وہ اللہ کی عطا کردہ عارضی ہے۔ اس سے بھی انسان کو علم ہونا چاہیے کہ رب صرف اللہ ہے۔

روایت کے مطابق ارزل العمر ۱۰۰ سال ہے۔ دعاؤں میں آیا ہے:

واعوذ بك ان ارد الی ارذل العمر [1] میں نکمی ترین عمر کو پہنچنے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

اہم نکات

۱۔ جو علم و قدرت دیتا ہے وہ اس کو چھیننے پر بھی قدرت رکھتا ہے: لَا یَعۡلَمَ بَعۡدَ عِلۡمٍ ...۔

۴۴۲

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ فِی الرِّزۡقِ ۚ فَمَا الَّذِیۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّیۡ رِزۡقِهِمۡ عَلٰی مَا مَلَكَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَهُمۡ فِیۡهِ سَوَآءٌ ؕ اَیۡمَانُهُمۡ فَهُمۡ فِیۡهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے، پھر جنہیں فضیلت دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کو دینے والے نہیں ہیں کہ دونوں اس رزق میں برابر ہو جائیں، کیا (پھر بھی) یہ لوگ اللہ کی نعمت سے انکار کرتے ہیں؟

تفسیر آیات

گزشتہ آیات میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد مشرکوں کے معاشرے میں رائج ایک مثال کا ذکر ہے۔ بعض لوگ اپنے مال میں تصرف کرنے میں خودمختار ہوتے ہیں اور بعض غلام، نوکر ہوتے ہیں جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ تم آقا اور غلام کے درمیان تو حفظ مراتب کے پابند ہو اور اپنے غلاموں اور نوکروں کو اتنا

---

[1] الاقبال: ۲۳۲

مال اور اتنا اختیار نہیں دیتے ہو کہ وہ تمہارے برابر ہو جائیں تو جو تم خود اپنے لیے پسند نہیں کرتے ہو، اللہ کے لیے کیسے پسند کرتے ہو کہ اللہ کی مخلوق اور اس کے محتاج بندے اس کے برابر ہو جائیں۔

۱۔ اَفَبِنِعۡمَۃِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ: نعمت تو ہم نے دی ہے مگر اس کا شکریہ میرے محتاج بندوں کو ادا کرتے ہیں۔ یہ میری نعمتوں کا سراسر انکار ہے۔

اہم نکات

۱۔ اگر آقا اور غلام اختیارات میں برابر نہیں ہو سکتے تو اللہ اور اس کے مخلوق بندے کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا وَّجَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِکُمۡ بَنِیۡنَ وَحَفَدَۃً وَّ رَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ اَفَبِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ وَ بِنِعۡمَتِ اللّٰہِ ہُمۡ یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں اور اس نے تمہاری ان بیویوں سے تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کیے اور تمہیں پاکیزہ چیزیں عطا کیں تو کیا یہ لوگ باطل پر ایمان لائیں گے اور اللہ کی نعمت کا انکار کریں گے؟

تشریح کلمات

حَفَدَۃً: (ح ف د) اَلۡحَافِدُ اس شخص کو کہتے ہیں جو تبرّعاً تیزی کے ساتھ خدمت بجا لائے خواہ وہ اجنبی ہو یا رشتہ دار۔ یہاں حَفَدَۃً سے مراد اَسۡبَاط یعنی پوتے نواسے ہیں۔ ۴۴۳

تفسیر آیات

۱۔ وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ: اللہ تمہیں ازواج و اولاد جیسی نعمتیں عطا فرماتا ہے، پاکیزہ ارزاق کی فراوانی کرتا ہے اور تم ایسی چیزوں پر ایمان رکھتے ہو جو باطل ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے. ایسے لوگوں سے اولاد مانگتے ، حاجات کی برآوری اور بیماریوں کی شفا چاہتے ہو جو بے بنیاد اور بے حقیقت اوہام کے سوا کچھ نہیں ہیں اور جس کے ہاتھ یہ سب کچھ ہے اس کے دروازے پر دستک نہیں دیتے۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ اور غیر مجاز دروازوں پر دستک دینا کفران نعمت اور ایمان بالباطل ہے۔

۲۔ تشکیل خاندان، اللہ کی نعمت ہے۔

۳۔ منعم حقیقی کی نعمتوں کا شکر غیر منعم کو ادا کرنا، حقیقی منعم کی نعمت کا انکار ہے: وَبِنِعۡمَتِ اللّٰہِ ہُمۡ یَکۡفُرُوۡنَ۔

وَیَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمۡلِکُ لَہُمۡ رِزۡقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ شَیۡئًا وَّلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ ایسوں کی پوجا کرتے ہیں جنہیں نہ آسمانوں سے کوئی رزق دینے کا اختیار ہے اور نہ زمین سے اور نہ ہی وہ اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَیَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ: یہ لوگ رازق حقیقی کو چھوڑ کر ایسے بے شعور بتوں کی پرستش کرتے ہیں جو اسباب رزق آسمان سے نازل نہ زمین سے فراہم کر سکتے ہیں۔ تمہارے معبود کی گرفت میں آفتاب اور اس کی تابش ہے نہ زمین اور اس کی روئیدگی ان کے اختیار میں ہے۔ پھر یہ کہاں سے تم کو رزق دیتے ہیں؟

۲۔ وَّلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ: تمہارے معبودوں میں ایسی صلاحیت سرے سے موجود نہیں ہے کہ وہ تمہیں زمین سے ایک دانہ اگا کر دیں۔

اہم نکات

۱۔ معبود وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں رزق ہے: وَیَعۡبُدُوۡنَ ... مَا لَا یَمۡلِکُ لَہُمۡ رِزۡقًا ....

فَلَا تَضۡرِبُوۡا لِلّٰہِ الۡاَمۡثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ پس اللہ کے لیے مثالیں نہ دیا کرو، (ان چیزوں کو) یقیناً اللہ بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡکًا لَّا یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ وَّمَنۡ رَّزَقۡنٰہُ مِنَّا رِزۡقًا حَسَنًا فَہُوَ یُنۡفِقُ مِنۡہُ سِرًّا وَّجَہۡرًا ؕ ہَلۡ یَسۡتَوٗنَ ؕ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ اللہ ایک غلام کی مثال بیان فرماتا ہے جو دوسرے کا مملوک ہے اور خود کسی چیز پر قادر نہیں اور دوسرا (وہ شخص) جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق دے رکھا ہے پس وہ اس رزق میں سے پوشیدہ و علانیہ طور پر خرچ کرتا ہے، کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ثنائے کامل اللہ کے لیے ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَا تَضۡرِبُوۡا لِلّٰہِ الۡاَمۡثَالَ: اللہ کے لیے تم اپنے محسوسات کی روشنی میں مثالیں نہ دیا کرو کہ اللہ کی بیٹیاں، بیٹے ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرنے کے لیے بتوں کا ذریعہ اختیار کرنا پڑتا ہے جیسا کہ دنیوی بادشاہوں تک پہنچنے کے لیے مقربین کو ذریعہ بنانا پڑتا ہے۔ تم ذات خدا کی صفات کو جانتے نہیں ہو۔

۲۔ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبۡدًا: اس باب میں صحیح مثال اللہ پیش فرماتا ہے کہ مملوک اور مالک برابر نہیں ہوسکتے اور یہ بات چونکہ تمہارے لیے محسوس اور تمہارے مشاہدے میں آتی ہے اس لیے تمہیں ماننا پڑتا ہے کہ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ الحمد اللہ! حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ حقیقی مالک اور حقیقی مملوک کا برابر ہونا قابل تصور اور معقول نہیں ہے۔ ایک مالک ہے وہ اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے اور مملوک کسی مال کا مالک ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ خود کسی کا مال ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ بے بس غلام اس شخص کے برابر نہیں ہوسکتا جسے اللہ نے رزق دیا ہے تو وہ بت جو ایک غلام سے بھی زیادہ بے بس ہے، خود رازق اللہ کے برابر کیسے ہوسکتا ہے؟

وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا رَّجُلَیۡنِ اَحَدُہُمَاۤ اَبۡکَمُ لَا یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ وَّ ہُوَ کَلٌّ عَلٰی مَوۡلٰىہُ ۙ اَیۡنَمَا یُوَجِّہۡہُّ لَا یَاۡتِ بِخَیۡرٍ ؕ ہَلۡ یَسۡتَوِیۡ ہُوَ ۙ وَ مَنۡ یَّاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ ۙ وَ ہُوَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ اور اللہ دو (اور) مردوں کی مثال دیتا ہے، ان میں سے ایک گونگا ہے جو کسی چیز پر بھی قادر نہیں ہے بلکہ وہ اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے، وہ اسے جہاں بھی بھیجے کوئی بھلائی نہیں لاتا، کیا یہ اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جو انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود صراط مستقیم پر قائم ہے؟

تشریح کلمات

اَبۡکَمُ: (ب ك م) اَلَابۡکَم پیدائشی گونگے اور اَلۡاَخۡرس عام گونگے کو کہتے ہیں۔

کَلٌّ: (ك ل ل) عاجز ہو جانا، تھک جانا، بوجھ بن جانا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَحَدُہُمَاۤ اَبۡکَمُ: اس آیت میں اس بات کی مزید وضاحت ہے کہ اللہ اور ان کے خود ساختہ معبودوں کے درمیان یہ فرق بھی ہے کہ اس غلام کی زندگی کا بوجھ بھی خود نہیں اٹھا سکتا، نہ کسی کی بات سن سکتا

ہے، نہ خود بات کرسکتا ہے، نہ ہی کسی قسم کے کام میں آتا ہے۔

۲۔ وَمَنۡ یَّاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ: جب کہ اس کا آقا خود بھی راہ راست پر اور ہدایت یافتہ ہے اور دوسروں کو عدل وانصاف کی دعوت دیتا ہے۔ جب ایک غلام جو ہر اعتبار سے بے بس اور بے سود ہے، اس آقا کے برابر نہیں ہوسکتا جو معاشرے کے لیے رہنما کی حیثیت رکھتا ہے تو اللہ اور یہ جامد بے حس پتھر کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ امر بمعروف سے انسان کی قیمت بنتی ہے۔

۲۔ قوت گویائی سے انسان کی قیمت بنتی ہے۔

۳۔ وہ انسان قابل قدر ہے جس کی زندگی کا بوجھ کسی پر نہ ہو: وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوۡلٰىهُ ....

وَلِلّٰهِ غَيۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَاۤ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ کے لیے (خاص) ہے اور قیامت کا معاملہ تو ایسا ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا بلکہ اس سے بھی قریب تر، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

ارض و سما کے غیب کا مالک اللہ ہے جیسے شہود کا مالک ہے۔ غیب و شہود اس کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ وہ جب چاہے غیبی امور پر تصرف کرسکتا ہے۔ قیامت بھی غیبی امور میں سے ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی مالکانہ گرفت ہے۔ اس کے آنے میں کسی چیز کی رکاوٹ نہیں ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کے ارادے کی دیر ہے۔ جب اللہ کا ارادہ ہوگا، چشم زدن یا اس سے بھی زیادہ کم وقت میں قیامت برپا ہوگی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کی قدرت کو بروئے کار لانے کے لیے وسائل یعنی علل واسباب کا ذریعہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اللہ کے لیے کچھ کام آسان اور کچھ کام مشکل ہو جائیں۔

اہم نکات

۱۔ قیامت تدریجاً نہیں، دفعتاً وجود میں آئے گی۔

۲۔ قیامت برپا کرنا اللہ کی عظیم قدرت کے سامنے کوئی اہم چیز نہیں ہے۔

وَ اللّٰہُ اَخۡرَجَکُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّہٰتِکُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا ۙ وَّ جَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَۃَ ۙ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ﴿۷۸﴾

۷۸۔ اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے کہ شاید تم شکر کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اللّٰہُ اَخۡرَجَکُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ: تمام جانداروں میں انسان کا بچہ سب سے زیادہ بے بس اور بے خبر پیدا ہوتا ہے۔ بے بس اتنا کہ وہ اپنی گردن پر اپنے سر کو بھی نہیں سنبھال سکتا اور بے خبر بھی اتنا کہ ایک عرصے تک اپنی ماں کو بھی نہیں پہچان سکتا لیکن باقی جانوروں کے خلاف انسان ارتقاء پذیر ہے اور عقل و فکر کے ذریعے یہی بے بس اور بے خبر انسان تمام حیوانات پر حکمرانی کرتا ہے۔

اللہ نے انسان کو آوازوں کے ادراک کے لیے کان، رنگوں کے ادراک کے لیے آنکھیں، اور ان ادراکات سے نتائج اخذ کرنے کے لیے دل یعنی عقل کی طاقت عنایت فرمائی ہے۔ ان نعمتوں کے شکر کا طریقہ یہ ہونا چاہیے: کانوں سے کلام الٰہی سن لیں، آنکھوں سے آیات الٰہی دیکھ لیں اور عقل و فکر کے ذریعے ان سے نتیجہ اخذ کریں کہ ان کا ایک خالق ہے جس نے یہ نعمتیں عنایت کی ہیں۔ وہی رب ہے۔ وہی ہماری زندگی رواں دواں کیے ہوئے ہے۔

اہم نکات

۱۔ کان، آنکھ اور دل انسان کی عقل و فکر کے مأخذ ہیں: وَّ جَعَلَ لَکُمُ ....

۲۔ زمینی موجودات میں فقط انسان ارتقاء پذیر ہے: وَّ جَعَلَ لَکُمُ ...

اَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمۡسِکُہُنَّ اِلَّا اللّٰہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ﴿۷۹﴾

۷۹۔ کیا انہوں نے ان پرندوں کو نہیں دیکھا جو فضائے آسمان میں مسخر ہیں؟ اللہ کے سوا انہیں کسی نے تھام نہیں رکھا، ایمان والوں کے لیے یقیناً ان میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ مُسَخَّرٰتٍ: اس فضائے بیکراں میں معلق کرہ ارض کی فضا میں معلق پرندے

بھی اللہ کی نشانیاں ہیں۔ اگرچہ اس کرہ ارض کو فضا میں معلق رکھنا اور اس کی پشت پر موجودات کو ٹھہرانا خود اپنی جگہ قابل توجہ آیات الٰہی ہیں تاہم اس کرہ کی فضا میں پرندوں کا معلق کرنا زیادہ محسوس آیت ہے کہ کشش ثقل کے باوجود ہوائے لطیف میں محو پرواز ان پرندوں کو اللہ ہی نے اپنے نظام فطرت و خلقت کے تحت تھام رکھا ہے۔ ان پرندوں کے خالق نے ان کو زندگی گزارنے کا سلیقہ دیا ہے۔

۲۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ: ان پرندوں کو پرواز کے ذریعے زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھانے والا یہ رب ہے اور اسی کے ہاتھ میں زندگی کی تدبیر ہے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الملک آیت ۱۹۔

اہم نکات

۱۔ ایمانی شعور رکھنے والے ہی آیات الٰہی کا ادراک کر سکتے ہیں: ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ۔

وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُیُوۡتًا تَسۡتَخِفُّوۡنَہَا یَوۡمَ ظَعۡنِکُمۡ وَ یَوۡمَ اِقَامَتِکُمۡ ۙ وَ مِنۡ اَصۡوَافِہَا وَ اَوۡبَارِہَا وَ اَشۡعَارِہَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ اور اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لیے سکون کی جگہ بنایا ہے اور اس نے جانوروں کی کھالوں سے تمہارے لیے ایسے گھر بنائے جنہیں تم سفر کے دن اور حضر کے دن ہلکا محسوس کرتے ہو اور ان (جانوروں مثلاً بھیڑ) کی اون اور (اونٹ کی) پشم اور (بکرے کے) بالوں سے گھر کا سامان اور ایک مدت تک کے لیے (تمہارے) استعمال کی چیزیں بنائیں۔

تشریح کلمات

بیوت: (ب ی ت) البیت۔ اصل میں بَیۡت کے معنی انسان کے رات کے ٹھکانے کے ہیں کیونکہ لفظ بَاتَ رات کو کسی جگہ اقامت کرنے پر بولا جاتا ہے۔ بعد میں یہ لفظ مطلق مکان کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔

ظَعۡنِکُمۡ: (ظ ع ن) ظَعۡن کے معنی کوچ کرنا کے ہیں۔

اَثَاثًا: (ا ث ث) الاثاث وافر سامان خانہ، اصل میں اث سے مشتق ہے جس کے معنی زیادہ اور گنجان ہونے کے ہیں۔

تفسیر آیات

گھر سکون و اطمینان اور تحفظ کی جگہ ہے۔ اسلام گھر کی چار دیواری کو تقدس اور تحفظ دیتا ہے۔ چنانچہ بلا اجازت گھر میں داخل ہونا، گھر کا تجسس کرنا، جائز نہیں ہے۔ کسی حکومت یا فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی گھر کے مکینوں کے امن و سکون کے خلاف کوئی قدم اٹھائے۔ حتیٰ حالت جنگ میں بھی کسی گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

سفری مکان آج بھی بہت سے لوگوں کے لیے جائے امن و سکون ہے۔ خیمے صرف پناہ گزین کی مجبوری یا شکاری حضرات کے تعیش کا سامان نہیں بلکہ اس قسم کے رہائشی مکانات تمدن یافتہ لوگوں کی بھی ضرورت ہیں۔ صرف یہ ہے کہ عرب اپنے خیمے چمڑے سے بنایا کرتے تھے، آج کل دوسرے مواد سے بناتے ہیں۔

جس ذات نے تمہارے لیے سامان زندگی فراہم کیا ہے، وہی تمہارا رب ہے۔

اہم نکات

۱۔ مکان انسان کی اہم ضرورت ہے: مِّنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا ...۔

۲۔ سکون، انسانی زندگی کا اہم ستون ہے: مِّنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا ...۔

وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنَ الۡجِبَالِ اَکۡنَانًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمُ الۡحَرَّ وَ سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمۡ بَاۡسَکُمۡ ؕ کَذٰلِکَ یُتِمُّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تُسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ اور اللہ نے تمہارے لیے اپنی پیدا کردہ چیزوں سے سائے بنائے اور پہاڑوں میں تمہارے لیے پناہ گاہیں بنائیں اور تمہارے لیے ایسی پوشاکیں بنائیں جو تمہیں گرمی سے بچائیں اور ایسی پوشاکیں جو تمہیں جنگ سے بچائیں، اس طرح اللہ تم پر اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے شاید تم فرمانبردار بن جاؤ۔

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۸۲﴾

۸۲۔ پھر اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو (اے رسول) آپ کی ذمے داری تو صرف واضح انداز میں تبلیغ کرنا ہے۔

یَعۡرِفُوۡنَ نِعۡمَتَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنۡکِرُوۡنَہَا وَ اَکۡثَرُہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۸۳﴾

۸۳۔ یہ لوگ اللہ کی نعمت کو پہچان لیتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر تو کافر ہیں۔

تشریح کلمات

اَكۡنَانًا: (ك ن ن) الكِنُّ ہر وہ چیز جس میں کسی چیز کو محفوظ رکھا جائے۔ كَاَنَّهُنَّ بَيۡضٌ مَّكۡنُوۡنٌ گویا کہ وہ محفوظ انڈے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمۡ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا: غروب آفتاب کے بعد خود زمین کا سایہ، درخت، پہاڑ اور دیواروں کے سائے انسانی زندگی کے لیے نہایت ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر یہ سائے نہ ہوتے تو زمین پر زندگی کا باقی رہنا ممکن نہ ہوتا۔

۲۔ مِّنَ الۡجِبَالِ اَكۡنَانًا: گرم ترین علاقوں میں مسافر کے لیے گرمی سے بچنے کے لیے غار بہترین جگہ ہے۔

۳۔ جَعَلَ لَكُمۡ سَرَابِيۡلَ تَقِيۡكُمُ الۡحَرَّ: پوشاکوں کے بارے میں گرمی سے بچانے کا ذکر کیا۔ سردی سے بچانے کا ممکن ہے اس لیے ذکر نہ کیا ہو کہ جو لباس انسان کو گرمی سے بچاتا ہے وہی سردی سے بھی بچاتا ہے۔ آپس کی جنگوں میں انسان کو تحفظ دینے والی پوشاک سے مراد زرہ ہیں۔

اتمام نعمت کے بارے میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی ضرورت کے لیے کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔ انسانی تحفظ کے لیے مکان، سایہ، لباس، غار، زرہ وغیرہ فراہم فرمائے۔ ان پہلوؤں سے اللہ نے نعمت پوری فرمائی۔ اسی طرح انسانی ضرورت اور خواہش کے دیگر پہلوؤں میں کوئی نقص نہیں چھوڑا پھر بھی اے مشرکو! تم اللہ کے علاوہ دوسروں سے تدبیر زندگی کی امیدیں لگائے بیٹھے ہو۔

۴۔ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعۡمَتَهٗ: تمہارے انکار کے باوجود اللہ اپنی نعمتیں تم پر پوری کر رہا ہے۔ شاید تم تسلیم کرو کہ تمہارا رب اللہ ہے۔

۵۔ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا: اگر وہ ان دلائل کے باوجود صرف اللہ کو رب ماننے سے منہ موڑ لیں تو اے رسول آپ کے ذمے راستہ دکھانا ہے۔ منوانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔

۶۔ يَعۡرِفُوۡنَ نِعۡمَتَ اللّٰهِ: یہ مشرکین سمجھتے تو ہیں یہ ساری نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں مگر وہ ان نعمتوں کی نسبت، جان بوجھ کر یا جبر معاشرہ کی وجہ سے اپنے معبودوں کی طرف دیتے ہیں۔

وَاَكۡثَرُهُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ: فرمایا جب کہ سب کافر تھے۔ اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ ایسا عقیدہ رکھنے والوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن پر ابھی حجت پوری نہ ہوئی ہو چونکہ میں فکری اور عقلی بلوغت اس حد تک نہیں ہوتی کہ معاشرے کی سوچ سے ہٹ کر کسی بات کو سمجھ لیں۔

اہم نکات

۱۔ انسانی تمدن اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہے۔

۲۔ مشرک اللہ کی نعمت کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔

وَ یَوۡمَ نَبۡعَثُ مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیۡدًا ثُمَّ لَا یُؤۡذَنُ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ لَا ہُمۡ یُسۡتَعۡتَبُوۡنَ﴿۸۴﴾

۸۴۔ اور اس روز ہم ہر امت میں سے ایک گواہ اٹھائیں گے پھر کافروں کو نہ تو اجازت دی جائے گی اور نہ ہی ان سے اپنے عتاب کو دور کرنے کے لیے کہا جائے گا۔

تشریح کلمات

یُسۡتَعۡتَبُوۡنَ: (ع ت ب) اَلۡاِسۡتِعۡتَابُ کسی سے یہ خواہش کرنا کہ وہ اپنا عتاب دور کردے تا کہ راضی ہو جائے۔

تفسیر آیات

یہ گواہ اس امت کا نبی ہو سکتا ہے اور وہ ہستیاں بھی ہو سکتی ہیں جو اس نبی کے پیغام توحید کی محافظ ہوں، جن ہستیوں نے اتمام حجت کا سلسلہ قائم رکھا ہے۔ مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۳۔

اس گواہ کی شہادت کے بعد کافروں کو بولنے کی اجازت ملے گی نہ ہی اللہ کو راضی کرنے کا موقع ملے گا کیونکہ قیامت کا دن حساب کا ہے، عمل کا نہیں۔

تفصیل کے لیے اسی سورۃ کی آیت ۹۸ ملاحظہ فرمائیں

اہم نکات

۱۔ تمام اقوام و ملل کا کوئی شاہد اعمال ہے۔

۲۔ گواہ کی شہادت کے بعد عذر کا کوئی راستہ نہ ہو گا۔

وَ اِذَا رَاَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوا الۡعَذَابَ فَلَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمۡ وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ﴿۸۵﴾

۸۵۔ اور جب ظالم لوگ عذاب کو دیکھ لیں گے تو نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہو گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔

تفسیر آیات

مشاہدہ عذاب کا مرحلہ آنے سے پہلے، دنیا میں تو اس بات کے لیے گنجائش ہے کہ عذاب میں

تخفیف ہو یا مہلت مل جائے لیکن جب اللہ کا فیصلہ نافذ ہو چکا ہو گا اور عذاب کے مشاہدہ کی نوبت آ گئی ہو گی تو پھر تخفیف ہو سکتی ہے نہ ہی مہلت مل سکتی ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۲۹ میں اس بات کا ذکر آ گیا کہ مشاہدہ عذاب کا مرحلہ جان کنی کے وقت آ جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مشاہدہ عذاب تک تخفیف و مہلت کی گنجائش ہے۔

وَ اِذَا رَاَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا شُرَکَآءَہُمۡ قَالُوۡا رَبَّنَا ہٰۤؤُلَآءِ شُرَکَآؤُنَا الَّذِیۡنَ کُنَّا نَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِکَ ۚ فَاَلۡقَوۡا اِلَیۡہِمُ الۡقَوۡلَ اِنَّکُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۸۶﴾

۸۶۔ اور جنہوں نے شرک کیا ہے جب وہ اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! یہ ہمارے وہی شریک ہیں جنہیں ہم تیرے بجائے پکارتے تھے تو وہ (شرکاء) اس بات کو مسترد کر دیں گے (اور کہیں گے) بے شک تم جھوٹے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا رَاَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا: وہ اس بات کی تکذیب نہیں کریں گے کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر ان شریکوں کو پکارتے تھے بلکہ تکذیب اس بات کی ہو گی کہ وہ فی الواقع اللہ کے شریک ہیں۔ شرک کا تصور ان مشرکوں کا خود ساختہ ہے اور آج یہ خود اس کے ذمے دار ہیں۔

۲۔ فَاَلۡقَوۡا اِلَیۡہِمُ الۡقَوۡلَ: القاء قول بات کرنے کے معنوں میں ہے۔ شرکاء نے ان مشرکین کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا:

۳۔ اِنَّکُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ: ہمیں معبود کہنے میں جھوٹے ہو کہ ہم معبود نہیں ہیں یا یہ کہ تم نے جو ہماری عبادت کی ہے وہ ہماری نہیں، ایک موہوم معبود کی عبادت ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن خود بت بھی مشرکین کے خلاف گویا ہو جائیں گے۔

وَ اَلۡقَوۡا اِلَی اللّٰہِ یَوۡمَئِذِۣ السَّلَمَ وَ

۸۷۔ اور اس دن وہ اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیں

ضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۸۷﴾

گے اوران کی افترا پردازیاں ناپید ہو جائیں گی۔

اَلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ زِدۡنٰهُمۡ عَذَابًا فَوۡقَ الۡعَذَابِ بِمَا كَانُوۡا يُفۡسِدُوۡنَ ﴿۸۸﴾

۸۸۔ جنہوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) راہ خدا سے روکا ان کے لیے ہم عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے اس فساد کے عوض جو یہ پھیلاتے رہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَلۡقَوۡا اِلَى اللّٰهِ: قیامت کے دن جب وہ عالم شہود میں آ گئے ہوں گے اور حق و باطل کا امتیاز واضح ہو گیا ہو گا تو وہ اللہ کے آگے سر تسلیم خم کریں گے۔

۲۔ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ: اور جن کو یہ دنیا میں سہارا سمجھتے تھے ان کی وہاں خبر تک نہ ملے گی۔ قیامت کے دن ان کا اسلام قبول کرنا اضطراری اور مجبوری ہے، اس کی کوئی قیمت نہیں ہو گی۔ اسلام اس وقت مفید تھا جب یہ لوگ خود مختار تھے۔

۳۔ اَلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا: وہ کافر جو کفر اختیار کرنے کے ساتھ دوسروں کو راہ خدا سے روکتے بھی تھے، دو بڑے جرائم کے مرتکب ہیں: ایک کفر اور دوسرا دوسروں کے ایمان کا راستہ روکنا۔ اسی اعتبار سے ان کا عذاب بھی دوگنا ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ خود ساختہ سہارے قیامت کے دن ناپید ہو جائیں گے: وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ۔

وَيَوۡمَ نَبۡعَثُ فِىۡ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيۡدًا عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَجِئۡنَا بِكَ شَهِيۡدًا عَلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ ؕ وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً وَّبُشۡرٰى لِلۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۸۹﴾

۸۹۔ اور (انہیں اس دن سے آگاہ کیجیے) جس روز ہم ہر امت میں سے ایک ایک گواہ خود انہی میں سے اٹھائیں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لے آئیں گے اور ہم نے آپ پر یہ کتاب ہر چیز کو بڑی وضاحت سے بیان کرنے والی اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت بنا کر نازل کی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَيَوۡمَ نَبۡعَثُ: قیامت کے دن جب حساب اعمال کے لیے انسانوں کو پیش کیا جائے گا تو ان

کے حق میں یا خلاف فیصلہ دینے سے پہلے ان کے اعمال پر ایسی گواہی اور حجت قائم ہو گی جو نا قابل تردید ہو گی اگرچہ اللہ سب سے بہتر جانتا ہے کہ کس نے کیا عمل کیا ہے۔ قیامت کے دن اللہ کے سامنے کسی کا کیا بس چلتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ کے باوجود ضوابط و اصول کے مطابق گواہ پیش فرماتا ہے۔

۲۔ فِیۡ کُلِّ اُمَّۃٍ: ''ہر امت'' سے مراد ہر جماعت اور ہر صدی ہے۔[1]

سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گواہوں پر گواہ ہیں۔ اس لیے اس آیت سے بھی ہم یہی سمجھیں گے کہ ہٰۤؤُلَآءِ کا اشارہ گواہوں کی طرف ہے۔ اسی طرح آیت کے یہ معنی بنتے ہیں: ہم ہر امت میں سے ایک گواہ خود انہی میں سے اٹھائیں گے اور آپ کو ان گواہوں پر گواہ بنا کر لے آئیں گے۔

۳۔ مِّنۡ اَنۡفُسِہِمۡ: یہ گواہ خود ان کے جانے پہچانے لوگ ہوں گے۔ لوگوں کے لیے ناشناس نہیں ہوں گے۔

اس سے یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ رسولؐ گواہوں پر گواہ ہیں اور ہر امت و جماعت پر رسول کے علاوہ گواہ ہیں۔ چنانچہ سورۃ الزمر کی آیت ۶۹ میں فرمایا:

وُضِعَ الۡکِتٰبُ وَجِایۡٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّہَدَآءِ .... اور (اعمال کی) کتاب رکھ دی جائے گی اور پیغمبروں اور گواہوں کو حاضر کیا جائے گا....

اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبروں کے علاوہ بھی گواہ ہوتے ہیں۔

لہٰذا کُلِّ اُمَّۃٍ (ہر امت) سے مراد ہر عصر کی جماعت ہی ہو سکتی ہے اور ہر جماعت کے لیے ایک ایک گواہ لایا جائے گا جو اپنے ہم عصر لوگوں کے اعمال کے شاہد ہو گا۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی عصر گواہ و حجت سے خالی نہیں ہے۔ ہماری احادیث وارد ہے:

لَوْ بَقِیَتِ الْاَرْضُ بِغَیْرِ اِمَامٍ لَسَاخَتْ.[1] اگر زمین امام کے بغیر ہو جائے تو یہ دھنس جائے۔

اس شاھد میں دو باتوں کا ہونا ضروری ہے: ایک یہ کہ وہ جائز الخطا نہ ہو۔ ورنہ بقول رازی:

> اس کے لیے بھی گواہ کی ضرورت ہو گی اور یہ سلسلہ کہیں بھی نہ رکے گا۔ لہٰذا ہر زمانے میں ایسے افراد کو گواہ ہونا چاہیے کہ جن کی گفتار حجت ہو۔[2]

دوسری یہ کہ اس شاھد کی اعمال عباد پر نظر ہو۔ ورنہ جو اعمال عباد کا ناظر نہ ہو گا وہ شاھد بھی نہ ہو گا۔

فخر الدین رازی نے اجماع امت کو شاھد قرار دے کر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی

---

[1] الکافی ۱: ۱۷۹ [2] تفسیر کبیر رازی ۲۰: ۹۸

ہے کہ ہر زمانے میں وہ شاھد کون ہوسکتا ہے جو جائز الخطا نہ ہو لیکن یہ جواب اس لیے ناقص رہ جاتا ہے کہ اجماع امت، اعمال امت پر ناظر کیسے ہوسکتا ہے اور خود امت ہی امت پر گواہ ہو جائے تو آیت کی ترکیب کچھ اس طرح بنتی ہے: ویوم نبعث فی کل امۃ اجماعھا۔ یہ ترکیب کسی طرح بھی درست نہیں بنتی کیونکہ اجماع قابل بعث نہیں ہے۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر امت میں ایسی ہستیاں موجود رہتی ہیں جو معصوم عن الخطا ہیں اور اعمال عباد پر ناظر بھی ہیں۔ وہ امت کے اعمال پر گواہ ہوں گی اور رسول ان کے اس مقام شہادت پر شاھد ہوں گے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسولوں کو اپنی امت کے تمام اعمال کا کیسے پتہ چلتا ہے کہ ان کی گواہی دیں؟

جواب یہ ہے کہ الکافی ا: ۲۱۹ میں ایک باب عرض الاعمال علی النبی والائمۃ علیھم السلام میں چنداحادیث مذکور ہیں کہ اعمال عباد رسولؐ وائمہ علیہم السلام کی خدمت پیش ہوتے ہیں۔ چنانچہ آیۃ:

وَقُلِ اعۡمَلُوۡا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمۡ وَ رَسُوۡلُہٗ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ...۔ [2]	اور کہدیجیے: لوگو! عمل کرو کہ تمہارے عمل کو عنقریب اللہ اور اس کا رسول اور مومنین دیکھیں گے...

کی تشریح میں وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ سے مراد ائمہ علیہم السلام ہیں۔

۲۔ وَ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ: قرآن میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔ خطاب رسولؐ سے ہے۔ قرآن میں رسولؐ کے لیے ہر چیز کا بیان ہے۔ اگر غیر رسول کے لیے قرآن میں ہر چیز کا بیان نہیں ملتا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ باقی مسلمانوں کے لیے قرآن ہدایت و رحمت اور بشارت ہے اور رسولؐ کے لیے ہر چیز کا واضح بیان ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مَا مِنۡ اَمۡرٍ یَخۡتَلِفُ فِیہِ اثۡنَانِ اِلَّا وَ لَہٗ اَصۡلٌ فِی کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ وَلٰکِنۡ لَا تَبۡلُغُہٗ عُقُولُ الرِّجَالِ۔ [3]	کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس میں کسی دو کا اختلاف ہو مگر یہ کہ اس کے بارے میں کتاب اللہ میں ایک کلیہ بیان ہوا ہے لیکن اس تک لوگوں کی عقلوں کی رسائی نہیں ہوتی۔

لہٰذا نہ وہ تفسیر درست معلوم ہوتی ہے کہ اس بیان کو صرف ہدایت و بیان احکام کے ساتھ محدود کیا جائے کیونکہ یہ ظاہر آیت کے خلاف ہے اور نہ وہ تفسیر مناسب معلوم ہوتی ہے کہ جس کے تحت ہر شخص کے لیے قرآن میں ہر چیز کا بیان ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ قرآن میں رسولؐ کے لیے ہر چیز کا بیان ہے اور امت کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

---

۱ ؎ تفسیر کبیر فخر الرازی۔ ۳۰: ۹۸ ۲ ؎ ۹ توبۃ: ۱۰۵ ۳ ؎ الکافی ۱: ۶۰ باب الرد الی الکتاب و السنۃ ....

اس سے ان روایات کا مطلب بھی قابل فہم ہو جاتا ہے جو کہتی ہیں: قرآن میں علوم اولین و آخرین موجود ہیں۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن ہر قوم و ملت کا ایک گواہ ہو گا۔

۲۔ ہر قوم کے لیے ایک گواہ کا ہونا دلیل ہے کہ ہر قوم کے لیے ایک حجت ہے۔

۳۔ رسول کریمؐ گواہوں کے گواہ ہیں۔

۴۔ قرآن میں رسول کریمؐ اور حاملان قرآن کے لیے ہر چیز کا بیان ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَ الۡاِحۡسَانِ وَ اِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ یَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ وَ الۡبَغۡیِ ۚ یَعِظُکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ﴿۹۰﴾

۹۰۔ یقیناً اللہ عدل اور احسان اور قرابتداروں کو (ان کا حق) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم نصیحت قبول کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ: انسانی زندگی کی سعادتمندی کا انحصار ایک اچھے معاشرے پر ہے۔ ایک فاسد معاشرے میں کسی فرد کے لیے کامیابی حاصل کرنا بہت مشکل ہے اور معاشرے کی درستی عدالت پر منحصر ہے۔ عدالت ہی کے زیر سایہ انسان امن و سکون کی زندگی گزار سکتا ہے، صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور فکری نشوونما اور باہمی محبت و آشتی کو فروغ ملتا ہے۔

عدالت کی تعریف مساوات سے کی جاتی ہے لیکن مساوات کا مطلب مشابہ نہیں ہے کہ ہر ایک کو ایک جیسا حق ملے بلکہ مساوات کا مطلب ہے: اعطاء کل ذی حق حقہ۔ ہر صاحب حق کو اس کا حق دیا جائے۔ مثلاً ہر طالب علم کو اس کی لیاقت کے مطابق نمبر دیے جائیں۔ لائق اور نالائق دونوں کو ایک جیسے نمبر دینا عدالت نہیں، ظلم ہے۔ مساوات یہ نہیں کہ بوڑھے اور بچے دونوں کو ایک جیسا حق دیا جائے بلکہ مساوات اور عدالت یہ ہے کہ بوڑھے اور بچے میں سے ہر ایک کو اپنا اپنا حق دیا جائے۔ کچھ لوگ عدالت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں: عدالت یہ ہے کہ لوگوں کے حقوق میں توازن قائم کیا جائے۔

یہ تعریف عدالت کے نتیجے کی ہے خود عدالت کی نہیں کیونکہ ہر صاحب حق کو اس کا حق دینے سے معاشرے میں توازن قائم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عدالت کے قیام کے نتیجے میں معاشرے میں توازن آ جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام عدل کی تعریف میں فرماتے ہیں:

وَ الْعَدْلُ سَائِسٌ عَامٌّ ...[1] اور عدل سب کی نگہداشت کرنے والا ہے۔

جس کے تحت ہر طبقہ اور ہر مذہب کے لوگوں کو تمام انسانی حقوق میسر آتے ہیں۔

سورۃ النساء آیت ۵۸ اور سورۃ المائدہ آیت ۸ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ عدالت اور ادائے امانت کو اسلام انسان کے بنیادی حقوق کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ یہ مسلم و غیر مسلم سب کا حق ہے چنانچہ فرمایا:

قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۫ وَ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا ۟ ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ...[2]

اللہ کے لیے بھرپور قیام کرنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہاری بے انصافی کا سبب نہ بنے، (ہر حال میں) عدل کرو! یہی تقویٰ کے قریب ترین ہے....

مزید کے سورہ مائدہ آیت ۵۸ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ وَالۡاِحۡسَانِ: احسان۔ انسان کی تین حالتیں ہوسکتی ہے:

اول: وہ دوسروں کے ساتھ عدل و انصاف کے ساتھ پیش آ رہا ہوگا۔

دوم: وہ دوسروں پر ظلم و زیادتی کر رہا ہوگا۔

سوم: وہ دوسروں پر احسان کر رہا ہوگا۔

اس آیت میں جہاں عدل و انصاف کا حکم ہے وہاں احسان کا بھی حکم ہے۔ عدل یہ ہے کہ کسی نے آپ پر ظلم کیا ہے تو اس کا بدلہ لیں۔ احسان یہ ہے بدلہ لینے سے باز آجائیں اور توبہ و معذرت کی صورت میں اسے معاف کریں۔ عدل یہ ہے کہ اگر کسی نے آپ سے قرض لیا ہے تو اپنا قرض وصول کریں۔ احسان یہ ہے کہ مقروض کے نادار ہونے کی صورت میں اسے معاف کر دیں۔ عدل سے معاشرہ ظلم و زیادتی سے پاک ہو جاتا ہے تو احسان سے معاشرے میں انسانی قدریں زندہ ہوتی ہیں۔ عدل سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے تو احسان سے معاشرے میں حلاوت اور شیرینی پیدا ہوتی ہے۔ ظلم کے مارے لوگوں کے لیے جہاں عدل کی ضرورت ہے وہاں حالات و گردش ایام کے مارے لوگوں کو احسان کی ضرورت ہے۔

۳۔ ذِی الۡقُرۡبٰی: اس سے عموماً قریبی ترین رشتہ دار مراد لیے جاتے ہیں۔ خاندان کے معاشرے کا اساسی عنصر ترکیبی ہونے کی وجہ سے اسلام صلہ رحمی کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اور ذِی الۡقُرۡبٰی سے مراد یہ ہے کہ خاص کر اپنے قریبی رشتہ داروں میں سے نادار اور محتاجوں پر احسان کریں۔

روایات اہل بیت علیہم السلام میں آیا ہے کہ ذِی الۡقُرۡبٰی سے مراد ائمہ اہل بیت علیہم السلام ہیں اور

---

[1] نہج البلاغۃ کلمات قصار: ۴۳۷ [2] ۵ مائدہ: ۸

ادائے حق سے مراد خمس ہے جو رسول اللہؐ کے قرابتداروں کا حق ہے۔

۴۔ عدل و احسان اور ذِی الۡقُرۡبٰی کے ذکر کے مقابلے میں تین ایسی برائیوں کا ذکر فرمایا جن سے اسلامی معاشرے پاک رہنا چاہیے:

الۡفَحۡشَآءِ: اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو قباحت میں حد سے بڑھا ہوا ہے۔

الۡمُنۡکَرِ: ہر اس فعل کو کہتے ہیں جسے عقول سلیمہ قبیح خیال کریں۔

الۡبَغۡیِ: کسی چیز کی طلب میں میاں روی کی حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔

اسلام ایسے معاشرے کے قیام کا خواہاں ہے جس میں بے حیائی کے ارتکاب کو بے حیائی تصور کیا جائے۔ عقول سلیمہ کے تقاضے معاشرے پر حاکم ہوں اور خواہشات اپنی حدود میں رہ کر پورا کی جائیں۔ کسی کے حق پر ڈاکہ نہ ڈالا جائے۔

اس طرح اس آیت میں اسلامی دستور حیات، نہایت جامع اور مختصر ترین لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عدل و احسان اور صلہ رحمی معاشرے کے مثبت اور بے حیائی، برائی اور زیادتی منفی احکام ہیں۔ مثبت کے فروغ اور منفی کی روک تھام سے معاشروں میں انسانی قدروں کی روشنی پھیلتی ہے۔

وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِ اللّٰہِ اِذَا عٰہَدۡتُّمۡ وَ لَا تَنۡقُضُوا الۡاَیۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡکِیۡدِہَا وَ قَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰہَ عَلَیۡکُمۡ کَفِیۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۹۱﴾	۹۱۔ اور جب تم عہد کرو تو اللہ سے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو جب کہ تم اللہ کو اپنا ضامن بنا چکے ہو، جو کچھ تم کرتے ہو یقیناً اللہ اسے جانتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِ اللّٰہِ: جب انسان کوئی عمل خیر انجام دینے یا ایک جائز کام چھوڑنے کے لیے اللہ کے ساتھ عہد باندھتا ہے تو اس پر عمل کرنا واجب اور ترک کرنا موجب کفارہ ہے۔

۲۔ وَ لَا تَنۡقُضُوا الۡاَیۡمَانَ: اسی طرح کوئی عمل انجام دینے یا ترک کرنے کی قسم کھائے تو اس قسم کا توڑنا حرام اور موجب کفارہ ہے۔ تفصیل فقہی کتابوں میں موجود ہے۔

۳۔ بَعۡدَ تَوۡکِیۡدِہَا: قسم پختہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قسم اگر سنجیدہ ہو تو اس کا توڑنا قابل مؤاخذہ ہے اور بے مقصد قسموں کا مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ جیسے بلا ارادہ یا تکیہ کلام کے طور پر واللہ، باللہ کہتے

ہیں۔ جیسے فرمایا:

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغۡوِ فِیۡۤ اَیۡمَانِکُمۡ — اللہ تمہاری بے مقصد قسموں پر تمہارا مواخذہ نہیں کرے

وَ لٰکِنۡ یُّؤَاخِذُکُمۡ بِمَا عَقَّدۡتُّمُ الۡاَیۡمَانَ ۔[1] — گا لیکن جو سنجیدہ قسمیں تم کھاتے ہو ان کا مواخذہ ہو گا۔

اس آیت میں بَعۡدَ تَوۡکِیۡدِہَا اسی معنی میں ہے جو بِمَا عَقَّدۡتُّمُ الۡاَیۡمَانَ کے ہیں۔

۴۔ قَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰہَ: جب انسان اللہ کے ساتھ قسم کھاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے: میں اللہ کو کفیل اور ضامن بناتا ہوں کہ یہ کام کروں گا یا چھوڑ دوں گا۔ جب وہ اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی ہے جس کا کفارہ دینا ہوتا ہے۔ اسی لیے احادیث میں آیا ہے کہ قسمیں زیادہ نہ کھایا کرو۔

اس آیت سے یہ نظریہ صحیح ثابت نہیں ہوتا کہ مکی سورتوں میں آیات احکام نازل نہیں ہوئیں۔

اہم نکات

۱۔ قسم توڑنا اللہ کی شان میں گستاخی ہے۔

وَ لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّتِیۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَہَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّۃٍ اَنۡکَاثًا ؕ تَتَّخِذُوۡنَ اَیۡمَانَکُمۡ دَخَلًۢا بَیۡنَکُمۡ اَنۡ تَکُوۡنَ اُمَّۃٌ ہِیَ اَرۡبٰی مِنۡ اُمَّۃٍ ؕ اِنَّمَا یَبۡلُوۡکُمُ اللّٰہُ بِہٖ ؕ وَ لَیُبَیِّنَنَّ لَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ مَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۹۲﴾

۹۲۔ اور تم اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے پوری طاقت سے سوت کاتنے کے بعد اسے تار تار کر ڈالا، تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا ذریعہ بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے، اس بات کے ذریعے اللہ یقیناً تمہیں آزماتا ہے اور قیامت کے دن تمہیں وہ بات کھول کر ضرور بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے۔

تشریح کلمات

الغَزۡلُ: (غ ز ل) کاتے ہوئے سوت کو کہتے ہیں۔

اَنۡکَاثًا: (ن ک ث) اَلنَّکۡثُ کے معنی کمبل یا سوت ادھیڑنے کے ہیں۔ بطور استعارہ عہد شکنی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

الدخل: (د خ ل) اندرونی عداوت، فساد یا کسی نسب کا دعویٰ کرنے سے کنایہ ہے جو فریب اور خیانت کے معنوں میں ہے۔

---

[1] ۵ مائدۃ ۸۹

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّتِیۡ: اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے پوری طاقت سے سوت کاتنے کے بعد اسے تار تار کر ڈالا۔ قریش کی ایک عورت کا ذکر ہے جو دیگر لڑکیوں کے ساتھ مل کر ظہر تک سوت کاتتی تھی پھر ان لڑکیوں کو حکم دیتی کہ سب کو تار تار کر ڈالو۔ یہ عورت اپنی حماقت کی وجہ سے خرقاء مکہ مشہور ہو گئی تھی۔ آیت میں عہد اور قسم توڑنے والوں کے لیے ایک مثل کا ذکر فرمایا ہے۔

۲۔ کوئی قوم کسی دوسری قوم سے کوئی معاہدہ کرتی ہے تو اس معاہدے کی پابندی کرنا ایک انسانی و اخلاقی فریضہ ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں ہے خواہ دوسرا فریق مسلم ہو یا غیر مسلم۔ ہدایت یافتہ ہو یا گمراہ۔ وفائے عہد چونکہ ایک انسانی مسئلہ ہے لہٰذا فریق مخالف کو نہیں دیکھا جاتا کہ وہ کون ہے بلکہ معاہدہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا ہے۔

۳۔ تَتَّخِذُوۡنَ اَیۡمَانَکُمۡ دَخَلًۢا بَیۡنَکُمۡ: یہ آیت ان لوگوں کے لیے لحہ فکریہ ہے کہ جو اپنے حریف کو گمراہ خیال کر کے اس کے ساتھ عہد شکنی، کذب و افتراء اور بہتان تراشی کرتے ہیں۔ یہاں مسئلہ یہ ہے کہ کوئی فریق حق پر ہی ہو اور اس کا فریق مقابل باطل ہی ہو تو بھی عہد شکنی، مکر و فریب اختیار کرنا ایسا جرم ہے جس کے بارے میں بروز قیامت سوال ہو گا اور وہ الٰہی امتحان میں ناکام ثابت ہو گا۔

۴۔ : اپنی جماعت کی بالا دستی قائم کرنے اور دوسروں کو زیر کرنے لیے وہ قسم اور عہد کو دخل، فریب اور خیانت کا ذریعہ بناتے ہیں۔

۵۔ اِنَّمَا یَبۡلُوۡکُمُ اللّٰہُ بِہٖ: عہد و قسم کی پابندی کا حکم تمہارے لیے ایک آزمائش ہے جس سے تمہارے ایمان و امانت کا امتحان لینا مقصود ہے کہ ان گروہی مسائل میں تم نے مکر و فریب کے ذریعے جو اختلاف ڈالا ہے قیامت کے دن اس کے بارے میں فیصلہ سنا دیا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ وفائے عہد ایک انسانی مسئلہ ہے اس کی پاسداری فرض ہے۔

۲۔ انسانی قدروں کو پامال کر کے مذہبی قدروں کا احیا ممکن نہیں ہے۔

وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمۡ اُمَّۃً	۹۳۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی امت بنا دیتا
وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنۡ یُّضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ	لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے
یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَلَتُسۡـَٔلُنَّ عَمَّا	چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو

كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾　اس کے بارے میں تم سے ضرور پوچھا جائے گا۔

تفسیر آیات

عہد شکنی، مکر و فریب و دیگر ناجائز ذرائع سے اپنے مذہب کا پرچار کرنے والوں سے خطاب ہے:

۱۔ وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ : اگر دوسرے مذاہب کو طاقت کے ذریعے مٹا کر لوگوں کو ایک ہی مذہب پر لانا مقصود ہوتا تو یہ کام اللہ کے لیے نہایت آسان تھا۔ بقول تفہیم القرآن اللہ کو اپنے نام نہاد طرفداروں اور ان کے ذلیل ہتھکنڈوں سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔

۲۔ وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ : بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لیے ایک ایسا غیر جبری نظام قائم فرمایا ہے جس کے تحت کچھ لوگ اپنے اختیار سے ضلالت کی طرف جاتے ہیں تو اللہ طاقت کے ذریعے نہیں روکتا، انہیں جانے دیتا ہے۔ اسی مطلب کو اللہ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے، کی تعبیر سے بیان فرماتا ہے۔

واضح رہے کہ ناجائز ذرائع سے حق کا پرچار کرنا خود اپنی جگہ حق کی پامالی ہے۔ جب عہد شکنی اور مکر وفریب، بہتان تراشی جیسی باطل اور غیر انسانی قدروں کا ارتکاب کیا جاتا ہے تو حق کس اقدار کا نام ہے جسے یہ نادان زندہ کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام پر بیت المال کی مساویانہ تقسیم پر اعتراض کیا گا تو آپؑ نے فرمایا:

أَ تَأْمُرُونِّي اَنْ اَطْلُبَ النَّصْرَ بِالْجَورِ.[۱]　کیا تم مجھے ظلم و جور کے ذریعے کامیابی حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہو؟

۳۔ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ : اپنی جماعت کی بالادستی کے لیے جو عہد شکنی اور فریب کاری تم نے انجام دی ہے اس کے بارے میں کل قیامت کے دن تم سے سوال ہوگا اور اس جرم کا سامنا کرنا ہوگا۔

اہم نکات

۱۔　باطل کو اللہ نے خود مختار رکھا ہے۔ اس لیے لوگ حق و باطل میں بٹ جاتے ہیں۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ لَكُمْ عَذَابٌ

۹۴۔ اور تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان فساد کا ذریعہ نہ بناؤ کہ قدم جم جانے کے بعد اکھڑ جائیں اور راہ خدا سے روکنے کی پاداش میں تمہیں عذاب چکھنا پڑے اور (ایسا کیا تو) تمہارے لیے بڑا

---

[۱] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۲۶

عَظِیۡمٌ ﴿۹۴﴾ عذاب ہے۔

تفسیر آیات

جب تم جھوٹی قسمیں کھا کر دوسروں کو دھوکہ دیتے اور عہد شکنی کرتے ہو فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعۡدَ ثُبُوۡتِہَا تو اس سے وہ لوگ جو اسلامی انسان ساز تعلیمات اور مسلمانوں کی طرف سے عہد و پیمان کی پاسداری سے متاثر ہو کر ایمان لے آئے ہیں، تمہاری بدعہدی دیکھ کر اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ ان کے قدم جم جانے کے بعد اکھڑ جائیں گے۔ وَ تَذُوۡقُوا السُّوۡٓءَ بِمَا صَدَدۡتُّمۡ اس طرح تم راہ خدا میں رکاوٹ بن جاتے اور عذاب عظیم کے مستحق قرار پاتے ہو۔

یہ آیت آج کل کے مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ اسلام ان کے کردار کے پردے میں چھپا ہوا ہے اور آج اس دین حق کی قبولیت میں کوئی رکاوٹ ہے تو وہ مسلمان ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مسلمانوں کا کردار دین حق کی قبولیت میں رکاوٹ بن جاتا ہے تو مسلمان اس کے ذمے دار ہیں۔

وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِعَہۡدِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ اِنَّمَا عِنۡدَ اللّٰہِ ہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۵﴾

۹۵۔ اور اللہ کے عہد کو تم قلیل معاوضے میں نہ بیچو، اگر تم جان لو تو تمہارے لیے صرف وہی بہتر ہے جو اللہ کے پاس ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِعَہۡدِ اللّٰہِ: اللہ کا نام لے کر جو عہد کیا گیا ہے اس کی پاسداری کو جو حیثیت دنیا و آخرت میں حاصل ہے اس کے مقابلے میں دنیا کی بڑی سی بڑی چیز بھی ناچیز اور قلیل معاوضہ ہے۔

۲۔ اِنَّمَا عِنۡدَ اللّٰہِ ہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ: عہد شکنی کر کے دنیا میں جو مفاد حاصل کیا ہے اس سے وہ ثواب جو اللہ تعالیٰ کے پاس اس عہد کی پاسداری کرنے والوں کے لیے ہے، بہتر ہے۔ کس قدر بہتر ہے؟ اسے یہ انسان نہیں سمجھتا۔

۳۔ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ: اگر انسان اپنی عقل و فکر سے اس ابدی اور ختم نہ ہونے والے ثواب کو جان لیتا تو پوری دنیا کو اس کے مقابلے میں ٹھکرا دیتا۔

اہم نکات

۱۔ مومن اللہ کے پاس جو پاتا ہے وہ دنیا کی کسی قیمت پر قابل معاوضہ نہیں ہے۔

مَا عِنۡدَکُمۡ یَنۡفَدُ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجۡزِیَنَّ الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَہُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ﴿۹۶﴾

۹۶۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور جن لوگوں نے صبر کیا ہے ان کے بہترین اعمال کی جزا میں ہم انہیں اجر ضرور دیں گے۔

تفسیر آیات

عہد الٰہی کے مقابلے میں دنیا کی بڑی سے بڑی چیز بھی قلیل ہے۔ یہ معاوضہ قلیل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز فنا پذیر اور وقتی ہے اور اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ دائمی اور غیر فانی ہے۔ ان فنا پذیر چیزوں کو دوام بخشنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ان کو خزانہ عند اللہ میں پس انداز کیا جائے۔

اللہ کی اطاعت کے لیے بالعموم اور وفا بعہد کے لیے بالخصوص صبر کی ضرورت ہے۔ صبر سے عمل کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اس لیے صبر کرنے والوں کے عمل کو احسن قرار دیا ہے چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَہُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ [۱] یقیناً بے شمار ثواب تو صرف صبر کرنے والوں ہی کو ملے گا.

اہم نکات

۱۔ صبر سے عمل کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً ۚ وَ لَنَجۡزِیَنَّہُمۡ اَجۡرَہُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ﴿۹۷﴾

۹۷۔ جو نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی ضرور عطا کریں گے اور ان کے بہترین اعمال کی جزا میں ہم انہیں اجر (بھی) ضرور دیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا: عمل صالح انجام دینے والا صابر اور مؤمن ہو تو اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مرد یا عورت ہونے کو عمل کی قدر و قیمت میں کوئی دخل نہیں ہے۔ عورت اسلام کی نظر میں مرد

---

[۱] ۳۹ زمر: ۱۰

سے کم نہیں ہے بلکہ عمل صالح کا اجر و ثواب پانے میں مرد اور عورت مساوی ہیں۔ اس سے ہر اس فرسودہ نظریے کی تردید ہو گئی جو عورت کو پست و حقیر مخلوق ٹھہراتا رہا۔

۲۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ: عمل صالح کی قدر و قیمت ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلے ہی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ صرف عمل کا حسن کافی نہیں ہے بلکہ عمل کرنے والے میں حسن شرط ہے۔ دوسرے لفظوں میں عمل کا صالح ہونا کافی نہیں ہے بلکہ عمل کرنے والے کا بھی صالح ہونا ضروری ہے۔ جب فعل اور فاعل دونوں میں حسن و صلاح آئے گا تو اس عمل کی قدر و قیمت بنتی ہے:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ...[1] اور جو کوئی ایمان سے منکر ہو یقیناً اس کا عمل ضائع ہو گیا.

جیسے والدین کے عاق کی ہر خدمت بے قیمت ہے۔ چور چوری کے مال سے رفاہی خدمات انجام دیتا ہے۔ اسی طرح بڑی طاقتیں تیسری دنیا کا خون چوس کر انسانیت کی خدمت انجام دینے اور انسانی حقوق کے دفاع کا دعوی کرتی ہیں۔

۳۔ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً: نیک عمل انجام دینے والے پاکباز لوگ نہ صرف اخروی زندگی سنوارتے ہیں بلکہ ان کو دنیا میں بھی ایک پاکیزہ زندگی مل جاتی ہے۔ ان کی زندگی بدعمل لوگوں کی زندگی کی طرح نہیں ہوتی۔ اگرچہ دونوں کی زندگی کی نوعیت ایک ہے لیکن خصوصیت ایک نہیں ہے۔ چنانچہ آیت کی تعبیر یہ ہے کہ ہم اس مؤمن کو پاکیزہ زندگی دیں گے۔ حیات طیبہ کے ساتھ احیا کریں گے۔ یہ ایک خاص حیات ہے جو اللہ صرف مؤمن کو دیتا ہے۔ وہ اس پاکیزہ زندگی کے ساتھ جو کامیابیاں اور زندگی کی لذت حاصل کرتا ہے، وہ بدعمل لوگوں کو میسر نہیں آتی۔ نیک کردار بوریا نشین جس کیف و سرور کے لمحات اپنے رب کی بارگاہ میں گزارتا ہے وہ کسی امیر و شاہ کو نصیب نہیں ہوتے۔ غریب پرور کو مساکین و فقرا کی داد رسی میں جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ غریبوں کا خون چوسنے والوں کو کبھی نصیب نہیں ہوتی۔

حضرت علی علیہ السلام سے حَيٰوةً طَيِّبَةً کے بارے میں سوال ہوا تو آپؑ نے فرمایا: هی القناعة.[2] وہ قناعت ہے۔ چونکہ قناعت سے طمع، لالچ ختم اور حرام و شبہات سے پرہیز آسان ہو جاتا ہے اور زندگی پاکیزہ ہو جاتی ہے۔ قناعت حَيٰوةً طَيِّبَةً کا ایک مصداق نہیں بلکہ مکمل تعریف ہے۔ چنانچہ قرآن، اطاعت خدا و رسولؐ کو لبیک کہنے کو حیات قرار دیتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ....[3] اے ایمان والو! اللہ اور رسول کو لبیک کہو جب وہ تمہیں حیات آفریں باتوں کی طرف بلائیں....

۴۔ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ: ان کو ان کے بہتر عمل کی وجہ سے آخرت میں ثواب ملے گا۔ واضح رہے یہ آیت ثواب دارین کا ذکر فرما رہی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں پاکیزہ زندگی ہے اور آخرت میں

---

[1] ۵ مائدہ: ۵ [2] نہج البلاغة کلمات قصار: ۲۲۹ [3] ۸ انفال: ۲۴

ثواب ہے۔

اہم نکات

۱۔ جزائے اعمال میں مرد و زن مساوی ہیں۔

۲۔ ایمان سے عمل کی قدر و قیمت بنتی ہے۔

۳۔ نیک کردار مؤمن کو دنیا میں پاکیزہ زندگی اور آخر میں اجر ملتا ہے۔

فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ﴿۹۸﴾

۹۸۔ پس جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو راندہ درگاہ شیطان سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں۔

تفسیر آیات

شیطان سب سے زیادہ جس چیز سے خائف ہے وہ قرآن ہے کہ انسان اس سے ہدایت حاصل نہ کرنے پائے۔ لہٰذا قرآن پڑھتے وقت توجہ رہنی چاہیے کہ قرآنی معانی و مطالب کے بارے میں شیطان انسان کو شکوک و شبہات میں مبتلا نہ کر دے کہ یہ بات درآمد شدہ نظریات سے متصادم ہے۔ جدید سائنس و انقلابی افکار سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس طرح کے وسوسوں سے شیطان انسان کو اس چشمہ ہدایت سے محروم کر دیتا ہے۔ اگر اس قرآن سے ہدایت حاصل نہ کر سکا تو ہدایت حاصل کرنے کا کوئی اور موقع میسر نہیں آئے گا۔ صرف اعوذ باللّٰہ کہہ دینا کافی نہیں بلکہ دل و جان سے اللہ کی پناہ میں جانا چاہیے پھر قرآن کے مطالب و مباحث کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

حال ہی کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے پہلی بار قرآن کا مطالعہ کیا پھر یہ کہہ کر چھوڑ دیا یہ تو میرے عقائد کے خلاف ہے۔

اہم نکات

۱۔ سرچشمہ ہدایت، قرآن سے استفادہ کے لیے وسوسہ شیطانی ایک خطرہ ہے۔

اِنَّہٗ لَیۡسَ لَہٗ سُلۡطٰنٌ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿۹۹﴾

اِنَّمَا سُلۡطٰنُہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَوَلَّوۡنَہٗ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ بِہٖ مُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

۹۹۔ شیطان کو یقیناً ان لوگوں پر کوئی بالادستی حاصل نہ ہوگی جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

۱۰۰۔ اس کی بالادستی تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اسے اپنا سرپرست بناتے ہیں اور جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

تفسیر آیات

اللہ کی پناہ میں وہ شخص جائے گا جس پر شیطان کی بالا دستی نہیں ہے کیونکہ وہ مومن ہے، اللہ پر توکل کرتا اور اللہ کی پناہ میں جاتا ہے۔ جو ایمان اور توکل رکھتا ہے وہ شیطان پر بھروسہ نہیں کرے گا۔ شیطان کا زور ان لوگوں پر چلتا ہے جو اس کی بالادستی اور سرپرستی کو قبول کریں۔ شیطان کی سرپرستی میں آنے والے مومن نہیں، مشرک ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ شیطان کا زور ایمان اور توکل رکھنے والوں پر نہیں چلتا بلکہ

۲۔ شیطان کو سرپرست بنانے والوں اور شرک کرنے والوں پر چلتا ہے۔

وَاِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ ۙ وَّ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾

۱۰۱۔ اور جب ہم ایک آیت کو کسی اور آیت سے بدلتے ہیں تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ کیا نازل کرے، یہ لوگ کہتے ہیں: تم تو بس خود ہی گھڑ لاتے ہو، درحقیقت ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

آیت سے مراد یہاں آیات الاحکام ہیں۔ احکام شریعت، مصالح عباد پر مبنی ہوتے ہیں۔ ابتدائی تشریع و قانون گزاری میں بعض احکام وقتی حکمت و مصلحت کے مطابق ہوتے تھے۔ اس وقتی مصلحت کے ختم ہونے پر احکام بھی اٹھائے جاتے ہیں جسے نسخ کہتے ہیں۔ اسے کفار مکہ اس بات پر دلیل بناتے تھے کہ یہ قرآن خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساختہ و بافتہ ہے۔ ورنہ کلام خدا ہوتا تو بار بار تبدیلی کیوں آتی۔ اس کا جواب درج ذیل آیت میں ہے۔

قُلۡ نَزَّلَہٗ رُوۡحُ الۡقُدُسِ مِنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ لِیُـثَبِّتَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ہُدًی وَّ بُشۡرٰی لِلۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ کہد یجیے: اسے روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے برحق نازل کیا ہے تا کہ ایمان لانے والوں کو ثابت (قدم) رکھے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور بشارت (ثابت) ہو۔

ان نادان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ یہ قرآن کسی انسان کا ساختہ نہیں ہے بلکہ روح القدس (پاکیزہ

فرشتے) نے بتدریج نازل کیا ہے۔ یہاں وحی لانے والے فرشتے، جبرائیل کا نام نہیں لیا اور پاکیزہ روح کے لقب کے ساتھ اس امکان کو رد کرنے کے لیے ذکر کیا کہ اس سے کوئی غلطی اور فریب کاری صادر ہو سکتی ہے۔ اسے روح الامین بھی کہتے ہیں۔

احکام، بتدریج نازل اور مصالح عباد کے ساتھ تبدیل و تنسیخ کرنے سے اہل ایمان کی ثابت قدمی اور ایمان میں پختگی آ جاتی ہے کیونکہ احکام کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کرنے سے انسان مطمئن ہوتا ہے کہ قانون گزار کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔

دوسری بات اس میں یہ ہے کہ قانون، حالات کے ساتھ سازگار ہونے سے لوگوں کو ہدایت کی طرف بلانے کی راہ بھی سازگار ہو جاتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ تدریج و تنسیخ سے مسلمان ایک تابناک مستقبل اور ایک عظیم کامیابی کے انتظار میں رہتے ہیں جو ایک مشن کی کامیابی کے لیے کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔

اہم نکات

۱۔ تنسیخ احکام، ایمان میں پختگی کا باعث ہے: لِيُثَبِّتَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ....

۲۔ تدریج و تنسیخ سے مستقبل کی بشارت کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں: هُدًى وَّبُشۡرٰى ....

وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِىۡ يُلۡحِدُوۡنَ اِلَيۡهِ اَعۡجَمِىٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳۔ اور بتحقیق ہمیں علم ہے کہ یہ لوگ (آپ کے بارے میں) کہتے ہیں: اس شخص کو ایک انسان سکھاتا ہے، حالانکہ جس شخص کی طرف یہ نسبت دیتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ (قرآن) تو واضح عربی زبان ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهۡدِيۡهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۰۴﴾

۱۰۴۔ جو لوگ اللہ کی نشانیوں پر ایمان نہیں لاتے، یقیناً اللہ ان کی ہدایت نہیں کرتا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اِنَّمَا يَفۡتَرِى الۡكَذِبَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰذِبُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

۱۰۵۔ جھوٹ تو صرف وہی لوگ افترا کرتے ہیں جو اللہ کی نشانیوں پر ایمان نہیں لاتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔

تشریح کلمات

يُلۡحِدُوۡنَ: (ل ح د) لحد بلسانه الى كذا زبان سے کسی کی طرف جھکنے، غلط بات کہنے کے معنوں

میں ہے۔ اسی سے الحاد ایمان سے پھیرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

العجم: غیر عرب کو کہتے ہیں۔ العجمۃ غیر واضح اور ابہام کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ الزام کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک غیر علمی، غیر معروف، غیر عرب شخص سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، خود اس بات پر دلیل ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی انسانی مکتب میں نہیں پڑھا۔ نہ ہی اس وقت مکہ میں کوئی فرد ایسا تھا جو رسول اللہؐ کا معلم بن سکتا تھا۔ اس لیے ایک غیر معروف، غیر عرب شخص کی طرف نسبت دی نیز اس الزام میں اس بات کا اعتراف ہے کہ قرآن کی عربی ترکیب کسی کی تعلیم نہیں ہے کیونکہ جس شخص کی طرف نسبت دی جاتی ہے وہ عجمی ہے، عربی زبان جانتا ہی نہیں۔ رہا معانی و مطالب قرآن، اس شخص سے اخذ کیا ہو۔ اس کا جواب اگلی دو آیات میں آ گیا۔ یہ مطالب من عند اللّٰہ ہی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا اسے ایسے مطالب کی رہنمائی نہیں ملتی جس کا اللہ تعالیٰ سے ربط نہ ہو۔ اس کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسولؐ کے ہم عصر معاندین کی الزام تراشی میں اضطراب۔

مَنۡ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِیۡمَانِہٖۤ اِلَّا مَنۡ اُکۡرِہَ وَ قَلۡبُہٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِیۡمَانِ وَ لٰکِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡکُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَیۡہِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰہِ ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۰۶﴾

۱۰۶۔ جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ کا انکار کرے (اس کے لیے سخت عذاب ہے) بجز اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو (تو کوئی حرج نہیں) لیکن جنہوں نے دل کھول کر کفر اختیار کیا ہو تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

شان نزول: حضرت ابن عباس اور قتادہ راوی ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو مجبور ہوئے۔ یہ افراد عمار، ان کے والد یاسر، ان کی والدہ سمیہ، صہیب، بلال اور خباب تھے۔ ان کو اذیتیں دی گئیں۔ چنانچہ عمار کے والد اور والدہ قتل ہو گئے اور عمار نے وہ کچھ کہدیا جو کفار ان سے کہلوانا چاہتے تھے۔ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے آگاہ فرمایا۔ دوسری طرف مسلمانوں میں کچھ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ عمار کافر ہو گیا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان عمارا ملیئ ایمانا من قرنه الی قدمه و اختلط الایمان بلحمه و دمه۔
عمار سرتاپا ایمان سے سرشار ہے۔ ایمان اس کے گوشت و خون میں رچا بسا ہوا ہے۔

چنانچہ عمار روتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ عرض کیا: بری بات ہے۔ کفار نے اس وقت تک میری جان نہیں چھوڑی جب تک میں نے آپؐ کو برا اور ان کے معبودوں کو اچھا نہیں کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمار کے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا:

اِنْ عادوا فعُدْ۔[1]
اگر وہ پھر ایسا کریں تو تم پھر ایسا کہہ دینا۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں دو گروہوں کا ذکر ہے: اسلام سے پھر جانے والے مرتدین اور دوسرا تقیہ کرنے والوں کا۔ تنگ نظر مخالفین کی طرف سے ظلم و ستم روا رکھنے اور انسان سے نظریے و عقیدے کی آزادی سلب کرنے کی صورت میں تقیہ کی نوبت آتی ہے۔ ایسی صورت میں تقیہ یعنی اپنے عقیدے پر قائم رہ کر اپنا بچاؤ کرنا ایک انسانی حق ہے۔ عار و ننگ ان لوگوں کے لیے ہے جو دوسروں سے عقیدے و نظریے کی آزادی سلب کرتے اور تقیہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ آل عمران آیت ۲۸۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾
۱۰۷۔ یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کیا ہے اور اللہ کافروں کی ہدایت نہیں کرتا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾
۱۰۸۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور یہی لوگ غافل ہیں۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾
۱۰۹۔ لازماً آخرت میں یہی لوگ خسارے میں رہیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا: ان کے لیے عذاب عظیم اس لیے ہوگا کہ انہوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دی ہے اور حب دنیا، دنیا پرستی تمام جرائم کی بنیاد ہے۔

---

[1] مجمع البیان

۲۔ وَاَنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی: اللہ کافروں کو اتمام حجت کے بعد کفر پر ڈٹ جانے کی وجہ سے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے، ہدایت نہیں دیتا۔ جب وہ خود اپنے اختیار سے ایمان نہیں لاتے تو اللہ بالجبر ہدایت نہیں دیتا۔

۳۔ تمام قوانین میں بغاوت کی سزا سنگین ہوتی ہے کیونکہ بغاوت سنگین جرم ہے۔ خصوصاً عہد و پیمان کے بعد۔ ان آیات میں اسلام سے بغاوت کرنے والوں کے لیے کئی ایک سزاؤں کا ذکر ہے:

i۔ ان کے لیے عظیم عذاب ہے۔

ii۔ ان کو اللہ ہدایت سے نہیں نوازتا۔

iii۔ ان کے دلوں پر اللہ مہر لگا دیتا ہے۔

۴۔ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ: پہلے بھی کئی بار اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ مہر لگانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور جس کو اللہ پنے حال پر چھوڑ دے وہ گمراہی کی تاریکیوں میں چلا جاتا ہے۔ آیت میں مہر لگانے کا سبب ان کے آخرت کے مقابلے میں حب دنیا کو قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ دنیا پرستی سے انسان کے شعور و ادراک پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ جبرہ و اکراہ سے سرزد ہونے والے عمل پر مثبت اور منفی اثرات مترتب نہیں ہوتے۔

۲۔ حب دنیا سے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے: بِاَنَّہُمُ اسۡتَحَبُّوا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا....

۳۔ بغاوت (مرتد ہونا) سنگین جرم ہے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا فُتِنُوۡا ثُمَّ جٰہَدُوۡا وَ صَبَرُوۡۤا ۙ اِنَّ رَبَّکَ مِنۡۢ بَعۡدِہَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۱۰﴾

۱۱۰۔ پھر آپ کا پروردگار یقیناً ان لوگوں کے لیے جنہوں نے آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد ہجرت کی پھر جہاد کیا اور صبر سے کام لیا ان باتوں کے بعد آپ کا رب یقیناً بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

تشریح کلمات

فُتِنُوۡا: (ف ت ن) الفتن کے اصل معنی سونے کو آگ میں گلانے کے ہیں تاکہ اس کا کھرا کھوٹا ہونا معلوم ہو جائے۔ اسی سے تکلیف و آسائش کے ذریعے انسان کے صبر و شکر کا امتحان لینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا: کلام کا سلسلہ ان لوگوں کے بارے میں جاری ہے جو راہ

ایمان میں ظلم وستم سے دوچار اور اس جان لیوا آزمائش میں کامیاب ہوئے۔ اپنے ایمان پر قائم رہے اور ہجرت اختیار کی۔ ممکن ہے حبشہ کی ہجرت کی طرف اشارہ ہو یا بعد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں ہونے والی ہجرت کی طرف اشارہ ہو۔

مِنۡۢ بَعۡدِهَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ: مہاجرت کے بعد جہاد راہ خدا میں پیش آنے والی مشقتوں پر صبر اختیار کرے تو ان تمام مراحل، آزمائش میں استقامت، راہ خدا میں مہاجرت، جہاد فی سبیل اللہ اور مشکلات میں صبر اختیار کرنے کے بعد اگر کوئی کوتاہی ان سے سرزد ہو جائے تو اللہ بڑا معاف فرمانے والا مہربان ہے۔

آیت کے اس جملے سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: اول یہ کہ ہجرت، جہاد اور صبر کے باوجود مغفرت رب کا محتاج ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اعمال صالحہ بجا لانے والے مغفرت رب کے مستحق ہوتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس کوئی عمل نہ ہو تو وہ لائق مغفرت نہیں ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ آزمائش پر پورے اترنے والے مجاہدین عفو الٰہی کے مستحق ہیں۔

۲۔ اس آیت سے ہجرت اور جہاد نہ کرنے والے طلقاء کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔

يَوۡمَ تَاۡتِیۡ كُلُّ نَفۡسٍ تُجَادِلُ عَنۡ نَّفۡسِهَا وَ تُوَفّٰی كُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ وَ هُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱۔ اس دن ہر شخص اپنی صفائی کی حجتیں قائم کرتے ہوئے پیش ہوگا اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

بروز قیامت نفسا نفسی کے عالم میں انسان کو صرف اپنے نفس کی فکر لاحق ہوگی۔ بارگاہ الٰہی میں حساب کے لیے جب پیش ہوگا اور بداعمالیوں کے بارے میں پوچھا جائے گا تو عذر پیش کرنے اور حیل و حجت میں مصروف ہوگا۔ چونکہ جرم خود منصف کے سامنے سرزد ہوا ہے اس لیے اس کی معذرت اور حجت قبول نہ ہوگی تاہم اس پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ نیکی کے اجر میں کمی نہیں ہوگی، زیادہ ہوسکتا ہے اور بدی کا بدلہ زیادہ نہیں ہوگا، کم ہوسکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ بروز قیامت ہر شخص اپنی فکر میں مشغول ہوگا۔

۲۔ قیامت کے دن عذرین اور حجتیں نہیں سنی جائے گی۔

۳۔ قیامت کے دن اللہ کا فضل و عدل ہو گا ظلم نہیں ہو گا۔

وَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرۡیَۃً کَانَتۡ اٰمِنَۃً مُّطۡمَئِنَّۃً یَّاۡتِیۡہَا رِزۡقُہَا رَغَدًا مِّنۡ کُلِّ مَکَانٍ فَکَفَرَتۡ بِاَنۡعُمِ اللّٰہِ فَاَذَاقَہَا اللّٰہُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَ الۡخَوۡفِ بِمَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

۱۱۲۔ اور اللہ ایسی بستی کی مثال دیتا ہے جو امن سکون سے تھی، ہر طرف سے اس کا وافر رزق اسے پہنچ رہا تھا، پھر اس نے اللہ کی نعمات کی ناشکری شروع کی تو اللہ نے ان کی حرکتوں کی وجہ سے انہیں بھوک اور خوف کا ذائقہ چکھا دیا۔

وَ لَقَدۡ جَآءَہُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡہُمۡ فَکَذَّبُوۡہُ فَاَخَذَہُمُ الۡعَذَابُ وَ ہُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

۱۱۳۔ اور بتحقیق ان کے پاس خود انہی میں سے ایک رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا پس انہیں عذاب نے اس حال میں آ لیا کہ وہ ظالم تھے۔

شان نزول: ممکن ہے اس بستی کا ذکر بعنوان مثال ہو اور ابن عباس کی روایت کے مطابق اس بستی سے مراد مکہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد کئی سالوں تک ان پر قحط چھایا رہا اور ان کے قافلوں پر اکثر حملے ہوتے اور غارت گری ہو جاتی جس سے ان کو ہمیشہ خوف لاحق رہتا تھا۔[1]

تفسیر آیات

کسی شہر یا بستی کے لیے امن اور رزق کی فروانی ہی بنیادی باتیں ہیں جن سے یہ بستی پرسکون اور پرکشش بنتی ہے۔ بظاہر مکہ میں دعوت ابراہیم کے بعد یہ دو باتیں موجود تھیں۔ ہر سال حاجیوں کے ہمراہ ہر طرف سے رزق پہنچتا تھا۔ حرم کعبہ کی وجہ سے ان کو امن و اطمینان بھی نصیب تھا اور اللہ نے ان کی طرف ایک رسول کو نجات دہندہ بنا کر بھیجا جس سے ان پر اللہ کی نعمتیں پوری ہوگئیں مگر ان لوگوں نے ان نعمتوں کی قدردانی نہیں کی تو ان پر قحط اور خوف مسلط ہو گیا۔

سیاق آیات سے جو بات قرین واقع معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس قریہ سے مراد مکہ نہیں ہے، ایک مثال پیش فرمائی ہے جو مکہ پر صادق آتی ہے۔ لہٰذا مکہ مراد نہیں، مصداق ہے۔

اہم نکات

۱۔ کفران نعمت کی صورت میں نعمتوں کو سلب کرنا سنت الٰہی ہے۔

---

[1] مجمع البیان

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

۱۱۴۔ پس جو حلال اور پاکیزہ رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اس کی بندگی کرتے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا: جب کفران نعمت کی صورت میں نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں تو تم اللہ کے عطا کردہ رزق کو حلال اور پاکیزہ طریقہ سے کھاؤ اور شکر نعمت کرو۔ شکر نعمت میں سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ رزق خدا کو حلال و پاک طریقوں سے کھایا کریں۔ زمین میں جو کچھ خلق ہوا وہ سب انسانوں کے لیے ہے، اسے حلال اور جائز طریقے سے استعمال کرنا اور ناجائز حربوں سے اجتناب کرنا شکر نعمت ہے۔

۲۔ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ: موحدین نعمتوں کو اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں تو اللہ کا شکر کرتے ہیں جب کہ مشرک ان نعمتوں کی نسبت غیر خدا کی طرف دیتے ہیں اس لیے اللہ کا شکر نہیں کرتے۔

اہم نکات

۱۔ آیت سے یہ کلیہ نکلتا ہے کہ ہر چیز حلال ہے مگر دلیل شرعی جسے حرام قرار دے۔

۲۔ شکر نعمت عبودیت کا لازمہ ہے: اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

۱۱۵۔ اس نے تو تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور اس چیز کو جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو حرام کر دیا ہے، پس اگر کوئی مجبور ہوتا ہے نہ (قانون کا) باغی ہو کر اور نہ (ضرورت سے) تجاوز کا مرتکب ہو کر تو اللہ یقیناً بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

یہ حکم سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۳، سورۃ الانعام آیت ۱۴۵ اور سورۃ المائدۃ آیت ۳ میں بھی آ چکا ہے۔

وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَا تَصِفُ اَلۡسِنَتُكُمُ الۡكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰهِ الۡكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ الۡكَذِبَ لَا یُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾

۱۱۶۔ اور جن چیزوں پر تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگاتی ہیں ان کے بارے میں نہ کہو یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تم اللہ پر جھوٹ افترا کرو، جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں وہ یقیناً فلاح نہیں پاتے۔

مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ ۪ وَّ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۱۷﴾

۱۱۷۔ چند روزہ کیف ہے اور پھر ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَا تَصِفُ: خطاب اس مرتبہ خود مسلمانوں سے ہے کہ تم پر جو حرام قرار دیا گیا ہے وہ مردار خون، سور کا گوشت اور وہ جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ ان کے علاوہ جن چیزوں کو تم حرام و حلال قرار دیتے ہو یہ افتراء علی اللّٰہ ہے۔

واضح رہے قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا لازمی نتیجہ ہے۔ لہٰذا اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کو قبول کر لینے کے بعد قانون سازی میں مداخلت کرنا اللہ کی حاکمیت اعلیٰ میں مداخلت ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ یونس آیت ۵۹۔

۲۔ لِّتَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰهِ الۡكَذِبَ: اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دینا نہایت عظیم گناہ اور جرم ہے۔ فرمایا:

وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ...[1]

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے یا اس کی آیات کو جھٹلائے؟

اہم نکات

۱۔ قانون سازی اللہ کی حاکمیت اعلیٰ میں مداخلت ہے۔

وَعَلَی الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا مَا قَصَصۡنَا عَلَیۡكَ مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ

۱۱۸۔ اور جنہوں نے یہودیت اختیار کی ہے ان پر وہی چیزیں ہم نے حرام کر دیں جن کا ذکر پہلے ہم آپ سے کر چکے ہیں اور ہم نے تو ان پر کوئی ظلم

----

[1] ۶ انعام: ۲۱

يَظْلِمُوْنَ ﴿١١٨﴾　　نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۶ کی طرف اشارہ ہے: وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ....۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الانعام، سورۃ النحل سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

بعض اہل قلم نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے: سورۃ النحل کی اس آیت میں سورۃ الانعام کی ایک آیت کا حوالہ دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الانعام اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی لیکن سورۃ الانعام آیت ۱۱۹ میں اشارہ ہوا ہے:

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ...　　اور کیا وجہ ہے کہ تم وہ (ذبیحہ) نہیں کھاتے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ اللہ نے جن چیزوں کو اضطراری حالت کے سوا تم پر حرام قرار دیا ہے....

اس میں سورۃ النحل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مکی سورتوں میں سورۃ الانعام کے علاوہ بس یہی سورہ ہے جس میں حرام چیزوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سا سورہ پہلے نازل ہوا تھا اور کون سا بعد میں؟[1]

ہمارے نزدیک صحیح جواب یہ ہے کہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۹ کا اشارہ اسی سورہ کی آیت ۱۴۶ کی طرف ہو سکتا ہے جس میں ان چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے:

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ　　اور ہم نے یہود پر ہر ناخن والا جانور حرام کر دیا تھا اور بکری اور گائے کی چربی حرام کر دی تھی....

اور سورہ میں آیت ۱۴۶ بعد میں مذکور ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ آیت نازل بھی بعد میں ہوئی ہے کیونکہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ تدوین کی ترتیب، نزول کی ترتیب کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ بعض الٰہی احکام بندوں کے مکافات عمل کے طور پر بھی نافذ ہوئے ہیں: وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ　　۱۱۹۔ پھر بے شک آپ کا رب ان کے لیے جنہوں نے نادانی میں برا عمل کیا پھر اس کے بعد توبہ

---

[1] تفہیم القرآن ۲: ۵۷۹

وَاَصۡلَحُوۡۤا ۙ اِنَّ رَبَّکَ مِنۡۢ بَعۡدِہَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۱۹﴾

کر لی اور اصلاح کر لی تو یقیناً اس کے بعد آپ کا پروردگار بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہاں جہالت سے مراد حقیقت گناہ اور اس کے ارتکاب کے برے اثرات سے ناآگاہی ہو سکتا ہے ورنہ بغیر کسی کوتاہی کے گناہ کا علم نہ ہو تو یہ سرے سے گناہ ہی نہیں ہے۔

بِجَہَالَۃٍ کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ النساء آیت ۱۷۔

۲۔ توبہ کے بعد اصلاح کا ذکر اس لیے آیا کہ اصلاح توبہ کا لازمی نتیجہ ہے کیونکہ توبہ گزشتہ برے اعمال سے برگشتہ ہونے کو کہتے ہیں اور برے اعمال کو چھوڑنے کا مطلب اصلاح ہے۔ ورنہ صرف لفظی استغفار سے توبہ وجود میں نہیں آتی۔

اہم نکات

۱۔ گزشتہ سے توبہ آیندہ کی اصلاح کے عہد کے ساتھ مربوط ہے۔

اِنَّ اِبۡرٰہِیۡمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیۡفًا ؕ وَلَمۡ یَکُ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاکِرًا لِّاَنۡعُمِہٖ ؕ اِجۡتَبٰہُ وَہَدٰىہُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَاٰتَیۡنٰہُ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً ؕ وَاِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۲۲﴾

۱۲۰۔ ابراہیم (اپنی ذات میں) ایک امت تھے اللہ کے فرمانبردار اور (اللہ کی طرف) یکسو ہونے والے تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔

۱۲۱۔ (وہ) اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، اللہ نے انہیں برگزیدہ کیا اور صراط مستقیم کی طرف ان کی ہدایت کی۔

۱۲۲۔ اور ہم نے دنیا میں انہیں بھلائی دی اور آخرت میں وہ صالحین میں سے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کفر کے مقابلے میں ایک امت کی طرح تھے۔ ایک امت کی طرح قیام کیا۔ ایک امت کی طرح طاقتور رہے۔ ایک امت کی طرح طاغوت وقت کا مقابلہ کیا۔ ایک امت کی طرح طاغوت پر فتح حاصل کی اور ایک امت کی طرح انسانیت کی تاریخ کا رخ بدلا۔

۲۔ قَانِتًا لِّلّٰہِ: وہ اللہ کے فرماں بردار تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ طاقت اللہ کی اطاعت اور

طاقت کے سرچشمہ سے گہرے ربط کی وجہ سے ملی۔

۳۔ حَنِیۡفًا: یکسو ہونے والا۔ وہ تمام غیر اللہ سے منقطع ہو کر یکسوئی کے ساتھ صرف اللہ کی طرف متوجہ رہتے اور اسی پر تکیہ کرتے تھے۔ غیر اللہ سے منقطع ہونے کی صورت میں ہی اللہ پر کامل بھروسہ ہو سکتا ہے اور اگر کوئی غیر اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ اس کو اسی غیر اللہ پر چھوڑ دیتا ہے۔

۴۔ وَلَمۡ یَکُ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ: ابراہیم علیہ السلام کے عقائد اور کردار میں، شریك اور غیر اللّٰہ کی طرف توجہ کرنے کا شائبہ تک نہ تھا۔

۵۔ شَاکِرًا لِّاَنۡعُمِہٖ: اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے۔ مقام شکر پر فائز ہونا حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے خلیل الرحمٰن کے لیے اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر نعمت قولاً و عملاً کس قدر عند اللہ قابل قدر عمل ہے۔

درج بالا اوصاف کا حامل ہونے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو درج ذیل عنایتوں سے نوازا:

i۔ اِجۡتَبٰہُ :ان کو برگزیدہ کیا۔

ii۔ ھَدٰىہُ: ان کی صراط مستقیم کی راہنمائی کی۔

iii۔ وَاٰتَیۡنٰہُ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً: دنیا میں بھی ان کو حسنات سے نوازا اور آخرت میں بھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نیک اعمال کے اثرات اس زندگی پر بھی مترتب ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ عبادت اور انقطاع الی اللّٰہ سے ابراہیمؑ کو ایک امت کا درجہ ملا۔

ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۲۳﴾

۱۲۳۔ (اے رسول) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ یکسوئی کے ساتھ ملت ابراہیمی کی پیروی کریں اور ابراہیم مشرکین میں سے نہ تھے۔

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبۡتُ عَلَی الَّذِیۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ ؕ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَیَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾

۱۲۴۔ سبت (کا احترام) ان لوگوں پر لازم کیا گیا تھا جنہوں نے اس بارے میں اختلاف کیا اور آپ کا رب قیامت کے دن ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں یہ لوگ اختلاف کرتے تھے۔

تفسیر آیات

یہاں ربط کلام اور نظم عبارت میں خاصی توجہ کی ضرورت ہے۔ سلسلہ کلام تشریع اور تقنین کے بارے میں ہے کہ امت مسلمہ پر چند چیزیں حرام کر دی گئیں مثلاً مردار، خون، سور کا گوشت وغیرہ اور یہ کہ تقنین، اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کا مسئلہ ہے۔ اس میں کوئی اور مداخلت نہیں کر سکتا۔ قانون ہمیشہ اللہ ہی بناتا ہے۔ اس کے وضع کردہ قانون میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ جیسا کہ یہودی قانون اور شریعت محمدی میں بظاہر نظر آتا ہے کیونکہ بعض قوانین یہودیوں پر ان کی نافرمانیوں کے مکافات کے طور پر نافذ کر دے گئے تھے۔ یہ معروضی قوانین تھے، ان کا ملت ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۔ ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ: ملت ابراہیمی کے ساتھ اے رسولؐ آپ کا تعلق ہے اور آپؐ کو ملت ابراہیمی پر چلنے کا ہم نے حکم دیا ہے۔

۲۔ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبۡتُ: یہاں ایک مرتبہ پھر ایک ایسے قانون کی طرف اشارہ فرمایا جو یہودیوں پر ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے نافذ رہا ہے۔ وہ یوم سبت (ہفتہ) کا قانون ہے۔ یوم سبت کا تعلق صرف یہودیوں کی نافرمانی کی پاداش سے ہے۔ اس کا ملت ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یوم سبت کی تفصیل سورۃ البقرۃ آیت ۶۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔

اہم نکات

۱۔ شریعت محمدی، ملت ابراہیمی کا تسلسل ہے۔

۲۔ بعض قانون یہودیوں کے ساتھ مخصوص تھے۔

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۱۲۵﴾

۱۲۵۔ (اے رسول) حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف دعوت دیں اور ان سے بہتر انداز میں بحث کریں، یقیناً آپ کا رب بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ: دعوت الی الحق تین بنیادوں پر استوار ہے: ایک حکمت،

دوسری موعظہ حسنہ اور تیسری مناظرہ۔ حکمت یعنی حقائق کا صحیح ادراک۔ لہٰذا حکمت کے ساتھ دعوت دینے سے مراد دعوت کا وہ اسلوب ہو سکتا ہے جس سے مخاطب پر حقائق آشکار ہونے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ لہٰذا واقع بینی کی دعوت دینا حکیمانہ دعوت ہو گی۔

دعوت کو حکیمانہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مخاطب کی ذہنی وفکری صلاحیت، نفسیاتی حالت، اس کے عقائد ونظریات اور اس کے ماحول و عادات کو مدنظر رکھا جائے۔ موقع اور محل اور مقتضی حال کے مطابق بات کی جائے کہ مخاطب کو کون سی دلیل متاثر کر سکتی ہے۔ اس بات پر بھی توجہ ہو کہ ہر بات، ہر جگہ نہیں کہی جاتی بلکہ ہر حق کی بات ہر جگہ نہیں کہی جاتی۔ جیسا کہ ہر دوائی سے ہر مریض کا علاج نہیں کیا جاتا بلکہ ہر صحیح علاج بھی ہر مریض کے لیے مناسب نہیں ہوتا، اگر مریض کا معدہ اس دوائی کو ہضم کرنے کے قابل نہ ہو۔ جیسا کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ اسلام میں تدریجی حکمت عملی اختیار فرمائی اور شروع میں صرف قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ تفلحوا پر اکتفا فرمایا چونکہ یہ حکیمانہ تقاضوں کا منافی تھا کہ شریعت کے تمام احکام بیک وقت تبلیغ اور نافذ کیے جائیں۔

۲۔ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ: موعظہ حسنہ۔ موعظہ کے ساتھ حسنہ کی قید سے معلوم ہوا کہ موعظہ غیر حسنہ بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس دعوت میں ہر قسم کا موعظہ درکار نہیں ہے۔ مثلاً وہ موعظہ جس میں واعظ اپنی بڑائی دکھانا چاہتا ہے اور مخاطب کو حقیر سمجھتا ہے یا صرف سرزنش پر اکتفا کرتا ہے۔

موعظہ حسنہ کے لیے سب سے پہلے خود واعظ کے لیے اس موعظہ کا پابند ہونا ضروری ہے ورنہ اس کا موعظہ حسنہ اور مؤثر نہ ہو گا بلکہ ایسا کرنا قابل سرزنش ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝ کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝[1]	اے ایمان والو! تم وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں ہو۔

موعظہ حسنہ ہونے کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ یہ موعظہ دل سوزی، خیر خواہی کے ساتھ ہو اور مخاطب اس بات کو محسوس کرے کہ ناصح کے دل میں اس کے لیے ہمدردی ہے۔ وہ اس کی خالصانہ اصلاح چاہتا ہے۔

۳۔ وَجَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ: بہتر انداز میں مباحثہ و مناظرہ یہ ہے کہ اس بحث و مناظرے کا مقصد کج بحثی، حریف مقابل پر بالا دستی اور غلبہ حاصل کرنا نہ ہو بلکہ اس مناظرے کا مقصد حریف مقابل کو راہ راست پر لانا ہو۔ مناظرے میں غالباً الزام تراشیاں ہوتی ہیں۔ حریف مقابل اور اس کے مقدسات کی توہین ہوا کرتی ہے۔ نازیبا کلمات استعمال کرنے، بہتان تراشی اور کذب و افترا کی نوبت آتی ہے۔ اس لیے مناظرے

[1] ۶۱ صف: ۲۔۳

کے لیے اَحۡسَنُ کی شرط لگائی جب موعظہ کے لیے حسنۃ ہونا کافی ہے۔

ہر انسان انانیت کا شکار رہتا ہے اور اپنی انانیت پر آنے والی ہر آنچ کا پوری قوت سے مقابلہ کرتا ہے۔ مناظرے میں اگر حریف مقابل شکست کا احساس کرے اور اپنی انا متاثر ہونے کا خطرہ محسوس کرے تو اس پر کوئی دلیل اثر نہیں کر سکتی لیکن اگر مناظرہ احسن طریقے پر ہو تو حریف مقابل کو کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہ ہو گا اور دلیل اس پر اثر کرے گی۔

اہم نکات

۱۔ تبلیغ و دعوت میں شائستگی کا بڑا دخل ہے۔

۲۔ مناظرے میں حریف مقابل کی عزت نفس مجروح نہیں کرنی چاہیے۔

وَ اِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَ لَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَہُوَ خَیۡرٌ لِّلصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۲۶﴾

۱۲۶۔ اور اگر تم بدلہ لینا چاہو تو اسی قدر بدلہ لو جس قدر تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور اگر تم نے صبر کیا تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے۔

تفسیر آیات

دعوت الی الحق حکیمانہ، نصیحت و موعظہ ہمدردانہ اور مناظرہ محترمانہ ہونے کے باوجود اگر اہل دعوت کے ساتھ زیادتی ہو تو ایسی حالت میں اہل حق کے موقف میں بھی تبدیلی آنا قدرتی بات ہے۔ تجاوز اور زیادتی کی صورت میں دفاع کا حق اور مقابلہ بالمثل کا جواز مل جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ اسلامی تعلیمات کا اثر ہے کہ حکیمانہ اور ہمدردانہ دعوت کے جواب میں زیادتی ہونے کے باوجود بدلہ نہیں لیتے۔ حریف مقابل نے اگرچہ تمام حدود سے تجاوز کیا ہے لیکن حق کے داعی کو اپنی حدود میں رہنے کا حکم ہے کہ بدلہ صرف اسی قدر لے سکتے ہو جس قدر تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ تاہم داعی الی الحق اور انسانیت کی قیادت کا منصب سنبھالنے والے کے لیے بدلے کی جگہ صبر زیب دیتا ہے۔ بدلہ لے کر جذبہ انتقام کی تشفی کی جگہ جذبۂ انسانیت کے تحت ہمدردی کا مظاہرہ کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انتقام میں بھی عدل کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے: بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ ....

۲۔ انتقام پر صبر کو ترجیح دینا چاہیے: لَہُوَ خَیۡرٌ لِّلصّٰبِرِیۡنَ۔

وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَ

۱۲۷۔ اور آپ صبر کریں اور آپ کا صبر صرف اللہ کی

لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا تَکُ فِیۡ ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡکُرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾

مدد سے ہے اور ان (مشرکین) کے بارے میں حزن نہ کریں اور نہ ہی ان کی مکاریوں سے تنگ ہوں۔

۱۲۸۔ اللہ یقیناً تقویٰ اختیار کرنے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاصۡبِرۡ: اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو صبر و تحمل کی تلقین فرماتا ہے چونکہ مصائب و آلام اور دشمنوں کی زیادتیوں پر صبر اللہ کی توفیق اور اس کی عطا کردہ طاقت کی وجہ سے آئے گا۔

۲۔ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ: آپؐ کا کام صرف تبلیغ و ارشاد ہے۔ اس کے بعد اگر مشرکین ہدایت پر نہیں آتے تو آپؐ ان کے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ وہ اس ہمدردی کے اہل نہیں ہیں۔

۳۔ وَلَا تَکُ فِیۡ ضَیۡقٍ: ان کی مکاریوں سے تنگ نہ آئیں کیونکہ فتح و نصرت آپؐ کے ساتھ ہے اور اللہ تقویٰ و احسان والوں کے ساتھ ہے۔

اہم نکات

۱۔ صبر و تقویٰ کے ساتھ فتح و نصرت مل جاتی ہے۔

۲۔ صبر کی توفیق بڑی طاقت ہوتی ہے۔

خالی

سُورَةُ الاسراءِ

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورت کا نام بنی اسرائیل مشہور ہے اور اسے سورۃ الاسراء بھی کہتے ہیں۔

مشہور روایات کے مطابق اس سورہ کی تمام آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں۔ البتہ بعض روایات میں کچھ آیات کے بارے میں آیا ہے کہ مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔

اس سورہ کی ابتدائی آیت، آیت معراج سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ، معراج کے موقع پر نازل ہوا ہے اور یہ بات بھی تقریباً تسلیم شدہ ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال قبل پیش آیا تھا۔ لہٰذا یہ سورہ ہجرت سے ایک سال قبل نازل ہوا ہے۔

اس سورہ کے مضامین مکی مزاج ہیں جو اکثر توحید، نفی شرک اور معاد پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں بعض ایسی اخلاقی قدروں کے احیاء کا ذکر ہے جن کو زمان جاہلیت میں پامال کیا جاتا تھا۔ مثلاً زنا، اولاد کشی، احترام والدین اور تکبر سے اجتناب۔ کچھ اقتصادی اصول کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مثلاً فضول خرچی کی ممانعت، اسراف اور بخل کے درمیان اعتدال کی صورت اختیار کرنے کا حکم اور ناپ تول میں خیانت کی ممانعت۔

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ①

بنام خدائے رحمن رحیم

۱۔ پاک ہے وہ جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے اس مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے گرد و پیش میں ہم نے برکتیں رکھیں تاکہ ہم انہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں، یقیناً وہ خوب سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

تشریح کلمات

اَسۡرٰی: (س ر ی) اَلسُّری کے معنی رات کو سفر کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت میں واقعہ معراج کی طرف اشارہ ہے۔ آیت میں مسجد الحرام مکہ سے مسجد اقصیٰ، بیت المقدس تک لے جانے کا ذکر ہے۔ البتہ حدیث میں تواتر کے ساتھ آیا ہے کہ مسجد اقصیٰ سے آپؐ کو معراج پر لے جایا گیا اور ملکوت کی سیر کرائی گئی۔

معراج کی حکمت: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج پر لے جانے کا مقصد اسی آیت کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا: لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا تاکہ ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کو اپنی نشانیاں اس طرح دکھانا چاہتا ہے کہ وہ زمین و آسمان میں اللہ کی سلطنت کا اس طرح مشاہدہ کریں کہ ایمان بالغیب کے ساتھ ایمان بالشہود کی منزل پر فائز ہو جائیں۔ واضح رہے شہود سے مراد سمعی و بصری ذرائع نہیں ہیں جن میں غلطی کا امکان رہتا ہے کہ سننے میں کانوں اور دیکھنے میں آنکھوں کو غلطی لگ جائے بلکہ اس شہود سے مراد عقل، شعور، ضمیر، وجدان اور اپنے پورے وجود کے ساتھ مشاہدہ کرنا ہے کہ یقین و ایمان کی وہ

منزل آجائے جس کے بعد مزید یقین کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ جسے قرآن دل کا مشاہدہ قرار دیتا ہے۔

لہٰذا یہ مشاہدہ ظاہری حواس کے ذریعے نہیں ہوا تھا:

لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی ۝[1] تحقیق انہوں نے اپنے رب کی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔

بلکہ یہ عقل وشہود دونوں سے بالاتر تھا۔ جس کے بارے میں خود خداوند عالم فرماتا ہے:

مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝[2] جو کچھ (نظروں نے) دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا۔

اس مشاہدے میں قلب کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جس کی تصدیق کے بعد یقین کی آخری منزل آ جاتی ہے۔

نگاہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک جامع تعریف اس آیت میں آئی ہے:

مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَ مَا طَغٰی ۝[3] نگاہ نے نہ انحراف کیا اور نہ تجاوز۔

کیا کہنا اس رسولؐ کا جس کی بصارت اور بصیرت کے اعتدال کی گواہی خود خدا دے۔ اس بیان کے بعد اس سوال یا اس اختلاف میں وزن باقی نہیں رہتا کہ معراج کا واقعہ عالم خواب میں پیش آیا تھا یا عالم بیداری میں؟ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جس بیداری میں آسمانی ملکوت کی سیر کرائی ہے ایسی بیداری تو کائنات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوا کسی نبی کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔ اس بیداری کا موازنہ دنیا کی نام نہاد بیداریوں کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جس نگاہ کو ہم بیداری کی نگاہ کہتے ہیں اس میں سو فیصد صحیح ادراک ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ اس نگاہ کو دور سے چیزیں چھوٹی نظر آتی ہیں۔ پانی کے اندر سیدھی چیز بھی ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ اس طرح نظروں کے دھوکے بہت ہوتے ہیں۔

لیکن نگاہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیداری کا عالم یہ ہے کہ جب اللہ نے آیات کبریٰ کا مشاہدہ کرایا تو خود خدا گواہی دی ہے: مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَ مَا طَغٰی۔ اس نگاہ نے حقائق کا کماحقہ مشاہدہ کیا۔ نہ حقائق سے پیچھے رہی نہ آگے گئی۔ ۴۸۸

ہم متشابہات کی بحث میں لکھ چکے ہیں کہ بعض مطالب، محسوسات اور مادیات سے ماوراء ہوتے ہیں جو ہمارے لیے کماحقہ قابل فہم نہیں ہوتے۔ مثلاً قرآن فرماتا ہے: اللّٰہ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ[4] ہے۔ ظاہر ہے اللہ کی سماعت اور بصارت ایسی نہیں ہے جس سے ہم مانوس ہیں اور یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ جن چیزوں کو ہمارے حواس نے درک نہ کیا ہو ان کا تصور کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ مثلاً اگر پانی نہ ہوتا تو اس کا تصور کرنا ہمارے لیے ممکن نہ ہوتا۔

اللہ تعالیٰ ان غیر مادی لاہوتی حقائق کو ناسوتی یعنی مادی قالب میں بیان فرماتا ہے تو ان حقائق کے بارے میں ہم اپنی مادی محسوساتی حدود میں سوچنے لگتے اور اپنے محدود زمان و مکان کے دائرے میں لاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ غیر مادی حقائق، مادی طبیعاتی قوانین کی دفعات کے مطابق نہیں ہوتے۔ اس لیے انہیں اپنے

---

[1] ۵۳ نجم: ۱۸ [2] ۵۳ نجم: ۱۱ [3] ۵۳ نجم: ۱۷ [4] ۳۱ لقمان: ۲۸

محدود ناسوتی دائرے میں لانے اور طبیعاتی قوانین کی دفعات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے تاویلیں کرتے ہیں۔

چنانچہ معراج میں عروج سے مراد جاذبہ ارضی کے خلاف جانا اور اسری میں مسافتوں اور فاصلوں کو طے کرنا مراد لیتے ہیں۔

ہم چونکہ زمانی ہیں اس لیے اپنی اس دنیا کے زمانے کے مطابق سوچتے ہیں۔ غیر زمانی حقائق کا ہم ادراک نہیں کر سکتے یا دوسری دنیاؤں کے زمانے کا ہمیں علم نہیں، اس لیے خیال کرتے ہیں رات کے ایک حصے میں معراج کا یہ طویل سفر کیسے طے ہوا۔

اسی طرح ہم کل کائناتی حقائق کو اپنی محدود دنیا اور علم و آگہی کے محدود دائرے میں سوچتے اور اپنے زمان و مکان کے دائرے میں لا کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بلکہ جن حقائق تک اب تک انسان نے رسائی حاصل کی ہے ان کے تحت اس قسم کے مسائل قابل فہم ہو رہے ہیں۔ چنانچہ الکسس کا ریل انسان کے بارے میں کہتے ہیں:

افراد کو زمان و مکان میں محدود کو سمجھنا ایک مفروضہ ہے۔

اور آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کے تحت یہ کائنات یک گونہ نہیں ہے کہ زمان و مکان وغیرہ ہر جگہ یکساں ہوں۔ مثلاً ہمارا زمانہ اور روشنی کی رفتار سے سفر کرنے والی چیز کا زمانہ ایک جیسا نہیں ہے بلکہ مذکورہ رفتار کی چیز پر وقت رک جائے گا اور زمین پر سینکڑوں سال گزر چکے ہوں گے۔ لہٰذا معراج نہ صرف مکانی تھی بلکہ زمانی بھی تھی۔ رسول اللہؐ کو عروج، عمق فضا و زمان، زمان و مکان کے ماوراء معراج ہوئی ہے۔

یہ تو وہ چند ایک حقائق ہیں جنہیں آج تک کے انسان نے سمجھا ہے۔ ممکن ہے کل اس سلسلے کے دیگر حقائق منکشف ہو انسان کے سامنے آئیں اور اس مسئلے کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔ اس کے باوجود انسان مستقبل میں خواہ کتنے حقائق و رازہای قدرت تک رسائی کر لے، انسان کی معلومات اس کے مجہولات کے مقابلے میں ہیچ ہوں گی۔ اس لیے انسان کی معلومات کا ملکوت سماوات و ارض کے ساتھ موازانہ کرنا ایک بے جا عمل ہے۔

لہٰذا معراج کے حقائق اور آسمانوں کی طرف عروج کرنے کے لیے ہمارے نظام شمسی میں موجود رکاوٹوں کا ذکر اور ان کا جواب ایک غیر ضروری بحث ہے۔

رہا معراج کے بارے میں منقول روایات کا مسئلہ تو ان میں بعض روایات آیت کے مفہوم کے مطابق ہیں اور بعض میں تفصیل موجود ہے جو کہ آیت کے منافی نہیں ہے۔ البتہ راویان حدیث اپنے ناسوتی تصورات کے مطابق احادیث نقل کرتے ہیں۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی قرآن کی طرح کلم الناس علی قدر عقولھم، لوگوں کی عقل وفہم کے مطابق بات کرتے تھے۔ لہٰذا بعض روایات تمثیلی ہیں اور اس سلسلے کی بعض روایات قرآن و مسلمات کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہیں۔

وَ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ جَعَلۡنٰہُ ہُدًی لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اَلَّا تَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِیۡ وَکِیۡلًا ؕ﴿۲﴾

۲۔اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس (کتاب) کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت قرار دیا کہ میرے علاوہ کسی کو کارساز نہ بناؤ۔

ذُرِّیَّۃَ مَنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَبۡدًا شَکُوۡرًا ﴿۳﴾

۳۔ اے ان لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا! نوح یقیناً بڑے شکر گزار بندے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔وَ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ: واقعہ معراج اور بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرانا کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ یہ سنت الٰہیہ کا تسلسل ہے۔ چنانچہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور بنی اسرائیل کے لیے سامان ہدایت فراہم کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو ہدایت کی کتاب عنایت ہوئی تو اس کتاب کا خلاصہ: ''اللہ کے علاوہ کسی کو کارساز نہ بناؤ'' تھا۔ رسول اسلام (ص) کو معراج کے ذریعے عزت و تکریم سے نوازا ہے تو موسیٰ علیہ السلام کو بھی کتاب ہدایت عنایت کی ہے۔

۲۔ ذُرِّیَّۃَ مَنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ: ان عنایتوں کا سلسلہ نوح سے چلا آرہا ہے جن کی تم اولاد ہو۔ تمہیں کشتی کے ذریعے غرق ہونے سے نجات دی۔ نوح اس عنایت کے شکر گزار رہے ہیں۔

رخ کلام دراصل اہل مکہ کی طرف ہے۔ تاریخ انبیاء کی روشنی میں اللہ کی طرف سے انبیاء پر ہونے والی عنایتوں کا ذکر ہے۔ اگلی آیت میں ناشکری کی صورت میں پیش آنے والے نتائج کا ذکر ہے۔

اہم نکات

۱۔ دعوت موسیٰ علیہ السلام توحید پر مبنی تھی: اَلَّا تَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِیۡ وَکِیۡلًا۔

۲۔ بنی اسرائیل، نوح (ع) کی اولاد ہیں۔

وَ قَضَیۡنَاۤ اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ فِی الۡکِتٰبِ لَتُفۡسِدُنَّ فِی الۡاَرۡضِ مَرَّتَیۡنِ وَ لَتَعۡلُنَّ عُلُوًّا کَبِیۡرًا ﴿۴﴾

۴۔اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ ضرور فساد برپا کرو گے اور ضرور بڑی طغیانی دکھاؤ گے۔

تفسیر آیات

قرآن کے اس بیان کی تصدیق توریت اور انجیل کی متعدد تنبیہات سے ہوتی ہے جن میں بنی

اسرائیل سے کہا گیا کہ تمہاری بدکاری، سرکشی اور فسق و فجور کی پاداش میں تمہارے شہر ویران کر دیے جائیں گے۔ تمہاری لاشیں ہوائی پرندوں اور زمینی درندوں کی خوراک ہوگی۔ اس قسم کی پیش گوئیاں حضرت یرمیاہ، حضرت یسعیاہ، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ فساد و سرکشی سے پُر ہے۔ لہٰذا اس بارے میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان دونوں فسادوں سے مراد کون سے دو فساد ہیں۔

فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰىہُمَا بَعَثۡنَا عَلَیۡکُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّیَارِ ؕ وَ کَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا﴿۵﴾

۵۔ پس جب دونوں میں سے پہلے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے اپنے زبردست طاقتور جنگجو بندوں کو تم پر مسلط کیا پھر وہ گھر گھر گھس گئے اور یہ پورا ہونے والا وعدہ تھا۔

تشریح کلمات

الجوس: (ج و س) آیہ کریمہ میں جاسوا کے معنی ہیں کہ وہ تمہارے گھروں کے اندر گھس گئے اور ان میں خوب پھرے۔ قتل و غارت سے کنایہ ہے۔

تفسیر آیات

جب پہلے فساد کا وقت آیا اور بنی اسرائیل نے فساد اور سرکشی میں انتہا کر دی تو اللہ تعالیٰ نے از روئے انتقام ان پر کچھ ایسے جنگجوؤں کو مسلط کر دیا جن سے ان کے گھروں کی چار دیواری کا تقدس تک پامال ہو گیا۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا: ہم نے اپنے طاقتور جنگجو بندوں کو تم پر مسلط کیا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انتقام لینے والے افراد مؤمن ہوں کیونکہ اگر یہ عمل، اللہ کی طرف سے مسلط کرنا تشریعی ہو تو ایمان وغیرہ شرط ہے لیکن یہ عمل تکوینی، قدرتی مکافات عمل ہے جس کے لیے ایمان وغیرہ شرط نہیں ہے۔ چنانچہ شیاطین کے بارے میں فرمایا:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا الشَّیٰطِیۡنَ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ تَؤُزُّہُمۡ اَزًّا ﴿۸۳﴾[1]

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیاطین کو کفار پر مسلط کر رکھا ہے جو انہیں اکساتے رہتے ہیں؟

یہاں شیطانوں کے بارے میں اَرۡسَلۡنَا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہاں بھی لفظ اَمَرۡنَا برے لوگوں کے لیے

---
[1] ۱۹ مریم: ۸۳

استعمال ہوا ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا ....[1] اور جب ہم کسی بستی کو ہلاکت میں ڈالنا چاہتے ہیں تو اس کے عیش پرستوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس بستی میں فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں....

الفاظ عِبَادًا لَّنَآ ، لِعِبَادِي قرآن میں کافر و مومن دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ اسلام نے فرمایا:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ....[2] اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں۔

کیونکہ کافر بھی تو اللہ کے بندے ہیں لیکن وہ بندگی کا حق ادا نہیں کرتے۔

یہ طاقتور جنگجو کون لوگ تھے؟ اس میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک قرین واقع معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مراد بابل کے بادشاہ بخت نصر کا حملہ ہی ہوسکتا ہے جس نے یروشلم اور ہیکل سلیمانی تک زمین کو برابر کر دیا تھا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی مشیت قدرتی عوامل کے ذریعے عمل میں آتی ہے: عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ ....

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ ۶۔ پھر دوسری بار ہم نے تمہیں ان پر غالب کر دیا اور اموال اور اولاد سے تمہاری مدد کی اور تمہاری تعداد بڑھا دی۔

تفسیر آیات

ممکن ہے اس آیت کا اشارہ بابل سے رہائی کے بعد کے واقعات کی طرف ہو۔ چنانچہ بابل کی سلطنت کا زوال ہوا۔ ایرانی بادشاہ کورش نے بابل کو فتح کیا اور اسرائیلیوں کو وطن واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اس بات کی بھی اجازت مل گئی کہ ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی جائے۔ اس کے بعد حضرت عزیز نے یہودی مذہب کی تجدید کی اور توریت سمیت دیگر مقدس کتب کو از سر نو مرتب کیا۔ اس طرح تقریباً ۵۳۱ ق م سے ۴۴۵ ق م تک کے عرصے میں بیت المقدس پھر سے آباد ہوا اور یہودیت کو پھلنے پھولنے کا موقع میسر آیا۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ ۷۔ اگر تم نے نیکی کی تو اپنے لیے نیکی کی اور اگر

لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝

تم نے برائی کی تو بھی اپنے حق میں کی پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا (تو ہم نے ایسے دشمنوں کو مسلط کیا) وہ تمہارے چہرے بدنما کر دیں اور مسجد (اقصیٰ) میں اس طرح داخل ہو جائیں جس طرح اس میں پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے اور جس جس چیز پر ان کا زور چلے اسے بالکل تباہ کر دیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ: خطاب اگرچہ بنی اسرائیل سے ہے تاہم یہ ایک کلیہ ہے کہ نیکی کے مثبت اثرات سب سے پہلے نیکی کرنے والے پر مرتب ہوتے ہیں۔ اسی طرح برائی کے منفی اثرات برائی کا ارتکاب کرنے والے پر مترتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ظالم پر ظلم کے اثرات مظلوم سے زیادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

یوم المظلوم علی الظالم اشد من یوم الظالم علی المظلوم....

مظلوم کے خلاف ظالم کے دن سے، ظالم کے خلاف مظلوم کا دن بہت شدید ہو گا۔

۲۔ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ: زیادہ امکان یہ ہے کہ دوسرے وعدے سے مراد رومیوں کا وہ حملہ ہو جو ۷۰ء میں یروشلم پر ہوا، جس میں ایک لاکھ تینتیس ہزار آدمی مارے گئے۔ ۶۷ ہزار کو غلام بنا لیا گیا۔ یروشلم کے شہر کو ہیکل سلیمانی سمیت ایسا تباہ کر دیا کہ ہیکل دوبارہ تعمیر نہ ہو سکا۔

ہم نے مذکورہ دو واقعات کو اس لیے ترجیح دی کہ یہ دونوں واقعے اسرائیلی تاریخ کے اہم ترین یا یوں کہیے بدترین واقعے ہیں۔ ثانیاً قرطبی کی ایک روایت میں آیا ہے کہ فساد اول سے مراد بخت نصر کا حملہ اور فساد دوم سے مراد رومیوں کا حملہ ہے۔ یہ روایت حضرت حذیفہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہے جو تاریخی واقعات کے مطابق ہے۔

اہم نکات

۱۔ قوموں کا زوال و عروج ان کے کردار سے مربوط ہے۔

۲۔ نیکی و برائی کے اثرات خود انجام دینے والے پر پہلے اور زیادہ مرتب ہوتے ہیں۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ ۸۔ امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا اور

عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا ۘ وَ جَعَلۡنَا جَہَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ حَصِیۡرًا ﴿۸﴾

اگر تم نے (شرارت) دہرائی تو ہم بھی (اسی روش کو) دہرائیں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ : اللہ کی رحمت میں دریغ نہیں ہے، صرف اس رحمت کے لیے اہل ہونا شرط ہے۔ اگر بنی اسرائیل توبہ و انابت کے ساتھ اپنے آپ کو رحمت خدا کا اہل بنا دے تو اللہ ان پر رحم کرے گا۔ وہ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ہے۔

۲۔ وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا: لیکن جہاں اللہ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ہے، وہ شدید الانتقام بھی ہے کہ اگر تم نے پھر وہی سرکشی، نافرمانی اور ظلم و بربریت کی روش اختیار کی تو ہم بھی وہی سلوک اختیار کریں گے کہ تمہیں پھر قتل و اسیری، ذلت وخواری سے دوچار کریں گے۔

ہمارے معاصر یہود نے انسان سوز جرائم کے ارتکاب کی وہی پرانی روش اختیار کی ہے۔ وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ کا مرحلہ آ گیا ہے۔ عنقریب وعدہ الٰہی پورا ہونے یعنی عُدۡنَا کا مرحلہ آنے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کسی قوم یا فرد کا عمل ہی اس کی سرنوشت کا تعین ہے: وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا...۔

اِنَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ یَہۡدِیۡ لِلَّتِیۡ ہِیَ اَقۡوَمُ وَ یُبَشِّرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا کَبِیۡرًا ۙ﴿۹﴾

۹۔ یہ قرآن یقیناً اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھی ہے اور ان مومنین کو جو نیک اعمال بجا لاتے ہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے۔

وَّ اَنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۰﴾

۱۰۔ اور یہ کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لیے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عنایت فرمائی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنایا:

وَ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ جَعَلۡنٰہُ ہُدًی لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اَلَّا تَتَّخِذُوۡا ....[1] ۲۔ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس (کتاب) کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت قرار دیا....

اسی طرح یہ قرآن بھی ذریعہ ہدایت ہے اور اس ہدایت سے فائدہ اٹھانے والوں کو یہ قرآن بشارت دیتا ہے۔ کامیابی کی بشارت، اجر عظیم کی بشارت۔

۱۔ اِنَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ یَہۡدِیۡ: یہ قرآن انسانیت کی ایک ایسی طریقت اور شریعت کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو اقوم الطرق ہے۔ تمام نظامہائے حیات و دستور ہائے زندگی میں جامع ترین اور مستحکم ترین نظام کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔ قرآن، امت قرآن کو جس منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے وہ اَقۡوَمُ ہے۔ نہایت مضبوط بنیادوں پر استوار ہے یہ نظام حیات:

اَقۡوَمُ یعنی ایسا جامع نظام حیات ہے جس میں زندگی کا کوئی گوشہ نظر انداز نہیں کیا گیا۔
اَقۡوَمُ یعنی ایسا معتدل نظام زندگی ہے جو انسانی فطری تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔
اَقۡوَمُ یعنی ایسا نظام حیات جو عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورا کرتا ہے۔
اَقۡوَمُ یعنی ہر عصر کے لیے قابل عمل نظام حیات ہے۔
اَقۡوَمُ یعنی دنیا و آخرت دونوں کے تقاضے پورا کرتا ہے۔
اَقۡوَمُ یعنی اس پر عمل کرنا آسان اور انسانی طاقت کی حدود میں ہے۔
اَقۡوَمُ یعنی اس نظام زندگی کی شقوں میں کوئی ابہام نہیں ہے۔
اَقۡوَمُ یعنی اس نظام زندگی میں کوئی روحانی اور مادی پہلو تشنہ نہیں ہے۔

۲۔ وَ یُبَشِّرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: ایک جامع نظام حیات فراہم ہونے کے بعد اس پر ایمان لانے کی نوبت آتی ہے۔ ایمان کے بعد دستور حیات پر عمل کی نوبت آتی ہے اور پھر عمل کرنے میں کامیاب ہونے والوں کے لیے بشارت ملنا ایک قدرتی بات ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآنی بشارت، اس کے نظام اقوم پر عمل کرنے والوں کے لیے ہے۔

وَ یَدۡعُ الۡاِنۡسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَہٗ بِالۡخَیۡرِ ؕ وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ﴿۱۱﴾ ۱۱۔ اور انسان کو جس طرح خیر مانگنا چاہیے اسی انداز سے شر مانگتا ہے اور انسان بڑا جلد باز ہے۔

----

[1] ۱۷ اسراء: ۲

تفسیر آیات

مکہ والے حضورؐ سے بار بار یہ مطالبہ کرتے تھے کہ اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے رہتے ہو۔ اس طرح وہ رحمت خدا مانگنے کی بجائے عذاب خدا مانگتے ہیں۔ دوسرے فقرے میں اس حماقت کے پیچھے موجود محرک کا ذکر ہے۔ وہ ہے انسان کی عجلت پسندی۔ یہ خصلت انسان کو عزت کی جگہ ذلت، کامیابی کی جگہ ناکامی اور خیر کی بجائے شر کی طرف لے جاتی ہے۔ چنانچہ انسان کی بیشتر ناکامیوں کا سبب یہی عجلت پسندی ہے۔ عجلت پسندی کا مغلوب انسان زمینی حقائق کی جگہ ذہنی آرزوؤں پر چلتا ہے اور ناکام ہو جاتا ہے۔

سابقہ آیت کے ساتھ اس آیت کا ربط اس طرح ہے کہ یہ قرآن اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھی ہے اور اس پر چلنے والوں کو بشارت دیتا ہے لیکن یہ عجلت پسند انسان اللہ کی عطا کردہ اس خیر کی جگہ شر کی طلب میں نکلتا ہے اور اس قرآن سے ہدایت حاصل کر کے رحمت الٰہی کا منتظر رہنے کی جگہ جلد بازی سے کام لیتے ہوئے شر کے دامن میں پھنس جاتا ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذلك۔

اہم نکات

۱۔ انسان نادانی میں اپنی مصلحت کے خلاف دعا کر بیٹھتا ہے۔

۲۔ عجلت پسندی سے ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

وَ جَعَلۡنَا الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ اٰیَتَیۡنِ فَمَحَوۡنَاۤ اٰیَۃَ الَّیۡلِ وَ جَعَلۡنَاۤ اٰیَۃَ النَّہَارِ مُبۡصِرَۃً لِّتَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِیۡنَ وَ الۡحِسَابَ ؕ وَ کُلَّ شَیۡءٍ فَصَّلۡنٰہُ تَفۡصِیۡلًا ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے پھر ہم نے رات کی نشانی کو ماند کر دیا اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور سالوں کا شمار اور حساب معلوم کر سکو اور ہم نے ہر چیز کو پوری تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ جَعَلۡنَا الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ اٰیَتَیۡنِ: سورہ بقرہ آیت ۱۶۴ و دیگر آیات میں شب و روز کے آیات الٰہی ہونے کے بارے میں تفصیل سے گفتگو ہوئی ہے۔ یہاں دونوں آیتوں میں اختلاف کی حکمت بیان ہو

رہی ہے کہ رات کو ماند، بے نور بنا دیا اور دن کو روشن کر دیا۔ روشن دن فضل رب کا سرچشمہ ہے۔ دن میں سورج کی روشنی کے ذریعے اللہ بندوں پر فضل فرماتا ہے اور ساتھ انسان دن کی روشنی میں اپنے لیے سامان زندگی فراہم کر سکتا ہے۔

۲۔ وَلِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِیۡنَ: شب کی بے نوری اور دن کی روشنی کے اختلاف سے نور کا وجود محسوس ہوتا ہے اور اس نور کے آنے جانے سے سالوں مہینوں، ہفتوں اور دنوں کا حساب ہوتا ہے۔ یہ روز و شب اللہ تعالیٰ کی قدرتی تقویم بھی ہے جسے ہر خواندہ و ناخواندہ پڑھ سکتا ہے۔

۳۔ وَکُلَّ شَیۡءٍ فَصَّلۡنٰہُ تَفۡصِیۡلًا: عام طور پر اس جملے کی یہ تفسیر کی جاتی ہے: ہم نے ہر اس بات کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔ اس سے احکام مراد لیے گئے ہیں۔ جب کہ آیت میں کسی تشریع کی نہیں، تکوین کی بات ہو رہی ہے۔ لہٰذا اس جملے سے یہ مراد لینا زیادہ مناسب ہے: وکل شئ مما خلقنا فصلناہ تفصیلا کہ اللہ کے تخلیقی نظام میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ ہر شیء کی خلقت کی حکمت اور مصلحت واضح ہے جس طرح لیل و نہار کی خلقت کی حکمت واضح ہے۔

اہم نکات

۱۔ عالم تخلیق میں کوئی ابہام نہیں ہے: وَکُلَّ شَیۡءٍ فَصَّلۡنٰہُ تَفۡصِیۡلًا۔

۲۔ قدرتی وسائل سے سامان زندگی حاصل کرنا چاہیے: لِتَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا....

وَکُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰہُ طٰٓئِرَہٗ فِیۡ عُنُقِہٖ ؕ وَ نُخۡرِجُ لَہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ کِتٰبًا یَّلۡقٰىہُ مَنۡشُوۡرًا ﴿۱۳﴾	۱۳۔ اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب پیش کریں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔
اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ ؕ کَفٰی بِنَفۡسِکَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡکَ حَسِیۡبًا ﴿۱۴﴾	۱۴۔ پڑھ اپنا نامۂ اعمال! آج اپنے حساب کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔

تشریح کلمات

طٰٓئِرَہٗ: (ط ی ر) الطائر، فضا میں حرکت کرنے والا پر دار جانور۔ تطیّر کسی پرندے سے شگون لینے کے معنوں میں ہے۔ عمل کو طائر کہا گیا کیونکہ "عمل" سرزد ہونے کے بعد اس کے ہاتھوں سے اڑ جاتا ہے۔ عمل سرزد ہونے کے بعد یہ اختیار میں نہیں رہتا کہ اسے واپس لیا جا سکے۔ ممکن ہے عمل کے انرجی ہونے کی وجہ سے اسے طائر، پرندہ کہا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ ہر انسان کی سعادت وشقاوت، کامیابی و ناکامی، حسن عاقبت یا انجام بد کسی بیرونی عامل سے مربوط نہیں ہے بلکہ اس کی تمام تر ذمے داری انسان کی اپنی ذات پر عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنے عمل کے ہاتھوں اسیر ہے اور اپنے عمل ہی سے آزاد ہو سکتا ہے۔ اس کے سامنے خیر اور شر کے دروازے اس کے اپنے عمل کی چابی سے کھلتے ہیں۔ وہ دنیا اور آخرت میں اپنے اعمال کے آئینے میں دیکھا جاتا ہے۔

كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِينَةٌ ۝ [۱] ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے۔

اس کی اپنی سرنوشت اور تقدیر کا پروانہ اس کے اپنے گلے کا ہار ہے۔

۲۔ قیامت کے دن اس کے اعمال ایک کھلی کتاب کی شکل میں اس کے سامنے رکھ دیے جائیں گے جسے دیکھ کر وہ چیخ اٹھے گا:

يَٰوَيۡلَتَنَا مَالِ هَٰذَا ٱلۡكِتَٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّآ أَحۡصَىٰهَاۚ وَوَجَدُواْ مَا عَمِلُواْ حَاضِرًاۗ وَلَا يَظۡلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۝ [۲]

ہائے ہماری رسوائی! یہ کیسا نامۂ اعمال ہے؟ اس نے کسی چھوٹی اور بڑی بات کو نہیں چھوڑا (بلکہ) سب کو درج کر لیا ہے اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ ان سب کو حاضر پائیں گے اور آپ کا رب تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

ممکن ہے یہاں کتاب سے مراد کوئی تحریر نہ ہو بلکہ خود اعمال سامنے آجاتے ہوں اور انسان بالعیان اپنے اعمال دیکھ لیں۔ وَوَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا ... کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ خود عمل کو حاضر پائیں گے۔

۳۔ اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ: پڑھ اپنا نامہ اعمال۔ پڑھ کر شرمساری اور ندامت ہو گی۔ کوئی بھی عذر قبول نہ ہوگا۔

لَا تَعۡتَذِرُوا الۡيَوۡمَ ... [۳] آج عذر پیش نہ کرو...

... وہ اپنے آپ کو اس عمل کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ لے گا۔ یہاں کسی شاہد کی ضرورت ہے نہ شک کی گنجائش ہے۔ آج انسان اپنا محاسبہ خود کرے گا۔

اہم نکات

۱۔ انسان کا عمل، طوق گردن ہے جس سے چھٹکارا نہیں۔

۲۔ بروز قیامت انسان کو اپنا عمل خود نظر آئے گا۔

مَنِ اهۡتَدٰی فَاِنَّمَا يَهۡتَدِيۡ لِنَفۡسِهٖ ۚ ۱۵۔ جو ہدایت حاصل کرتا ہے وہ اپنے لیے ہدایت

---

[۱] ۷۴ مدثر: ۳۸ [۲] ۱۸ کہف: ۴۹ [۳] ۶۶ تحریم: ۷

وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ؕ وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِیۡنَ حَتّٰی نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا ۝

حاصل کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ اپنے ہی خلاف گمراہ ہوتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور جب تک ہم کسی رسول کو مبعوث نہ کریں عذاب دینے والے نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنِ اهۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَهۡتَدِیۡ لِنَفۡسِهٖ: جب انسان کے اعمال اس کے گلے کا ہار ہیں جو ہمیشہ اس کے ساتھ چسپاں اور آویزاں رہتا ہے تو اس کا لازمہ یہ ہوا کہ اگر انسان ہدایت حاصل کرتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا وہ ہدایت و راہنمائی کرنے والوں پر کوئی احسان نہیں کرتا۔ اگر گمراہی اختیار کرتا ہے تو اس کا ضرر خود اٹھائے گا کسی اور کا کچھ نہیں بگڑتا۔

۲۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی: انسان اپنے عمل کا خود ذمے دار ہے۔ اس ذمے داری میں اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ اللہ کی عدالت میں یہ ناممکن ہے کہ دوسروں کے عمل کی ذمے داری اس پر ڈال دی جائے یا اس کا بار گناہ کسی اور پر ڈال دیا جائے۔ لہٰذا ہر شخص کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

البتہ اچھی روایت قائم کرنے والے کو اس پر عمل کرنے والوں کا ثواب ملے گا اور گمراہی لانے والے پر اس گمراہی میں جانے والوں کا وبال بھی آئے گا لیکن یہاں اس بات پر توجہ رہے کہ سنت حسنہ رائج کرنے کا ثواب ملے گا، نہ یہ کہ اس پر عمل کرنے والے کا ثواب اس کو ملے گا۔ اسی طرح گمراہی پھیلانے کا گناہ ہو گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گمراہ ہونے والا خود ذمے دار نہ ہو، صرف گمراہی پھیلانے والا ذمے دار ہو۔

۳۔ وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِیۡنَ: اللہ جب تک اپنے رسولوں کے ذریعے بندوں پر حجت پوری نہیں کرتا، عذاب نہیں دیتا۔ یہ انصاف نہیں ہے کہ پیغام پہنچائے بغیر بندوں کو عذاب دے۔ عذاب اس وقت دیا جائے گا کہ جب اللہ کا پیغام پہنچنے کے بعد منہ موڑا ہو۔

اہم نکات

۱۔ انسان کو دوسروں کے اعمال پر نظر رکھنے کی جگہ اپنے اعمال پر نظر رکھنی چاہیے۔

۲۔ اتمام حجت کے بعد انحراف کی صورت میں عذاب ہو گا۔

وَ اِذَاۤ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نُّہۡلِکَ قَرۡیَۃً اَمَرۡنَا مُتۡرَفِیۡہَا فَفَسَقُوۡا فِیۡہَا فَحَقَّ عَلَیۡہَا الۡقَوۡلُ فَدَمَّرۡنٰہَا تَدۡمِیۡرًا ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اور جب ہم کسی بستی کو ہلاکت میں ڈالنا چاہتے ہیں تو اس کے عیش پرستوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس بستی میں فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں، تب اس بستی پر فیصلہ عذاب لازم ہو جاتا ہے پھر ہم اسے پوری طرح تباہ کر دیتے ہیں۔

تشریح کلمات

مُتۡرَفِیۡہَا: (ت ر ف) الترفۃ عیش و عشرت میں فراخی اور وسعت کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے اترف فلان فھو مترف۔ وہ آسودہ حال اور کثرت دولت کی وجہ سے بدمست ہے۔

تفسیر آیات

جب کسی قوم پر تباہی آنے والی ہوتی ہے تو پہلے اس تباہی کے قدرتی اسباب و محرکات وجود میں آتے ہیں۔ قرآن کے مطابق ہر قوم پر تباہی اس کے مترفین، مراعات یافتہ طبقے کی طرف سے آتی ہے۔ یہ طبقہ خواہشات پرستی میں بدمست ہوتا ہے۔ اس لیے وہ انسانی اور اخلاقی قدروں کو نہیں جانتا۔ وہ تمام تر وسائل اور سہولیات کو اپنا حق تصور کرتا ہے اور محروم طبقے کے حقوق کا ادراک نہیں کرتا۔ وہ حقوق جن کے بغیر معاشرہ قائم نہیں رہتا۔ یہاں سے باہمی بقاء کا توازن بگڑ جاتا ہے اور اقوام ہلاکت میں پڑ جاتی ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّصِیۡبَہُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِہِمۡ ...[1]

اگر یہ منہ پھیر لیں تو جان لیجیے کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کے سبب انہیں مصیبت میں مبتلا کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے ....

سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ جب کسی معاشرے کا خوشحال طبقہ فسق و فجور پر اتر آئے اور ظلم و ناانصافی کو روا رکھے تو پورا معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ جب دولت اور اقتدار خیانت کاروں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے اور ظلم و ناانصافی اور فسق و فجور کو روکنے والا کوئی نہ ہو تو اس قوم کا تباہ ہونا قدرتی بات ہے۔

لہٰذا ان قدرتی اسباب و علل کے اثرات مرتب ہونے پر ارادہ خدا ازل سے قائم ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ فسق و فجور کا حکم نہیں دیتا۔ ایسا نہ تشریعاً ممکن ہے نہ تکویناً۔ تکویناً ایسا ممکن نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فسق و فجور کے اسباب و علل فراہم کرنے میں اللہ پہل نہیں کرتا۔ جب بندے ظلم و سرکشی کے مرتکب ہوتے ہیں تو اس کے اثرات مرتب ہونے کی راہ میں اللہ کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا بلکہ ان کے گناہوں کی پاداش میں

[1] ۵ مائدہ: ۴۹

ایسا ہونے دیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ارادہ الٰہی طبیعی اسباب و علل کے ساتھ نافذ ہوتا ہے۔

۲۔ انسانی معاشروں کی تباہی اس کے خوشحال طبقے کی طرف سے آتی ہے۔

۳۔ دولت اور عیش پرستی فسق و فجور کا سرچشمہ ہے۔

وَ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡۢ بَعۡدِ نُوۡحٍ ؕ وَ کَفٰی بِرَبِّکَ بِذُنُوۡبِ عِبَادِہٖ خَبِیۡرًۢا بَصِیۡرًا ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اور نوح کے بعد کتنی نسلوں کو ہم نے ہلاکت میں ڈال دیا اور آپ کا رب ہی اپنے بندوں کے گناہوں پر آگاہی رکھنے، نگاہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

تفسیر آیات

تاریخ عالم کا آغاز نوح علیہ السلام کے بعد ہوا۔ نوح علیہ السلام کے بعد ہی انسان نے تمدن میں قدم رکھا اور فطری تقاضوں سے انسان میں انحراف آیا۔ نوح علیہ السلام سے پہلے کے انسان، فطری تقاضوں کے مطابق چلتے تھے۔ ان میں انحراف نہیں تھا۔ اسی لیے ان کو شریعت کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

نوح علیہ السلام کے بعد انسان نے فطری تقاضوں سے انحراف کیا تو انہیں دوبارہ فطری تقاضوں کی طرف واپس کرنے کے لیے قانون یعنی شریعت کی ضرورت پیش آئی:

شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا ...۱ — اس نے تمہارے لیے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔

اور انہی انحرافات کی پاداش میں نوح علیہ السلام کے بعد کی نسلیں ہلاک ہوئیں۔

اہم نکات

۱۔ تاریخ، شریعت اور انحراف، نوح علیہ السلام کے بعد شروع ہوا۔

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعَاجِلَۃَ عَجَّلۡنَا لَہٗ فِیۡہَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِیۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا

۱۸۔ جو شخص عجلت پسند ہے تو ہم جسے جو چاہیں اس دنیا میں اسے جلد دیتے ہیں پھر ہم نے اس

---
۱ ۴۲ شوریٰ: ۱۳

لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝١٨
کے لیے جہنم کو مقرر کیا ہے جس میں وہ مذموم اور راندۂ درگاہ ہو کر بھسم ہو جائے گا۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝١٩
۱۹۔ اور جو شخص آخرت کا طالب ہے اور اس کے لیے جتنی سعی درکار ہے وہ اتنی سعی کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو ایسے لوگوں کی سعی مقبول ہو گی۔

تشریح کلمات

يَصْلٰىهَا: (ص ل ی) الصلی۔ آگ جلانے کے معنوں میں ہے۔ کہا جاتا ہے صلیت الشاۃ میں نے بکری کو آگ پر بھون لیا۔

مَّدْحُوْرًا: (د ح ر) الدحر کے معنی دھتکار دینے اور دور کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ: یہ اس شخص کا ذکر ہے جو صرف طالب دنیا ہو اور آخرت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ ایسے شخص کے لیے فرمایا: جو شخص عجلت پسند ہو ہم بھی عجلت سے دے دیتے ہیں یہ اس کے لیے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔

لیکن اگر کوئی آخرت کے لیے کھیتی کے عنوان سے طالب دنیا ہو تو یہ مذموم نہیں بلکہ دنیا سعادت اخروی کے لیے بہترین ذریعہ ہے۔ انبیاء، صلحاء و متقی لوگوں نے اسی دنیاوی زندگی سے عند اللہ مقام بنایا ہے۔ چنانچہ دوسرے جملے میں فرمایا:

۲۔ : وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ: اور جو شخص طالب آخرت ہو اور اس کے لیے مطلوبہ سعی بھی کرتا ہے تو اس کی اس سعی کی قدر دانی ہو جائے گی۔ ظاہر ہے یہ سعی اسی دنیاوی زندگی میں کرنا ہے۔ البتہ اس سعی کے ساتھ ایمان کا ہونا شرط ہے۔ اگر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرہ نہ ہو تو سعی بھی وجود میں نہیں آئے گی۔

اہم نکات

۱۔ دنیا پرستوں کے لیے دنیا کا مل جانا ضروری نہیں ہے۔ کچھ لوگ خسر الدنیا و الآخرہ ہوتے ہیں: لِمَنْ نُّرِيْدُ ....

۲۔ صرف ارادہ آخرت کافی نہیں بلکہ سعی بھی ضروری ہے۔ جب کہ طالب آخرت کے لیے آخرت کا ملنا ضروری ہے: كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا اور دنیا بھی مل جایا کرتی ہے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝۲۰

۲۰۔ ہم (دنیا میں) ان کی بھی اور ان کی بھی آپ کے پروردگار کے عطیے سے مدد کرتے ہیں اور آپ کے پروردگار کا عطیہ (کسی کے لیے بھی) ممنوع نہیں ہے۔

تشریح کلمات

مَحْظُوْرًا: (ح ظ ر) الحظر کے معنی کسی چیز کو احاطہ میں جمع کرنے کے ہیں اور ممنوع کو محظور کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی نظام نہایت غیر جانبدار ہے۔ پانی، خاک، ہوا، دھوپ سے مؤمن اور کافر دونوں یکساں طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں اور یکساں طور پر ان پر ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

اکثر لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں: کیا وجہ ہے کہ مسلمان حق پر ہونے کے باوجود پسماندہ اور باطل قوتیں ترقی یافتہ ہیں؟

جواب یہی ہے کہ فیزیکل قوانین بالکل غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک کافر زرخیز زمین پر ایک پودا لگاتا ہے جس کے لیے مناسب پانی، دھوپ، کھاد میسر ہے۔ دوسری طرف ایک تہجد کا پابند مؤمن بھی ایک پودا لگاتا ہے مگر نہ زمین زرخیز ہے، نہ مناسب پانی، دھوپ اور کھاد میسر ہے۔ اس صورت میں مؤمن کا پودا اس لحاظ سے کامیاب نہیں رہے گا کہ اس کا لگانے والا مؤمن ہے اور تہجد کا پابند ہے کیونکہ اس پودے کی کامیابی کے لیے تسبیح و نماز کی نہیں، کھاد اور پانی کی ضرورت ہے۔

اہم نکات

۱۔ دنیا میں مؤمن اور کافر دونوں یکساں طور پر عطیہ الٰہی سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝۲۱

۲۱۔ دیکھ لیجیے: ہم نے کس طرح ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور آخرت تو درجات کے اعتبار سے زیادہ بڑی اور فضیلت کے اعتبار سے بھی زیادہ بڑی ہے۔

تفسیر آیات

دنیا میں محنت اور کوشش کی بنا پر بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے۔ جو زیادہ محنت کرتا ہے اس کے پاس زیادہ مال و دولت ہوتی ہے۔ اسی سے آخرت کا حال بھی قابل فہم ہو جاتا ہے کہ وہاں بھی سعی اور کوشش یعنی عمل ہی کے ذریعے بعض کو فوقیت حاصل ہو گی مگر دنیا میں مال و جاہ میں جو برتری حاصل ہوا کرتی ہے اس سے آخرت کی فضیلت بہت زیادہ ہے۔ دنیا کا مال و دولت، جاہ و سلطنت ناپائیدار، آخرت کے درجات و فضیلت ابدی اور دائمی ہے اور آخرت کے درجات صرف رضائے رب سے حاصل ہوتے ہیں۔ وَرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ...[1] اللہ کی خوشنودی کس قدر عظیم ہے؟ یہ ہمارے فہم و ادراک سے باہر ہے۔

اہم نکات

ا۔ عمل سے ہی دنیا و آخرت کے درجات میں تفاوت آتا ہے۔

لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنا ورنہ تو مذموم اور بے یار و مددگار ہو کر بیٹھ جائے گا۔

تفسیر آیات

اس کائنات کے سرچشمہ قوت کے ساتھ کسی ایسی چیز کو سرچشمہ طاقت قرار دیا جائے جس کی کوئی حقیقت نہ ہو تو دو باتیں اس کے لازمہ کے طور پر سامنے آتی ہیں:

i۔ یہ عمل خود اپنی جگہ قابل مذمت ہے کہ کسی لاشیء کو خدائے قہار کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے۔

ii۔ مصدر طاقت و قوت اور سرچشمہ فیض سے محرومی کا بھی سبب بنے گا کیونکہ جب وہ کسی لاشیء کو سرچشمہ فیض قرار دیتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ محرومیت اور بے یار و مددگار رہنا ہے۔

اہم نکات

ا۔ شرک کا لازمہ محرومیت ہے۔

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ؕ اِمَّا یَبۡلُغَنَّ

۲۳۔ اور آپ کے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور والدین

---

[1] ۹ توبۃ: ۷۲ اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر ہے۔

عِنۡدَکَ الۡکِبَرَ اَحَدُہُمَاۤ اَوۡ کِلٰہُمَا فَلَا تَقُلۡ لَّہُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنۡہَرۡہُمَا وَ قُلۡ لَّہُمَا قَوۡلًا کَرِیۡمًا ﴿۲۳﴾

کے ساتھ نیکی کرو اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے پاس ہوں اور بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف تک نہ کہنا اور انہیں نہ جھڑکنا بلکہ ان سے عزت و تکریم کے ساتھ بات کرنا۔

وَ اخۡفِضۡ لَہُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَۃِ وَ قُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡہُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیۡ صَغِیۡرًا ﴿ؕ۲۴﴾

۲۴۔ اور مہر و محبت کے ساتھ ان کے آگے انکساری کا پہلو جھکائے رکھو اور دعا کرو: پروردگارا! ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے) پالا تھا۔

تشریح کلمات

قَضٰی: (ق ض ی) القضاء کے معنی قولاً یا عملاً کسی کام کا فیصلہ کر دینے کے ہیں۔

اُفٍّ: (ا ف ف) الافّ اصل میں ہر گندی اور قابل نفرت چیز کو کہتے ہیں۔ میل کچیل، ناخن کا تراشا وغیرہ۔

تَنۡہَرۡ: (ن ھ ر) اَلنَّھرُ و الانتھار۔ سختی سے جھڑکنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا: آیت میں قَضٰی اس امر کے لیے استعمال ہوا ہے جو زیادہ لازم اور واجب ہے۔ ابن عباس، ابن مسعود اور ابی بن کعب کی قرائت کے مطابق قَضٰی کی جگہ وصّیٰ ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں: اصل میں وَوَصّیٰ تھا۔ پھر دو واو میں ایک واو وصّیٰ کے صاد کے ساتھ مل گئی تو لوگوں نے قضیٰ سمجھا ہے۔ اس زمانے میں حروف پر نقطے نہیں ہوتے تھے۔ ابن عباس کہتے ہیں:

اذ لو کان علی القضاء ما عصی احد۔ اگر لفظ قضاء ہوتا تو اللہ کی کوئی نافرمانی نہ کرتا۔

ابن عباس کا مطلب یہ ہے کہ لفظ قضیٰ حکم تکوینی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اللہ کے حکم تکوینی کی نافرمانی نہیں ہو سکتی۔ نافرمانی حکم تشریعی میں ہوتی ہے۔[1]

۲۔ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا: جس طرح والدین بڑھاپے میں اولاد کے احسان کے محتاج ہوتے ہیں، اولاد کو بھی بچپنے میں والدین کی توجہ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کو تکوین و فطرت کے ذریعے پورا کیا کہ والدین کے دل میں اولاد کی محبت اس طرح ودیعت فرمائی کہ وہ اپنی جان سے بھی زیادہ اولاد کو عزیز سمجھتے ہیں۔ حفظ و بقائے نوع انسانی کے لیے ضروری تھا کہ انسان کے دل

---

[1] تفسیر قرطبی۔ ذیل آیہ

میں اولاد کی محبت اس قدر جاگزین ہو کہ وہ اولاد سے دست بردار نہ ہو سکے۔ اگر یہ عمل فطرت کے حوالے نہ ہوتا اور تشریع و قانون کے ذریعے والدین کو حکم ملتا کہ اپنی اولاد پر شفقت کریں تو اس پر باقی احکام کی طرح عمل کم ہوتا اور بقائے نوع انسانی خطرے میں پڑ جاتی۔

جب کہ والدین پر احسان کو توحید کے بعد اہم ترین قانون اور دستور الٰہی قرار دیا کیونکہ انسان فطرتاً آنے والی نسل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اولاد والدین کے احسانات کو فراموش کرتی ہے۔ اس لیے اولاد والدین کو وہ مہر و محبت نہیں دے سکتی جو انہوں نے انہیں بچپنے میں دی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس قانون کو اپنی عبادت کے بعد اہم ترین قرار دے کر فرمایا:

i۔ اِمَّا یَبۡلُغَنَّ: ان پر احسان کرو۔ وہ عالم ضعف و پیری میں احسان کے محتاج ہوتے ہیں۔

ii۔ فَلَا تَقُلۡ لَّہُمَاۤ اُفٍّ: ان کو اف تک نہ کہو۔ ان کی خدمت خندہ پیشانی کے ساتھ انجام دیا کرو۔ آداب کے دائرے سے اُف کی حد تک بھی تجاوز نہ کرو۔

۳۔ وَّلَا تَنۡہَرۡہُمَا: ان کو جھڑکو نہیں۔ ان کے مطالبات کو فراخدلی سے پورا کرو۔

۴۔ وَقُلۡ لَّہُمَا قَوۡلًا کَرِیۡمًا: ان سے گفتگو کرو تو عزت و تکریم کے ساتھ۔ یہ ساری باتیں انسان کے امکان میں ہیں۔

۵۔ وَاخۡفِضۡ لَہُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ: والدین کے سامنے تواضع کے ساتھ پیش آؤ۔ ایسی تواضع جس کا سرچشمہ مِنَ الرَّحۡمَۃِ مہر و وفا ہو۔

۶۔ وَقُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡہُمَا: اللہ سے دعا کرو: پروردگارا! ان پر رحم کر جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا ہے۔ جو مہر و شفقت والدین نے بچپن میں اولاد کو دی ہے وہ اولاد والدین کو نہیں دے سکتی۔ لہٰذا یہ نہیں فرمایا کہ تم اپنے والدین پر اسی طرح احسان کرو جس طرح وہ بچپن میں تمہاری پرورش کرتے تھے بلکہ اللہ سے درخواست کرو: وَقُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡہُمَا ...۔

روایت ہے کہ جب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

الاِحْسَانُ اَنْ تُحْسِنَ صُحْبَتَهُمَا وَ لَا تُكَلِّفَهُمَا اَنْ يَسْئَلَاكَ شَيْئاً هُمَا يَحْتَاجَانِ اِلَيْهِ وَ اِنْ كَانَا مُسْتَغْنِيَيْنِ أَ لَيْسَ اللّٰهُ يَقُولُ: لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ... وَ اَمَّا قَوْلُهُ اِمَّا يَبۡلُغَنَّ عِنۡدَکَ الۡکِبَرَ اَحَدُہُمَاۤ اَوۡ کِلٰہُمَا	والدین پر احسان سے مراد یہ ہے کہ ان دونوں کے ساتھ احسن طریقہ سے رہنا کہ ان کو تجھ سے اپنی ضرورت کی کسی چیز کا سوال کرنے کی نوبت نہ آئے خواہ وہ دونوں بے نیاز ہی کیوں نہ ہوں۔ کیا اللہ نے نہیں فرمایا: تم نیکی کی منزل پر فائز نہیں ہو سکتے جب ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم پسند

فَلَاتَقُلۡ لَّهُمَاۤ اُفٍّ قَالَ: اِنْ اَضْجَرَاكَ فَلَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَّلَاتَنْهَرْهُمَا اِنْ ضَرَبَاكَ.... الآخر [1]

کرتے ہواور اگر والدین تمہیں تنگ کریں تو اف تک نہ کہو اور اگر وہ تمہیں ماریں تو انہیں مت جھڑکو....

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اَدْنَى الْعُقُوقِ اُفٍّ۔ وَ لَو عَلِمَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ شَيْئاً اَهْوَنَ مِنْهُ لَنَهَى عَنْهُ۔ [2]

کم ترین عاق اف کرنا ہے۔ اگر اس سے کمتر کوئی چیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی منع فرماتا۔

اہم نکات

۱۔ الٰہی انسان، فطرت کے تحت اولاد سے محبت اور شریعت کے تحت والدین پر احسان کرتا ہے۔

۲۔ اسلام انسانی قدروں (والدین پر احسان) کو توحید کے بعد سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کی فضا میں ایک خوشگوار خاندان تشکیل پاتا ہے۔

رَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِمَا فِىۡ نُفُوۡسِكُمۡ ؕ اِنۡ تَكُوۡنُوۡا صٰلِحِيۡنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلۡاَوَّابِيۡنَ غَفُوۡرًا ﴿۲۵﴾

۲۵۔ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس پر تمہارا پروردگار زیادہ باخبر ہے اگر تم صالح ہوئے تو وہ پلٹ کر آنے والوں کے لیے یقیناً بڑا معاف کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ رَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِمَا فِىۡ نُفُوۡسِكُمۡ: اگر والدین کے بارے میں مذکورہ ہدایات میں سے کسی بات پر عمل کرنے میں کوتاہی سرزد ہو جائے تو اس کوتاہی کا محرک اللہ کے علم میں ہے۔ اگر یہ کوتاہی خبث باطنی کا نتیجہ نہ ہو

۲۔ اِنۡ تَكُوۡنُوۡا صٰلِحِيۡنَ: اور تم بنیادی طور پر صالح ہو، پھر یہ کوتاہی سرزد ہو جائے اور لِلۡاَوَّابِيۡنَ احساس ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرو تو ایسی کوتاہیوں کو اللہ معاف فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ صالح افراد کی کوتاہی قابل عفو ہے۔

وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ

۲۶۔ اور قریبی ترین رشتہ داروں کو ان کا حق دیا

---

[1] مستدرک ۱۵: ۱۷۳ باب وجوب بر والدین [2] الکافی ۲: ۳۴۸ باب العقوق

وَابۡنَ السَّبِیۡلِ وَلَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِیۡرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ کَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ ؕ وَکَانَ الشَّیۡطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوۡرًا ﴿۲۷﴾

کرو اور مساکین اور مسافروں کو بھی اور فضول خرچی نہ کیا کرو۔

۲۷۔ فضول خرچی کرنے والے یقیناً شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔

تشریح کلمات

الۡمُبَذِّرِیۡنَ: (ب ذ ر) التبذیر کے معنی پراگندہ کرنے اور بکھیرنے کے ہیں۔ بطور استعارہ مال ضائع کرنے کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔

تفسیر آیات

والدین پر احسان کے حکم کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے اسلام نے جن کے حقوق متعین کیے ہیں۔ وہ قریبی رشتے دار، مساکین اور مسافر ہیں۔

۱۔ ذَاالۡقُرۡبٰی: خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے لہٰذا ذَاالۡقُرۡبٰی کے اولین مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی رشتے دار ہیں تاہم آیت کا مفہوم وسیع ہے اور تمام رشتے داروں کو شامل کرتا ہے۔

۲۔ الۡمِسۡکِیۡنَ: مساکین کے بارے میں گزشتہ آیات میں تفصیل کے ساتھ ذکر آ چکا ہے۔ البقرۃ: ۸۳، ۱۷۷ ملاحظہ فرمائیں۔

۳۔ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ: راہماندہ مسافروں کے لیے اسلامی نظام میں مستقل فنڈ کا اہتمام ہے۔

مذکورہ بالا مصارف کے تعین کا مطلب یہ ہے کہ مادی اقدار کا تعلق انسانی قدروں کے ساتھ ہے۔ مصرف اگر قریبی رشتے دار، مساکین اور راہ ماندہ مسافر ہیں تو ان کا حق ادا کرنا واجب ہے۔ اگر مصرف انسانی اور الٰہی قدروں کے خلاف ہو تو وہ تبذیر و اسراف ہے۔

اسراف اور تبذیر میں فرق: اگر کسی مال کا مصرف اصولاً درست ہے مگر اس پر ضرورت سے زیادہ خرچ ہوتا ہے تو یہ اسراف ہے۔ مثلاً گھر انسانی ضرورت ہے مگر اس پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے۔

جبکہ تبذیر میں اس کا مصرف اصولاً درست نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً فسق و فجور اور ریاکاری پر خرچ کرنا، اسی طرح کتوں، بلیوں اور جوئے پر خرچ کرنا تبذیر ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

مَنْ اَنْفَقَ شَیْئاً فِی غَیْرِ طَاعَۃِ اللّٰہِ فَھُوَ مُبَذِّرٌ ...[۱]
جو شخص اپنا مال اطاعت الٰہی کے علاوہ دیگر جگہوں پر خرچ کرے، وہ تبذیر کرنے والا ہے۔

البتہ جہاں تبذیر ہے وہاں اسراف بھی ہے لیکن جہاں اسراف ہے وہاں تبذیر کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:

اَلَا وَ اِنَّ اِعْطَاءَ الْمَالِ فِی غَیْرِ حَقِّہٖ تَبْذِیرٌ وَ اِسْرَافٌ ...[۲]
واضح رہے کہ ناحق جگہ پر مال خرچ کرنا تبذیر اور اسراف ہے۔

شیطان کا بھائی: مال، اطاعت الٰہی کا بہترین ذریعے ہے۔ اس ذریعے کا اتلاف تبذیر ہے اور شیطان کا بنیادی ہدف ذرائع کا اتلاف ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو ان ذرائع کو بے مقصد چیزوں پر خرچ کر کے تلف کر دیتے ہیں وہ عمل میں شیطان کے بھائی قرار پاتے ہیں۔

تبذیر کا المیہ: ہمارے معاصر اخوان الشیاطین کی تبذیر نہایت وحشتناک ہے۔ یہ لوگ اپنے شیطانی حربوں سے تیسری دنیا کا استحصال کر کے جو دولت حاصل کرتے ہیں اسے بے دردی سے لغویات پر خرچ کرتے ہیں۔ جس دنیا کا استحصال کرتے ہیں اس میں کروڑوں انسانوں کو بھوکا رکھتے اور نہایت بے شرمی سے انسانی حقوق کے علمبردار بنتے ہیں۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق صرف امریکہ میں اس سال (2011ء) کتوں اور بلیوں پر اٹھنے والے اخراجات ۴۱ بلین ڈالر سالانہ ہیں۔ اگلے دو سالوں میں یہ اخراجات ۵۲ بلین ڈالر سالانہ تک ہوں گے۔ دیگر یورپین ممالک میں اٹھنے والے اخراجات اس کے علاوہ ہیں جو افریقی غریب ممالک کے بھوکے انسانوں کی ضروریات سے زیادہ ہیں۔ ان اخوان الشیاطین کے بارے میں شاعر کا یہ قول صادق آتا ہے:

وکان فتی من جند ابلیس فارتقی
به الحال حتی صار ابلیس من جنده

یہ شخص کبھی ابلیس کا سپاہی تھا اب ترقی اس حد تک مل
گئی ہے کہ ابلیس اس کا سپاہی ہوگیا ہے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے ایک شامی سے پوچھا: کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟
اس نے کہا: ہاں
فرمایا: کیا تم نے سورہ بنی اسرائیل میں یہ آیت پڑھی ہے: وَاٰتِ ذَاالۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ ....
اس نے کہا: کیا ذَاالۡقُرۡبٰی سے آپ لوگ مراد ہیں جن کا حق دینے کا اللہ نے حکم کیا ہے۔
فرمایا: ہاں۔[۳]

---

[۱] مستدرك الوسائل ۱۵: ۲۶۹   [۲] نہج البلاغة خ ۱۲۶   [۳] الدر المنثور

حدیث ہے:

لما نزلت هذه الاية وَاٰتِ ذَاالۡقُرۡبٰی حَقَّهٗ دعا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله و سلم فاطمة فاعطاها فدك۔

جب آیت وَاٰتِ ذَاالۡقُرۡبٰی حَقَّهٗ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فاطمہ (س) کو بلایا اور اور انہیں فدک عنایت فرمایا۔

اس حدیث کو ابن عباس، ابو سعید خدری اور خود حضرت علی علیہ السلام نے روایت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو مجمع الزوائد حدیث ۴۹۷۔ میزان الاعتدال ۲: ۲۲۸۔ منتخب کنزالعمال۔ شواھد التنزیل ۱: ۴۴۲۔ الدرالمنثور ذیل آیت۔

علی بن طاؤس سعد السعود صفحہ ۱۰۲ میں لکھتے ہیں: محمد بن العباس، جو ابن الحجام مشہور ہیں، نے حدیث فدک کو بیس (۲۰) طرق سے روایت کیا ہے۔ اس سلسلے میں مزید تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو: سید مرتضیٰ علم الھدیٰ کی کتاب الشافی۔ بحاالانوار ۲۹: ۲۰۵۔ سیرت امیر المؤمنین (ع) اور الغدیر ۷: ۱۹۰۔ ۸: ۱۳۷۔

اہم نکات

۱۔ مالی حقوق ادا کرنے والے شیطان سے دور ہیں۔

۲۔ اقتصادی قوت کا اتلاف شیطانی عمل ہے۔

وَاِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡهُمُ ابۡتِغَآءَ رَحۡمَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ تَرۡجُوۡهَا فَقُلۡ لَّهُمۡ قَوۡلًا مَّیۡسُوۡرًا ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور اگر آپ اپنے پروردگار کی رحمت کی تلاش میں جس کی آپ کو امید بھی ہو ان لوگوں کی طرف توجہ نہ کر سکیں تو ان سے نرمی کے ساتھ بات کریں.

تفسیر آیات

اگر کوئی آپ سے سوال کرے اور اس کو دینے کے لیے آپ کے پاس کچھ نہ ہو، تلاش رحمت خدا (رزق) میں مصروف ہوں تو نفی میں جواب دیتے ہوئے اخلاقی قدروں کا پاس کرنا ضروری ہے۔ اگر آپ کے پاس سائل کو دینے کے لیے کچھ نہ ہو تو نرم کلامی کے ساتھ اس کو جواب دیں۔

کیونکہ مادی قدروں سے انسانی قدریں کہیں زیادہ اہم ہیں:

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَیۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ یَّتۡبَعُهَاۤ اَذًی ....[۱]

نرم کلامی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد (خیرات لینے والے کو) ایذا دی جائے....

----

[۱] ۲ بقرۃ: ۲۶۳

وَلَا تَجۡعَلۡ یَدَکَ مَغۡلُوۡلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبۡسُطۡہَا کُلَّ الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا ﴿۲۹﴾

۲۹۔ اور نہ تو آپ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ کر رکھیں اور نہ ہی اسے بالکل کھلا چھوڑ دیں، ورنہ آپ ملامت کا نشانہ اور تہی دست ہو جائیں گے۔

تفسیر آیات

ہاتھ باندھنا بخل اور اسے کھلا چھوڑنا فضول خرچی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ آیت سابقہ آیات میں موجود احکام کا خلاصہ اور نتیجہ ہے جن میں مصارف مال کا تعین اور اسراف و تبذیر سے منع فرمایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انفاق کے بارے میں نہ تو بخل کرنا چاہیے، نہ ہی اسراف و تبذیر۔ دونوں صورتوں میں انسان ملامت کا نشانہ بنتا ہے۔

ہم نے وَلَا تَبۡسُطۡہَا کُلَّ الۡبَسۡطِ کی تفسیر اسراف سے اس لیے کی ہے اگر حقوق کی ادائیگی اور جائز مصارف میں انسان اپنا سارا مال و متاع دے دے تو یہ ایثار قابل ملامت نہیں ہے۔ ثانیاً دوسری آیت اس تفسیر کی تائید کرتی ہے:

وَالَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ یُسۡرِفُوۡا وَلَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَکَانَ بَیۡنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ۝[1]

اور یہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں بلکہ ان کے درمیان اعتدال رکھتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ تمام امور میں اعتدال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَقۡدِرُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیۡرًۢا بَصِیۡرًا ﴿۳۰﴾

۳۰۔ یقیناً آپ کا رب جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ اور تنگ کر دیتا ہے، وہ اپنے بندوں کے بارے میں یقیناً نہایت باخبر، نگاہ رکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

رزق کی کشادگی اور ایک اندازے سے محدود رکھنا بندوں کی استعداد اور استحقاق کے مطابق ہے۔ کسی کے رزق میں بعنوان رحمت، کشادگی یا تنگی فرماتا ہے۔ کسی کے رزق میں بعنوان عذاب و نقمت کشادگی فرما کر اسے دنیا میں ہی سب کچھ دے دیتا ہے اور آخرت میں اسے ہر چیز سے محروم کر دیتا ہے۔

----

[1] ۲۵ فرقان: ۶۷

اہم نکات

۱۔ بخیل اور مسرف کے رزق کی فراوانی اس کے لیے سزا ہے۔

وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ خَشۡیَۃَ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُہُمۡ وَ اِیَّاکُمۡ ؕ اِنَّ قَتۡلَہُمۡ کَانَ خِطۡاً کَبِیۡرًا ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اور تم اپنی اولاد کو تنگ دستی کے خوف سے قتل نہ کیا کرو، ہم انہیں رزق دیں گے اور تمہیں بھی، ان کا قتل یقیناً بہت بڑا گناہ ہے۔

تفسیر آیات

یہ آیت واضح طور پر ان اقتصادی اصولوں کو بے بنیاد قرار دے رہی ہے جن کے تحت قدیم زمانے سے آج تک نسل کی آفزائش کو اقتصادی بدحالی کا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ محسوس پرست لوگ ہمیشہ محسوسات کو پیمانہ بناتے ہیں۔ وہ اس بات کی توجیہ کرنے سے قاصر ہیں کہ ہر متنفس اپنا رزق لے کر آتا ہے۔ وہ اس نکتے کو نہیں سمجھ سکتے کہ گھر میں مہمان زیادہ آنے سے رزق میں اضافہ کیسے ہوتا ہے؟ انسان سخاوت کرتا ہے تو اس کے رزق میں فراوانی کیسے آتی ہے؟ اسی طرح آبادی بڑھنے سے معاشی وسائل میں اضافہ کیسے ہوتا ہے؟ اگر وہ اپنے محسوس پیمانے ہی کو معیار قرار دیں تو بھی یہ بات محسوس بھی ہوئی ہے کہ مختلف ملکوں کی آبادی میں جتنا اضافہ ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ ان کے معاشی ذرائع میں اضافہ ہوا ہے۔

ایسے لوگوں کو افزائش نسل روکنے کی بجائے قدرت کی فیاضی پر توجہ دینی چاہیے جو سورج کی صرف ایک منٹ کی تابش سے کرہ ارض کے تمام بسنے والوں کے لیے ایک سال کی ضرورت کی انرجی فراہم کرتی ہے۔ جس کی عطا کردہ دماغی صلاحیت میں سے صرف چند فیصد استعمال میں لائی جاتی ہے۔ جس کی وسیع و عریض زمین میں سے کچھ حصے سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ جس کے عنایت کردہ سمندر اور بارش کے پانی سے کچھ فیصد استفادہ کیا جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے تکوینی نظام میں دخل اندازی ایک بڑی خطا ہے۔

۲۔ اللہ رزق دینے میں بڑا فیاض ہے۔

وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ؕ وَ سَآءَ سَبِیۡلًا ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، یقیناً یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت برا راستہ ہے۔

تفسیر آیات

زنا اس جنسی ملاپ کو کہتے ہیں جس میں زوجیت کا بوجھ اٹھائے بغیر مرد کو اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔عورت کے رحم میں ٹھہرنے والے بچے کا وہ ذمے دار ہوتا ہے اور نہ اس عورت کی عزت و آبرو، زندگی کے مادی وسائل کا تحفظ دیتا ہے۔ وہ غیر ذمے دارانہ طریقے سے اپنی حیوانی شہوت پوری کر کے عورت کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔

یہی جنسی ملاپ اگر باہمی معاہدے اور نتائج کی پوری ذمہ داری اٹھانے کے تحت، ازدواجی حیثیت میں ہو تو اسلام نے اس عمل کو مستحسن اور کبھی واجب قرار دیا ہے۔

زنا ایک ایسا عمل شنیع ہے جس سے نہ صرف انسانی غیرت کی خلاف ورزی ہوتی ہے بلکہ اس سے نسل کشی اور توارث و دیگر حقوق میں بھی خیانت ہوتی ہے۔ زنا ان تمام اقدار کو درہم برہم کر دیتا ہے جن پر خاندان کی تشکیل کا دارومدار ہے۔

اس لیے حکم ہوا کہ زنا کے قریب نہ جاؤ۔ اس کے محرکات اور اسباب سے بھی دور رہو کیونکہ شہوت ایسی چیز ہے جس کے نزدیک ہونے کے بعد اس سے بچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں اس عمل زشت کے قریب جانے سے منع کیا ہے، ساتھ اس کے محرکات پر بھی پابندی لگا دی۔ مثلاً:

i۔ نامحرموں کی طرف نگاہ کرنا منع ہے کیونکہ نگاہ، زنا کے مقدمات میں سرفہرست ہے۔مصری شاعر نے خوب کہا:

نظرة ثم ابتسامة فسلام فكلام فموعد و لقاء

ایک نگاہ پھر ایک تبسم پھر سلام پھر گفتگو پھر ملنے کا وعدہ، آخر میں ملاقات۔

ii۔ پردہ، جس کے تحت عورت پر اظہار تجمل ممنوع ہے۔

iii۔ نامحرم مرد و عورت کا خلوت میں بیٹھنا ممنوع اور حرام ہے۔اسی طرح شراب، موسیقی اور رقص وغیرہ پر بھی پابندی لگا دی۔

جائز طریقہ سے جنسی خواہشات پوری کرنے کی ترغیب۔ مثلاً:

i۔شادی کو سنت رسولؐ اور اس سے روگردانی کو رسولؐ سے روگردانی قرار دیا۔

ii۔قرآن نے شادی کو توسیع رزق کا سبب قرار دیا:

وَاَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَالصّٰلِحِیۡنَ	اور تم میں سے جو لوگ بے نکاح ہوں اور تمہارے غلاموں
مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَاِمَآئِکُمۡ ؕ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا	اور کنیزوں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر
فُقَرَآءَ یُغۡنِہِمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَاللّٰہُ	دو، اگر وہ نادار ہوں تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی

وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ [1] کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا، علم والا ہے۔

iii۔ شادی نہ کرنے والوں کی مذمت کی چنانچہ:

iv۔ جائز طریقے سے اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ازدواجی قوانین کو آسان اور سہل بنایا۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کے لیے الگ قانون وضع کیا جو ازدواجی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ زنا اخلاقی اعتبار سے فحش ہے اور اجتماعی اعتبار سے خاندان، پھر معاشرے کی تشکیل میں انسانی قدروں کو پامال کر دیتا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا ۝۳۳

۳۳۔ اور جس جان کا مارنا اللہ نے حرام کیا ہے تم اسے قتل نہ کرو مگر حق کے ساتھ اور جو شخص مظلوم مارا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو (قصاص کا) اختیار دیا ہے، پس اسے بھی قتل میں حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، یقیناً نصرت اسی کی ہوگی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ: اللہ کی دی ہوئی زندگی کو ناحق ختم کرنا اللہ کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔ جیسا کہ سورہ مائدہ آیت ۳۲ میں

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ....

جس نے کسی ایک کو قتل کیا جب کہ یہ قتل خون کے بدلے میں یا زمین میں فساد پھیلانے کے جرم میں نہ ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا۔

اور سورہ نساء آیت ۹۳ میں جان بوجھ کر ایک مؤمن کے قاتل کو دائمی جہنمی قرار دے دیا۔

۲۔ إِلَّا بِالْحَقِّ: بعض حالات میں قتل، عمومی مصلحت کے تحت جائز ہو جاتا ہے جیسا کہ آیت قصاص میں مشروحاً ذکر ہو گیا اور دیگر موارد میں جو فقہی کتب میں مذکور ہیں۔

۳۔ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا: جو شخص ناحق اور مظلوم مارا جائے تو اس کے ولی الدم کو قانوناً اختیار حاصل ہے کہ وہ قصاص لے یا دیت لے کر معاف کر دے۔ سُلْطَانًا سے مراد یہاں قانونی بالادستی

---

[1] ۲۴ نور: ۳۲

ہے جو مقتول کے خون کے وارث کو حاصل ہے ۔ حکومت کو قصاص لینے یا معاف کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ البتہ وارث حاکم شرع ہی کے ذریعے قصاص لینے کا مجاز ہے، از خود نہیں۔

۴۔ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ: قتل میں اسراف نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ وارث صرف قاتل سے قصاص لینے کا مجاز ہے، اس کے دیگر عزیزوں سے نہیں۔ ایک کے بدلے صرف ایک قصاص میں مارا جائے گا، زیادہ نہیں۔ جیسا کہ انسانی حقوق کا پرچار کرنے والے اپنی قوم کے ایک فرد کا قصاص دوسری پوری قوم سے لیتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اسلام اپنی قانون سازی میں مظلوم کے وارثوں کا حامی ہے: اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقے سے جس میں بہتری ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو، یقیناً عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اور تم ناپتے وقت پیمانے کو پورا کر کے دو اور جب تول کر دو تو ترازو سیدھی رکھو، بھلائی اسی میں ہے اور انجام بھی اسی کا زیادہ بہتر ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾

۳۶۔ اور اس کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں ہے کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان سب سے باز پرس ہوگی۔

تشریح کلمات

لا تقف: (ق ف و) القفا کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ: مال یتیم کے بارے میں سورۃ النسآء آیت نمبر۲ تا ۱۰ میں تفصیل آ

گئی ہے۔ یتیم کے مال کے نزدیک نہ جانے کا مطلب اس پر تصرف ہے۔ اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ میں استثناء اس صورت میں ہے کہ یہ تصرف یتیم کے مال کی حفاظت کے لیے ہو۔ سورۃ الانعام آیت ۱۵۲ میں اس کا ذکر آ چکا ہے۔ حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّہٗ جب وہ بلوغ کو پہنچ جائے اور اپنے مال کا خود تحفظ کر سکے تو مال اس کے حوالے کرنا ہو گا۔

۲۔ وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَہۡدِ: اسلامی تعلیمات میں وفا بعہد، معاہدوں کی پابندی کرنا ایک انسانی مسئلہ ہے۔ دوسرا فریق مسلم ہو یا غیر مسلم، ہر صورت میں معاہدہ توڑنا جائز نہیں ہے جب تک دوسرا فریق نہ توڑے۔

۳۔ وَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ: ناپ تول میں امانتداری کے معاشرے پر بہت بہتر اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ نوے فیصد تک معاملات خرید و فروخت کے ساتھ مربوط ہیں۔ اس میں امانتداری سے معاشرے پر بہتر اثرات مرتب ہوتے ہیں اور خیانت ہونے کی صورت میں معاشرے کی بنیاد ہل جاتی ہے۔ چنانچہ سورۃ المطففین میں مذکور ہے۔

۴۔ وَلَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ: علم، واقع کے قطعی انکشاف کو کہتے ہیں۔ کسی امر پر علم نہ ہونے کی صورت میں تین حالتیں ہیں: ظن، شک اور جہل۔ ان تینوں میں زیادہ قرین واقع ظن ہے۔ اس کے باوجود ظن کے بارے میں قرآن کا یہ موقف ہے:

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡـًٔا ... [1] ظن انسان کو حق (کی ضرورت) سے ذرہ برابر بے نیاز نہیں کرتا...۔

علم چونکہ حقیقت نمائی کرتا ہے لہٰذا ہر حقیقت پسند، علم پسند ہوتا ہے اور جو حقیقت سے چشم پوشی کرتا ہے وہ علم سے کتراتا ہے۔

اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ اسلام علم ہی کو دلیل سمجھتا ہے:

i۔ بنیادی عقائد کے لیے ضروری ہے کہ انہیں علمی دلائل سے سمجھا جائے۔ اس طرح اوہام پرستی کا خاتمہ کر دیا گیا۔

ii۔ قضاوت میں فیصلوں کے لیے یا تو علم ہونا ضروری ہے یا ایسی دلیل، جس کے دلیل ہونے پر علم حاصل ہو۔

iii۔ شہادت کے لیے ضروری ہے کہ علم ہو، ظن و تخمین کی بنیاد پر گواہی درست نہیں۔

iv۔ اخلاق میں علم کے بغیر ظن و گمان کی بنیاد پر کسی پر الزام لگانا جائز نہیں۔

v۔ فقہی ابواب میں احکام کا نفاذ علم پر موقوف ہے۔ مثلاً کل شیء لك طاهر حتی تعلم انه قذر۔ ہر چیز پاک ہے، اس کی نجاست کا علم حاصل ہونے تک۔ اصالت طہارت۔ علم میں آنے

---

[1] ۱۰ یونس: ۳۶

آنے تک ہر چیز پاک ہے، ایک فقہی کلیہ ہے۔

vi۔ اصول الفقہ میں یہ بات طے ہے کہ دلیل یا علم ہونا چاہیے یا علمی۔ علمی سے مراد وہ دلیل ہے جو بذات خود علم نہیں دیتی لیکن اس کے دلیل ہونے پر علمی دلیل قائم ہے۔ جیسے خبر واحد اور گواہی۔ ان دونوں سے اگرچہ علم و یقین تو حاصل نہیں ہوتا لیکن ان دونوں کے دلیل ہونے پر قطعی علمی دلیل قائم ہے۔

اس طرح اس اسلامی تعلیمات کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی میں علم کو ہی بنیاد قرار دیا گیا اور ظن و گمان پر عمل کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ اس طرح ظن و گمان کی پیروی کرنے سے پیدا ہونے والی تمام خرابیوں سے اسلامی معاشرے کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے تحت علم کے بغیر کسی کے خلاف کوئی قدم اٹھانا جائز نہیں ہے۔ غرض اسلامی نظام حیات میں زندگی کے تمام امور میں علم و یقین کے علاوہ ظن و تخمین اور وہم و گمان کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ علم کسی امر کے حق میں یا خلاف حجت ہے۔ اگر کوئی قدم علم کے بغیر اٹھایا جائے تو اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

۲۔ اِنَّ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ: اگر کوئی عمل یا عقیدہ سننے سے متعلق ہے تو قوت سماعت سے سوال ہو گا کہ کیا علم کے علاوہ ظن و گمان پر تو عمل نہیں کیا۔ اگر یہ عمل یا عقیدہ بصری امور سے متعلق ہے تو قوت بصارت سے سوال ہو گا۔ اگر اس قسم کے نظریے کا قیام، فکر و تعقل سے مربوط ہے تو دل پر سوال آئے گا۔

ان پر سوال اسی لیے ہو گا کیونکہ یہ علم و یقین کے حصول کے ذرائع ہیں اور علم و یقین حاصل ہونے سے پہلے اگر قدم اٹھ گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان ذرائع کا صحیح استعمال نہیں ہوا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلام، صرف علم کو حق تک پہنچنے کا ذریعہ تسلیم کرتا ہے۔
۲۔ علم کے بغیر کسی بات کو تسلیم یا رد کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔
۳۔ تمام حقوق کی پامالی اور ناانصافیاں، غیر علم کو بنیاد بنانے کی وجہ سے رونما ہوتی ہیں۔
۴۔ اکثر کدورتیں، اختلافات، غلط فیصلے غیر علم پر عمل کرنے کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

وَ لَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا ۚ اِنَّکَ لَنۡ تَخۡرِقَ الۡاَرۡضَ وَ لَنۡ تَبۡلُغَ الۡجِبَالَ طُوۡلًا ﴿۳۷﴾	۳۷۔ اور زمین پر اکڑ کر نہ چلو، بلاشبہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ ہی بلندی کے لحاظ سے پہاڑوں تک پہنچ سکتے ہو۔
کُلُّ ذٰلِکَ کَانَ سَیِّئُہٗ عِنۡدَ رَبِّکَ	۳۸۔ ان سب کی برائی آپ کے رب کے نزدیک

مَكۡرُوۡهًا ﴿۳۸﴾ ناپسندیدہ ہے۔

تفسیر آیات

تُو پانچ سے چھ فٹ کی مخلوق اپنی حد میں رہ۔ تو اپنی محدودیت سے نکل نہیں سکتا، نہ زمین کو پھاڑ سکتا ہے، نہ پہاڑوں سے اونچا جا سکتا ہے۔ یہ ایک محسوس مثال ہے کہ جس طرح تو زمین کو پھاڑ کر کچھ زمین کو نیچے کر کے اور پہاڑوں کی بلندیوں تک نہیں جا سکتا، جس طرح تیرے مادی وجود کے لیے ایسا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح تیری شخصیت کا وجود بھی محدود، عاجز، حقیر اور ناتواں ہے۔ جس طرح تو اپنے جسم کے قد و قامت کو بلند نہیں کر سکتا۔ بالکل اسی طرح اپنی شخصیت کا قد اپنی محدودیت سے اونچا نہیں کر سکتا۔

تکبر کرنے والا عموماً اپنی چال میں اپنی بڑائی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ چنانچہ برد باری کا اظہار بھی چال کے ذریعے ہوتا ہے۔

تکبر، نفسیاتی اعتبار سے انسان کی شخصیت میں احساس خلا کے تدارک کی ناکام کوشش ہے۔ جس طرح نیم خواندہ شخص اپنا علمی خلا القاب کے ذریعے پر کرنا چاہتا ہے اسی طرح جس کی شخصیت میں خلا ہو وہ اسے پر کرنے کے لیے تکبر اور اپنی چال کے ذریعے بڑائی کا اظہار کرتا ہے۔ تکبر کا تعلق دوسروں سے بھی ہے۔ متکبر، دوسروں کو اپنے سے زیر اور اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا دکھانا چاہتا ہے۔ تکبر ایک ایسی بیماری ہے جس کے منفی اثرات معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ لوگ تکبر کرنے والوں سے متنفر ہوتے ہیں۔ جس سے باہمی مودت و محبت متاثر ہو جاتی ہے۔

تکبر اجتماعی آداب اور نفسیاتی توازن کے منافی ہے۔ اس لیے متکبر جہاں اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے وہاں وہ لوگوں کے نزدیک بھی منفور ہے۔

اہم نکات

۱۔ زمین اور پہاڑ کے مقابلے میں کمزور انسان کو تکبر کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ ؕ وَلَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلۡقٰى فِىۡ جَهَنَّمَ مَلُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ﴿۳۹﴾

۳۹۔ یہ حکمت کی وہ باتیں ہیں جو آپ کے پروردگار نے آپ کی طرف وحی کی ہیں اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ ورنہ ملامت کا نشانہ اور راندہ درگاہ بنا کر جہنم میں ڈال دیے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤی اِلَیۡكَ: جو بات آپ کو حقیقت اور حق تک پہنچا دے وہ حکمت ہے۔ گزشتہ آیات میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں وہ سب حقائق کی نشاندہی کرنے والی ہیں۔

۲۔ وَلَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا: ان حکمتوں میں سب سے بنیادی حکمت، ان حقائق میں سب سے اہم حقیقت، توحید ہے جو تمام حقائق کا سرچشمہ ہے اور تمام حقائق توحید کے گرد گھومتے ہیں۔

۳۔ اگرچہ خطاب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے لیکن اصل مخاطب ہر انسان ہے۔ قرآن اس قسم کا طرز خطاب اس وقت اختیار کرتا ہے جب موضوع اہمیت کا حامل ہو۔

جیسے کوئی شخص اپنے غلاموں کو ایک اہم ترین حکم دینا چاہتا ہے تو وہ اگر اپنے عزیز بیٹے کو خطاب کر کے کہہ دے کہ اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں تیرا انجام اچھا نہ ہوگا تو غلاموں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ موضوع کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔

اہم نکات

۱۔ احکام دین حکمت آمیز ہیں: اَوۡحٰۤی اِلَیۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ...

۲۔ مشرک رحمت خدا سے دور ہوتا ہے۔

اَفَاَصۡفٰىکُمۡ رَبُّکُمۡ بِالۡبَنِیۡنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنَاثًا ؕ اِنَّکُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ قَوۡلًا عَظِیۡمًا ﴿۴۰﴾

۴۰۔ (اے مشرکین) کیا تمہارے رب نے تم کو بیٹوں کے لیے چن لیا اور خود فرشتوں کو بیٹیاں بنا لیا، بتحقیق تم لوگ بہت بڑی (گستاخی کی) بات کرتے ہو۔

تشریح کلمات

اصفی[۱]: (ص ف و) الصفاء کے اصل معنی کسی چیز کا ہر قسم کی آمیزش سے پاک اور صاف ہونے کے ہیں اور چن لینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تفصیل ملاحظہ ہو سورۃ النحل آیت ۵۷۔

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ ۴۱۔ اور ہم نے اس قرآن میں (دلائل کو) مختلف

لِيَذَّكَّرُوۡا ؕ وَ مَا يَزِيۡدُهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرًا ﴿۴۱﴾

انداز میں بیان کیا ہے تاکہ یہ لوگ سمجھ لیں مگر وہ مزید دور جا رہے ہیں۔

تشریح کلمات

صرف: (ص ر ف) التصریف کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنے یا ایک امر کو دوسرے امر کی طرف تبدیل کرنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اپنی تعلیمات کی تبلیغ و توضیح کے بارے میں قرآن نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ لوگ اگر توحید کو نہیں مانتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ دلیل میں قوت اور اس میں پوری وضاحت نہیں بلکہ قرآن میں توحید پر طرح طرح کے دلائل دیے گئے ہیں اور مختلف اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے لیکن مشرکین کو چونکہ حق کے ساتھ عناد ہے اس لیے وہ ان دلائل سے متاثر ہونے کی بجائے مزید متنفر ہو جاتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دلائل سے مزید متنفر ہوتے ہیں تو دلائل قائم کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب یہ ہے کہ اگرچہ ان دلائل سے چند معاندین کی نفرت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن ان سے ہدایت لینے والے تا قیام قیامت فائدہ لیتے رہیں گے۔ یہاں رخ کلام ان دلائل سے فائدہ نہ اٹھانے والوں کی طرف ہے ورنہ ان دلائل کی افادیت اپنی جگہ ہر شخص کے لیے واضح ہے۔

دوسری وجہ اتمام حجت ہے۔ دلیل و برہان قائم کرنے کا مقصد صرف منوانا نہیں ہے بلکہ حجت قائم کرنا بھی مقصود ہے چونکہ حق بیان کرنے کے بعد سوال آتا ہے، پہلے نہیں۔

اہم نکات

۱۔ قرآن جہاں اہل ایمان کے لیے چراغ راہ ہے وہاں مشرک کے لیے باعث ہلاکت ہے۔

۲۔ اللہ نے تبلیغ کے لیے طاقت نہیں، دلیل استعمال کی ہے۔

قُلۡ لَّوۡ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوۡلُوۡنَ اِذًا لَّابۡتَغَوۡا اِلٰى ذِى الۡعَرۡشِ سَبِيۡلًا ﴿۴۲﴾

۴۲۔ کہد یجیے: اگر اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں تو وہ مالک عرش تک پہنچنے کے لیے راستہ تلاش کرتے۔

سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوۡلُوۡنَ عُلُوًّا

۴۳۔ پاکیزہ اور بالاتر ہے وہ ان باتوں سے جو

كَبِيۡرًا ﴿۴۳﴾　یہ لوگ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

ا۔ قُلۡ لَّوۡ کَانَ مَعَہٗۤ اٰلِـہَۃٌ: توحید پر ایک بیّن دلیل کا ذکر ہے: اگر اللہ کے علاوہ معبود ہوتے تو وہ رَبّ ہونے کی وجہ سے ہوتے۔ مشرکین ان دیوتاؤں کو معبود مانتے ہیں جو ان کے خیال میں ان کی تدبیر حیات میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا معبود کا مطلب مدبّر ہے۔ آیت اس نکتے کو واضح کرنا چاہتی ہے کہ اگر اللہ کے ساتھ کوئی اور مدبّر ہوتا تو وہ صاحب عرش کے مقابلے میں آنے کی ضرور کوشش کرتا۔ اس کی تدبیر صاحب عرش کی تدبیر سے متصادم ہوتی۔ یہاں اِلٰی ذِی الۡعَرۡشِ اس لیے فرمایا ہے کہ عرش اللہ کے مقام تدبیر کا نام ہے۔ چنانچہ ہم نے عرش کی وضاحت بھی میں یہ بات بیان کی ہے۔

اگر تدبیر کائنات میں دوسرے خداؤں کا بھی دخل ہوتا تو ان خداؤں کے ارادوں کا اللہ کے ارادے کے ساتھ تصادم ہوتا اور نظم کائنات درہم برہم ہو جاتا۔ جب کہ اس کائنات کی تمام موجودات میں ایک ہی قدرت کے نشانات نظر آتے ہیں۔ کائنات کا وحدت نظام اس کے مدبّر کی وحدت کی علامت ہے۔

اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ المؤمنون آیت ۹۱۔ سورۃ الانبیاء آیت ۲۲۔

اہم نکات

۱۔ کائنات میں ہم آہنگی ایک ہی ارادے کی علامت ہے۔

۲۔ اللہ کا عرش سلطنت، ناقابل نزاع ہے۔

تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِیۡہِنَّ ؕ وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَہُوۡنَ تَسۡبِیۡحَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیۡمًا غَفُوۡرًا ﴿۴۴﴾

۴۴۔ ساتوں آسمان اور زمین اور ان میں جو موجودات ہیں سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو، اللہ یقیناً نہایت بردبار، معاف کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ تُسَبِّحُ لَہُ: تسبیح، تنزیہ الٰہی بیان کرنے کو کہتے ہیں کہ اس کی ذات ہر نقص و عیب سے پاک ہے۔ اللہ کی تنزیہ و تسبیح کائنات کی ہر چیز کرتی ہے۔ تسبیح چونکہ قصداً تنزیہ کرنے کو کہتے ہیں اس لیے اس

آیت اور دوسری بہت سی آیات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں شعور موجود ہے۔ البتہ موجودات میں سے ہر ایک میں اپنے درجہ وجود کے مطابق شعور موجود ہے۔ انسان، فرشتے، جن، حیوانات، نباتات اور جمادات میں سے ہر ایک اپنے درجہ وجود کے مطابق شعور رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن ہد ہد اور چیونٹی کے شعور اور شہد کی مکھی پر وحی نازل کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ سورۃ الانبیاء آیت ۷۹ میں پہاڑوں پر امانت پیش کرنے کا ذکر ہے۔ سورہ سبا آیت ۱۰ میں تو پہاڑوں کو حکم ملتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح کرتے رہو۔ سورہ بقرہ آیت ۷۴ میں چٹانوں میں موجود خوف خدا کا ذکر ملتا ہے۔ انسانوں اور دیگر موجودات میں درجہ وجود و شعور میں نمایاں فرق ہونے کی وجہ سے انسان اس شعور کا ادراک نہیں کر سکتا جو اپنے سے مختلف درجہ میں ہوتا ہے۔

۲۔ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ: انسان اپنے سے مختلف موجودات کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے جیسے ان میں موجود شعور کو نہیں سمجھتے۔

ہر شیء کی تسبیح سے مراد زبان حال لینا کہ ہر مخلوق خالق کے وجود پر دلالت کرتی ہے، یہی ان کی تسبیح ہے۔ صریحاً آیت کے خلاف ہے کہ قرآن کہے ان کی تسبیح کو تم سمجھتے نہیں اور ہم کہیں: ہم نے سمجھ لیا ہے، وہ زبان حال ہے۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۟	۴۵۔ اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کے درمیان ایک نامرئی پردہ حائل کر دیتے ہیں۔
وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۟	۴۶۔ اور ہم ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکیں اور ان کے کانوں میں سنگینی کر دیتے ہیں اور جب آپ قرآن میں اپنے یکتا رب کا ذکر کرتے ہیں تو وہ نفرت سے اپنی پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔

شان نزول: یہ آیت مکہ کے ان مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو تلاوت قرآن اور خانہ کعبہ کے پاس نماز ادا فرماتے تو وہ انہیں اذیت دیتے، پتھر مارتے اور اسلام کی طرف لوگوں کو دعوت دینے میں حائل ہوتے تھے لیکن اللہ نے کرم فرمایا اور تلاوت قرآن کے وقت وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت نہیں دے سکتے تھے۔[1]

---

[1] مجمع البیان ذیل آیہ

تفسیر آیات

۱۔ وَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ آیت اس بات کو واضح کرنا چاہتی ہے: اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب آپ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو لوگ ایک جیسے نہیں ہوں گے۔ جو لوگ آخرت پر، کسی حساب وثواب پر عقیدہ نہیں رکھتے وہ اسے نہیں سمجھ سکیں گے۔

۲۔ وَّ جَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اَکِنَّۃً: لوگ اگرچہ ایک جگہ بیٹھے ہوں گے اور آپ کی طرف سے تلاوت قرآن کی آواز کو سن رہے ہوں گے مگر کچھ لوگ ان آیات سے کسب فیض کر رہے ہوں گے اور کچھ لوگوں کے دلوں پر پردہ پڑا ہو گا، وہ حقائق قرآن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔

۳۔ یہ بات ہم نے تکراراً لکھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کافروں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اس بات میں پہل کرتا ہے اور وہ ایمان لانے سے عاجز ہو جاتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہدایت کے تمام اسباب فراہم اور حجت پوری ہونے کے باوجود وہ کفر اختیار کرتے ہیں تو اللہ ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل پر غلاف چڑھ جاتا ہے اور اس کے کان حق سننے کے قابل نہیں رہتے۔

خصوصاً جب قرآن میں صرف خدائے واحد کا ذکر ملتا ہے، اس کے ساتھ ان کے دیویوں، دیوتاؤں کا ذکر نہیں آتا تو یہ ان کی مشرکانہ طبع پر ناگوار گزرتا ہے۔

۴۔ وَاِذَا ذَکَرۡتَ رَبَّکَ: اور اگر ان کے معبودوں کے نام لیے بغیر صرف اللہ کا نام لیا جاتا تو نفرت سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

وَاِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحۡدَہُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ ...[1]	اور جب صرف اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل متنفر ہو جاتے ہیں۔

شرک کی واضح علامت یہی ہے کہ صرف اللہ کا نام سننے سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے لیے صرف اللہ کا ذکر ہی ناپسندیدہ گفتگو ہے۔ ایسے لوگ اس قسم کی محفلوں میں بیٹھنا گوارا نہیں کرتے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان بہ آخرت قرآن کا بنیادی پیغام ہے۔

۲۔ آخرت کا منکر قوت شناخت سے محروم ہو جاتا ہے۔

۳۔ ذکر خدا کا ناگوار گزرنا مشرک ہونے کی علامت ہے۔

---
[1] ۳۹ الزمر: ۴۵

نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَسۡتَمِعُوۡنَ بِہٖۤ اِذۡ یَسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡکَ وَ اِذۡ ہُمۡ نَجۡوٰۤی اِذۡ یَقُوۡلُ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا ﴿۴۷﴾

۴۷۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ جب یہ لوگ آپ کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں تو کیا سنتے ہیں اور جب یہ لوگ سرگوشیاں کرتے ہیں تو یہ ظالم کہتے ہیں: تم (لوگ) تو ایک سحرزدہ آدمی کی پیروی کرتے ہو۔

شان نزول: ابو سفیان، ابوجھل اور اخنس بن شریق رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے گرد ایک دوسرے سے بے خبر رسول اللہؐ کی تلاوت قرآن سنا کرتے تھے۔ جب وہ آپس میں باتیں کرتے تو کوئی کہتا یہ دیوانہ ہے، کوئی کہتا یہ کاہن ہے اور کوئی کہتا یہ شاعر ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر آیات

کفار مکہ قرآن سن کر فطرۃً متاثر ہوتے تھے۔ ان کا کہنا کہ قرآن جادو اور کہانت ہے اس تاثر کی علامت ہے۔ البتہ وہ اس تاثر کو چھپانے کے لیے طرح طرح کی بہتان تراشی کرتے تھے کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ عام بشری کلام نہیں ہے اور وہ اسے اللہ کا کلام ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے اسے جادو یا کہانت کہہ کر اپنے قلبی تاثر پر پردہ ڈالتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ کافر بھی کلام اللہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اُنۡظُرۡ کَیۡفَ ضَرَبُوۡا لَکَ الۡاَمۡثَالَ فَضَلُّوۡا فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ سَبِیۡلًا ﴿۴۸﴾

۴۸۔ دیکھ لیں! ان لوگوں نے آپ کے بارے میں کس طرح کی مثالیں بنائی ہیں پس یہ گمراہ ہو چکے ہیں چنانچہ یہ کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ ضَرَبُوۡا: اگر یہ لوگ آپ کو رسول برحق نہیں مانتے ہیں تو آپؐ کے بارے میں ان کا کوئی ایک محکم موقف نہیں ہوتا۔ کبھی ساحر کہہ دیا، کبھی کاہن اور کبھی شاعر۔

۲۔ فَضَلُّوۡا فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ سَبِیۡلًا: آپؐ کے بارے میں موقف میں تضاد اور اضطراب اس بات کی دلیل ہے کہ حق کو مسترد کرنے کے بعد ان کے سامنے کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔ نہ ہدایت کا، نہ ہی ایک موقف پر قائم رہنے کا۔

اہم نکات

۱۔ انسان جب حق کا راستہ ترک کرتا ہے تو باطل کی پیچیدگی میں پھنس جاتا ہے۔

وَ قَالُوۡۤا ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خَلۡقًا جَدِیۡدًا ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اور وہ کہتے ہیں: کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟

قُلۡ کُوۡنُوۡا حِجَارَۃً اَوۡ حَدِیۡدًا ﴿۵۰﴾

۵۰۔ کہدیجیے: تم خواہ پتھر ہو جاؤ یا لوہا۔

اَوۡ خَلۡقًا مِّمَّا یَکۡبُرُ فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ ۚ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ مَنۡ یُّعِیۡدُنَا ؕ قُلِ الَّذِیۡ فَطَرَکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ۚ فَسَیُنۡغِضُوۡنَ اِلَیۡکَ رُءُوۡسَہُمۡ وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہُوَ ؕ قُلۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ قَرِیۡبًا ﴿۵۱﴾

۵۱۔ یا کوئی ایسی مخلوق جو تمہارے خیال میں بڑی ہو (پھر بھی تمہیں اٹھایا جائے گا) پس وہ پوچھیں گے: ہمیں دوبارہ کون واپس لائے گا؟ کہدیجیے: وہی جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا، پس وہ آپ کے آگے سر ہلائیں گے اور کہیں گے: یہ کب ہو گا؟ کہدیجیے: ہوسکتا ہے وہ (وقت) قریب ہو۔

تشریح کلمات

رُفَاتًا: (ر ف ت) کسی چیز کے چور چور کر دینے کے ہیں اور جیسے بھوسہ وغیرہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔

ینغضون: (ن غ ض) الانغاض کے معنی دوسرے کے سامنے تعجب سے سر ہلانے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالُوۡۤا ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا: حیات بعد الموت ایک ایسا مسئلہ تھا جسے مشرکین بڑے شد و مد سے مسترد کرتے تھے۔ قرآن اس مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ پیش کرتا اور مشرکین کے اعتراض کا جواب دیتا ہے۔

وہ کہتے ہیں: کیسے ممکن ہے انسان ہڈی اور خاک ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جائے؟ بوسیدہ ہڈی اور خاک، حیات سے بہت دور ہے۔

۲۔ قُلۡ کُوۡنُوۡا حِجَارَۃً اَوۡ حَدِیۡدًا: ان سے فرمایا: حیات کا اگر خاک کے ساتھ ربط ہے تو تم ایسی چیز فرض کرو جو حیات سے تمہاری نظر میں بہت دور ہے۔ مثلاً پتھر اور لوہا جس میں روئیدگی کی صلاحیت نہیں

ہوتی، اللہ انہیں بھی دوبارہ زندگی دے سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تخلیقی سامان کُنۡ فَیَکُوۡنُ ہر جگہ ایک ہے۔

۳۔ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ مَنۡ یُّعِیۡدُنَا: دوسری تخلیق ممکن ہونا دکھانے کے بعد ان مشرکین کا سوال ہے کہ اس خاک کو دوبارہ زندگی کون دے سکتا ہے؟

۴۔ قُلِ الَّذِیۡ فَطَرَکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ: قرآن ایک سادہ عام فہم اور منطقی جواب دیتا ہے کہ اس خاک کو دوبارہ زندگی وہی دے گا جس نے پہلی بار تمہیں عدم سے ایجاد کیا ہے۔ وہی تمہارا خاک سے اعادہ کرے گا۔ جو ایجاد پر قادر ہے وہ اعادہ پر بہتر قادر ہے۔ یہ ایک اہم دلیل ہے۔ جو کام ایک بار کر کے دکھایا ہے اس کا دوبارہ کرنا یقیناً ممکن ہے۔ اگر ممکن نہ ہوتا تو پہلے یہ کام نہ کر سکتا تھا۔

۵۔ فَسَیُنۡغِضُوۡنَ اِلَیۡکَ رُءُوۡسَہُمۡ: یہ ناقابل تردید جواب سن کر وہ تمسخر کے انداز میں اپنا سر ہلاتے تھے اور پھر بطور محال کہتے: مَتٰی ہُوَ یہ کب ہوگا؟ یہ نہ ہونے والی بات ہے۔ قُلۡ عَسٰۤی: کہہ دیجیے ہو سکتا ہے قریب ہو۔ جواب کا لہجہ بھی بتاتا ہے کہ قیامت کب ہوگی؟ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان پتھر یا لوہے میں بدل جائے تو بھی اسے زندہ کیا جائے گا۔

۲۔ جو ذات ایجاد پر قادر ہے وہ اعادہ پر بھی قادر ہے۔

یَوۡمَ یَدۡعُوۡکُمۡ فَتَسۡتَجِیۡبُوۡنَ بِحَمۡدِہٖ وَ تَظُنُّوۡنَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۵۲﴾	۵۲۔ جس دن وہ تمہیں بلائے گا تو تم اس کی ثنا کرتے ہوئے تعمیل کرو گے اور (اس وقت) تمہارا یہ گمان ہوگا کہ تم (دنیا میں) تھوڑی دیر رہ چکے ہو۔

تفسیر آیات

منکرین معاد سے خطاب ہے: منکرو! جب قیامت کے دن تمہیں قبروں سے اٹھنے کا حکم ملے گا اس وقت تمہارے پاس سوائے حمد و ستائش الٰہی کے کوئی جواب نہ ہوگا اور قیامت کی ابدی زندگی کو سامنے دیکھ کر دنیاوی زندگی کو تم نہایت ناچیز سمجھو گے۔

اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا: ممکن ہے دنیاوی زندگی کے بارے میں ہو اور ممکن ہے برزخی زندگی کے بارے میں ہو۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ یُقۡسِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۬ۙ مَا لَبِثُوۡا غَیۡرَ سَاعَۃٍ ... [1]	اور جس روز قیامت برپا ہوگی مجرمین قسم کھائیں گے کہ وہ (دنیا میں) گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے۔

---

[1] ۳۰ روم: ۵۵

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد برزخی زندگی ہے کیونکہ اس قسم کے جواب میں اہل علم و ایمان کہیں گے:

وَقَالَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ وَالۡاِيۡمَانَ لَقَدۡ لَبِثۡتُمۡ فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوۡمِ الۡبَعۡثِ فَهٰذَا يَوۡمُ الۡبَعۡثِ ...[1]

اور جنہیں علم اور ایمان دیا گیا تھا وہ کہیں گے: نوشتہ خدا کے مطابق یقیناً تم قیامت تک رہے ہو اور یہی قیامت کا دن ہے....

ظاہر ہے کہ یہ لوگ قیامت تک دنیا میں زندہ نہ رہے بلکہ برزخ میں رہے۔

اس آیت سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے کہ حیات برزخی سب کے لیے ہے جبکہ عام طور پر حیات برزخی صرف قبر میں نکیرین کے سوال تک محدود سمجھا جاتا ہے۔ البتہ شہداء اور بڑے مجرموں کے لیے حیات برزخی ثابت ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن کافر بھی حمد الٰہی کریں گے: فَتَسۡتَجِيۡبُوۡنَ بِحَمۡدِهٖ

وَقُلۡ لِّعِبَادِىۡ يَقُوۡلُوا الَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ يَنۡزَغُ بَيۡنَهُمۡ ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ كَانَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوًّا مُّبِيۡنًا ۝۵۳

۵۳۔ اور میرے بندوں سے کہہ دیجیے: وہ بات کرو جو بہترین ہو کیونکہ شیطان ان میں فساد ڈلواتا ہے، بتحقیق شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

تفسیر آیات

روئے سخن اہل ایمان کی طرف ہے جو مشرکین کی طرف سے تمسخر سننے پر بدکلامی کرتے تھے۔ آیت کے اطلاق سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ ہر وقت، ہر موقع پر اور ہر شخص سے وہ بات کریں جو بہترین ہو۔ جو اس عظیم دعوت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔ جو اس پاکیزہ فکر کو نمودار کرے۔ جو ان اعلیٰ اخلاقی قدروں کی نمائندگی کرے، جس سے ان اقدار کی خوشبو پھیلے جو اس دعوت میں ہے۔ ایسی باتیں جو گرد و پیش کو معطر کریں۔ جو قلب و نظر پر اپنی گرفت مضبوط کرے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:

رُبَّ قَوۡلٍ اَنۡفَذُ مِنۡ صَوۡلٍ۔[2]　کبھی ایک جملہ ایک حملے سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

اِنَّ الشَّيۡطٰنَ يَنۡزَغُ بَيۡنَهُمۡ: جب فہم و فراست سے عاری شخص کسی کے بارے میں نازیبا زبان استعمال کرتا ہے تو کمین میں بیٹھا ہوا شیطان اس پر اپنا تیر چلاتا اور اسے مزید اکساتا ہے تاکہ دعوت الی الحق میں حق

---

[1] ۳۰ روم: ۵۶　[2] نہج البلاغۃ۔ تشریح طلب کلام: ۳۹۴

کی چاشنی باقی نہ رہے بلکہ اس دعوت دینے والے اور اس کے مذہب کے بارے میں بُغض و عناد وجود میں آئے پھر اصلاح کی جگہ فساد و فتنہ برپا ہو جائے۔

ایسا بہت ہوا ہے کہ ایک جملے نے لوگوں پر وہ مثبت اثر دکھایا جو کسی طاقت کے ذریعے نہیں ہو سکتا تھا اور کبھی ایک نامناسب جملے نے وہ فساد اور خون ریزی کو جنم دیا جو کسی جانی دشمن سے نہیں ہو سکتی تھی۔ خوش گفتاری کا اپنا اثر ہے۔ ایک مناسب اور برمحل جملہ انسان کی تقدیر بدل دیتا ہے اور ایک نامناسب جملہ ایک بہت بڑے فساد کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

چنانچہ ہماری مجالس و محافل کے بعض غیر ذمے دار افراد نے شہید انسانیتؑ کے منبر سے انسانوں کی دل آزاری کر کے اس مکتب کو وہ نقصان پہنچایا جو دنیا کے کسی دشمن کے بس میں نہ تھا۔

اہم نکات

۱۔ دعوت میں خوش گفتاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

۲۔ شیطان گفتار کے ذریعہ فساد پھیلاتا ہے۔

رَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِكُمۡ ؕ اِنۡ يَّشَاۡ يَرۡحَمۡكُمۡ اَوۡ اِنۡ يَّشَاۡ يُعَذِّبۡكُمۡ ؕ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ وَكِيۡلًا ﴿۵۴﴾

۵۴۔ تمہارا رب تمہارے حال سے زیادہ باخبر ہے، اگر وہ چاہے تو تم پر رحم کرے اور اگر چاہے تو تمہیں عذاب دے اور (اے رسول) ہم نے آپ کو ان کا ضامن بنا کر نہیں بھیجا۔

تفسیر آیات

اس آیت میں بھی روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کیسے پیش آئیں۔

۱۔ کسی کو گمراہ اور جہنمی یا کسی کو جنتی قرار دینا تمہارے دائرہ علم میں نہیں ہے۔ ممکن ہے جسے تم گمراہ سمجھتے ہو اس کا انجام ایمان پر ہو اور جسے تم بڑا مؤمن سمجھتے ہو اس کا انجام برا ہو۔ لہٰذا رحم و عذاب اللہ کے علم اور مشیت کے ساتھ مربوط ہے۔

۲۔ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ وَكِيۡلًا: اے رسول! ہم نے آپ کو اس بات کی ضمانت دینے والا بنا کر نہیں بھیجا کہ عمل صالح سے ہٹ کر ان لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کریں یا ان کو طاقت کے ذریعے مؤمن بنا دیں۔

اہم نکات

۱۔ مشیت الٰہی، علم پر مترتب ہوتی ہے۔

۲۔ رسول کے ذمے صرف تبلیغ ہے۔

۳۔ لوگوں کو طاقت کے ذریعے ناجی بنانا رسول کی ذمے داری نہیں۔

وَ رَبُّکَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ لَقَدۡ فَضَّلۡنَا بَعۡضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعۡضٍ وَّ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اور (اے رسول) آپ کا رب آسمانوں اور زمین کی موجودات کو بہتر جانتا ہے اور بتحقیق ہم نے انبیاء میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کی ہے۔

تفسیر آیات

مشرکین مکہ کے اس خیال کا جواب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نبوت دینے کے لیے عبد اللہ کا یتیم مل گیا۔ بھلا سابقہ انبیاء کہاں اور یہ یتیم کہاں؟ فرمایا: اللہ کی نگاہ پوری کائنات پر ہوتی ہے جس کسی پر اللہ کی نظر انتخاب پڑتی ہے تو انبیاء کو اسی بنیاد پر فضیلت دیتا ہے۔ یہاں حسن گفتار میں حضرت داود علیہ السلام کو فضیلت دی کہ ان کی تسبیح سے جمادات بھی متاثر ہوتے تھے اور پہاڑ بھی ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ انتخاب کرنے والے کی نگاہ سے کوئی پہلو غائب نہیں ہونا چاہیے: وَ رَبُّکَ اَعۡلَمُ ....

قُلِ ادۡعُوا الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ فَلَا یَمۡلِکُوۡنَ کَشۡفَ الضُّرِّ عَنۡکُمۡ وَ لَا تَحۡوِیۡلًا ﴿۵۶﴾

۵۶۔ کہد یجیے: جنہیں تم اللہ کے سوا (اپنا معبود) سمجھتے ہو انہیں پکارو، پس وہ تم سے نہ کسی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں اور نہ (ہی اسے) بدل سکتے ہیں۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ اِلٰی رَبِّہِمُ الۡوَسِیۡلَۃَ اَیُّہُمۡ اَقۡرَبُ وَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَہٗ وَ یَخَافُوۡنَ عَذَابَہٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحۡذُوۡرًا ﴿۵۷﴾

۵۷۔ جن (معبودوں) کو یہ پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب تک رسائی کے لیے وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ قریب ہو جائے اور وہ اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے خائف بھی، کیونکہ آپ کے رب کا عذاب یقیناً ڈرنے کی چیز ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلِ ادۡعُوا الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ : اے رسول! آپ ان مشرکین سے کہہ دیں کہ اپنے معبودوں کو پکار کے دیکھو، کیا وہ تمہاری پکار کو سن کر تم سے کسی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے تم ایک واہمے کو پکارتے ہو اور تم ایسے اسم کو پکارتے ہو جس کا کوئی مسمیٰ نہیں ہے تو اس پکار کا نتیجہ کیا ہو گا؟

۲۔ جنہیں یہ مشرکین وسیلہ بنا کر پکارتے ہیں وہ خود محتاج وسیلہ ہیں کہ قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے وسیلہ تلاش کرتے ہیں تا کہ انہیں علم ہو جائے اَیُّہُمۡ اَقۡرَبُ ان میں سے کون زیادہ اللہ کے قریب ہے۔

۳۔ وَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَہٗ : یہ خود اللہ کی رحمت کے امیدوار و محتاج ہیں۔ وہ تمہیں (مشرکین کو) کہاں سے رحمت فراہم کریں گے۔

۴۔ وَ یَخَافُوۡنَ عَذَابَہٗ : یہ خود اللہ کے عذاب کا خوف دل میں رکھتے ہیں، تم (مشرکین) کو کس طرح بچائیں گے؟ مشرکین میں سے کچھ عُزیر کو پکارتے ہیں کچھ مسیح کو پکارتے ہیں اور کچھ فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں حالانکہ یہ خود اللہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وسیلے کی تلاش میں ہیں۔

واضح رہے جہاں عبادات اور انفاق فی سبیل اللّٰہ وسیلہ ہیں، وہاں وہ ذوات مقدسہ بھی وسیلہ ہیں جنہوں نے عبادت کی رہنمائی فرمائی ہے۔

عالم اہل سنت حسکانی اپنی تفسیر شواھد التنزیل ذیل آیت میں عکرمہ سے روایت کرتے ہیں:

... اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ اِلٰی رَبِّہِمُ الۡوَسِیۡلَۃَ کہا۔ وہ وسیلہ نبی، علی، فاطمہ، حسن اور حسین ہیں۔

اہم نکات

۱۔ قرب الٰہی کے لیے وسیلہ تلاش کرنا درست ہے۔

۲۔ اقرب وہ ہے جس کی نشاندہی خود اللہ نے کی ہو۔

وَ اِنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا نَحۡنُ مُہۡلِکُوۡہَا قَبۡلَ یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ اَوۡ مُعَذِّبُوۡہَا عَذَابًا شَدِیۡدًا ؕ کَانَ ذٰلِکَ فِی الۡکِتٰبِ مَسۡطُوۡرًا ﴿۵۸﴾

۵۸۔ اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم قیامت کے دن سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب میں مبتلا نہ کریں، یہ بات کتاب (تقدیر) میں لکھی جا چکی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ : کوئی بستی ایسی نہ ہو گی جو اللہ کے عادلانہ قانون مکافات کی زد میں نہ

آئے اور وہ ہلاکت یا عذاب شدید کی صورت میں وقوع پذیر ہو گا۔ ہلاکت کو عذاب کے مقابلے میں ذکر کرنے کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ہلاکت سے مراد طبیعی موت ہے۔ وہ ہلاکت نہیں جو عذاب کی صورت میں آتی ہے۔ اسی لیے بعض کی یہ رائے ہے کہ ہلاکت (طبیعی موت) اچھی بستیوں کے لیے ہے اور عذاب بری بستیوں کے لیے لیکن ہوسکتا ہے ہلاکت اور عذاب، مکافات عمل کی دو صورتیں ہوں۔

قیام قیامت سے پہلے لوگوں کے فسق و فجور یا حد سے بڑھ کر عیش و نوش کی وجہ سے بغاوت اور سرکشی کے سبب ساری آبادیاں تباہ ہو جائیں گی۔ کچھ کو ہلاکت یعنی قوم لوط کی طرح تباہ کر کے اور کچھ کو قحطی، وباء کی بیماری اور جنگ وغیرہ کے ذریعے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

۲۔ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا: اس عالم ہستی کو اللہ تعالیٰ نے جس قانون اور دستور پر قائم کر رکھا ہے، اسے کبھی "لوح محفوظ" کبھی "کتاب مبین" کہا ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ اس قانون اور اس تقدیر کے مطابق ہوتا ہے جس پر اس کائنات کا نظام قائم ہے۔ جو اللہ کے اس حتمی فیصلے سے عبارت ہے کہ ہر علت پر معلول کا مترتب ہونا ضروری ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر بستی کو مکافات عمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۲۔ اللہ کا حتمی فیصلہ کتاب مبین ہے۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝۵۹

۵۹۔ اور نشانیاں بھیجنے سے ہمارے لیے کوئی مانع نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس سے پہلے کے لوگوں نے اسے جھٹلایا ہے اور (مثلاً) ثمود کو ہم نے اونٹنی کی کھلی نشانی دی تو انہوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا اور ہم ڈرانے کے لیے ہی نشانیاں بھیجتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ تعالیٰ ہر نبی کو نبوت کے اثبات کے لیے معجزہ کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے۔ اس ابتدائی معجزے کو قبول نہ کرنے کی صورت میں مہلت مل جاتی ہے فوری عذاب نہیں آتا لیکن اگر لوگوں کے مطالبے پر معجزہ دکھایا جائے اور پھر اس معجزے کا انکار کریں تو اس صورت میں فوری عذاب آجاتا ہے۔

کفار کی طرف سے تجویز شدہ معجزہ اس وقت دکھایا جاتا ہے جب ان کو انکار کی صورت میں تباہ کرنا

مقصود ہو۔ مکہ کے کفار کی طرف سے معجزے کا مطالبہ درحقیقت اپنی تباہی کا مطالبہ تھا۔ جیسا کہ قوم ثمود کو ناقہ کا معجزہ دکھا کر تباہ کر دیا گیا۔ جب کہ مشیت الٰہی یہ رہی ہے کہ کفار مکہ کو مہلت دی جائے۔ چونکہ مشیت الٰہی کی نگاہ آنے والی نسلوں پر ہوتی ہے کہ اگر ان کی آنے والی نسلوں میں اہل ایمان ہیں تو ان کفار کو تباہ نہیں کیا جاتا اور اگر آنے والی نسلوں میں اہل ایمان نہیں ہیں تو اس صورت میں ان پر تباہی آجاتی ہے جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی تباہی کے مطالبہ میں فرمایا:

اِنَّكَ اِنۡ تَذَرۡهُمۡ يُضِلُّوۡا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ○[1]	اگر تو انہیں چھوڑ دے گا تو وہ یقیناً تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور یہ لوگ صرف بدکار کافر اولاد ہی پیدا کریں گے۔

۲۔ وَمَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّا تَخۡوِيۡفًا معجزے کی ایک قسم تخویفی بھی ہوتی ہے۔ مثلاً لوگوں کو خوف و ہراس، کم مال و دولت اور قحط میں مبتلا کر کے کم سے کم عذاب دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورہ نحل آیت ۴۷ میں فرمایا:

اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ○	یا انہیں خوف میں رکھ کر گرفت میں لیا جائے؟ پس تمہارا رب یقیناً بڑا شفقت کرنے والا، مہربان ہے۔

اس آیت میں تخویف کے ذکر کے بعد یہ فرمایا: ”تمہارا رب بڑا شفقت والا مہربان ہے۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی شفقت ہے کہ کم سے کم سزا، تخویف کی سزا ہے ممکن ہے وَمَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّا تَخۡوِيۡفًا کا تعلق امت محمدی سے ہو کہ اس امت پر شفقت اور مہربانی فرما کر صرف تخویفی عذاب نازل فرماتا ہے جو کم سے کم عذاب ہے۔ چنانچہ سورۃ الانعام آیت ۶۵ میں بھی کمترین عذاب کے بارے میں فرمایا:

اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ	یا تمہیں فرقوں میں الجھا کر ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے....

اہم نکات

۱۔ آنے والی نسلوں کی وجہ سے موجودہ نسل کو امان مل جاتی ہے۔

۲۔ کفار کا مطالبہ معجزہ، درحقیقت اپنی تباہی کا مطالبہ تھا۔

وَاِذۡ قُلۡنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡيَا الَّتِىۡۤ اَرَيۡنٰكَ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ	۶۰۔ اور (اے رسول وہ وقت یاد کریں) جب ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کے رب نے لوگوں کو گھیر رکھا ہے اور جو خواب ہم نے آپ کو دکھلایا ہے اور وہ درخت جسے قرآن میں ملعون ٹھہرایا

----

[1] ۷۱ نوح: ۲۷

الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝۶۰

گیا ہے اسے ہم نے صرف لوگوں کی آزمائش قرار دیا اور ہم انہیں ڈراتے ہیں مگر یہ تو ان کی بڑی سرکشی میں اضافے کا سبب بنتا جاتا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں چند ایک مباحث قابل توجہ ہیں:

ا۔ الرُّءْيَا: قرآن مجید میں تین مقامات میں لفظ الرُّءْيَا آیا ہے: سورۃ الصافات آیت ۱۰۵ میں حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کا حضرت ابراہیمؑ کا خواب: قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ... دوسری جگہ صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خواب: لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ [1] تیسری جگہ زیر بحث آیت: الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ ... قابل توجہ اور تعجب یہ ہے کہ غیر شیعہ علماء نے ان تین آیات میں سے پہلی دو آیات میں الرُّءْيَا کے معنی خواب لیے ہیں جب کہ زیر بحث آیت میں الرُّءْيَا کے معنی مشاہدہ لیتے ہیں تاکہ اس خواب کی تشریح میں جو احادیث کئی طرق سے بنی امیہ کے بارے میں وارد ہیں ان کی زد میں بنی امیہ نہ آئے۔ اس لیے آیت کی اپنی خواہش کے مطابق تشریح کرتے ہیں۔

پھر کہتے ہیں: جب الرُّءْيَا رؤیت (مشاہدہ) کے معنوں میں استعمال ہوا تو آیت میں الرُّءْيَا سے مراد معراج کے مشاہدات ہیں۔ جب کہ معراج کے بارے میں قرآن کی تعبیر رَاٰی ہے الرُّءْيَا نہیں۔ ملاحظہ ہو لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى۔ [2]

اہل لغت کی بھی اس پر صراحت موجود ہے کہ الرُّءْيَا خواب کے معنوں میں ہے۔ قاموس اور لسان العرب میں آیا ہے: الرؤیا ما رأیته فی منامك۔ رؤیا اسے کہتے ہیں جو آپ کو خواب میں نظر آئے۔ راغب المفردات میں لکھتے ہیں: الرؤیا ما یری فی المنام۔ رؤیا، جو خواب میں نظر آتا ہے اسے کہتے ہیں۔ نہایت قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگر رؤیا بمعنی رؤیت (مشاہدہ) ہے تو آیت کی ترکیب اس طرح بن جاتی ہے: الرؤیۃ الّتی اریناك۔ وہ رؤیت (دیکھنا) جو ہم نے آپ دکھایا ہے۔ اس طرح رؤیت، مرئی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ ترکیب نہایت ناقابل قبول ہے کہ اللہ نے دیکھنا دکھایا ہے۔ کچھ لوگ اس خیال کو اختیار کرنے میں خفت محسوس نہیں کرتے: مشرکین چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج کو خواب سمجھتے تھے اس لیے اللہ نے بھی اس نظریے کا لحاظ کرتے ہوئے معراج کو خواب کہا ہے۔[1]

اس افتراء کے ساتھ یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ اور معاویہ کے نزدیک معراج بیداری میں ہوئی ہے۔ دوسرا نظریہ یہ پیش کرتے ہیں کہ رؤیا کے معنی خواب ہیں لیکن اس خواب سے مراد سال حدیبیہ کا خواب ہے۔ اس نظریے میں دو باتیں قابل ملاحظہ ہیں: اول یہ کہ یہ سورۃ مکی ہے اور سال حدیبیہ چھ ہجری کا واقعہ ہے۔ دوم یہ کہ اس میں دو باتیں مورد امتحان و آزمائش ہیں۔ ایک خواب، دوسری شجرہ

---

[1] ۴۸ الفتح: ۲۷ [2] ۵۳ النجم: ۱۸

ملعونہ۔ حدیبیہ میں خواب تو ہے مگر یہاں شجر معلونہ کی کوئی توجیہ نہیں ہے۔
وَالشَّجَرَۃَ: شجرہ کے معنی درخت کے ہیں جس کی جڑیں اور شاخیں ہوتی ہیں۔ سلسلۂ نسب کو بھی شجرہ کہتے ہیں جو پشت در پشت باقی رہتا ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں آیا ہے:

یقال: فلان من شجرة مبارکة ای من اصل مبارك۔	کہا جاتا ہے: فلاں کا تعلق ایک مبارک شجرہ یعنی مبارک نسل سے ہے۔

یہاں بھی ایک تفسیر بالرای یہ ہے کہ شجرہ ملعونہ سے مراد شجرہ زقوم ہے جو جہنم میں ہے حالانکہ اللہ نے قرآن میں شجرہ زقوم پر لعنت بھیجی ہے نہ آتش جہنم پر اور نہ جہنم کے دربانوں پر۔
لعنت۔ اللعن: کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کرنا، دھتکار دینا ہے۔ خدا کی طرف سے کسی شخص پر لعنت سے مراد یہ ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی رحمت اور توفیق سے محروم ہو جائے اور آخرت میں عقوبت کا مستحق قرار پائے۔[۲]
جن پر خدا و رسولؐ کی لعنت ثابت ہے ان کے ہمدرد لوگوں نے یہ حدیث بنا ڈالی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

اللّٰھم... ایما مؤمن اذیته اوسببته او لعنته فاجعلها له کفارة و قربة تقربه بها۔[۳]	اے اللہ جس مؤمن کو میں اذیت دوں یا اسے (معاذ اللہ) گالی دوں یا اس پر لعنت کروں اسے اس کے لیے کفارہ اور اپنی قربت کا ذریعے بنا دے۔

اس کا مطلب یہ ہوا جس پر خدا و رسول جس قدر لعنت بھیجیں اسی قدر وہ دھتکارنے کی جگہ زیادہ مقرب درگاہ ہوگا۔ جب کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کی زبان سے جس پر لعنت ہو جائے اس پر اللہ کی طرف سے بھی لعنت ہے اور جس پر اللہ کی طرف سے لعنت ہو اس کے بارے میں اللہ فرماتا ہے:

مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝[۴]	اور جس پر اللہ لعنت کرے اس کے لیے آپ کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔

جب کہ یہ حضرات کہتے ہیں خود لعنت مددگار اور باعث قربت ہے۔
یہ سب بے دلیل خیالات اس دلیل کے مقابلے میں پیش کیے جاتے ہیں جو مستند مصادر سے ثابت ہے کہ الرُّءْيَا سے مراد وہ خواب ہے جو حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ بنی امیہ بندر کی طرح آپؐ کے منبر پر اچھل کود کر رہے ہیں جس کے بعد آپ بہت کم ہنسے۔
سھل بن سعد راوی ہیں:

رأی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وآله وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ

---

[۱] روح المعانی ۱۵: ۱۰۵ [۲] مفردات راغب [۳] صحیح بخاری کتاب الدعوات، صحیح مسلم کتاب البر والصلة [۴] نساء: ۵۲

بنی امیه ینزون علی منبره نزو القردة فساء ه ذلك فما استجمع ضاحكا حتی مات و انزل اللّٰه تعالیٰ وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡیَا الَّتِیۡۤ اَرَیۡنٰکَ ....

بنی امیہ ان کے منبر پر بندروں کی طرح اچھل کود کر رہے ہیں۔ آپ کو اس سے دکھ ہوا۔ جس کے بعد آپ کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا گیا اور اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡیَا الَّتِیۡۤ اَرَیۡنٰکَ ....

چنانچہ ابن عباسؓ، سهل بن سعدؓ، سعید بن مسیبؒ، یعلی بن مرهؓ، ابن عمروؓ، ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ شجرہ ملعونہ سے مراد بنی امیہ ہیں۔ ملاحظہ ہو مستدرك حاکم ۴: ۴۸، اسد الغابة ۳: ۱۴، الخصائص الکبری ۲: ۱۱۸، تفسیر طبری، قرطبی، شوکانی، الدر المنثور، تاریخ طبری وغیرہ۔

حضرت عائشہؓ نے ایک بار مروان سے فرمایا:

لعن اللّٰه أباك و انت فی صلبه فانت بعض من لعنه اللّٰه۔

اے مروان! اللہ نے تیرے باپ پر اس وقت لعنت بھیجی جب تو اس کی صلب میں تھا۔ لہٰذا تو بھی اس لعنت میں شامل ہے۔

ملاحظہ ہو تفسیر فخر رازی ذیل آیت۔

حضرت جبیر بن مطعم راوی ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے تو حکم بن ابی العاص کو دیکھا تو نبیؐ نے فرمایا:

ویل لِاُمَّتِی مما فی صلب هذا۔[1]

اس شخص کے صلب میں جو موجود ہے اس سے میری امت کے لیے تباہی ہے۔

ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان اهل بیتی سیلقون من بعدی من امتی قتلا و تشریداً و ان اشد قوماً لنا بغضا بنو امیه و بنو المغیره و بنو مخزوم.[2]

میرے بعد میرے اہل بیت کو قتل اور جلا وطنی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہمارے خلاف سب سے زیادہ بغض رکھنے والے بنی امیہ، بنی مغیرہ اور بنی مخزوم ہوں گے۔

بزرگ صحابی حضرت ابو برزہؓ کہتے ہیں:

کان ابغض الاحیاء او الناس الی رسول اللّٰه بنو امیة۔[3]

لوگوں میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے سب سے زیادہ مبغوض ترین بنی امیہ ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

---

[1] اسد الغابة ۱: ۵۱۴ [2] کنز العمال حدیث نمبر ۳۱۰۷۴
[3] مستدرك الحاکم ۴: ۴۸۰ اور کہا: سند صحیح ہے۔ هیثمی نے مجمع الزواید ۶: ۷۱ میں کہا ہے: رجاله رجال الصحیح

لکل امة آفة و آفة هذه الامة بنو امية۔[1]
ہر امت کو ایک آفت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس امت کی آفت بنی امیہ ہیں۔

وَالشَّجَرَةَ الۡمَلۡعُوۡنَةَ: قرآن میں جن سلسلوں کو لعنت کا نشانہ بنایا ہے وہ تین ہیں: اہل کتاب، مشرکین اور منافقین۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خواب میں جس ملعون سلسلے کو مسلمانوں کے لیے آزمائش قرار دیا گیا ہے وہ اہل کتاب اور مشرکین نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ دونوں اسلام کے کھلے دشمن ہیں اور جن کی دشمنی کھلی ہوئی ہے وہ آزمائش نہیں ہوتے۔ آزمائش وہ ہوتے ہیں جو حق کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یعنی منافقین۔

چنانچہ قرآن نے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دینے والوں، فساد فی الارض اور قطع رحم کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔

اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دینے والوں کے بارے میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ...[2]
جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت کی ہے۔

فساد اور قطع رحمی کے بارے میں فرمایا:

فَہَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ اَنۡ تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ تُقَطِّعُوۡۤا اَرۡحَامَکُمۡ ○ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فَاَصَمَّہُمۡ وَ اَعۡمٰۤی اَبۡصَارَہُمۡ ○[3]
پھر اگر تم نے (جہاد سے) منہ پھیر لیا تو تم سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم زمین میں فساد برپا کرو گے اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے لہٰذا انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

چنانچہ یہ مفسدین اس قدر اندھے ہو گئے تھے کہ اسی شجرہ ملعونہ کی ایک کڑی حجاج نے کہا تھا:

من قال لی اتق اللہ ضربت عنقه۔[4]
اگر کوئی مجھ سے کہے کہ اللہ کا خوف کرو، میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔

بنی امیہ کی سیاہ تاریخ، ملت اسلامیہ کے لیے کس قدر سنگین آزمائش ہے یہ بات تاریخ کا ادنیٰ مطالعہ رکھنے والے پر بھی پوشیدہ نہیں ہے۔

چنانچہ آلوسی روح المعانی میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> بنی امیہ مراد ہونے کی صورت میں نُخَوِّفُہُمۡ کی ضمیر بنی امیہ کی طرف، ان کی اولاد اور شجرہ ہونے کے اعتبار سے جاتی ہے۔ بنی امیہ پر لعنت اس لیے ہوئی ہے کہ ان کے ہاتھوں بہت ناحق خون بہہ گئے اور بہت سی عصمتیں لٹ گئیں۔ لوگوں کے اموال کو ناحق

---

[1] کنز العمال ۶: ۹۱ [2] ۳۳ احزاب: ۵۷ [3] ۴۷ محمد: ۲۲، ۲۳ [4] تفسیر المنار

تاراج کیا، بہت سے حقوق کو پامال کیا، احکام میں تبدیلیاں کیں اور اللہ نے اپنے رسول پر جو احکام نازل کیے ان کے خلاف فیصلے صادر کیے۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی سیاہ کاریوں اور بڑی رسوائیوں کا ارتکاب کیا گیا جو رہتی دنیا تک ناقابل فراموش ہیں۔

بنی امیہ کے یہ مظالم، ان کی سیاہ کاریاں اور اس غیر قانونی حکومت کی طرف سے ہونے والی قتل وغارت ملت اسلامیہ کے لیے ایک عظیم آزمائش تھی کہ راسخ الایمان ان مظالم پر صبر اور ان میں شریک ہونے سے اجتناب کرتے ہیں جس سے ان کے ایمان کی سچائی ثابت ہوتی ہے جب کہ ضعیف الایمان والوں کا بھی امتحان ہے کہ وہ اس ظلم کے خلاف قیام کرنا تو درکنار خود اس میں شریک ہو جاتے ہیں جس سے ان کے ایمان کی کمزوری ثابت ہو جاتی ہے۔

چنانچہ معاویہ کے ساتھ صلح کے بعد حضرت امام حسن علیہ السلام نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

وَاِنۡ اَدۡرِیۡ لَعَلَّہٗ فِتۡنَۃٌ لَّکُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿﴾[1]

اور میں نہیں جانتا شاید اس (عذاب کی تاخیر) میں تمہاری آزمائش ہے اور ایک مدت تک سامان زیست ہے۔

اہم نکات

۱۔ ظالم حکمران، امت کے لیے آزمائش ہیں۔

۲۔ قرآن کے دقیق مطالعہ سے اس شجرہ ملعونہ کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔

۳۔ تنبیہ و نصیحت کی صورت میں شجرہ ملعونہ کی بغاوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ قَالَ ءَاَسۡجُدُ لِمَنۡ خَلَقۡتَ طِیۡنًا ﴿۶۱﴾

۶۱۔ اور (یاد کریں) جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے کہا: کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے؟

قَالَ اَرَءَیۡتَکَ هٰذَا الَّذِیۡ کَرَّمۡتَ عَلَیَّ ۫ لَئِنۡ اَخَّرۡتَنِ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَاَحۡتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۶۲﴾

۶۲۔ پھر کہا: مجھے بتاؤ! یہی ہے وہ جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے؟ اگر تو نے مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دی تو قلیل تعداد کے سوا میں اس کی سب اولاد کی جڑیں ضرور کاٹ دوں گا۔

---

[1] ۲۱ الانبیاء: ۱۰۹

تشریح کلمات

لَاَحۡتَنِکَنَّ :(ح ن ك) یہ حنکت الدابۃ سے مشتق ہوسکتا ہے جس کے معنی اس کے منہ میں لگام دینے یا رسی باندھنے کے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے۔ احتنك الجراد الارض سے مشتق ہو جس کے معنی ٹڈی کے زمین کی روئیدگی کو صفاچٹ کر دینے کے ہیں۔ پس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ میں انہیں اس طرح تباہ کر دوں گا جیسے ٹڈی زمین پر سے نبات صفاچٹ کر دیتی ہے۔ (راغب)

مجمع البیان میں آیا ہے: الاحتناك الاقتطاع من الاصل۔ یعنی احتناك جڑ سے کاٹنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

شجرہ ملعونہ کے ذکر کے بعد ابلیس کی سرکشی، تکبر اور بنی آدم کے ساتھ اس کے بغض وعناد کا ذکر ممکن ہے اس لیے ہو کہ اس شجرہ ملعونہ کا سرا ابلیس کی سرکشی سے ملتا ہے۔ جس طرح ابلیس کا وجود ایک آزمائش و امتحان ہے، اسی طرح شجرہ ملعونہ کے وجود کا فلسفہ بھی آزمائش ہے جس سے خالص ایمان والے نفاق والوں سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔

قَالَ اذۡهَبۡ فَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمۡ جَزَآءً مَّوۡفُوۡرًا ﴿۶۳﴾

۶۳۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: دور ہوجا! ان میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا تو تم سب کے لیے جہنم کی سزا ہی یقیناً مکمل سزا ہے۔

وَاسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِكَ وَاَجۡلِبۡ عَلَيۡهِمۡ بِخَيۡلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكۡهُمۡ فِى الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ وَعِدۡهُمۡ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۶۴﴾

۶۴۔ اور ان میں سے تو جس جس کو اپنی آواز سے لغزش سے دوچار کر سکتا ہے کر اور اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ ان پر چڑھائی کر دے اور ان کے اموال اور اولاد میں ان کا شریک بن جا اور انہیں (جھوٹے) وعدوں میں لگا رکھ اور شیطان سوائے دھوکے کے انہیں اور کوئی وعدہ نہیں دیتا۔

تشریح کلمات

وَاسۡتَفۡزِزۡ : (ف ز ز) الاستقزاز ہلکا سمجھنا۔ گھبرا دینا اور جگہ سے ہٹا دینا۔

وَاَجۡلِبۡ: (ج ل ب) الجلب کے اصل معنی کسی چیز کو ہنکانے اور چلانے کے ہیں۔ اجلب الیہ کسی پر زور چلا کر زبردستی اسے آگے بڑھانا۔

تفسیر آیات

ایک جنگ، ایک معرکہ جس میں شیطان اپنی سوار اور پیادہ فوج اور ساز و آواز کے ساتھ اولاد آدم پر حملہ آور ہے۔ اس حملے میں شیطان درج ذیل وسائل حرب بروئے کار لاتا ہے:

۱۔ بِصَوۡتِکَ: آواز۔ حق کے مقابلے میں ہر اٹھنے والی آواز کو جاذب اور پرکشش بنانا۔ آج کے ذرائع ابلاغ شاہد ہیں کہ ہر اس آواز کے ذریعے جس سے انسانی عقل مغلوب ہو جاتی ہے، سمعی ذرائع سے شیاطین کس قدر گمراہ کن افکار پھیلاتے اور اپنا کثیر سرمایہ خرچ کرتے ہیں۔

۲۔ وَاَجۡلِبۡ عَلَیۡہِمۡ بِخَیۡلِکَ: طاقت کا استعمال۔ وہ اپنے کارندوں کے ذریعے بالکل ایک گرم معرکہ کی طرح، جس میں دشمن اپنے سوار اور پیدل فوج دونوں کو جھونک دیتے ہیں، لوگوں کی عقل و حواس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

۳۔ وَشَارِکۡہُمۡ فِی الۡاَمۡوَالِ: اقتصادی حرب۔ اصولی طور پر انسان اپنے فائدے کے لیے مال کماتا ہے لیکن جب شیاطین کے حملے کی زد میں آتا ہے تو شیاطین ان سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ آج کے شیاطین، معاشروں میں مال کا اکثر حصہ غیر انسانی امور، مثلاً لہو و لعب، بلی کتے پالنے وغیرہ جیسی غیر ضروری چیزوں پر خرچ کرتے ہیں۔ اس مقام پر اعداد و شمار نہایت دہشت ناک ہیں۔

۴۔ وَعِدۡہُمۡ: نفسیاتی حرب۔ دلفریب وعدوں کے ذریعے انسان کو فریب دینا، شیاطین کا خطرناک ترین حملہ ہے۔ وہ انسان سے دولت مندی، جاہ و ریاست اور بالا دستی کے پرکشش وعدے کرتے ہیں اور انسان سے احساس گناہ سلب کر کے گناہ کو ناچیز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کبھی گناہ کے بعد توبہ کا فریب دے کر اور کبھی غلط توجیہات سے گناہ کا ارتکاب کرنے پر اکساتے ہیں۔ گناہ کا ارتکاب کرنے والوں سے ہم روز اس قسم کی توجیہات سنتے ہیں۔ تارک الصلوۃ، بے حجاب، رشوت خور ہر ایک اپنے ان گناہوں کی توجیہات اور نامعقول قیاسات پر مبنی ایسے دلائل رکھتے ہیں جو سب کے سب شیطانی افکار ہیں۔

۵۔ وَالۡاَوۡلَادِ: نئی نسل منفی اور مثبت تربیت کے لیے نہایت سازگار اور ہموار زمین رکھتی ہے، جیسا کہ مثبت تربیت کے سلسلے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

عَلَیْکَ بَالْاَحْدَاثِ فَاِنَّھُمْ اَسْرَعْ اِلَیٰ کُلِّ خَیْرٍ ....[1]	نئی نسل پر توجہ دو کیونکہ یہ لوگ ہر کار خیر کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔

---

[1] الکافی ۸: ۹۳

اسی طرح منفی تربیت کے لیے بھی اس ذہن میں آمادگی موجود ہے۔ شیاطین اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ شیاطین کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع اس وقت ملتا ہے جب والدین ان کی تربیت میں کوتاہی کرتے اور برے ماحول میں ان کو جانے کی اجازت دیتے ہیں جیسا کہ لوگ اپنی اولاد کو مغربی ممالک میں لے جا کر شیاطین کے حوالے کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے اولاد باقیات صالحات بننے کی بجائے شیاطین کی آلہ کار بن جاتی ہے۔

وَشَارِكۡهُمۡ فِی الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ کے ذیل حضرت علی علیہ السلام سے مخاطب ہو کر ابلیس کا یہ قول ہے:

ما ابغضك احد الا سبقت نطفتي في رحم امه قبل ان يسبق نطفة ابيه ولقدشاركت مبغضك في الاموال و الاولاد ...[1]	(اے علی!) آپ سے وہ شخص بغض رکھے گا جس کی ماں کے رحم میں اس کے باپ سے پہلے میرا نطفہ پہنچ گیا ہو گا۔ (اے علی!) آپ سے بغض رکھنے والے کے اموال و اولاد میں شریک ہوتا ہوں۔

جابر بن عبداللہ انصاری اس روایت کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

واقعہ حرہ کے بعد ہم علی علیہ السلام کی محبت سے پہچان لیتے تھے کہ ان میں حلال زادہ کون ہے اور غیر حلال زادہ کون ہے۔

واضح رہے واقعہ حرہ کے موقع پر یزیدی لشکر مدینہ منورہ میں تین دن تک عصمتیں لوٹتا رہا جس سے ایک ہزار کنواری لڑکیاں حاملہ ہو گئیں۔ حسکانی نے شواهد التنزیل میں آیت کے ذیل میں، ابن عساکر نے تاریخ دمشق حالات امیر المؤمنین علیہ السلام میں، خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد ۳: ۲۹۰ میں اس مضمون کی روایت کو مختلف لفظوں میں ذکر کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب طیب الفطرة فی حب العترة۔ حاشیہ شواهد التنزیل وغیرہ۔

اہم نکات

۱۔ شیطان گمراہی کے وسائل سے لیس ہے۔

۲۔ مال و اولاد شیاطین کے حملہ کے زیادہ زد میں ہوتے ہیں۔

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ ؕ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیۡلًا ﴿۶۵﴾

۶۵۔ میرے بندوں پر تیری کوئی بالادستی نہیں ہے اور آپ کا پروردگار ہی ضمانت کے لیے کافی ہے۔

---

[1] شواهد التنزیل ۱: ۴۴۷

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ: شیاطین کے مذکورہ حربوں کے مقابلے میں مؤمن کے پاس عبودیت و بندگی کا اسلحہ موجود ہوتا ہے۔ جس قدر انسان اللہ کے نزدیک ہوتا ہے اتنا ہی شیطان سے دور ہوتا ہے۔ اللہ کے نزدیک ہونے کا راستہ اس کی بندگی ہے۔

۲۔ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیۡلًا: اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کا کارساز اور ضامن ہونے کے اعتبار سے، انہیں شیطان کے شر سے بچاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ شیطان کے مقابلے میں بندگی ہی مؤمن کا اسلحہ ہے۔

رَبُّکُمُ الَّذِیۡ یُزۡجِیۡ لَکُمُ الۡفُلۡکَ فِی الۡبَحۡرِ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِکُمۡ رَحِیۡمًا ﴿۶۶﴾

۶۶۔ تمہارا پروردگار وہ ہے جو سمندر میں تمہارے لیے کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل (روزی) تلاش کرو، اللہ تم پر یقیناً نہایت مہربان ہے۔

تشریح کلمات

یُزۡجِیۡ: (ز ج و) الزجیۃ کسی چیز کو دفع کرنے کے معنوں میں ہے تاکہ چل پڑے۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ یونس آیت ۲۲۔۲۳

وَ اِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ فِی الۡبَحۡرِ ضَلَّ مَنۡ تَدۡعُوۡنَ اِلَّاۤ اِیَّاہُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىکُمۡ اِلَی الۡبَرِّ اَعۡرَضۡتُمۡ ؕ وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ کَفُوۡرًا ﴿۶۷﴾

۶۷۔ اور جب سمندر میں تمہیں کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو سوائے اللہ کے جن جن کو تم پکارتے تھے وہ سب ناپید ہو جاتے ہیں پھر جب اللہ تمہیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو تم منہ موڑنے لگتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ثابت ہوا ہے۔

اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمۡ جَانِبَ الۡبَرِّ اَوۡ یُرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا

۶۸۔ تو کیا تم اس بات سے خائف نہیں ہو کہ اللہ تمہیں خشکی کی طرف زمین میں دھنسا دے یا تم

ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ وَکِیۡلًا ﴿۶۸﴾ پر پتھر برسانے والی آندھی چلا دے پھر تم اپنے لیے کوئی ضامن نہیں پاؤ گے۔

اَمۡ اَمِنۡتُمۡ اَنۡ یُّعِیۡدَکُمۡ فِیۡہِ تَارَۃً اُخۡرٰی فَیُرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیۡحِ فَیُغۡرِقَکُمۡ بِمَا کَفَرۡتُمۡ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ عَلَیۡنَا بِہٖ تَبِیۡعًا ﴿۶۹﴾

۶۹۔ آیا تمہیں اس بات کا خوف نہیں کہ اللہ تمہیں دوبارہ سمندر کی طرف لے جائے پھر تم پر تیز ہوا چلا دے پھر تمہارے کفر کی پاداش میں تمہیں غرق کر دے؟ پھر تمہیں اپنے لیے اس بات پر ہمارا پیچھا کرنے والا کوئی نہ ملے گا۔

تشریح کلمات

حاصب: (ح ص ب) سنگریزوں کو اڑانے والی تیز آندھی۔

قاصف: (ق ص ف) تیز اور سخت ہوا جو درختوں اور عمارتوں کو توڑتی ہوئی چلی جائے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ فِی الۡبَحۡرِ: سمندر میں پیش آنے والے حادثے کی وجہ سے غرق ہونے کا خطرہ ہے تو اس وقت یہ مشرکین اپنے خود ساختہ معبودوں کو بھول جاتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں کیونکہ غرق ہونے کے خوف سے ان کی فطرت پر پڑا ہوا پردہ ہٹ جاتا ہے اور اس رب کی طرف لوٹ آتی ہے جس سے یہ مانوس تھی۔

۲۔ فَلَمَّا نَجّٰىکُمۡ اِلَی الۡبَرِّ: لیکن نجات ملنے پر وہ پردہ دوبارہ اس کی فطرت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اپنی نجات کی نسبت اللہ کی طرف دینے کی بجائے ان وسائل کی طرف دیتا ہے جو اللہ نے فراہم کیے تھے۔

۳۔ اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمۡ: انسان کاملاً اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ دریا میں ہو یا خشکی میں اس کے لیے اللہ کی گرفت سے بچ نکلنا ممکن نہیں ہے۔ خشکی میں اگر وہ زمین میں دھنس جائے، آندھی میں گھر جائے یا سمندر کی لہروں میں پھنس جائے تو اللہ کے علاوہ اسے بچانے والا کوئی نہیں ہے کیونکہ ان تمام چیزوں پر اللہ کی حکومت ہے اور اللہ کی حکومت سے فرار ممکن نہیں ہے۔

وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ وَ حَمَلۡنٰہُمۡ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ وَ رَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ

۷۰۔ اور بتحقیق ہم نے اولاد آدم کو عزت و تکریم سے نوازا اور ہم نے انہیں خشکی اور سمندر میں سواری

الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلۡنٰہُمۡ عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِیۡلًا ﴿۷۰﴾

دی اور انہیں پاکیزہ چیزوں سے روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں بڑی فضیلت دی۔

تفسیر آیات

اولاد آدم کو اللہ تعالیٰ نے دو باتوں سے نوازا ہے: تکریم اور تفضیل۔

تکریم: انسان کو خلق کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو باوقار زندگی بسر کرنے کے سامان فراہم کیے۔ ایسا نہیں کیا کہ انسان اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے خواری اٹھانے پر مجبور ہو۔ چنانچہ اسی آیت میں اس کے دو مصادیق کا ذکر بھی ہے:

۱۔ وَ حَمَلۡنٰہُمۡ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ: انسان کو خشکی اور سمندر میں سواری دی۔ مسافت طے کرنے کے لیے سواری فراہم کرنے میں عزت و تکریم ہے۔ جیسا کہ آپ کسی مہمان کو بلاتے ہیں تو اس کی انتہائی تکریم سواری فراہم کر کے کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ انسان کے لیے خشکی اور سمندر کو مسخر کر دیا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

اَللّٰہُ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَکُمُ الۡبَحۡرَ لِتَجۡرِیَ الۡفُلۡکُ فِیۡہِ بِاَمۡرِہٖ ....[۱]

اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں....

آپ اپنے مہمان کو عزت و تکریم سے نوازنا چاہتے ہیں تو خدمت گزاروں اور نوکروں کو اس کے اختیار میں رکھتے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے انسان کو کسی کے لیے مسخر نہیں فرمایا بلکہ بہت سی دیگر چیزوں کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے۔

۵۴۳

۲۔ وَ رَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ: عزت و تکریم کی خاطر اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو پاکیزہ چیزوں سے روزی عطا کی۔ اگر اللہ تعالیٰ کو انسان کی تکریم منظور نہ ہوتی اور صرف اس کو روئے زمین پر زندہ رکھنا منظور ہوتا تو اس کے لیے جو کا دانہ کافی تھا مگر اس نے انسان کی تکریم کے لیے انواع و اقسام کے کھانے، میوے پیدا کیے اور فرمایا:

ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ...[۲]

وہ وہی اللہ ہے جس نے زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے لیے پیدا کیا۔

تفضیل: وَ فَضَّلۡنٰہُمۡ عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِیۡلًا: وہ وہی اللہ ہے جس نے زمین میں موجود ہر چیز کو تفضیل کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو دوسری مخلوقات پر ترجیح دی اور اسے اضافی چیزیں عنایت فرمائیں۔ ان میں سے اہم چیز جس سے انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دی ہے، عقل ہے جس کی وجہ

---

[۱] ۴۵ جاثیہ: ۱۲　　[۲] ۲ بقرۃ: ۲۹

سے انسان ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو گیا۔

چنانچہ ابتدائی انسان اپنے مقتول بھائی کی لاش چھپانے کا طریقہ نہیں جانتا تھا۔ کوے سے اس طریقے کو سیکھا۔ آج وہ انسان اپنے ارتقائی سفر میں حیرت انگیز مراحل طے کر چکا ہے، جب کہ کوا آج بھی اسی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارتقائی صلاحیت دے کر دوسری مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔ دوسری مخلوقات میں ارتقاء کی صلاحیت نہیں ہے۔ چنانچہ جانور آج ایٹمی دور میں بھی اسی طرح چرتے ہیں جس طرح وہ تخلیق کے ابتدائی دور میں چرتے تھے۔

فضیلت تکوینی: واضح رہے انسان کو اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر تکوینی اور تخلیقی مرحلہ میں دوسروں پر ترجیح دی ہے۔ فضیلت سے مراد تخلیقی ہے، تشریعی نہیں ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرماتا:

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫[1] — بتحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔

نیز فرمایا:

وَّ صَوَّرَکُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَکُمۡ وَ رَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ[2] — اسی نے تمہاری صورت بنائی تو بہترین صورت بنائی اور تمہیں پاکیزہ رزق دیا۔

جیسے

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ...[3] — مرد عورتوں پر نگہبان ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے...

میں بھی مردوں کو عورتوں پر تفضیل تکوینی ہے۔ تشریعاً فضیلت، عمل و کردار کے نتیجے میں ملتی ہے جیسا کہ

فَضَّلَ اللّٰہُ الۡمُجٰہِدِیۡنَ بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ عَلَی الۡقٰعِدِیۡنَ دَرَجَۃً ...[4] — اللہ نے بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ زیادہ رکھا ہے...

یہاں تفضیل، اجر و ثواب کے اعتبار سے ہے مگر انسان کو دوسری مخلوقات پر اور مردوں کو عورتوں پر جو فضیلت دی ہے وہ اجر و ثواب اور عند اللہ قرب و منزلت کے اعتبار سے نہیں بلکہ جسمانی اور تخلیقی اعتبار سے ہے۔

احترام آدمیت: انسانوں میں سے مومن کو اللہ نے تکوینی تکریم و تفضیل کے ساتھ تشریعی اعتبار سے بھی عزت و تکریم سے نوازا ہے:

i۔ غیبت مؤمن حرام ہے۔ اس کا راز فاش اور وقار مجروح کرنا حرام ہے۔

ii۔ اہانت مؤمن حرام ہے۔

iii۔ مومن کی عزت و آبرو کو تحفظ دینا اسلامی حکومت پر فرض ہے۔

iv۔ مؤمن کا تمسخر اڑانا حرام ہے:

---

[1] ۹۵ تین: ۴ [2] ۴۰ مومن: ۶۴ [3] ۴ نساء: ۳۴ [4] ۴ نساء: ۹۵

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا یَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا خَیۡرًا مِّنۡهُمۡ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنۡ نِّسَآءٍ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُنَّ خَیۡرًا مِّنۡهُنَّ ۚ وَ لَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَ لَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ ؕ بِئۡسَ الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِیۡمَانِ ۚ وَ مَنۡ لَّمۡ یَتُبۡ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿﴾ [1]

اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ ہی عورتیں عورتوں کا (مذاق اڑائیں) ممکن ہے کہ یہ ان سے بہتر ہوں اور آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگایا کرو اور ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد نہ کیا کرو، ایمان لانے کے بعد برا نام لینا نامناسب ہے اور جو لوگ باز نہیں آتے پس وہی لوگ ظالم ہیں۔

v۔ مؤمن پر بہتان بڑا گناہ ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡغٰفِلٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ لُعِنُوۡا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۪ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿﴾ [2]

جو لوگ بے خبر پاک دامن مومنہ عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَۃِ شُهَدَآءَ فَاجۡلِدُوۡهُمۡ ثَمٰنِیۡنَ جَلۡدَۃً وَّ لَا تَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَۃً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿﴾ [3]

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں پھر اس پر چار گواہ نہ لائیں پس انہیں اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی گواہی ہرگز قبول نہ کرو اور یہی فاسق لوگ ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لِلّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ فِی بِلَادِهِ خَمْسُ حُرَمٍ حُرْمَةُ رَسُولِ اللّٰهِ ص وَ حُرْمَةُ آلِ رَسُولِ اللّٰهِ ص وَ حُرْمَةُ کِتَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ حُرْمَةُ کَعْبَةِ اللّٰهِ وَ حُرْمَةُ الْمُؤْمِنِ۔ [4]

اللہ تعالیٰ کے ہاں پانچ حرمتیں ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرمت، آل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرمت، کتاب اللہ کی حرمت، کعبہ کی حرمت اور مؤمن کی حرمت۔

روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے کعبہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

حرمة المؤمن اعظم من حرمة هذه البنية ....۔ [5]

مؤمن کی حرمت اس عمارت (کعبہ) کی حرمت سے عظیم تر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ نے اولاد آدم کو بنفسہ عزت و تکریم سے نوازا ہے۔

[1] ۴۹ حجرات: ۱۱ [2] ۲۴ نور: ۲۳ [3] نور: ۴ [4] الکافی ۸: ۱۰۷ [5] الاختصاص صفحہ ۳۲۵

۲۔ انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔

یَوۡمَ نَدۡعُوۡا کُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِہِمۡ ۚ فَمَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیۡنِہٖ فَاُولٰٓئِکَ یَقۡرَءُوۡنَ کِتٰبَہُمۡ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۷۱﴾

۷۱۔ قیامت کے دن ہم ہر گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے پھر جن کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا پس وہ اپنا نامہ اعمال پڑھیں گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہو گا۔

وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿۷۲﴾

۷۲۔اور جو شخص اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ (اندھے سے بھی) زیادہ گمراہ ہو گا۔

تشریح کلمات

الامام: (ا م م) الامام وہ جس کی اقتدا کی جائے خواہ وہ انسان ہو کہ اس کے قول و فعل کی اقتدا کی جائے یا کتاب وغیرہ ہو اور خواہ وہ شخص جس کی پیروی کی جائے حق پر ہو یا باطل پر۔

تفسیر آیات

قرآنی اصطلاح میں امام وہ ہے جو رہنمائی اور دعوت کا کردار ادا کرے خواہ حق کی طرف رہنمائی کرے یا باطل کی طرف۔ چنانچہ ائمہ حق کے بارے میں فرمایا:

وَ جَعَلۡنٰہُمۡ اَئِمَّۃً یَّہۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا ...[1] اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق رہنمائی کرتے تھے...

اور ائمہ باطل کے بارے میں فرمایا:

وَ جَعَلۡنٰہُمۡ اَئِمَّۃً یَّدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ ...[2] اور ہم نے انہیں ایسے رہنما بنایا جو آتش کی طرف بلاتے ہیں.

ان دو آیتوں کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ امام حق وہ ہے جو اپنے مقتدیوں کی اللہ کی طرف راہنمائی کرے اور امام باطل وہ ہے جو اپنے مقتدیوں کو آتش کی طرف دعوت دے۔

اس آیت میں فرمایا: قیامت کے دن ہم ہر گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔ دوسری آیت میں فرمایا: جو شخص اس دنیا میں اندھا رہا وہ قیامت کے دن بھی اندھا رہے گا۔

ان دو آیتوں سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان دنیا میں جس رہبر کی اقتدا کرتا ہے وہ اس کی آخرت کے لیے تقدیر ساز ہے اور جو دنیا میں اندھا رہا ہو وہ آخرت میں اندھا رہے گا۔

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۷۳ [2] ۲۸ قصص: ۴۱

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں امام حق اور امام باطل دونوں موجود ہوتے ہیں کیونکہ قیامت کے دن کُلَّ اُنَاسٍ ہر گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلایا جائے گا تو ہر گروہ کے پاس امام کا ہونا لازمی قرار پایا، خواہ امام حق ہو یا باطل۔ اگر اس گروہ کے پاس امام حق نہیں ہے تو امام باطل ضرور ہوگا۔

چنانچہ مشہور حدیث میں آیا ہے:

وَ اَنَّ مَنْ مَاتَ وَ لَم یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهِ مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً ...[1]

جو اپنے زمانے کے امام کی معرفت کے بغیر مرتا ہے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امامت و ولایت کو نجاتِ آخرت میں کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلَی خَمْسٍ عَلَی الصَّلَاةِ وَالزَّکَاةِ وَالصَّوْمِ وَالْحَجِّ وَالْوَلَایَةِ وَلَمْ یُنَادَ بِشَیْءٍ کَمَا نُودِیَ بِالْوَلَایَةِ۔[2]

اسلام کے ارکان پانچ ہیں: نماز، زکوۃ، روزہ، حج اور ولایت اور جو اہمیت ولایت کو دی گئی ہے کسی اور چیز کو نہیں دی گئی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

لا تمجدون اللّٰہ اذا کان یوم القیامة فدعا کل اناس الی من یتولونه و فزعنا الی رسول اللّٰہ ص و فزعتم الینا فالیٰ أین ترون یذهب بکم؟ الی الجنة و رب الکعبة. قالها ثلاثاً...[3]

کیا تم اللہ کی حمد و ستائش بجا نہیں لاتے کہ جب قیامت کے دن اللہ ہر انسان کو اس شخص کے ساتھ بلائے گا جس کی پیشوائی اس نے قبول کی ہوگی ہمیں رسول اللہ کے ساتھ پکارے گا تو تم ہماری پناہ میں آؤ گے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ تم کو کدھر لے جائیں گے؟ رب کعبہ کی قسم جنت کی طرف۔ اس جملے کو امام نے تین مرتبہ دہرایا۔

اہم نکات

۱۔ فلاح و نجات کا مسئلہ، امامت و رہبری سے مربوط ہے۔

۲۔ نامہ اعمال کے مندرجات کا انحصار امامت پر ہے۔

۳۔ انتخاب رہبر میں جو شخص دنیا میں اندھا رہا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔

---

[1] وسائل الشیعة ۱۶: ۲۴۶ ۳۳ باب تحریم تسمیة المهدی ع و سائر الائمة....　[2] الکافی ۲: ۱۸ باب دعائم الاسلام

[3] مجمع البیان۔ بحارالانوار ۸: ۸ باب ۱۹۔ انه یدعا فیه کل اناس بامامهم

وَ اِنۡ کَادُوۡا لَیَفۡتِنُوۡنَکَ عَنِ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ لِتَفۡتَرِیَ عَلَیۡنَا غَیۡرَہٗ ٭ۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوۡکَ خَلِیۡلًا ﴿۷۳﴾

وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰکَ لَقَدۡ کِدۡتَّ تَرۡکَنُ اِلَیۡہِمۡ شَیۡئًا قَلِیۡلًا ﴿٭ۙ۷۴﴾

اِذًا لَّاَذَقۡنٰکَ ضِعۡفَ الۡحَیٰوۃِ وَ ضِعۡفَ الۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیۡنَا نَصِیۡرًا ﴿۷۵﴾

۷۳۔اور (اے رسول) یہ لوگ آپ کو اس وحی سے منحرف کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے تا کہ آپ (وحی سے ہٹ کر) کوئی اور بات گھڑ کر ہماری طرف منسوب کریں اس صورت میں وہ ضرور آپ کو دوست بنا لیتے۔

۷۴۔ اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو بلاشبہ آپ کچھ نہ کچھ ان کی طرف مائل ہو جاتے۔

۷۵۔ اس صورت میں ہم آپ کو زندگی میں بھی دوہرا عذاب اور آخرت میں بھی دوہرا عذاب چکھا دیتے پھر آپ ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتے۔

شان نزول: اس آیت کے شان نزول میں آیا ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا:

> ہمارے معبودوں کو برا کہنا اور ہماری عقل وشعور پر حملہ کرنا بند کرو اور ان غلاموں کو اپنے سے دور کر دو جن سے ہمیں بدبو آتی ہے تا کہ ہم آپ کی مجلس میں حاضر ہوں اور آپ کی باتیں سنیں۔

جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوچا ان کی بات مان لی جائے تا کہ یہ لوگ اسلام قبول کر لیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

تفسیر آیات

یہ روایت ظاہر آیت کے خلاف ہے۔ آیت کا جملہ یہ ہے کہ اگر اللہ آپ کو ثابت قدم نہ رکھتا تو بعید نہ تھا کہ آپ ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اب چونکہ اللہ نے آپ کو ثابت قدم رکھا ہے لہٰذا آپ کا ان کی طرف جھکنا بعید ہے۔ اس سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت ثابت ہوتی ہے جب کہ روایت کا یہ کہنا ہے کہ آپ میں یہ جھکاؤ آ گیا تھا۔

چنانچہ اس آیت کے بارے میں مامون کے سوال کے جواب میں حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ آیت اور دیگر بہت سی اس قسم کی آیتیں ایاک اعنی فاسمعی یا جارہ (سر دلبراں در حدیث

دیگراں) کے اسلوب میں نازل ہوئی ہیں[1] کہ کسی مسئلہ کو جب زیادہ اہمیت دینا ہو تو اس سلسلے میں براہ راست اپنے رسولؐ سے خطاب ہوتا ہے:

لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ ...[2] اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضرور حبط ہو جائے گا...

لیکن یہاں درحقیقت امت سے خطاب ہے کہ شرک سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس آیت میں بھی اصل خطاب امت سے ہے۔

اہم نکات

۱۔ دشمنان اسلام، اللہ پر افتراء باندھنے والوں کو اپنا دوست بناتے ہیں۔

۲۔ اللہ پر افترا باندھنے والوں کے لیے دوگنا عذاب ہے۔

وَ اِنۡ کَادُوۡا لَیَسۡتَفِزُّوۡنَکَ مِنَ الۡاَرۡضِ لِیُخۡرِجُوۡکَ مِنۡہَا وَ اِذًا لَّا یَلۡبَثُوۡنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۷۶﴾

سُنَّۃَ مَنۡ قَدۡ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ مِنۡ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحۡوِیۡلًا ﴿۷۷﴾

۷۶۔ اور قریب تھا کہ یہ لوگ آپ کے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں تاکہ آپ کو یہاں سے نکال دیں اور اگر یہ ایسا کریں گے تو آپ کے بعد یہ زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکیں گے۔

۷۷۔ یہ ہمارا دستور ہے جو ان تمام رسولوں کے ساتھ رہا ہے جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا اور آپ ہمارے دستور میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

تفسیر آیات

قرآن کی یہ پیشگوئی چند سالوں کے اندر صحیح ثابت ہوئی۔ اس سورہ کے نزول کے کچھ مدت بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور آٹھ سال کا عرصہ نہیں گزرا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد ایک مختصر عرصے میں جزیرۂ عرب مشرکین سے پاک ہو گیا۔

تمام انبیاء علیہم السلام کی قوموں میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جب کسی قوم نے اپنے محسن اور نجات دہندہ کو اپنے ملک سے نکال دیا اور اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی ناشکری کی تو اس قوم کو اللہ نے گوناگون عذاب سے دوچار کر دیا۔

جیسا کہ اس سنت الٰہی کی طرف سورہ ابراہیم آیت ۱۳ میں ارشاد فرمایا:

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِرُسُلِہِمۡ لَنُخۡرِجَنَّکُمۡ اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا: ہم تمہیں اپنی سرزمین

---

[1] بحار الانوار ۱۱: ۸۳ [2] ۳۹ زمر: ۶۵

مِّنۡ اَرۡضِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِیۡ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوۡحٰۤی اِلَیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ لَنُہۡلِکَنَّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿ۙ۱۳﴾

سے ضرور نکال دیں گے یا بہر صورت تمہیں ہمارے دین میں واپس آنا ہوگا اس وقت ان کے رب نے ان پر وحی کی کہ ہم ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے۔

اہم نکات

۱۔ اپنے محسن کی ناقدری کرنے والی قوم فلاح نہیں پاتی۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا ﴿۷۸﴾

۷۸۔ زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب و عشاء کی) نماز قائم کرو اور فجر کی نماز بھی کیونکہ فجر کی نماز (ملائکہ کے) حضور کا وقت ہے۔

تشریح کلمات

دلوك: (د ل ك) دلکت الشمس دلوکا۔ زالت۔ (صحاح) دلوك الشمس کے معنی ہیں آفتاب کا مائل بہ غروب ہونا۔

غَسَقِ: (غ س ق) غَسَقِ الَّیۡلِ کے معنی شب کی سخت تاریکی کے ہیں (راغب) الغسق اول ظلمة اللیل رات کی تاریکی کی ابتدا کے معنوں میں ہیں (صحاح)

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں پانچ نمازوں کے اوقات بیان ہوئے ہیں۔ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے روایت ہے: دلوك الشمس سے مراد زوال آفتاب اور غَسَقِ الَّیۡلِ سے مراد نصف شب ہے اور قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ سے مراد صبح کی نماز ہے۔

چنانچہ زرارہ، حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ان لفظوں میں روایت کرتے ہیں:

دُلُوکُهَا زَوَالُهَا فَفِیمَا بَیْنَ دَلُوكِ الشَّمْسِ اِلَی غَسَقِ اللَّیْلِ اَرْبَعُ صَلَوَاتٍ سَمَّاهُنَّ اللّٰہُ وَ بَیَّنَهُنَّ وَ وَقَّتَهُنَّ وَ غَسَقُ اللَّیْلِ هُوَ انْتِصَافُهُ ثُمَّ قَالَ تَبَارَكَ وَتَعَالَی

دلوک کا معنی زوال آفتاب ہے۔ غَسَقِ الَّیۡلِ تک میں چار نمازیں ہیں جن کا اللہ نے نام لیا ہے اور واضح کیا ہے اور وقت کا تعین کیا ہے اور غَسَقِ الَّیۡلِ آدھی رات تک ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے

وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡهُوۡدًا فهذه الخامسة...۔[1]

فرمایا: وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡهُوۡدًا. یہ پانچویں نماز ہے۔

اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡهُوۡدًا: صبح کی نماز کے بارے میں امامیہ و غیر امامیہ مصادر میں آیا ہے:

صلاۃ الفجر تشهد ہ ملائكة الليل و ملائكة النهار ....[2]

رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے نماز صبح کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

لہٰذا صبح کی نماز، فجر کے اول وقت میں پڑھی جائے تو ان فرشتوں کے مشاہدے میں آتی ہے جو نہایت فضلیت کی بات ہے۔

جمع بین الصلوٰتین: آیت میں نمازوں کے لیے تین اوقات کا ذکر ہے۔

الف: لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ۔ زوال آفتاب۔

ب: غَسَقِ الَّیۡلِ رات کے اندھیرے تک۔

ج: وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ۔ فجر کی نماز

اگرچہ آیت سے پانچ اوقات ظاہر نہیں ہوتے تاہم احادیث وسیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیت کی تشریح ہو جاتی ہے کہ نمازیں پانچ اور اوقات تین کیسے ہیں؟ کیا احادیث اور سیرت نے پانچ نمازوں کے لیے پانچ اوقات کو لازم قرار دیا ہے؟ یا پانچ نمازوں کے لیے تین اوقات کو لازم قرار دیا ہے؟ مجموعی سیرت و احادیث سے ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کو لازم قرار دینا ثابت نہیں ہوتا چونکہ عصر رسالت میں جمعاً و تفریقاً دونوں طریقوں سے نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔ جمعاً پڑھیں تو تفریقاً پڑھنے سے منع نہیں فرمایا اور تفریقاً پڑھیں تو جمعاً پڑھنے سے منع نہیں فرمایا۔

i۔صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے۔ عمرو بن دینا کہتے ہیں: میں نے جابر بن زید سے سنا جو ابن عباس سے روایت کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سبعا جمعا و ثمانيا جمعيا۔ سات رکعتیں (مغرب وعشا) ایک ساتھ اور آٹھ رکعتیں (ظہر و عصر) ایک ساتھ پڑھیں۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوۃ باب وقت المغرب جلد اول صفحہ ۱۴۷۔ صحیح مسلم باب جمع بین الصلوتین جلد اول صفحہ ۱۴۶۔

ii۔ صحیح مسلم اور سنن ترمذی کی روایت ہے۔ ابن عباس راوی ہیں: جمع رسول الله صلى الله عليه (و آله) وسلم بين الظهر والعصر والمغرب والعشاء بالمدينة فى غير خوف و لا مطر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم نے ظہر اور عصر، مغرب اور عشا کو مدینہ میں کسی خوف اور بارش کے بغیر ایک ساتھ جمع کر کے پڑھا۔ ابن عباس سے پوچھا گیا: جمعاً

---

[1] الکافی ۳: ۲۷۱　[2] الکافی ۳: ۲۸۲

پڑھنے کی وجہ کیا تھی؟ تو انہوں نے کہا: اراد ان لا یحرج امته۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے ہیں کہ امت مشقت میں نہ پڑے۔ ملاحظہ ہو صحیح مسلم باب جمع بین الصلوتین، سنن ترمذی باب ماجاء فی الجمع بین الصلوتین۔ ابن مسعود کی روایت کے مطابق کسی خوف اور بارش کے بغیر جب رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم نے جمعاً پڑھی تو سوال ہونے پر فرمایا: صنعت هذا لئلاتحرج امتی۔[1] یہ میں نے اس لیے کیا کہ میری امت کو دشواری نہ ہو۔

مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو شرح صحیح مسلم نووی۔ جس میں جمع بین الصلوة کے حق میں بہت سی احادیث کا ذکر ہے اور کتاب فلك النجاة میں بھی تسلی بخش تحقیق موجود ہے۔

ارسال الیدین: نماز میں ہاتھ باندھنا مستحب ہے یا نہیں، اختلاف ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ ہاتھ باندھنا مستحب ہے، واجب نہیں ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا واجب ہے۔ ہاتھ باندھنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے لہٰذا ہاتھ کھول کر پڑھی جانے والی نماز صحیح ہے۔ جب کہ ہاتھ باندھ کر پڑھی جانے والی نماز مشکوك الصحة ہے۔ ہاتھ باندھنے کے مستحب ہونے پر جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں اس خلاصہ یہ ہے:

صحیح بخاری کی روایت۔ سہل بن سعد راوی ہیں:

کان الناس یؤمرون ان یضع الرجل الید الیمنی علی ذراعه الیسری فی الصلوة۔	لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ نماز میں دایاں ہاتھ، بائیں ذراع (کلائی سے اوپر) رکھا جائے۔

اس میں حکم دینے والے کا ذکر نہیں ہے۔ اگر یہ روایت زمان رسولؐ سے متعلق ہے تو حکم دینے والے رسولؐ ہو سکتے ہیں۔ اگر روایت خلفاء کے زمانے کی ہے تو حکم دینے والے خلفاء ہوں گے۔ پس سہل نے یہ بات کس کے زمانے کی کی ہے؟ معلوم نہیں ہے تو ہوسکتا ہے یہ حکم، فرمان خلفاء میں صادر ہونے والا کوئی حکم ہو۔ چنانچہ قاری حنفی نے شرح موطا میں کہا ہے:

یؤمرون یعنی یأمرهم الخلفاء الاربعة اولامراء۔	یہ امر چاروں خلفاء اور امیروں کی طرف سے ہوتا ہے۔

چنانچہ وضوء کے مسئلے میں ہم نے بیان کیا کہ پاؤں دھونے کا حکم خلیفہ نے دیا تھا۔ اس پر ایک شاہد انس بن مالك کی روایت ہے۔ انہوں نے کہا: کان یؤمر بالسوط۔ تازیانے کا حکم دیا جاتا تھا۔ انس سے پوچھا گیا: کس کے زمانے میں؟ کہا: عمر بن الخطاب کے زمانے میں۔ ملاحظہ ہو المصنف ۱۰: ۵۰۔

ہاتھ باندھنے کے بارے میں طاؤس کی روایت جو سنن ابی داؤد ا: ۴۸۱ میں ہے، مرسلہ ہونے کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں ہے۔ چونکہ طاؤس تابعی تھے۔ اسی طرح حبة الملك بن سعد کی روایت بھی

---

[1] فتح الباری ۳: ۳۰۷

مخدوش ہے چونکہ اس میں کبھی عن رجل کہا ہے، کبھی راوی کا نام تردد کے ساتھ لیا گیا ہے۔اس طرح یہ روایت، مسند اور مرسل میں متردّد ہونے کی وجہ سے قابل عمل نہیں ہے۔

اس روایت کے مقابلے میں معاذ بن جبل کی روایت ہے:

اِن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا کان فی صلاتہ رفع یدیہ قبال اذنیہ فاذاکبر ارسلھماثم سکت:وربما رأیتہ یضع یمینہ علی یسارہ۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نماز میں اپنے دونوں ہاتھوں کو کانوں تک بلند کرتے تھے اور تکبیر کے بعد دونوں ہاتھ چھوڑ دیتے تھے....کبھی میں نے ان کو اپنا دایاں ہاتھ بایاں ہاتھ پر رکھتے دیکھا ہے۔

اس روایت میں ربما "کبھی" کا لفظ قابل توجہ ہے کہ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے طویل قیام کی وجہ سے جہاں پاؤں میں ورم آجاتا تھا، کبھی ہاتھوں میں تھکاوٹ محسوس ہوتی ہو اس لیے ربما "کبھی" ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر تھکاوٹ دور کرنا چاہتے ہوں۔

چنانچہ امام مالک کہتے ہیں:

العزیمۃ فی الارسال والرخصۃ فی الوضع الاخذلان النبی علیہ السلام کان یفعل کذلك وکذاالصحابۃ حتی نزل الدم علی رؤس اصابعھم۔[2]

ہاتھ کھولنا فرض اور باندھنا جائز ہے چونکہ نبی علیہ السلام اور اصحاب ایسا ہی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے ہاتھ کی پوروں میں خون اتر جاتا تھا۔لوگوں نے اس عمل کو دیکھ کر یہ سمجھا ہو کہ ایسا کرنا مستحب ہے۔

یہ کام اگر مستحب ہوتا تو اس پر رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کبھار نہیں، ہمیشہ عمل فرماتے۔

ابن عباس کہتے ہیں: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز دیکھنا ہو تو ابن زبیر کی نماز کی طرح پڑھو۔[3]

ان روایات کے علاوہ باقی روایات بلحاظ سند قابل اعتنا نہیں ہیں لہٰذا شیعہ امامیہ، زیدیہ اور مالکیہ کا موقف صحیح ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں ہاتھ باندھنا مستحب نہیں ہے۔مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بحوث فقھیۃ۔ السید محمد رضا سیستانی دام عزّہ۔

بیان احکام میں اختلاف کیسے ہوتا ہے: امت مسلمہ میں جب کسی مسئلہ پر اختلاف ہوتا ہے تو یہ اختلاف زمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد واقع ہوا ہے۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اصحاب شریعت کے تمام احکام پر عبور نہیں رکھتے تھے۔ رسول اللہؐ کو کبھی کسی حالت میں دیکھ لیا، اسے آگے نقل کر دیا۔چنانچہ مسح علی الخفین کے مسئلہ پر حضرت علی علیہ السلام نے عہد حضرت عمر میں اختلاف کیا تو لوگوں نے کہا: ہم نے خود رسول اللہؐ کو خفین (موزوں) پر مسح کرتے دیکھا ہے۔حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: سورہ مائدۃ

---

[1] معجم الکبیر طبرانی ۲۰: ۶۳ رقم ۱۳۹۔ المصنف لابی شیبہ ۱: ۳۹۱۔
[2] عینی شرح کنزالدقائق حاشیۃ نمبر ۱ صفحہ ۸۷ طبع نول کشور
[3] ابن زبیر ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے ملاحظہ ہو مسند احمد صفحہ ۱۱۹۔مسند عبد اللہ بن عباس نمبر ۲۳۰۸۷۔ سنن ابی داؤد۔

کے نزول سے پہلے یا بعد میں؟ کہا: یہ ہم نہیں جانتے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

وَلَكِنْ اَدْرِى اَنَّ النَّبِىَّ تَرَكَ الْمَسْحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ حِيْنَ نَزَلَتِ الْمَائِدَةُ۔[1]

میں جانتا ہوں۔ جب سورۃ المائدۃ نازل ہوئی رسول خداؐ نے موزوں پر مسح کرنا چھوڑ دیا تھا۔

اسی طرح یہاں بھی ہوا کہ کسی صحابی نے رسول اللہؐ کو نماز میں کبھی ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے دیکھ لیا تو اس بات کو آگے چلا دیا۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اس عمل کی وجہ وقوع کیا ہے؟ تھکاوٹ کی وجہ سے ہے یا سنت کی وجہ سے۔ چنانچہ ابن حزم نے اپنی کتاب المحلی جلد۴ صفحہ۱۱۳ میں لکھا ہے:

حضرت علی علیہ السلام جب نماز میں دیر تک قیام کرتے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں کی کلائی سے بالا، علی زراعه اليسرى، پر رکھتے تھے۔

یعنی دیر تک نماز میں کھڑے رہنے کی وجہ سے ہاتھوں کی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی زراع پر رکھ دیا۔ اگر یہ عمل سنت رسولؐ ہوتا تو حضرت علی علیہ السلام اسے ترک نہ کرتے، ہمیشہ بجا لاتے، نہ صرف قیام لمبا ہونے کی صورت میں۔ اس جگہ حضرت علی علیہ السلام کے ایک اہم فرمان کا خلاصہ ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

سلیم بن قیس الهلالی کہتے ہیں:

میں نے امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے پوچھا: میں سلمان، مقداد اور ابوذر سے تفسیر قرآن اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق کچھ باتیں سنتا ہوں۔ پھر آپ ان کی تصدیق فرماتے ہیں۔ جب کہ دیگر لوگوں کے پاس بہت ساری باتیں اس کے خلاف ہیں، آپ ان کو باطل قرار دیتے ہیں۔ کیا لوگ جان بوجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جھوٹی نسبت دیتے اور قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں؟ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: تم نے پوچھا ہے، اس کا جواب سن لو: لوگوں کے پاس حق کے ساتھ باطل بھی ہے۔ سچ بھی ہے جھوٹ بھی ہے۔ ناسخ بھی ہے منسوخ بھی ہے۔ عام بھی ہے خاص بھی ہے۔ محکم بھی ہے متشابہ بھی ہے۔ محفوظ بھی ہے موہوم بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں ہی ان کی طرف جھوٹی نسبت شروع ہو گئی تھی تو آپؐ نے فرمایا: ايها الناس قد كثر عليّ الكذابة فمن كذب عَليّ متعمداً فليتبوأ مقعده النار۔ لوگو! مجھ پر کثرت سے جھوٹ بولنے والے ہو گئے ہیں۔ جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے، وہ جہنم کو اپنا ٹھکانا بنائے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی ان پر جھوٹ بولا گیا۔ تمہارے پاس چار قسم کے لوگوں کی

[1] مستدرك الوسائل ۱: ۳۳۳

طرف سے احادیث آ جاتی ہیں۔ پہلا شخص وہ ہے جو منافق ہے۔ اسے رسول اللہؐ کی طرف جھوٹی نسبت دینے میں کوئی تأمل نہ ہوگا۔ اگر لوگ جانتے یہ منافق ہے تو اس سے حدیث نہ لیتے لیکن لوگوں نے اس سے حدیث اس لیے لی کہ یہ رسولؐ کا صحابی ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث سن لی مگر بات درست طریقے سے نہ سمجھا کچھ اور خیال میں آیا۔ اس نے جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولا۔ اگر لوگوں کو علم ہو جاتا کہ اس کو غلط فہمی ہوئی ہے تو اس سے حدیث نہ لیتے۔ تیسرا شخص وہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک بات کا حکم دیتے ہوئے سنا بعد میں اس سے منع کرتے نہیں سنا یا منع کرتے ہوئے سنا، حکم دیتے ہوئے نہیں سنا۔ اس نے منسوخ کو سنا اور ناسخ کو نہیں سنا۔ اگر لوگوں کو علم ہو جاتا یہ حکم منسوخ ہے تو یہ حدیث اس سے نہ لیتے۔ چوتھا شخص وہ ہے جس نے نہ جھوٹ بولا، نہ سمجھنے میں غلطی کی اور ناسخ اور منسوخ کا علم بھی رکھتا ہے چونکہ حدیث نبوی قرآن کی طرح ہے جس میں ناسخ منسوخ، عام خاص اور محکم متشابہ ہیں۔[1]

نماز میں ہاتھ باندھنا کب اور کہاں شروع ہوا: تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ باندھنے کی رسم دوسری صدی ہجری میں شام میں، فقیہ شام اوزاعی کے زمانے میں رائج ہوئی۔ چنانچہ حافظ عبدالرحمن بن عمرو النصری المتوفی ۲۸۱ھ کتاب تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی صفحہ ۳۱۹ میں لکھتے ہیں:

حدثنی عبدالرحمن بن ابراهیم عن عبدالله بن یحییٰ المعافری عن حیوة عن بکر بن عمرو انه لَمْ یر ابا اُمامة یعنی ابن سهل واضعا احدی یدیه علی الاخری قط ولا احداً من اهل المدینة حتی قدم الشام فرأی الاوزاعی واناساً یضعونه۔

مجھے عبداللہ بن ابراهیم نے بتایا، انہوں نے عبد اللہ بن یحییٰ معافری سے انہوں نے حیوۃ سے انہوں نے بکر بن عمرو سے سنا کہ انہوں نے یعنی بکر بن عمرو (فقیہ مدینہ) نے ابو امامہ یعنی ابن سہل اور کسی اہل مدینہ کو (نماز میں) ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کبھی بھی نہیں دیکھا۔ جب شام پہنچا تو یہاں اوزاعی (فقیہ شام) اور ان کے چند پیروکاروں کو ہاتھ باندھتے دیکھا۔

نیز ملاحظہ ہو: تهذیب تاریخ دمشق لابن عساکر جلد ۳ صفحہ ۲۹۰ ترجمہ بکر بن عمرو المعافری المصری طبع احیاء التراث العربی بیروت۔ تاریخ دمشق ۱۰: ۲۹۷ ط دار الفکر بیروت۔

---

[1] الکافی ۱: ۶۲ باب اختلاف الحدیث

واضح رہے فقیہ مدینہ ابواُمامہ بن سہل بن حنیف انصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۰۰ ہجری میں وفات پائی۔ لہٰذا پہلی صدی ہجری میں ہاتھ باندھنے کی رسم کہیں بھی رائج نہ تھی۔ البتہ دوسری صدی ہجری میں فقیہ شام عبدالرحمن بن عمرو اوزاعی جو ۸۸ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۵۷ھ میں وفات پائی، کے زمانے میں ہاتھ باندھنے کا رواج شروع ہوا اور مذکورہ عبارت میں واناسا سے معلوم ہوتا ہے کہ شام میں بھی چند لوگ اوزاعی کے ساتھ ہاتھ باندھتے تھے۔ تاریخ دمشق میں عبارت اس طرح ہے: واناساً مَعَہ یضعون ایدیھم۔

ضیاع نماز: ابھی اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کے درمیان موجود ہیں پھر بھی وہ فضا ہی بدل گئی جو عہد رسالت میں موجود تھی۔ خادم رسولؐ حضرت انس سے سنیے اس بارے میں ایک عینی شاہد کے طور پر کیا کہتے ہیں:

عن انس قال: ما اعرف شیئاً مما کان علی عھد النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم۔ قیل الصلوۃ قال: الیس صنعتم ما صنعتم فیھا۔	حضرت انس سے روایت ہے. انہوں نے کہا: عہد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جو کچھ موجود تھا ان میں سے میں کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ کسی نے کہا: نماز تو ہے نا۔ کہا: کیا تم نے نماز میں بھی وہ کچھ نہیں کیا جو تم نے کیا۔

دوسرے نسخے میں ہے:

ضیعتم ما ضیعتم فیھا۔	کیا تم نے نماز میں بھی جو کچھ ضائع کرنا تھا، ضائع نہیں کیا؟

عبد العزیز کا بھائی عثمان بن ابی روّاد راوی ہے کہ میں نے زُھری کو یہ کہتے سنا: میں دمشق میں حضرت انس بن مالک کے ہاں داخل ہوا تو وہ رو رہے تھے۔ میں نے رونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا:

لا اعرف شیئا مما ادرکت الاھذہ الصلوۃ وھذہ الصلوۃ قد ضُیّعت۔	میں نے جو کچھ (عہد نبی میں) پایا ان میں سے کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی سوائے اس ایک نماز کے اور اس نماز کو بھی ضائع کر دیا گیا ہے۔

ملاحظہ ہو: صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوۃ باب تضییع الصلوۃ۔

اہم نکات

۱۔ قرآن نے نماز ظہر وعصر کے لیے دلوك الشمس اور مغرب وعشا کے لیے غَسَقِ الَّیۡلِ سے ہر دو نمازوں کے لیے ایک تعبیر اختیار فرمائی ہے۔

۲۔ مؤمن کو چاہیے کہ صبح کی نماز فرشتہ ہائے شب و روز کے سامنے بجا لائے۔

وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾

۷۹۔ اور رات کا کچھ حصہ قرآن کے ساتھ بیداری میں گزارو، یہ ایک زائد (عمل) صرف آپ کے لیے ہے، امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر فائز کرے گا۔

تشریح کلمات

تہجد: (ھ ج د) الھجود کے معنی نیند کے ہیں۔ نائم آدمی کو ھاجد کہا جاتا ہے اور ھجدتہ فتھجد کے معنی ہیں میں نے اس کی نیند کو دور کیا تو وہ بھاگ گیا جیسا کہ مرضتہ کے معنی ہیں میں نے اس کے مرض کو دور کیا۔

نَافِلَةً: (ن ف ل) نفل، نافلہ کے معنی واجب پر اضافی نماز کے ہیں۔ وہ رضا کارانہ عمل جو واجب کے علاوہ ہے۔

تفسیر آیات

خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے کہ رات کو نیند توڑ کر اٹھ جایا کرو اور بِهٖ کی ضمیر قرآن کی طرف ہے۔ قرآن کے ساتھ نماز پڑھا کرو۔

نَافِلَةً لَّكَ: یہ آپ کے لیے ایک اضافی عمل ہے۔ اس جملے سے بعض مفسرین نے واجب سمجھا ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرائض کے بعد نماز تہجد ایک اضافی فریضہ تھی۔

مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا: محمود کے معنی یہ ہیں کہ ستائش کی جائے۔ یہ لفظ مطلق ہے اور مخصوص نہیں کیا گیا کہ یہ ستائش کن لوگوں کی طرف سے ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ستائش سب کی طرف سے ہوگی۔ امامیہ و غیر امامیہ روایات میں اس بات پر اتفاق ہے کہ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا سے مراد مقام شفاعت ہے۔ چنانچہ شفاعت کے مقام کی ستائش سب کی طرف سے ہوگی۔

امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے:

قیام اللیل مصحة للبدن و مرضاة للرب عزوجل و تعرض للرحمة و تمسك باخلاق النبيّين [1]

رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا صحت بدن اور خوشنودی رب اور رحمت کا موجب اور انبیاء کے اخلاق سے متمسک ہونے کا ذریعہ ہے۔

---

[1] الخصال ۲: ۶۱۲

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ثَلَاثٌ هُنَّ فَخْرُ الْمُؤْمِنِ وَ زَيْنُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ الصَّلٰوةُ فِي آخِرِ اللَّيْلِ وَيَأْسُهُ مِمَّا فِي اَيْدِي النَّاسِ وَ وَلَايَتُهُ الْإِمَامَ مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ ....[1]

تین چیزیں مؤمن کے لیے باعث افتخار اور دنیا و آخرت کی زینت ہیں: آخر شب کی نماز، لوگوں کے مال سے بے نیازی، آل محمد میں سے امام کی ولایت میں اطاعت۔

اہم نکات

۱۔ نماز شب کی فضیلت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو مقام محمود عنایت فرمایا ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۸۰

۸۰۔ اور یوں کہیے: پروردگارا! تو مجھے (ہر مرحلہ میں) سچائی کے ساتھ داخل کر اور سچائی کے ساتھ (اس سے) نکال اور اپنے ہاں سے مجھے ایک قوت عطا فرما جو مددگار ثابت ہو۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعا کی تلقین ہے اور اس تلقین میں اخلاص عمل کی ایک دعوت ہے۔ جو عمل بھی سرزد ہو اس کے بارے میں ظاہر و باطن ایک، نیت اور عمل میں توافق ہو تو وہ سچا ہوتا ہے۔ کسی عمل میں قدم رکھتے ہوئے سچائی یہ ہے کہ جو عمل بجا لایا اور چھوڑا جا رہا ہے، سب محض اللہ کے لیے ہو اور کسی عمل سے فارغ ہوتے ہوئے بھی سچائی یہ ہے کہ اس عمل پر اترائے نہ نام و نمود کی توقع رکھے۔ صرف اللہ کی خوشنودی کی توقع رکھی جائے۔

مفسرین نے اس داخل اور خارج ہونے سے، مکہ سے خارج اور مدینہ میں داخل ہونا مراد لیا ہے چونکہ یہ آیت ہجرت کے قریبی دنوں میں نازل ہوئی ہے لیکن آیت کے الفاظ میں عمومیت ہے۔ اس میں تمام امور شامل ہیں۔

سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا: نفاذ اسلام کے اقتدار و طاقت کی طرف اشارہ ہے کہ حدود اللہ کے اجراء اور عدل و انصاف کے نظام کا قائم کرنا عادلانہ حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ آیت میں فرمایا: وَّاجْعَلْ لِّيْ مجھے

---

[1] الکافی ۸: ۲۳۴

یعنی رسولؐ کو اقتدار عطا فرما۔ اسی طرح رسولؐ کے جانشین کو اگر اقتدار مل جاتا ہے تو عدل قائم ہو جاتا ہے: وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا۔ مجھے اپنے ہاں سے ایک قوت عطا فرما جو مددگار ثابت ہو۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں: اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا قبول فرمائی اور علی بن ابی طالب کو قوت کے طور پر عطا فرمایا جو دشمنوں کے مقابلے میں آپؐ کی مدد کرے۔ ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ذیل آیت۔

اہم نکات

۱۔ کامیابی کا راز تمام مراحل میں سچائی میں مضمر ہے۔

۲۔ نفاذ اسلام کے لیے اقتدار کا حصول مطلوب ہے۔

وَ قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَ زَہَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَہُوۡقًا ﴿۸۱﴾

۸۱۔ اور کہدیجیے: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل کو تو یقیناً مٹنا ہی تھا۔

تفسیر آیات

حق کو بقا کا حق حاصل ہے کیونکہ حق کے عناصر فطری ہوتے ہیں۔ حق کا سرچشمہ صداقت ہے۔ حق کی بقا کے عوامل اس کے اپنے ذاتی ہوتے ہیں۔

جب کہ باطل کے عناصر غیر فطری ہوتے ہیں۔ اس کے عوامل بھی وقتی اور بیرونی ہوتے ہیں۔ اس لیے باطل خس و خاشاک کی مانند وقتی اچھل کود کرتا ہے:

کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡحَقَّ وَ الۡبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡہَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ....[1]

اس طرح اللہ حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے پھر جو جھاگ ہے وہ تو ناکارہ ہو کر ناپید ہو جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے فائدے کی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے ....

یہ اعلان مکی زندگی کے نہایت سنگین مظالم کے سائے میں ہو رہا ہے۔ ان مظالم سے تنگ آ کر کچھ مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور بظاہر کامیابی کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اسی مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بتوں پر ضرب لگا رہے ہیں اور اسی آیت کی تلاوت فرما رہے ہیں۔

جابر بن عبد اللّٰہ انصاری روایت کرتے ہیں:

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ فتح مکہ کے موقع پر مکہ داخل ہوئے تو کعبہ کے

---

[1] ۱۳ رعد: ۱۷

گرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر سب بتوں کو گرا دیا مگر کعبہ پر ایک طویل بت نصب تھا جسے ہبل کہتے تھے۔ رسول اللہؐ نے علی علیہ السلام سے فرمایا: یا علیؑ ! آپ مجھ پر سوار ہوں گے یا میں آپ پر سوار ہو جاؤں؟ عرض کیا: آپ مجھ پر سوار ہو جائیں لیکن سوار ہونے پر علی علیہ السلام رسالت کا بوجھ نہ اٹھا سکے تو میں (علی) نے کہا: میں سوار ہوتا ہوں۔ علیؑ دوش رسولؐ پر فائز ہوئے تو فرمایا:

فو الذّی خلق الحبة و برء النسمة لو اردت ان اَمس السمآء لمستَها بیدی فالقیت ھبل عن ظھر الکعبة۔	قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو شگافتہ اور لوگوں کو خلق کیا۔ اگر میں آسمان کو چھونا چاہتا تو چھو سکتا تھا۔ پھر میں نے کعبہ سے ہبل کو گرا دیا۔

اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ ....

ملاحظہ ہو مستدرك حاکم کتاب التفسیر۔ تفصیل کے لیے رجوع فرمائیں تعلیقات شواھد التنزیل۔

اہم نکات

۱۔ باطل کو بقا و دوام کا حق حاصل نہیں ہے۔

۲۔ اہل حق باطل کی اچھل کود سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ وہ حق کے ظہور کا انتظار کرتے ہیں۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۙ وَلَا يَزِيۡدُ الظّٰلِمِيۡنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾	۸۲۔ اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے تو شفا اور رحمت ہے لیکن ظالموں کے لیے تو صرف خسارے میں اضافہ کرتی ہے۔

تفسیر آیات

اہل ایمان اگرچہ ایمان کی منزل پر فائز ہیں تاہم بعض اخلاقی اور روحانی بیماریوں سے بھی دوچار رہتے ہیں۔ جاہ پرستی، خوش پرستی، مال دولت سے محبت، حسد اور کینہ جیسی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں اور کبھی ایمان کے ساتھ شک اور ایمان میں اضطراب آ جاتا ہے۔

ایسی بیماریوں کے لیے قرآن شفا فراہم کرتا ہے۔ قرآن کی تلاوت اور براہین و دلائل کی شیرینی روحانی و اخلاقی بیماریوں کی تلخی کو دور کر دیتی ہے۔ قرآن کا صحیح مطالعہ کرنے سے انسانی نفس کو جلا ملتی ہے اور نفس انسانی میں موجود رذائل کا ملبہ ہٹا دیا جاتا ہے جسے علم اخلاق کی اصطلاح میں تخلیہ کہتے ہیں۔

ملبہ ہٹنے کے بعد زمین ایک جدید اور کامل عمارت کے لیے ہموار ہو جاتی ہے اور نفس انسانی میں رحمت الٰہی کے شامل حال ہونے کی اہلیت آ جاتی ہے۔ اسی لیے پہلے شفا اور اس کے بعد رحمت کی نوبت آ جاتی ہے اور نفس کی بیماریوں سے جو کچھ ہاتھ سے دیا تھا وہ سب رحمت کی وجہ سے واپس مل جاتا ہے اور مزید نعمتیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔

وَلَا یَزِیۡدُ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا خَسَارًا: چنانچہ رذائل کا ملبہ نہ ہٹنے کی وجہ سے ظالموں میں یہ اہلیت نہیں آتی اور رحمت خدا ان کے شامل نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے رحمت خدا سے محرومی اور نفس کی بیماریوں میں مبتلا شخص ہر لحہ اپنی متاع زندگی میں خسارہ اٹھاتا ہے اور قرآن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد منکرین کا خسارہ بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح قرآن بہ یک وقت مؤمن کے لیے شفا و رحمت اور ظالموں کے لیے خسارے کا باعث ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت ہے:

وَ شِفَاءُ لَا تُخْشَی اَسْقَامُهُ...۔[1]

وہ (قرآن) سراسر شفا ہے جس کے ہوتے ہوئے بیماریوں کا کھٹکا نہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

فَاسْتَشْفُوهُ مِنْ اَدْوَائِكُمْ وَ اسْتَعِينُوا بِهِ عَلَى لَأْوَائِكُمْ فَاِنَّ فِيهِ شِفَاءً مِنْ اَكْبَرِ الدَّاءِ وَ هُوَ الْكُفْرُ وَ النِّفَاقُ وَ الْغَيُّ وَ الضَّلَالُ...۔[2]

اس سے اپنی بیماریوں کی شفا چاہو اور اپنی مصیبتوں پر اس سے مدد مانگو اس میں کفر و نفاق اور ہلاکت و گمراہی جیسی بڑی بڑی مرضوں کی شفا پائی جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ حجت خدا (قرآن) مومن کے لیے رحمت اور ظالم کے لیے خسارہ ہے۔

۲۔ یہ انسان کے ہاتھ میں ہے کہ قرآن سے شفا حاصل کرے یا اپنا خسارہ بڑھائے۔

وَ اِذَاۤ اَنۡعَمۡنَا عَلَی الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِہٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ کَانَ یَـُٔوۡسًا ﴿۸۳﴾

۸۳۔ اور جب ہم انسان کو نعمتوں سے نوازتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے اور اپنی کروٹ پھیر لیتا ہے اور جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔

قُلۡ کُلٌّ یَّعۡمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ ؕ

۸۴۔ کہدیجیے: ہر شخص اپنے مزاج و طبیعت کے

---

[1] نہج البلاغۃ۔ خطبہ ۱۹۶　[2] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۷۶

فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿٨٤﴾	مطابق عمل کرتا ہے، پس تمہارا رب بہتر علم رکھتا ہے کہ کون بہترین راہ ہدایت پر ہے۔

تشریح کلمات

شَاكِلَتِهٖ : (ش ك ل) شاكلة اى على جديلته و طريقته و جهته (صحاح)

شاكلة اى ناحيته و طريقته بدليل قوله هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا اى طريقا (مجمع البحرين) اس تشریح کے مطابق شَاكِلَتِهٖ طریقہ کے معنوں میں ہے۔ ویقال شاكلته اى خليقته و طبيعته۔ اس کے مطابق شَاكِلَتِهٖ مزاج اور طبیعت کے معنوں میں ہے۔ تفسیر علی بن ابراهيم میں آیا ہے: اى نيته۔ شَاكِلَتِهٖ کے معنی نیت کے ہیں۔ (مجمع البحرين)

تفسیر آیات

جس انسان کی شخصیت میں ایمان و بندگی راسخ نہیں ہے وہ شخصیت بے ثباتی، بے سکونی اور عدم استحکام کا شکار ہوتی ہے۔ حوادث روزگار کا معمولی جھٹکا اس کی شخصیت کو منہدم کر دیتا ہے۔ نعمتوں کی فراوانی ہو یا گردش ایام کا کوئی ناگوار حادثہ دونوں حالتوں میں وہ اپنی شخصیت میں اعتدال برقرار نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ نعمت کی فراوانی کی صورت میں سرکش ہو جاتا ہے اور کسی ناگوار حادثہ کی صورت میں یاس و نومیدی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿١٩﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿٢٠﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿٢١﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿٢٢﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿٢٣﴾ [1]	انسان یقیناً کم حوصلہ خلق ہوا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، سوائے نماز گزاروں کے، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔

لہٰذا جس کی شخصیت ایمان و بندگی پر استوار ہے وہ نعمتوں میں شاکر اور مصیبتوں میں صابر ہوتا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان (کو اگر ایمان و بندگی سے دور رکھا جائے تو اپنی جگہ) نہایت کھوکھلا ثابت ہوا ہے۔ نہ خوشحالی کی صورت میں توازن برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ ہی مصیبت برداشت کر سکتا ہے۔

مصیبت کے متحمل نہ ہونے اور یاس و نومیدی کا شکار ہونے کے بعد اگر اس کی فطرت بیدار ہو جاتی ہے اور اپنے خالق حقیقی کی پناہ میں چلا جاتا ہے تو یہ دوسرا مرحلہ ہے۔ لہٰذا اس آیہ شریفہ کا دیگر ان آیات سے کوئی تصادم نہیں جو فرماتی ہیں:

---

[1] ۷۰ معارج: ۱۹ تا ۲۳

وَمَا بِكُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيۡهِ تَجۡـئَرُوۡنَ ۝[1]

اور تمہیں جو بھی نعمت حاصل ہو وہ اللہ کی طرف سے ہے پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو تم اس کے حضور زاری کرتے ہو۔

ان آیات کا تعلق دوسرے مرحلے سے ہے۔ اس قسم کا کھوکھلا انسان پہلے یاس و ناامیدی کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی فطرت جاگ جاتی ہے اور وہ اللہ کے حضور زاری کرتا ہے یا ممکن ہے اس کا تعلق ان لوگوں سے ہو جو فطری تقاضوں سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی فطرت کی بیداری کی نوبت نہیں آتی اور یاس و ناامیدی کا شکار رہتے ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا: كُلٌّ يَّعۡمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ہر شخص اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے۔ شَاكِلَتِهٖ بمعنی طریقہ لینے کی صورت میں آیت کا مطلب یہ بنتا ہے: مومن اور ظالم کا طریقہ عمل جدا ہوتا ہے۔ مومن قرآن سے شفا و رحمت حاصل کرتا ہے اور ظالم اسی قرآن سے خسارہ اٹھاتا ہے۔ مومن نعمت کے موقع شاکر اور مصیبت کے موقع پر صابر رہتا ہے۔ جب کہ ظالم نعمت کے موقع پر اتراتا ہے اور مصیبت کے موقع پر یاس کا شکار ہو جاتا ہے۔

آیت کا ذیل فَرَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِمَنۡ هُوَ اَهۡدٰى سَبِيۡلًا قرینہ بن سکتا ہے کہ شَاكِلَتِهٖ طریقہ کے معنوں میں ہے چونکہ سبیل، وہی طریقہ ہی ہے۔ ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے۔ پس تمہارا رب بہتر جانتا ہے کون بہتر طریقے پر ہے۔

اگر لفظ شَاكِلَتِهٖ کو خلق و طبیعت کے معنوں میں لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ بنے گا: مومن اور ظالم میں سے ہر شخص اپنے اپنے مزاج و طبیعت کے مطابق عمل بجا لاتا ہے۔ انسان کا کردار اس کا ضمیر فاش کرتا ہے اور ظاہری عمل باطنی ترجیحات پر دلالت کرتا ہے۔ اگر انسان اپنے مزاج و طبیعت میں عادل ہے تو اس سے عمل صالح نہایت آسانی سے صادر ہو جاتا ہے اور جس کا مزاج ظلم پسند ہے اس سے کار خیر سرزد نہیں ہوتا۔ درحقیقت ان دونوں معنوں کا نتیجہ ایک ہی ہے چونکہ ہر ایک کا طریقہ عمل اپنا ہوتا ہے لیکن اس کا محرک اس کا اپنا خلق و طبیعت ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لَو عَلِمَ النَّاسُ كَيفَ خَلَقَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى هَذَا الْخَلْقَ لَمْ يَلُمْ اَحَدٌ اَحَداً۔[2]

اگر لوگوں کو یہ علم ہو جائے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے لوگوں کو کس طرح خلق فرمایا ہے تو کوئی کسی کی ملامت نہ کرتا۔

ممکن ہے اشارہ انسانی D.N.A میں موجود جین Gene کی طرف ہو جس میں وہ بنیادی نقشہ ہوتا

---

[1] ۱۶ نحل: ۵۳
[2] الکافی ۲: ۴۴

ہے جس پر آگے چل کر انسان کی شخصیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے:

وَ النِّيَّةُ اَفْضَلُ مِنَ الْعَمَلِ اَلَا وَ اِنَّ النِّيَّةَ هِيَ الْعَمَلُ ثُمَّ تَلَا قَوْلَهُ عَزَّ وَ جَلَّ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ يَعْنِي عَلَى نِيَّتِهِ۔[1]

اور نیت عمل سے افضل ہے بلکہ نیت ہی عمل ہے، اس کے بعد آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ یعنی شاکلہ کے معنی نیت ہے۔

اس سے بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے. ہر ایک کی نیت اس کے خلق وخو کے تابع ہے اور اسی سے اس کے طریقہ عمل کا تعین ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ظالم انسان کھوکھلا اور عدم توازن کا شکار ہوتا ہے۔

۲۔ انسان کا عمل اس کے ضمیر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

۸۵۔ اور لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہدیجیے: روح میرے رب کے امر سے متعلق (ایک راز) ہے اور تمہیں تو بہت کم علم دیا گیا ہے۔

شان نزول: ابن عباس راوی ہیں کہ مشرکین قریش نے یہودیوں سے کہا: ہمیں کوئی ایسی بات بتلا دیں کہ ہم اس شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھ لیں۔ جس پر یہودیوں نے کہا: اس سے روح کے بارے میں پوچھ لو اور دیکھ لو کیا جواب ملتا ہے.... الی آخر۔[2]

تفسیر آیات

روح: اس قوت کا نام ہے جس سے "حیات" کی بنیاد پڑتی ہے۔ اسی سے علم اور ہدایت کو بھی روح کہتے ہیں جن سے حیات مزید فعال ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن اور وحی کو روح کہا گیا ہے۔

حیات کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ابھی تک ایک سربستہ راز ہے جو سینۂ قدرت میں پنہان ہے تاہم سائنسدانوں کو اس سلسلے میں کچھ پیشرفت حاصل ہوئی ہے۔

چنانچہ ۲۶ جون ۲۰۰۰ء کو ایک عظیم انکشاف کا اہم ترین دن قرار دیا گیا اور دعویٰ کیا گیا کہ اس روز سینہ کائنات میں پوشیدہ ایک راز "راز حیات" سے پردہ اٹھ گیا اور انسان کے D.N.A میں موجود تین ارب

---

[1] الکافی ۲: ۱۶۔ نور الثقلین ۲: ۱۱۴ [2] مجمع البیان ذیل آیہ

سالموں کی منظم ترتیب کے ذریعے جنیاتی کوڈ کا معمہ حل ہو گیا۔ اس انکشاف سے یہ بات واضح ہو گئی کہ تمام زندہ موجودات کے لیے جبلتی ہدایات اللہ نے خلیات (Cell) کے مرکزی حصے D.N.A میں ودیعت فرمائی ہیں جو تین ارب چھوٹے سالموں پر مشتمل ہے اور حیات کا راز انہیں سالموں اور ان کی منظم ترتیب میں پوشیدہ ہے۔

اس آیہ شریفہ میں روح سے کیا مراد ہے؟ مفسرین میں بڑا اختلاف ہے۔ ان اقوال میں دو قول قابل ذکر ہیں:

i۔ روح سے مراد جبرائیل امین ہیں کہ لوگوں نے جبرئیل کے بارے میں سوال کیا تھا۔

ii۔ روح سے مراد وہی قوت ہے جو منبع حیات ہے۔ ہم بھی اسے اختیار کرتے ہیں۔

علامہ طباطبائی نے اس جگہ ایک اہم نکتہ بیان فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

روح کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہاں قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ .... کا اضافہ فرمایا: اس میں مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ، جیسا کہ یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِہٖ ....[1]، یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ ..[2] وَکَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ....[3] تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوۡحُ فِیۡہَا بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ ۚ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ ۔[4] ان سب میں فرمایا۔ روح کا تعلق عالم امری سے ہے۔ عالم امری کے بارے میں فرمایا: اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۔[5] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امر خدا سے مراد قول خدا کُنۡ ہے اور کُنۡ کلمہ ایجاد اور ایجاد فعل خدا ہے۔ لہٰذا قول خدا، فعل خدا سے عبارت ہے۔ آیہ وَمَاۤ اَمۡرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمۡحٍۭ بِالۡبَصَرِ ۔[6] اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قول خدا فعل خدا ہے اور اس امر میں اسباب وجودیہ بروئے کار نہیں لائے جاتے۔ اس لیے اسے کَلَمۡحٍۭ بِالۡبَصَرِ چشم زدن کہا ہے۔ عالم اسباب سے متعلق اللہ کا عمل، زمانی اور تدریجی ہے اور جو عمل عالم اسباب سے متعلق نہیں، وہ غیر زمانی ہے۔ جو عمل زمانی و تدریجی ہے اسے خلق کہتے ہیں اور جو عمل غیر زمانی ہے، اسے امر کہتے ہیں۔ لہٰذا خلق وہ ہے جو اسباب وعلل کے ذریعے اللہ کی طرف منسوب ہو اور امر وہ ہے جو براہ راست اللہ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ .... [7] آگاہ رہو آفرینش بھی اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔ روح کا تعلق بھی عالم امر سے ہے جو غیر زمانی ہے اور بغیر علل و اسباب کے توسط کے براہ راست اللہ کی طرف منسوب ہے۔

---

[1] ۴۰ مومن: ۱۵　[2] نحل: ۲　[3] ۴۲ شوری: ۵۲　[4] ۹۷ قدر: ۴

[5] ۳۶ یس: ۸۲　[6] ۵۴ قمر: ۵۰　[7] ۷ اعراف: ۵۴

ممکن ہے آنے والا زمانہ اس راز سے پردہ اٹھائے کہ روح اور حیات کا تعلق کس طرح براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہے۔ ملاصدرا روح کو مادی الحدوث روحانی البقاء سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک روح مادہ کے ارتقاء کا آخری نتیجہ ہے۔ یعنی روح مادے کی گود میں پلتی ہے، پھر مستقل اور مستغنی عن المادہ ہو جاتی ہے۔

استقلال روح: ہم اس بات پر چند شواہد پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ روح اپنا مستقل وجود رکھتی ہے چونکہ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ روح کسی مستقل وجود کا نام اور غیر مادی نہیں ہے بلکہ روح بھی مادہ ہی ہے اور مادے کے طبیعیاتی اور کیمیائی عمل سے عبارت ہے:

i۔ سچے خواب: خواب میں انسانی روح اپنے دماغ کے طبیعیاتی عمل سے استفادہ کیے بغیر از خود سماعت و بصارت کی قوت رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ خواب میں آوازوں کو سنتی، باتوں کو سمجھتی ہے، شکلوں کو پہچان لیتی ہے حالانکہ جن چیزوں کو خواب میں دیکھا، جن آوازوں کو سنا، جن شکلوں کو پہچانا ہے یہ سب طبیعیاتی اور کیمیائی عمل سے نہیں گزرے، اس کی آنکھیں خواب کی حالت میں بند ہیں۔ کانوں سے کوئی طبیعی آواز نہیں ٹکرائی اس کے باوجود جو کچھ اس نے خواب میں دیکھا وہ سچا اور واقع کے عین مطابق ثابت ہو جاتا ہے۔

ii۔ ارادہ: پانچ کلومیٹر مسافت طے کرنے کے لیے گاڑی کو ایک لیٹر پیٹرول کی ضرورت ہے تو پچاس کلومیٹر طے کرنے کے لیے دس لیٹر کی ضرورت ہے اور ممکن نہیں پانچ لیٹر کفایت کرے۔ یہ قانون دنیا کے کسی گوشے میں بھی قابل استثنا نہیں ہے۔

مگر جو ارادہ سو کلومیٹر طے کرنے کے لیے درکار ہے اسی قسم کا ارادہ ہزار کلومیٹر طے کرنے کے لیے درکار ہے۔

اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ عزم و ارادہ روح کا عمل ہے۔ اس لیے یہ فیزیکل قواعد اور مادی قوانین سے خارج ہے۔

iii۔ مادہ کی تبدیلی: انسان کا مادی وجود ہر سات سال میں کلی طور پر بدل جاتا ہے لیکن انسان اپنی طفولیت سے بڑھاپے تک ایک حقیقت واحدہ رہتا ہے۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے: انسان کا جسم ایک شہر کی طرح ہے جس کی مختلف عمارتیں گرتی بنتی رہتی ہیں اور سو دو سو سالوں میں پورا شہر بدل جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی جسم کھربوں خلیوں (Cells) پر مشتمل ہے اور خلیے کی بھی عمر ہوتی ہے۔ بوسیدہ سیلز مر جاتے ہیں ان کی جگہ خون نئے سیلز بناتا ہے۔ اس طرح ہمارا مادی وجود سات سالوں میں بدل جاتا ہے لیکن اس سے ہماری شخصیت کی وحدت متاثر نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا جو بدلتا ہے وہ مادہ ہے اور جو نہیں بدلتا وہ

روح ہے۔

iv۔فکری صلاحیت: کہتے ہیں کہ انسانی دماغ میں بارہ ملین سیلز موجود ہیں لیکن انسانی دماغ دس لاکھ ملین معلومات کے ادراک کی قابلیت رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا انسانی فکر روح کا عمل ہے، دماغی خلیات میں محدود نہیں ہے۔

v۔روح کی توجہ: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے انسان کے پہلو میں ایک گفتگو ہو رہی ہے اور وہ انسان کسی اور بات میں مشغول ہے۔ اس گفتگو کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ اس گفتگو کی آواز کی لہریں سماعت کے اعصاب سے ٹکرا رہی ہیں، یہ لہریں دماغ تک پہنچ رہی ہیں اور مادی عمل مکمل ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود انسان اس آواز کو نہیں سن پاتا چونکہ اس کی روح متوجہ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر یہ ادراک مادی اور طبیعاتی عمل سے عبارت ہوتا تو اس کے ادراک کے لیے طبیعاتی عمل مکمل ہونے کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیے۔ جب کہ ہم نے دیکھا ہے کہ روح متوجہ نہ ہونے کی صورت میں طبیعیاتی عمل سے کوئی ادراک عمل میں نہیں آیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دماغ روح کا آلہ کار ہے۔

روح کے مادی ہونے پر دلائل

i۔روح چونکہ دائرہ تجربہ میں آتی ہے نہ ہمارے حواس میں۔ جو چیز حواس میں نہیں آتی اسے ہم قبول نہیں کرتے۔

جواب: اولاً ان کی یہی بات خود غیر تجرباتی ہے۔ ثانیاً تجربات سے کلی نتائج اخذ کرنے کے لیے غیر تجرباتی امو کو ماننا پڑتا ہے چونکہ تجربہ تمام افراد پر نہیں ہوتا بعض پر ہوتا ہے پھر عقلی کلیہ کے ذریعے تمام افراد پر لاگو کیا جاتا ہے۔ ثالثاً غیر تجرباتی امور کو اگر وہ قبول نہیں کر سکتے ہیں تو مسترد بھی نہیں کر سکتے کیونکہ جیسا کہ قبول کرنے کے لیے تجربہ درکار ہے تو مسترد کرنے کے لیے بھی تجربے کی ضرورت ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو سورہ بقرۃ آیت ۳۔

ii۔فکری فعالیت دماغی حالات سے متاثر ہوتی ہے۔ مثلاً دماغ کا ایک حصہ بیکار ہو جائے تو انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ فکری فعالیت سے دماغی سطح پر تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ سوچنے سے دماغ زیادہ غذا لیتا ہے۔ زیادہ سوچنے والوں کا دماغ زیادہ بڑا ہوتا ہے وغیرہ۔

جواب: روح جب تک اس بدن کی حدود میں ہوتی ہے تو روح سوچنے کے لیے دماغ کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرتی ہے اور اس آلہ کے ذریعے ہی سوچ سکتی ہے۔

دماغ خود سوچنے اور درک کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اگر دماغ خود درک کرنے اور سوچنے کی صلاحیت رکھتا تو روح کی توجہ کے بغیر یہ کام انجام پانا چاہیے تھا جب کہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ روح

متوجہ نہ ہونے کی صورت میں اگر صوتی لہریں دماغ تک پہنچ بھی جائیں دماغ آواز کو درک نہیں کرتا کیونکہ روح اس دماغ کو استعمال نہیں کر رہی۔

روح اور بدن کا تعلق: روح کو ہم غیر مادی مانتے ہیں تو اس صورت میں روح بدن میں تدبیر کنندہ کی حیثیت سے موجود ہے۔ چونکہ روح غیر مادی ہے اس کے لیے مکان کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا جسم انسانی روح کے لیے مکان نہیں ہے، نہ ہی روح نے جسم میں حلول کیا ہوا ہے بلکہ روح، جسم کی حاکم و مدبر ہے۔

کیا روح کسی قسم کے جسم کے بغیر موجود ہو سکتی ہے یا اسے کسی قسم کا جسم درکار ہے؟ اس سلسلے میں جواب مثبت ہے۔ روح کسی نہ کسی قسم کے جسم میں ہوتی ہے:

i۔ عالم ذر کا جسم: اس کی حقیقت معلوم نہیں ہے کہ عالم ذر میں وقتی طور پر کس قسم کے جسم میں موجود رہی ہے۔

ii۔ فیزیکلی جسم: رحم مادر سے لے کر مرنے تک جس مادی جسم میں ہماری روح موجود ہے۔

iii۔ برزخی جسم: مرنے کے بعد سے لے کر قیامت تک جس جسم میں ہوتی ہے اسے برزخی جسم کا نام دے سکتے ہیں۔

iv۔ آخرت کا فیزیکلی جسم: قیامت کے موقع پر جنت یا جہنم میں اس روح کو جس قسم کا جسم میسر آئے گا وہ یقیناً دنیوی فیزیکلی جسم سے مختلف ہو گا۔ وہاں زمان و مکان و دیگر محسوسات، مشاہدات و ادراکات اس دنیا سے مختلف ہوں گے۔

v۔ اثیری جسم: جدید علم ارواح کے ماہرین اس قسم کے جسم کے قائل ہیں مگر اس عقیدے کے مطابق ایک روح متعدد فیزیکلی جسموں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ۵۶۸

یہ دراصل تناسخ الارواح کا عقیدہ ہے جو اسلامی نظریات کے ساتھ متصادم اور باطل نظریہ ہے۔

کیا غیر مادی روح مادی جسم کی محتاج ہے؟: روح، غیر مادی ہونے کی وجہ سے زمان و مکان سے بالاتر ہے تاہم روح کے دو مختلف حالات ہیں۔ ایک حالت میں ممکن ہے کہ روح جسم کی محتاج نہ ہو لیکن جہاں کمالات کا حصول جسم پر موقوف ہے وہاں روح بھی جسم کی محتاج ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، جہاد و دیگر اطاعات کے ذریعے روح ارتقاء حاصل کرتی ہے۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ مباحث وحی۔

اہم نکات

۱۔ روح کا تعلق امر ربی کُنۡ فَیَکُوۡنُ سے ہے: مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ ....

۲۔ علم اللہ کی طرف سے دیا جاتا ہے: وَمَآ اُوۡتِیۡتُمۡ ....

۳۔ بشر کا علم قلیل ہوتا ہے: اِلَّا قَلِیۡلًا۔

وَلَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡهَبَنَّ بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیۡنَا وَكِیۡلًا ﴿۸۶﴾

۸۶۔ اور اگر ہم چاہیں تو ہم نے جو کچھ آپ کی طرف وحی کی ہے وہ سب سلب کر لیں پھر آپ کو ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہیں ملے گا۔

اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضۡلَهٗ كَانَ عَلَیۡكَ كَبِیۡرًا ﴿۸۷﴾

۸۷۔سوائے آپ کے رب کی رحمت کے، آپ پر یقیناً اس کا بڑا فضل ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ربط کلام اس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہیں تو بہت کم علم دیا گیا ہے اور جو کچھ اے رسول! آپ کو وحی کے ذریعے دیا گیا ہے اس کا بھی حال یہ ہے کہ ہم اگر چاہیں تو وہ سب سلب کر سکتے ہیں اور اگر ہم سلب کرنے پر آئیں تو ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہیں ملے گا جو سلب کرنے نہ دے۔

۲۔ اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ: صرف آپ کے پروردگار کی رحمت ہے جو اس جگہ آپ کے کام آسکتی ہے۔

۳۔ اِنَّ فَضۡلَهٗ كَانَ عَلَیۡكَ كَبِیۡرًا: اوپر کی بات ایک اصولی موقف کا بیان ہے ورنہ عملاً نہ اللہ اس علم کو آپؐ سے سلب کرے گا، نہ آپؐ کو رحمت رب کے سوا کسی اور حمایتی کی ضرورت ہے۔ آپؐ پر یقیناً اللہ کا بڑا فضل ہے۔ جس پر اللہ کا بڑا فضل ہے اس سے وہ فضل سلب نہیں ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ جس چیز کو اللہ سلب کرے اسے کوئی بچا نہیں سکتا۔

۲۔ رسول اللہؐ کی ذات پر اللہ کی طرف سے وہ فضل ہوا ہے جسے اللہ تعالیٰ كَبِیۡرًا سے تعبیر فرماتا ہے۔

قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَ الۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَلَوۡ كَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِیۡرًا ﴿۸۸﴾

۸۸۔ کہد یجیے: اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو وہ اس کی مثل لا نہیں سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

تفسیر آیات

یہ چیلنج جو فضائے ارضی میں صدیوں سے گونج رہا ہے ایک جامع تحدّی ہے جس میں کسی زمانے کی حد بندی نہیں ہے۔ اس میں کسی صنف خاص کی قید نہیں ہے، جن وانس سب کے لیے یکساں ہے۔ جن و انس انفرادی طور پر بھی نہیں سب مل کر اس جیسا قرآن تیار کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ بقرۃ آیت ۲۳۔۲۴

اہم نکات

۱۔ قرآن کا چیلنج آج بھی فضا میں گونج رہا ہے۔

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا لِلنَّاسِ فِیۡ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ کُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰۤی اَکۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوۡرًا ﴿۸۹﴾

۸۹۔ اور بتحقیق ہم نے اس قرآن میں ہر مضمون کو لوگوں کے لیے مختلف انداز میں بیان کیا ہے لیکن اکثر لوگ کفر پر ڈٹ گئے۔

تفسیر آیات

ہمیں قرآن میں انسان کے عقل و خرد سے کام ہے اس لیے ہم نے رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک محسوس معجزہ دینے کی جگہ ایک معقول معجزہ دیا ہے جس میں ہم نے صاحبان عقل کے لیے ہر مضمون کو مختلف انداز میں بیان کیا اور ان کی عقلوں کو جھنجوڑا ہے۔ ان کی خرد کو متوجہ کیا تو صاحبان عقل و خرد اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس پر ایمان لے آئے۔

مگر اکثر لوگوں نے وہی روش اختیار کی جو قدیم محسوس پرستوں نے اختیار کی تھی۔ محسوس معجزہ دیا جائے۔ جیسا کہ ذیل کی آیات میں مذکور ہے۔

وَقَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ یَنۡۢبُوۡعًا ﴿۹۰﴾

۹۰۔ اور کہنے لگے: ہم آپ پر ایمان نہیں لاتے جب تک آپ ہمارے لیے زمین کو شگافتہ کر کے ایک چشمہ جاری نہ کریں۔

اَوۡ تَکُوۡنَ لَکَ جَنَّۃٌ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الۡاَنۡہٰرَ خِلٰلَہَا تَفۡجِیۡرًا ﴿۹۱﴾

۹۱۔ یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایسا باغ ہو جس کے درمیان آپ نہریں جاری کریں۔

اَوۡ تُسۡقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمۡتَ عَلَيۡنَا كِسَفًا اَوۡ تَاۡتِىَ بِاللّٰهِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةِ قَبِيۡلًا ۙ﴿۹۲﴾

۹۲۔ یا آپ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دیں جیسا کہ خود آپ کا زعم ہے یا خود اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئیں۔

اَوۡ يَكُوۡنَ لَكَ بَيۡتٌ مِّنۡ زُخۡرُفٍ اَوۡ تَرۡقٰى فِى السَّمَآءِ ؕ وَلَنۡ نُّؤۡمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيۡنَا كِتٰبًا نَّقۡرَؤُهٗ ؕ قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّىۡ هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۳﴾

۹۳۔ یا آپ کے لیے سونے کا ایک گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے جب تک آپ ہمارے لیے ایسی کتاب اپنے ساتھ اتار نہ لائیں جسے ہم پڑھیں، کہد یجیے: پاک ہے میرا رب، میں تو صرف پیغام پہنچانے والا انسان ہوں۔

تشریح کلمات

الینبوع: (ن ب ع) اس چشمے کو کہتے ہیں جس کا پانی خشک نہ ہوتا ہو۔ اس کی جمع ینابیع آتی ہے۔

کِسَفًا: (ك س ف) الکسفة کے معنی بادل، روئی یا اس قسم کے دوسرے اجسام کے ٹکڑے کے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ ہیں ان محسوس پرستوں کے مطالبے۔ ان کی سوچ، انسان کے عہد طفولیت کی سوچ ہے۔

وَقَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ لَوۡلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوۡ تَاۡتِيۡنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ؕ تَشَابَهَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ○ [۱]

اور بے علم لوگ کہتے ہیں: اللہ ہم سے ہمکلام کیوں نہیں ہوتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ ان سے پہلے لوگ بھی اسی طرح کی بات کر چکے ہیں، ان کے دل ایک جیسے ہو گئے ہیں، ہم نے تو اہل یقین کے لیے کھول کر نشانیاں بیان کی ہیں۔

جواب میں فرمایا: قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّىۡ هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا۔

اس جملے میں تین جواب ہیں:

۱۔ سُبۡحَانَ رَبِّىۡ: میرا رب تمہاری ان باتوں سے پاکیزہ ہے جو تمہارے مطالبے میں ہیں۔ چونکہ ان کے مطالبے میں ایسی بات بھی ہے جو ذات الٰہی کی شان میں گستاخی ہے۔ وہ یہ ہے: اَوۡ تَاۡتِىَ بِاللّٰهِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةِ قَبِيۡلًا۔ یا خود اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آؤ۔ یہی مطالبہ قوم موسیٰ نے بھی کیا تو ان کو فوراً سزا ملی

---

[۱] ۲ بقرة: ۱۱۸

اور ان پر بجلی گری:

فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡہُمُ الصّٰعِقَۃُ بِظُلۡمِہِمۡ ...[1]

انہوں نے کہا: ہمیں اعلانیہ طور پر اللہ دکھا دو، ان کی اسی زیادتی کی وجہ سے انہیں بجلی نے آ لیا...

اس کے علاوہ ان کے مطالبات کی نوعیت پر نظر ڈالی جائے اور ان مطالبات کا آپس میں موازنہ کیا جائے تو ان مطالبات کی عدم معقولیت واضح ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ کے سامنے لانے کو سونے کا ایک گھر بنانے کے برابر قرار دیتے ہیں۔

۲۔ ہَلۡ کُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا: میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں خود ہی سب کچھ ہوں۔ میں نے ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے کہ میں ایک انسان ہوں۔ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کا پابند ہوں۔

۳۔ رَّسُوۡلًا: میں رسول ہونے کے اعتبار سے اپنی صداقت کے لیے دلیل پیش کرنے اور حجت پوری کرنے کا پابند ہوں۔ حجت پوری کرنے کے بعد پیغام پہنچانا میرا کام ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ نے ان کے تمام مطالبات کا ذکر کر کے مشرکین کی سطح فکری کو برملا کیا ہے۔

۲۔ روحانیت سے عاری ذہن پر ہمیشہ مادی قدریں سوار رہتی ہیں: بَیۡتٌ مِّنۡ زُخۡرُفٍ ....

۳۔ وہ پہلے ہی اعتراف کرتے ہیں کہ بعض معجزات کے سامنے آنے پر بعد میں ایمان نہیں لائیں گے: وَلَنۡ نُّؤۡمِنَ لِرُقِیِّکَ ....

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَہُمُ الۡہُدٰۤی اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۴﴾

۹۴۔ اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آ گئی تو اس پر ایمان لانے میں اور کوئی چیز مانع نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ وہ کہتے تھے: کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟

قُلۡ لَّوۡ کَانَ فِی الۡاَرۡضِ مَلٰٓئِکَۃٌ یَّمۡشُوۡنَ مُطۡمَئِنِّیۡنَ لَنَزَّلۡنَا عَلَیۡہِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۵﴾

۹۵۔ کہد یجیے: اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے بس رہے ہوتے تو ہم آسمان سے ایک فرشتے کو رسول بنا کر ان پر نازل کرتے۔

تفسیر آیات

بے علم لوگوں کے لیے یہ بات قابل فہم نہیں رہی انسان اللہ کا نمائندہ کیسے ہوسکتا ہے خاص کر بت

---

[1] ۴ نساء: ۱۵۳

اپرستوں کا تو عقیدہ ہی انکار نبوت پر مبنی ہے۔ ان کے خیال میں نبوت اور انسان دو متضاد چیزیں ہیں۔ وہ انسان کے مقام والا سے بے خبر ہیں۔ انہیں علم نہیں کہ اس کائنات میں انسان اشرف مخلوقات کے مقام اور معلم ملائکہ کی منزلت پر فائز ہے۔

جواب میں فرمایا: زمین جس طرح انسان کے لیے نہایت سازگار جگہ ہے اسی طرح اگر فرشتے بھی یہاں اسی سازگاری اور اطمینان سے رہ رہے ہوتے تو ہم ان کی طرف کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیج دیتے۔ اب یہاں انسان نہایت سازگاری کے ساتھ رہ رہا ہے اس لیے ان انسانوں کے لیے انسان ہی راہنما اور مشعل راہ بن سکتا ہے کیونکہ ہدایت کا تعلق قول و فعل دونوں سے ہے۔ ہادی اگر عمل میں شریک نہیں ہے تو تعلیم و تربیت کے اصولوں کی تطبیق اور سیرت و کردار کی مثال کون پیش کرے گا۔ چنانچہ اسی مطلب کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ ...[1] تحقیق تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے....

اہم نکات

۱۔ ہدایت و رہبری کے لیے اللہ نے انسان کو منتخب کیا ہے۔

۲۔ زمینی ماحول انسان کی زندگی کے لیے سازگار اور اطمینان بخش ہے۔

قُلۡ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًۢا بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیۡرًۢا بَصِیۡرًا ﴿۹۶﴾

۹۶۔ کہد یجیے: میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے اللہ کافی ہے، وہی اپنے بندوں کا حال یقیناً خوب جانتا اور دیکھتا ہے۔

تفسیر آیات

حجت پوری ہوگئی۔ دلیل و برہان میں کوئی کمی نہیں رہی، حق کی دعوت دلیل کے ساتھ ان تک پہنچا دی گئی لیکن حق واضح ہونے کے باوجود وہ اپنے عناد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہے تو کہہ دیجیے اس معاملے کو اپنے مالک حقیقی کے پاس لے جاتے ہیں۔ وہی میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا چونکہ وہ میرے اعمال اور تمہارے عناد سب کا شاہد اور گواہ ہے۔

----

[1] ۳۳ احزاب: ۲۱

اہم نکات

۱۔ ہر ممکن سعی کے بعد معاملہ اللہ پر چھوڑنا چاہیے کہ وہ فیصلہ کرے۔

وَمَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ فَہُوَ الۡمُہۡتَدِ ۚ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَہُمۡ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ؕ وَنَحۡشُرُہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ عَلٰی وُجُوۡہِہِمۡ عُمۡیًا وَّبُکۡمًا وَّصُمًّا ؕ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ؕ کُلَّمَا خَبَتۡ زِدۡنٰہُمۡ سَعِیۡرًا ﴿۹۷﴾

۹۷۔ اور ہدایت یافتہ وہ ہے جس کی اللہ ہدایت کرے اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو آپ اللہ کے سوا ان کا کوئی کارساز نہیں پائیں گے اور قیامت کے دن ہم انہیں اوندھے منہ اندھے اور گونگے اور بہرے بنا کر اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا، جب آگ فرو ہونے لگے گی تو ہم اسے ان پر اور بھڑکائیں گے۔

تشریح کلمات

خَبَتۡ: (خ ب و) الخبت نشیبی اور نرم زمین کو کہتے ہیں (صحاح) شعلہ آتش کے فرد ہونے کو خبت النار کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ: حقیقی ہدایت وہی ہے جو ہدایت کے سرچشمہ، اللہ کی جانب سے ہو اور جو اس سرچشمہ سے فیض حاصل کرتا ہے وہی فیضیاب ہے۔

۲۔ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡ: اور جسے اللہ ہدایت سے محروم کر دے تو وہ گمراہی کی اتھاہ گہرائی میں منہ کے بل گرنے لگے گا تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ لے۔

واضح رہے اللہ کسی کو از خود گمراہی میں نہیں ڈالتا بلکہ جو لوگ اللہ کی ہدایت کو قبول نہیں کرتے اور اللہ کی رحمت کے لیے اپنے اندر ظرفیت پیدا نہیں کرتے ان سے اللہ اپنی رحمت کو روک لیتا ہے۔ اس صورت میں لازمی نتیجہ گمراہی ہے چونکہ اللہ کی ہدایت کو قبول نہ کرنے کی صورت میں دو صورتیں سامنے ہیں: یا تو ان پر جبر کیا جائے اور ایمان لانے پر مجبور کیا جائے یا انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ جبر اللہ کرتا نہیں ہے لہٰذا انہیں اپنے حال پر چھوڑ دینے کی صورت باقی رہتی ہے۔ جب اللہ ان سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے تو ہدایت کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ اسی مطلب کو اللہ تعالیٰ نے لفظ یُّضۡلِلۡ کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہدایت کا حقیقی سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔
۲۔ اللہ کی رحمت کو مسترد کرنے والے کو کوئی اور سہارا نہیں دے سکتا۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ بِاَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خَلۡقًا جَدِيۡدًا﴿۹۸﴾

۹۸۔ یہ ان کے لیے اس بات کا بدلہ ہے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کا انکار کیا اور کہا: کیا جب ہم ہڈیاں اور خاک ہو جائیں گے تو کیا پھر ہم نئے سرے سے خلق کر کے اٹھائے جائیں گے؟

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح کے لیے اسی سورہ کی آیت ۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ وَجَعَلَ لَهُمۡ اَجَلًا لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوۡنَ اِلَّا كُفُوۡرًا﴿۹۹﴾

۹۹۔ کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے وہ ان جیسوں کو پیدا کرنے پر قادر ہے؟ اور اس نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں لیکن ظالم لوگ انکار پر تلے ہوئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ: منکرین قیامت کے جواب میں فرمایا: جس ذات نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ ان کی مثل بنانے پر بھی قادر ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَكۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ ...[۱]

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے خلق کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے۔

آسمانوں اور زمین میں ہمیشہ شکست و ریخت اور تجدید خلق کا سلسلہ جاری ہے: كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِىۡ شَاۡنٍ[۲] وہ ہر روز کرشمہ سازی میں مصروف ہے۔

---

[۱] ۴۰ غافر: ۵۷ [۲] ۵۵ رحمٰن: ۲۹

۲۔ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَہُمۡ : مشرکین کے لیے جو ناقابل فہم بات تھی وہ جسم کا اعادہ خلق تھا۔ اس لیے فرمایا: اس جسم کی مثل بنانے پر اللہ قادر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے عیناً یہی جسم دوبارہ پیدا نہیں کیا جائے گا چونکہ یہ جسم تو دنیا میں ہر سات سال بعد بدل کر کاربن کی صورت میں فضا میں منحل ہوتا رہتا ہے اور ہر سات سال بعد اللہ قدیم جسم کی مثل خلق فرماتا رہتا ہے۔

۳۔ وَجَعَلَ لَہُمۡ اَجَلًا : یہاں اجل سے مراد قیامت ہو سکتی ہے جس کے آنے میں کسی ریب و شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شک و ریب کا وجود نہیں ہے جیسا کہ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۛۚ فِیۡہِ [1] میں مذکور ہے کہ یہاں ریب و شک کی گنجائش نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ نظام کائنات ہر وقت شکست و ریخت میں ہے۔

۲۔ ہر بدن اور بدن کے ہر خلیہ کے لیے ایک مدت معیّن ہے۔

قُلۡ لَّوۡ اَنۡتُمۡ تَمۡلِکُوۡنَ خَزَآئِنَ رَحۡمَۃِ رَبِّیۡۤ اِذًا لَّاَمۡسَکۡتُمۡ خَشۡیَۃَ الۡاِنۡفَاقِ ؕ وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ قَتُوۡرًا ﴿۱۰۰﴾	۱۰۰۔ کہدیجیے: اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں پر اختیار رکھتے تو تم خرچ کے خوف سے انہیں روک لیتے اور انسان بہت تنگ دل واقع ہوا ہے۔

تفسیر آیات

لوگوں پر بخل و کنجوسی کی خصلت جب غالب ہے تو وہ کسی کو کشائش میں نہیں دیکھ سکتے۔ کسی پر اللہ کا فضل و رحمت ہو جائے تو جل مرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اگر اللہ کے ختم نہ ہونے والے خزانوں کا مالک بنایا جائے تو بھی وہ خرچ نہیں کر پائیں گے۔ یہ اشارہ ان مشرکوں کی طرف ہے جو صرف از راہ حسد و بخل رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ابوجہل نے کئی بار اس بات کا اظہار کیا کہ محمدؐ لوگوں پر افترا نہیں باندھتے، وہ اللہ پر افترا کیسے باندھ سکتے ہیں۔ تاہم ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ہم محمدؐ کی نبوت کو قبول کر کے اس کی برتری کو قبول کریں۔

اہم نکات

۱۔ جن لوگوں پر حسد اور بخل جیسی خصلت غالب ہے وہ کسی کی برتری قبول نہیں کر سکتے۔

----

[1] ۲ بقرۃ: ۲

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسٰى تِسۡعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسۡـَٔلۡ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِذۡ جَآءَهُمۡ فَقَالَ لَهٗ فِرۡعَوۡنُ اِنِّىۡ لَاَظُنُّكَ يٰمُوۡسٰى مَسۡحُوۡرًا﴿۱۰۱﴾

۱۰۱۔اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو نو (۹) واضح نشانیاں دی تھیں یہ بات خود بنی اسرائیل سے پوچھ لیجیے جب موسیٰ ان کے پاس آئے تو فرعون نے ان (موسیٰ) سے کہا: اے موسیٰ! میرا خیال ہے کہ تم سحرزدہ ہو گئے ہو۔

تفسیر آیات

مکہ کے مشرکین کے معجزات کے مطالبے کا جواب دیا جا رہا ہے کہ جو لوگ ایمان کی خاطر نہیں صرف بہانہ جوئی کے لیے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں وہ معجزوں سے کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ جیسا کہ فرعون کی مثال سامنے ہے۔ بنی اسرائیل سے اس کی تصدیق لے سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ایک دو نہیں نو معجزے دکھانے کے بعد ایمان لانے کی بجائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سحرزدہ قرار دیا۔

اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے نو سے زیادہ ہیں لیکن یہاں ان معجزوں کا ذکر ہے جو فرعون کو حجت تمام کرنے کے لے پیش کیے۔ وہ معجزات درج ذیل ہیں:

i۔ عصا کا اژدھا بن جانا۔

ii۔ ید بیضا جو سورج کی طرح چمکتا تھا۔

iii۔ جادوگروں کو شکست دینا۔

iv۔ طوفان۔

v۔ ٹڈی دل سے فرعونیوں کی فصلوں کا تباہ کرنا۔

vi۔ سسریوں کی آفت سے غلوں کی نابودی۔

vii۔ مینڈک۔ دریائے نیل سے اتنی مقدار میں ان کی نسل بڑھی کہ گھروں میں زندگی بسر کرنا مشکل ہو گیا۔

viii۔ خون۔ دریاؤں کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا۔

ix۔ ملک میں قحط سالی کا برپا ہونا۔

اہم نکات

۱۔ معاند، معجزوں سے ایمان نہیں لاتا بلکہ اس کے عناد میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ معجزوں سے حق کا طلبگار ایمان لاتا ہے۔

قَالَ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَاۤ اَنۡزَلَ ہٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ بَصَآئِرَ ۚ وَ اِنِّیۡ لَاَظُنُّکَ یٰفِرۡعَوۡنُ مَثۡبُوۡرًا ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ موسیٰ نے کہا: (اے فرعون! دل میں) تو یقیناً جانتا ہے کہ ان نشانیوں کو آسمانوں اور زمین کے پروردگار نے ہی بصیرت افروز بنا کر نازل کیا ہے اور اے فرعون! میرا خیال ہے کہ تو ہلاک ہو جائے گا۔

فَاَرَادَ اَنۡ یَّسۡتَفِزَّہُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ فَاَغۡرَقۡنٰہُ وَ مَنۡ مَّعَہٗ جَمِیۡعًا ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳۔ پس فرعون نے ارادہ کر لیا تھا کہ انہیں زمین سے ہٹا دے مگر ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک ہی ساتھ غرق کر دیا۔

تشریح کلمات

یستفز: (ف ز ز) فزّ ہٹا دینا۔ تنگ کرنا۔ نکال دینا۔

تفسیر آیات

فرعون کا نہ ماننا اس لیے نہ تھا کہ معجزوں میں اتنی قوت نہ تھی کہ اسے قائل کر سکیں بلکہ فرعون کو علم اور یقین ہو گیا تھا کہ یہ معجزے صرف اللہ رب العالمین ہی کی طرف سے ہو سکتے ہیں۔ اس علم و یقین کے باوجود فرعون نے نہ صرف معجزوں کو ماننے سے انکار کیا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تو اللہ نے خود اسے غرق کر دیا۔

اہم نکات

۱۔ معجزہ وہ ہوتا ہے جس سے مخالف کو یقین آئے۔

۲۔ یقینی معجزے کا منکر ہلاک ہو جاتا ہے۔

وَّ قُلۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ لِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اسۡکُنُوا الۡاَرۡضَ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَۃِ جِئۡنَا بِکُمۡ لَفِیۡفًا ﴿۱۰۴﴾

۱۰۴۔ اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا: تم اس سرزمین میں سکونت اختیار کرو پھر جب آخرت کا وعدہ آ جائے گا تو ہم تم سب کو ایک ساتھ لے آئیں گے۔

تشریح کلمات

لَفِیۡفًا: (ل ف ف) لففت الشئ کا ایک معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملانا اور مدغم کرنا ہے۔

تفسیر آیات

معجزات کے انکار کے نتیجے میں اول تو منکر ہلاک ہو گیا۔ دوم یہ کہ جنہیں وہ زمین سے نابود کرنا چاہتے تھے وہ سرزمین کے مالک ہو گئے۔ اس آیت میں سرزمین سے مراد فلسطین کی سرزمین ہو سکتی ہے۔ فرعون نے اپنی ساری طاقت اس بات پر لگائی تھی کہ اسرائیلی فلسطین میں آباد نہ ہوں لیکن اللہ نے فرعون کو ہلاک کر کے ان کو ارض فلسطین میں آباد کیا۔

وَعۡدُ الۡاٰخِرَۃِ: سے مراد روز قیامت ہو سکتا ہے چونکہ فرعون اور بنی اسرائیل ایک جگہ قیامت کے روز ہی جمع ہو سکتے ہیں۔

اس آیت میں مشرکین مکہ کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ تم چاہتے تو یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سرزمین سے ناپید کر دیں لیکن اس ناپاک کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سرزمین کے وارث بن جائیں گے۔ صدق اللّٰہ العلی العظیم۔

اہم نکات

۱۔ منکرین معجزہ کو دو دن دیکھنے پڑیں گے:

الف: معجزہ لانے والے کو زمین کا وارث بنتے ہوئے۔

ب: خود کو قیامت کے دن خواری اٹھاتے ہوئے۔

وَ بِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰہُ وَ بِالۡحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا ﴿۱۰۵﴾

۱۰۵۔ اور اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور اسی حق کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے اور (اے رسول) ہم نے آپ کو صرف بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

تفسیر آیات

یہ قرآن نازل کرنے والے نے برحق نازل کیا ہے اور جس کے قلب پر نازل ہوا ہے اور جس نے اسے وصول کیا ہے وہ بھی برحق ہے۔ کوئی شائبہ، نہ دینے والے کی طرف سے ہے، نہ لینے والے کی طرف سے۔ نازل کرنے والا حکیم و علیم ہے۔

وَ اِنَّکَ لَتُلَقَّی الۡقُرۡاٰنَ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ عَلِیۡمٍ ﴿۶﴾ [۱]

اور (اے رسول) یہ قرآن آپ کو یقیناً ایک حکیم، دانا کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔

---

[۱] ۲۷ نمل: ۶

اس کے بعد کے جملے میں فرمایا: ہم نے آپ کو ایمان والوں کے لیے بس بشارت دینے اور منکرین کی تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ طاقت کے ذریعے انہیں ایمان لانے پر مجبور کرنا آپ کا کام نہیں ہے۔

لَسۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ ...[1] آپ ان پر مسلط نہیں ہیں ....

اہم نکات

۱۔ منبع قرآن اور حامل قرآن دونوں برحق ہیں۔

۲۔ رسول کا کام حجت پوری کرنا ہے بس۔

وَ قُرۡاٰنًا فَرَقۡنٰہُ لِتَقۡرَاَہٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکۡثٍ وَّ نَزَّلۡنٰہُ تَنۡزِیۡلًا ﴿۱۰۶﴾

۱۰۶۔ اور قرآن کو ہم نے جدا جدا رکھا ہے تاکہ آپ اسے ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور ہم نے اسے بتدریج نازل کیا ہے۔

تفسیر آیات

یہ قرآن جو برحق نازل ہوا ہے اس کی حقانیت راسخ کرنے کے لیے ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تدریجی عمل کے ذریعے علم و عمل میں ہم آہنگی آ جائے۔ اس قرآن نے ایک ایسی قوم کی تربیت کرنا تھی جو جاہلیت کی اتھاہ گہرائیوں میں گری ہوئی اور تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھی۔ اس قوم کو نہ صرف تہذیب و اخلاق سے روشناس کرانا تھا بلکہ اسے اس قابل بنانا تھا جو اس کرہ خاکی پر بسنے والوں کو تہذیب سکھائے اور انسان کے لیے تمدن کے دروازے کھولے۔

اس مقصد کے پیش نظر اللہ نے اس قرآن کو دفعتۃً نازل نہیں فرمایا بلکہ اسے جدا جدا کر کے نازل فرمایا تاکہ وقفہ کے ساتھ تدریجی عمل سے لوگوں کو پڑھ کر سنائے اور یہ جدید علم ان کے دلوں میں راسخ ہو جائے۔ چنانچہ دنیائے انسان میں یہ عظیم انقلاب برپا کرنے والی کتاب اس امت کو ۲۳ سالوں میں پڑھائی گئی اور ان ۲۳ سالوں میں شاگردان قرآن امت کو حالت جنگ و امن سے گزارا، داخلی و خارجی سازشوں سے مقابلہ کرایا، امانت و خیانت اور ایثار و استحصال کے مواقع فراہم کیے اور ہر موقع اور محل کا درس پڑھایا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کا تخلیقی و تربیتی عمل تدریجی ہوتا ہے۔

۲۔ قرآن کو تدریجی مراحل کے ساتھ سیکھنا چاہیے۔

---

[1] ۸۸ غاشیہ: ۲۲

قُلۡ اٰمِنُوۡا بِہٖۤ اَوۡ لَا تُؤۡمِنُوۡا ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِہٖۤ اِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ یَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾

۱۰۷۔ کہدیجیے: تم خواہ ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، اس سے پہلے جنہیں علم دیا گیا ہے جب یہ پڑھ کرانہیں سنایا جاتا ہے تو یقیناً وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔

وَّ یَقُوۡلُوۡنَ سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنۡ کَانَ وَعۡدُ رَبِّنَا لَمَفۡعُوۡلًا ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔ اور کہتے ہیں: پاک ہے ہمارا پروردگار اور ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہوا۔

وَ یَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ یَبۡکُوۡنَ وَ یَزِیۡدُہُمۡ خُشُوۡعًا ﴿۱۰۹﴾

۱۰۹۔اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں اور روتے جاتے ہیں اور اللہ ان کا خشوع مزید بڑھا دیتا ہے۔

تفسیر آیات

قرآن پیغام فطرت ہے۔ فطرت سلیمہ رکھنے والے قرآنی آیات کو سن کر بے ساختہ ٹھوڑیوں پر گر پڑتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف آیات الٰہی سن کر سجدہ کرتے ہیں بلکہ بے ساختہ سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ان کے پاس جو علم ہے وہ ان کو ایسا کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ ان کے اعضاء و جوارح سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ان کے دل میں بھی خشوع آ جاتا ہے اور فرط جذبات سے گریہ کرتے ہیں۔

جب اس پیغام توحید کو پذیرائی دینے والے ایسے صاحبان علم موجود ہیں تو دیگر لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں یا نہیں، اس سے اس مشن کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا:

مَنِ اهۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَهۡتَدِیۡ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَ مَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡهَا ؕ ...[1]

پس جو کوئی ہدایت حاصل کرتا ہے تو اپنی ذات کے لیے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ بھی اپنی ذات کو گمراہ کرتا ہے....

یَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا: اذقان، ذقن کی جمع تھوڑی کے معنی میں ہے۔ ممکن ہے یخر اور اذقان میں ربط ہو۔ وہ اس طرح کہ جو سجدہ فطرت کے تقاضوں کے تحت بے ساختہ ہوتا ہے وہ یخر بھی ہے۔ یعنی پانی کے بہنے کی طرح گر جاتے ہیں اور صرف ماتھا نہیں پورا چہرہ زمین بوس ہو جاتا ہے جس میں پیشانی کے ساتھ تھوڑی بھی شامل ہے۔

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۱۵

اہم نکات

۱۔ اہل علم اس مشن کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔
۲۔ آیات قرآنی سے جسم و جان دونوں میں خشوع آتا ہے۔

قُلِ ادۡعُوا اللّٰہَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَیًّامَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ۚ وَ لَا تَجۡہَرۡ بِصَلَاتِکَ وَ لَا تُخَافِتۡ بِہَا وَ ابۡتَغِ بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ﴿۱۱۰﴾

۱۱۰۔ کہہ دیجیے: اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں اور آپ اپنی نماز نہ بلند آواز سے پڑھیں، نہ بہت آہستہ بلکہ درمیانی راستہ اختیار کریں۔

شان نزول: ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں نماز پڑھی اور دعا میں یااللہ یا رحمٰن پڑھا تو مشرکین نے کہا: اس صابئی کو دیکھو۔ ہمیں تو صرف ایک خدا کو پکارنے کی دعوت دیتا ہے اور خود دو خداؤں (اللہ اور رحمٰن) کو پکارتا ہے۔[1]

۱۔ قُلِ ادۡعُوا اللّٰہَ: اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ اور رحمٰن دونوں ایک ذات کے اسماء ہیں۔ اللہ کی ذات ایک ہی ہے مگر اس کی صفات و کمالات کا ایک لفظ میں سمونا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے لیے متعدد اسماء ہیں۔ اللہ اور رحمٰن انہی اسمائے حسنی میں سے ہیں۔ ان میں سے جس لفظ کے ساتھ پکارو، ایک ذات مراد ہے۔

اسم، مسمّٰی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مسمّٰی اگر خوبصورت ہے تو اس کا نام بھی خوبصورت لگتا ہے۔ چنانچہ لفظ "پھول" میں خوبصورتی اس کے معنی کی طرف سے ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس ذات پر دلالت کرنے والے الفاظ میں بھی ان خوبیوں کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ اعراف آیت ۱۸۰۔

۲۔ وَ لَا تَجۡہَرۡ بِصَلَاتِکَ: دوسرے جملے میں فرمایا نماز نہ زیادہ بلند آواز سے پڑھو، نہ بہت پست آواز میں بلکہ آواز میں اعتدال رکھو۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

الجَہْرُ بِہَا رَفْعُ الصَّوْتِ وَ التَّخَافُتُ مَا لَمْ تُسْمِعْ نَفْسَکَ وَاقْرَأْ مَا بَیْنَ ذَلِکَ۔[2]

جہر بہت زیادہ بلند آواز کو کہتے ہیں اور اخفات یہ ہے کہ خود بھی نہ سن سکو۔ ان دونوں کے درمیان میں اعتدال سے پڑھو۔

---

[1] مجمع البیان ذیل آیہ [2] وسائل الشیعۃ ۶: ۹۸

جہری نمازوں کو زیادہ بلند آواز میں نہ پڑھو اور اخفاتی نمازوں کو اتنی پست آواز میں نہ پڑھو کہ تم خود بھی نہ سن سکو۔

اہم نکات

۱۔ اللہ نے اسمائے حسنی کے ساتھ دعا کرنے کا حکم، فرمایا ہے یہی حکم قبولیت دعا کا ضمانت ہے۔

۲۔ نماز کی آواز میں بھی اعتدال اللہ کو پسند ہے

وَ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ کَبِّرۡہُ تَکۡبِیۡرًا ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱۔ اور کہد یجیے: ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا اور نہ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے اور نہ وہ ناتواں ہے کہ کوئی اس کی سرپرستی کرے اور اس کی بڑائی کماحقہ بیان کرو۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کی شرکت کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

i۔ کمتر شریک: جیسے اولاد، اللہ کے لیے اولاد کی صورت میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا خواہ درجہ میں اللہ سے کمتر ہی کیوں نہ ہوں: لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا....

ii۔ مساوی شریک: جیسے فرشتے یا بت جو تدبیر امور کائنات میں اللہ کے برابر شریک ہوں، ممکن نہیں ہے۔ بادشاہت اور حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اس کے اقتدار اعلیٰ میں کوئی شریک نہیں ہے: وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ....

iii۔ بالاتر شریک: کہ اللہ کو اس کی مدد کی ضرورت پیش آئے اور اس مدد کے ذریعے اپنی ناتوانی دور کرے: وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ....

وَ کَبِّرۡہُ تَکۡبِیۡرًا: اور اس کی بڑائی کماحقہ بیان کرو۔ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کماحقہ بیان کرنے کے لیے پہلے اس کا صحیح تصور ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ کی بڑائی کا اقرار کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اللہ کو دوسری مخلوقات یعنی خود اللہ کی اپنی مخلوقات کے مقابلے میں برتر سمجھا جائے۔ اللہ اکبر کے معنی کیے جائیں کہ "اللہ سب سے بڑا ہے" یعنی سب مخلوقات سے بڑا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا خود اس کی اپنی مخلوق کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے جو درحقیقت اللہ کی بڑائی نہیں بلکہ یہ اللہ کی شان میں گستاخی ہے۔ جیسا کہ ہم کسی آیۃ اللہ

کے بارے میں کہہ دیں کہ آیۃ اللہ بلی سے بڑے ہیں یا یہ کہہ دیں شاہ صاحب قبلہ گدھے سے بڑے ہیں تو یہ تعبیر اس قدر بے معنی نہیں جس قدر یہ کہنا بے معنی ہے کہ اللہ سب سے یعنی سب مخلوقات سے بڑا ہے۔

اس کا صحیح تصور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

> ایک شخص نے آپؑ کے پاس بیٹھ کر کہا: اللّٰہ اکبر۔ امامؑ نے فرمایا: من ایّ شیء؟ کس چیز سے بڑا ہے؟ اس نے عرض کیا: ہر چیز سے۔ امامؑ نے فرمایا: حدّدته۔ تم نے اللہ کو محدود کیا۔ اس نے عرض کیا: پھر کیا کہوں؟ فرمایا: قل ان اللّٰہ اکبر من ان یوصف: کہو اللہ اس سے بڑا ہے کہ اس کا وصف بیان ہو سکے۔[1]

اہم نکات

۱۔ اللہ کے ساتھ کمتر اور برابر شریک نہیں اور کسی بالاتر کا محتاج نہیں ہے۔

۲۔ اللہ کو سب چیزوں سے بڑا نہ کہو بلکہ یہ کہو اللہ وصف و بیان کی حد سے بڑا ہے۔

----

[1] الکافی ۱: ۱۱۷

فہرست

سورۃ یونس

سورۃ کا تعارف ۹

رسالت پر مشرکین کا اعتراض ۱۲

تمہارا رب کائنات کا خالق ۱۳

سب کو جوابدہی کے لیے اللہ کے پاس جانا ہے ۱۴

آفتاب اور ماہتاب اللہ کے تدبیری نشانیاں ہیں ۱۵
گردش لیل ونہار میں بھی
اللہ کی تدبیری آیات ہیں ۱۶

آخرت کا انکار اور دنیا پرستی سے جہنمی ہوتا ہے ۱۷

ایمان وعمل صالح بجالانے
والوں کے لیے جنت کی بشارت ۱۸

اللہ عطائے خیر کے لیے عجلت اور
سزا کے لیے مہلت سے کام لیتا ہے ۲۱

انسان مصیبت کے وقت اللہ کو پکارتا ہے ۲۱

سابقہ مجرم امتوں کی ہلاکت
کے بعد تم کو آباد کیا ہے ۲۲

قرآن میں کسی قسم تبدیلی کا کسی کو اختیار نہیں ۲۳

بتوں کی پرستش کرنے اور ان کو شفیع سمجھنے
والے کیا اللہ سے زیادہ جاننے والے ہیں؟ ۲۶

معجزہ اپنے وقت پر آتا ہے ۲۷

لوگ آسودگی میں اللہ کو بھول جاتے ہیں ۲۸

اللہ وہی ہے جسے اضطراری
حالت میں پکارتے ہو ۲۹

دنیا کی ناپائیداری کی ایک مثال ۳۱

نیکی کرنے والوں کو ثواب کے
ساتھ مزید بھی ملے گا ۳۳

گناہ کی سزا گناہ کے برابر ہوگی ۳۵

مشرکین کے موہومی معبود قیامت
کے دن ان سے بیزار ہوں گے ۳۶

انسان کے اعمال کھل کر سامنے آئیں گے ۳۷

رب کی تعریف، رب کون ہوتا ہے ۳۷،۳۹

رب وہ ہوتا ہے جو خلق کرتا ہے ۴۰

حق کی رہنمائی کرنے والا
ہی پیروی کا حقدار ہے ۴۱

ظن وگمان بذات خود دلیل نہیں ہے ۴۲

قرآن خود بتاتا ہے کہ
یہ غیر خدا کی طرف سے نہیں ہوسکتا ۴۳

جو ہدایت کی قابلیت نہیں رکھتا
ہدایت حاصل نہیں کرے گا ۴۶

قیامت کے دن دنیا کی زندگی
ایک گھڑی سے زیادہ نہیں لگے گی ______ ۴۷
رسولؐ کی زندگی میں ہو یا بعد میں
مشرکین پر عذاب آنے ہی والا ہے ______ ۴۸
ہر امت کی طرف رسولؐ بھیجا گیا ہے ______ ۴۹
مشیت خدا اور مقام رسول ______ ۵۰
ہر امت کی ایک عمر ہوتی ہے ______ ۵۰
عذاب کے معائنے کے بعد
ایمان بے سود ہے ______ ۵۱
کافر کے لیے عذاب سے
بچنے کا کوئی وسیلہ نہیں ہے ______ ۵۲
کائنات اللہ کے قبضے میں ہے
اس کا وعدہ برحق ہے ______ ۵۳
قرآن مؤمنین کے لیے
موعظہ، شفا، ہدایت اور رحمت ہے ______ ۵۴
مال و دولت سے فضل و رحمت خدا بہتر ہے ______ ۵۵
قانون سازی اللہ کی حاکمیت اعلا کا حصہ ہے ______ ۵۶
کوئی عمل اللہ سے پوشیدہ نہیں ہوسکتا ______ ۵۸
اولیاء اللہ کے لیے دنیا و آخرت
دونوں میں بشارت کا ذکر ______ ۵۹
مشرکین کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں
عزت اللہ کے پاس ہے ______ ۶۳
شب و روز، اللہ کی تدبیری نشانیاں ہیں ______ ۶۴
اللہ تعالیٰ کسی فرزند کا محتاج نہیں ہے ______ ۶۵
اللہ پر افترا باندھنے والے
عذاب سے دوچار ہوں گے ______ ۶۶
حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کو چیلنج ______ ۶۸
قوم نوح کی تباہی کے
بعد دیگر انبیاء علیہم السلام کا ذکر ______ ۶۹
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف
مبعوث کرنے کا ذکر ______ ۷۰
اللہ حق کو ثبات دیتا ہے ______ ۶۳
بنی اسرائیل کو اپنے گھروں
کو قبلہ بنانے کا حکم ______ ۷۶
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے
فرعون کی تباہی کی دعا ______ ۷۷
دعائے موسیٰ قبول ہوتی ہے
اور فرعون سے نجات مل جاتی ہے ______ ۷۹
غرق کی حالت کے ایمان نے
فرعون کو فائدہ نہیں دیا ______ ۸۰
اللہ نے فرعون کی لاش کو بچا لیا ______ ۸۱
بنی اسرائیل کو فلسطین میں بسا دیا ______ ۸۲
رسالت میں شک ہو تو اہل کتاب
سے پوچھنے کا حکم ______ ۸۳
جن لوگوں نے ایمان نہیں لانا وہ تمام
معجزات کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے ______ ۸۴
عذاب سامنے آنے کے بعد
صرف یونس علیہ السلام کی قوم بچ گئی ______ ۸۶
اگر اللہ جبر کرتا تو سب اہل ارض
ایمان لے آتے ______ ۸۷
مشرکین کو عذاب دینے کی صورت میں
مؤمنین کو اللہ بچا لے گا، ______ ۸۸
رسولؐ کو اپنی استقامت بیان کرنے کا حکم ______ ۸۹
تکلیف دور کرنے اور خیر و بھلائی

دینے والا صرف اللہ ہے ـــــ ۹۱
ہدایت اور ضلالت کے اثرات
خود انسان پر مترتب ہوتے ہیں ـــــ ۹۱
اللہ کا فیصلہ آنے تک صبر کرنے کا حکم ـــــ ۹۲

سورۃ ھود

تعارف سورۃ ـــــ ۹۵
قرآن کے استحکام اور تفصیل کا ذکر ـــــ ۹۷
استغفار سے دنیوی زندگی بھی سدھر جاتی ہے ـــــ ۹۸
عمل سے ہی درجہ ملتا ہے ـــــ ۹۹
ہر جاندار کی روزی اللہ کے ذمے ہے ـــــ ۱۰۱
اللہ کا عرش پانی پر تھا ـــــ ۱۰۳
گردش ایام سے صابرین کامیاب نکلتے ہیں ـــــ ۱۰۶
رسول ﷺ کی دل تنگی پر تسلی ـــــ ۱۰۷
قرآن کا چیلنج ـــــ ۱۰۸
دنیا پرست آخرت میں محروم ہو جاتا ہے ـــــ ۱۰۹
رسول ﷺ کی رسالت پر گواہ کا ذکر ـــــ ۱۱۱
اللہ پر افترا باندھنے والے بڑے ظالم ہیں ـــــ ۱۱۴
ایمان وعمل صالح والوں کا اجر ـــــ ۱۱۷
حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ اور ان کی قوم
کے ردعمل کا ذکر ـــــ ۱۱۸
نوح علیہ السلام کی کشتی سازی کا ذکر ـــــ ۱۲۷
کشتی پر سوار ہونے والوں کا ذکر ـــــ ۱۲۸
نوح کے بیٹے کا ذکر ـــــ ۱۳۰
کشتی نوح کے ٹھہرنے کا ذکر ـــــ ۱۳۱
حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر ـــــ ۱۳۶
قوم عاد کا ذکر ـــــ ۱۴۱
حضرت صالح علیہ السلام اور قوم ثمود کا ذکر ـــــ ۱۴۲
ناقۂ صالح کا ذکر ـــــ ۱۴۴
حضرت ابراہیم پر فرشتوں کے
نزول کا ذکر ـــــ ۱۴۶
حضرت اسحاق کی ولادت کی بشارت ـــــ ۱۴۸
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم لوط کے
بارے میں اللہ سے بحث ـــــ ۱۴۹
قوم لوط کے ناپاک ارادے ـــــ ۱۵۱
قوم لوط کی تباہی ـــــ ۱۵۳
حضرت شعیب کا ذکر ـــــ ۱۵۴
قوم شعیب کا منفی ردعمل ـــــ ۱۵۶
قوم شعیب کی تباہی ـــــ ۱۶۱
سعادت مند اور شقاوت پسند لوگوں کا ذکر ـــــ ۱۶۶
رسول اللہ ﷺ کے لیے استقامت کا حکم ـــــ ۱۷۱
ظالموں پر تکیہ نہ کرنے کا حکم ـــــ ۱۷۲
نیکیوں سے گناہ دھل جاتے ہیں ـــــ ۱۷۳
ہر قوم وملت میں عقل وخرد
والی جماعت کا وجود ـــــ ۱۷۵
اللہ نے رحمت کے لیے
لوگوں کو خلق فرمایا ہے ـــــ ۱۷۷
انبیاء علیہم السلام کے قصے رسول ﷺ کی تقویت
قلبی کے لیے بیان ہوئے ہیں ـــــ ۱۷۸
کافروں کو برے وقت کے انتظار کا حکم ـــــ ۱۷۹

سورۃ یوسف

تعارف سورۃ ـــــ ۱۸۳
قرآن کا مخاطب عقلی ہے ـــــ ۱۸۵
قصۂ یوسف بہترین قصہ ہے ـــــ ۱۸۶

حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب ____ ۱۸۶

یوسف علیہ السلام کو خواب بیان
کرنے سے منع کیا جاتا ہے ____ ۱۸۸

قصۂ یوسف کا بیان رسالت کا معجزہ ہے ____ ۱۸۹

برادران یوسف کا حسد ____ ۱۹۰

برادران یوسف کی والد سے درخواست ____ ۱۹۲

یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال دیا جاتا ہے ____ ۱۹۴

برادران یوسف والد کے پاس واپس آتے ہیں ____ ۱۹۵

قافلہ کے ہاتھ یوسف علیہ السلام فروخت ہوتے ہیں ____ ۱۹۸

حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے گھر میں ____ ۱۹۹

عزیز مصر کی بیگم کا یوسف علیہ السلام سے معاشقہ ____ ۲۰۱

یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی ____ ۲۰۳

حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کی گواہی ____ ۲۰۴

یوسف علیہ السلام مصر کی بیگمات کی محفل میں ____ ۲۰۷

یوسف علیہ السلام زنداں میں ____ ۲۰۹

زندانی ساتھیوں کا خواب اور درس توحید ____ ۲۱۲

زندانیوں کے خواب کی تعبیر ____ ۲۱۴

بادشاہ کا خواب ____ ۲۱۶

بادشاہ کے خواب کی تعبیر ____ ۲۱۸

یوسف علیہ السلام کی بادشاہ کے دربار میں طلبی
اور حضرت یوسف علیہ السلام کا انکار ____ ۲۱۹

حضرت یوسف علیہ السلام کا عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کے
واقعہ کی تحقیقات کا مطالبہ ____ ۲۱۹

حضرت یوسف علیہ السلام کا پاکدامن ثابت ہوتا ____ ۲۲۰

حضرت یوسف علیہ السلام مصری حکومت کے خزانے
کا سردار بنتے ہیں ____ ۲۲۳

برادران یوسف، حضرت یوسف علیہ السلام
کے دربار میں ____ ۲۲۵

حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائی بنیامین
کو لے کر آنے کا مطالبہ ____ ۲۲۶

حضرت یعقوب علیہ السلام، بنیامین کو
عہد میثاق لے کر روانہ کرتے ہیں ____ ۲۲۷

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیٹوں کو ایک دروازے
سے داخل نہ ہونے کی ہدایت ____ ۲۳۱

بنیامین اپنے بھائی یوسف علیہ السلام سے ملتے ہیں ____ ۲۳۳

حضرت یوسف علیہ السلام بنیامین کو اپنے پاس
رکھنے کا بہانہ بناتے ہیں ____ ۲۳۳

فرزندان یعقوب اپنے والد کے پاس ____ ۲۴۰

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی جاتی ہے ____ ۲۴۱

برادران یوسف دوبارہ دربار یوسف میں ____ ۲۴۴

حضرت یوسف علیہ السلام کی برادران کو معافی ____ ۲۴۶

قمیص یوسف سے حضرت یعقوب علیہ السلام
کی بینائی بحال ____ ۲۴۹

حضرت یعقوب علیہ السلام
مصر میں یوسف علیہ السلام کے پاس ____ ۲۵۱

اسلامی دعوت بصیرت پر مشتمل ہے ____ ۲۵۸

اللہ کی نصرت استقامت
کی آخری سرحد پر آتی ہے ____ ۲۶۱

سورۃ الرعد

قرآن برحق کتاب ہے ____ ۲۶۵

آسمان نامرئی ستونوں پر قائم ہیں ____ ۲۶۶

عرش مقام تدبیر کا نام ہے ____ ۲۶۷

زمین میں سامان زیست کی فراہمی ____ ۲۶۸

عقیدۂ آخرت کا انکار تعجب خیز ہے ____ ۲۷۰
کافر کو خیر کی جگہ عذاب میں عجلت ہے ____ ۲۷۱
منذر رسول اللہؐ اور ھاد علی علیہ السلام ہیں ____ ۲۷۲
اللہ ہی کو علم ہے کہ رحموں میں کیا ہے ____ ۲۷۳
انسان کی حفاظت کرنے والے فرشتے ہیں ____ ۲۷۵
انسان کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے ____ ۲۷۶
مظاہر قدرت کی نشاندہی ____ ۲۷۹
حق کی طرف دعوت
صرف اللہ کے پاس ہے ____ ۲۸۰
کل کائنات سجدہ ریز ہے ____ ۲۸۱
رب وہ ہوتا ہے جو خلق وایجاد کرتا ہے ____ ۲۸۳
حق دائمی ہوتا ہے، باطل وقتی ہنگامہ خیز ____ ۲۸۵
اچھی عاقبت کے مقابلے میں
پوری دنیا بھی کچھ نہیں ہے ____ ۲۸۵
عاقبت بخیر ہونے والوں کے اوصاف ____ ۲۸۷
برے انجام والوں کے اوصاف ____ ۲۹۰
رزق میں فراوانی وتنگی اللہ کے ہاتھ میں ہے ____ ۲۱۹
ایمان نہ لانے والے
معجزوں سے ایمان نہیں لاتے ____ ۲۹۲
قلب وضمیر کو صرف ذکر
خدا سے سکون ملتا ہے ____ ۲۹۳
قرآن بڑے سے بڑا معجزہ پیش کرے
یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے ____ ۲۹۸
دین کے انتخاب میں جبر نہیں ____ ۲۹۸
کافروں کو مہلت ملا کرتی ہے ____ ۲۹۹
بے وصف بت قابل پرستش نہیں ____ ۳۰۰
جنت کے اوصاف کا بیان ____ ۳۰۱
طالب حق قرآن کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ____ ۳۰۲
لوگوں کی خواہشات کی پیروی
اللہ سے دور کر دیتی ہے ____ ۳۰۳
تمام رسولوں کی بیوی اور اولاد ہوتی تھی ____ ۳۰۴
اللہ کے پاس لوح محو واثبات ہے ____ ۳۰۵
باطل کو نابود ہونا ہے ____ ۳۰۷
تمام تدبیریں اللہ کے پاس ہیں ____ ۳۰۸
علی علیہ السلام، رسولؐ کی رسالت کے گواہ ____ ۳۰۹

سورة ابراهيم

تعارف سورة ____ ۳۱۳
قرآن ظلمتوں سے نور کی
طرف دعوت دیتا ہے ____ ۳۱۵
ہر رسول کو اپنی قوم کی
زبان میں مبعوث کیا ہے ____ ۳۱۶
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تاریخ سے
عبرت حاص کرنے کی دعوت دینے کا حکم ____ ۳۱۷
شکر نعمت سے نعمت میں افزونی ہوتی ہے ____ ۳۱۸
اللہ لوگوں کے ایمان کا محتاج نہیں ہے ____ ۳۱۹
گذشتہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ امتوں کا سلوک ____ ۳۲۰
انبیاء کی دعوت دنیا وآخرت
دونوں کے حق میں ہے ____ ۳۲۱
آخر میں فتح انبیاء علیہم السلام کی ہوتی رہی ہے ____ ۳۲۴
کافروں کی نیکیاں بھی اکارت ہو جاتی ہیں ____ ۳۲۷
منکرین کی جگہ نئی قوم آباد ہوگی ____ ۳۲۸
طاغوت اپنے دنیا کے پیروکاروں کے لیے
قیامت میں کچھ بھی مدد نہیں کر سکیں گے ____ ۳۲۸

قیامت کے دن شیطان کہے گا:
میں نے تمہیں صرف دعوت دی تھی،
تم پر میرا بس نہیں چلتا تھا ____ ۳۲۹
کلمۂ طیبہ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ____ ۳۳۲
اللہ ایمان والوں کو استقامت عطا کرے گا ____ ۳۳۴
اللہ کی نعمت کو کفر میں بدلنے والوں کا انجام ____ ۳۳۵
نماز اور انفاق توشۂ آخرت ہیں ____ ۳۳۶
انسان کے لیے کائنات مسخر ہے ____ ۳۳۷
اللہ کی نعمتیں شمار میں نہیں آسکتیں ____ ۳۳۸
مکہ کے امن کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی دعا ____ ۳۳۹
اولادِ ابراہیم بت پرستی نہیں کرے گی ____ ۳۳۹
اولادِ ابراہیم کو مکہ میں بسانا ____ ۳۴۱
اسماعیل واسحاق جیسے فرزند عطا ہونے کا شکر ____ ۳۴۴
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والدین
کے لیے دعائے مغفرت ____ ۳۴۵
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین
کے ایمان کا ثبوت ____ ۳۴۵
ظالموں کو مہلت دنیا
ان کے حق میں نہیں ہے ____ ۳۴۶
عذاب آنے کے بعد
کافروں کی دعا نہیں سنی جائے گی ____ ۳۴۷
اللہ کی تدبیر کے مقابلے میں کافروں
کی بڑی سے بڑی تدبیر بے کار ہوگی ____ ۳۴۸
قیامت کے موقع پر پوری
کائنات تبدیل ہو جائے گی ____ ۳۴۹
پیامِ قرآن کی روح توحید ہے ____ ۳۵۰

سورة الحجر

تعارف سورہ ____ ۳۵۳
قیامت کے دن کافر مسلمانوں
کو دیکھ کر رشک کریں گے ____ ۳۵۵
ناز ونعمت میں مگن لوگوں
کو اپنی حالت پر چھوڑنا بڑی سزا ہے ____ ۳۵۶
ہر بستی اور ہر قوم کی ایک معین عمر ہوتی ہے ____ ۳۵۷
فرشتوں کے آنے کے بعد
مہلت نہیں ملتی ہے ____ ۳۵۷
قرآن نازل کرنے والا ہی اس کا محافظ ہے ____ ۳۵۸
ہر رسول کے ساتھ استہزا ہوا ہے ____ ۳۵۹
ان کافروں کو آسمان کی سیر کرائی جائے
تو بھی ایمان نہیں لائیں گے ____ ۳۶۰
ستارہ ہائے آسمان زینت اور
شیطان کو بھگانے کا ذریعہ بھی ہیں ____ ۳۶۱
ایک اہم سوال اور اس کا جواب ____ ۳۶۲
شہاب ثاقب سے کیا مراد ہے؟ ____ ۳۶۳
زمین کو زندگی کے لیے سازگار بنایا ____ ۳۶۵
ہر چیز کا خزانہ اللہ کے پاس ہے ____ ۳۶۶
اللہ پرنم ہواؤں کے ذریعہ بارش برساتا ہے ____ ۳۶۷
موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے اور عمل
میں آگے جانے اور پیچھے رہنے والوں کو
اللہ جانتا ہے ____ ۳۶۸
انسان کو مٹی سے اور جنات
آتش سے خلق کیا گیا ____ ۳۶۹
آدم کے لیے سجدہ کرنے کا
حکم اور ابلیس کا انکار ____ ۳۷۰

ابلیس کو مہلت مل جاتی ہے ____ ۳۷۱

اللہ کے خاص بندوں پر
ابلیس کی گرفت نہیں ہے ____ ۳۷۳

جہنم کے سات دروازے ہیں ____ ۳۷۴

اہل تقویٰ کی جنت کے اوصاف ____ ۳۷۴

بندگان خدا کو نوید مغفرت سنانے کا حکم ____ ۳۷۶

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں فرشتوں
کی آمد کا ذکر ____ ۳۷۸

حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں فرشتۂ عذاب
کی آمد کا ذکر ____ ۳۷۹

قوم لوط کی تباہی کا ذکر ____ ۳۸۱

اصحاب ایکہ کا ذکر ____ ۳۸۲

اصحاب حجر کا ذکر ____ ۳۸۳

سبع مثانی (سورۃ حمد) کی فضیلت ____ ۳۸۵

کفار کی رنگینیوں پر نظر رکھنے کی جگہ
مؤمنوں کے ساتھ تواضع سے پیش آئیں ____ ۳۸۶

حکم خدا کی بے لاگ تعمیل کرنے کا حکم ____ ۳۸۸

دشمن کے تمسخر کا مقابلہ تسبیح
سے کرنے کا حکم ____ ۳۸۹

سورۃ النحل

تعارف سورۃ ____ ۳۹۵

عذاب الٰہی کا فیصلہ آ گیا ____ ۳۹۷

اللہ اپنی مشیت کے مطابق
فرشتہ وحی نازل فرماتا ہے ____ ۳۹۸

کائنات کو بے مقصد خلق نہیں فرمایا ____ ۳۹۹

انسان کو نطفے سے پیدا کیا ____ ۳۹۹

جانوروں کو انسان کے لیے مسخر کیا ____ ۴۰۰

راہ راست دکھانا اللہ کے ذمے ہے ____ ۴۰۲

اللہ نے آسمان سے پانی
برسا کر سامان زندگی فراہم کیا ____ ۴۰۴

اللہ نے انسان کے لیے جن
چیزوں کو مسخر کیا ان کا ذکر ____ ۴۰۵

غیر خالق، خالق کی طرح نہیں ہو سکتا ____ ۴۰۸

اللہ کی نعمتیں شمار میں نہیں آتیں ____ ۴۰۹

جن میں زندگی تک نہیں ہے
ان کو پوجتے ہو؟ ____ ۴۰۹

دوسروں کو گمراہ کرنے والے
ان کے گناہ کا بوجھ بھی اٹھائیں گے ____ ۴۱۱

سازشی خود اپنی سازشوں
کے شکار ہوں گے ____ ۴۱۲

ائمہ اہل بیت علیہم السلام قیامت کے دن
مشرکین کی رسوائی کا اعلان کریں گے ____ ۴۱۳

کافروں کا عذاب نزع
روح سے شروع ہوگا ____ ۳۱۴

اہل تقویٰ کے درجات کا ذکر ____ ۳۱۴

اہل تقویٰ کو حالت نزع میں ہی
بشارت مل جائے گی ____ ۳۱۵

کافروں پر حجت پوری ہو گئی۔ اب وہ
کس چیز کے انتظار میں ہیں؟ ____ ۴۱۷

مشرکین اپنے شرک کو اللہ کی طرف نسبت
دیتے ہیں۔ نظریۂ جبر اختیار کرتے ہیں ____ ۴۱۹

اللہ نے ہر امت میں
ایک رسول مبعوث کیا ہے ____ ۴۱۹

قیامت آنا لازمی ہے ۴۲۰

ایجاد و تخلیق کے لیے اللہ
کا ایک ارادہ کافی ہے ۴۲۱

اللہ کی راہ میں ہجرت سے دین و دنیا
دونوں سدھر جاتے ہیں ۴۲۲

تمام انبیاءؑ انسان تھے ۴۲۳

نہ جاننے والوں کو جاننے والوں
کی طرف رجوع کرنے کا حکم ۴۲۴

سازشی سزا سے نہیں بچ سکتے ۴۲۵

آسمانوں اور زمین کی
مخلوقات اللہ کے لیے سجدہ کرتی ہیں ۴۲۶

ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم ۴۲۷

صرف مصیبت کے وقت اللہ
کو پکارنا ایمان نہیں ہے ۴۲۸

مشرکین مجہول اور موہوم
چیزوں کے نام پر مال خرچ کرتے ہیں ۴۲۹

اللہ کے لیے بیٹیاں ثابت کرتے
ہو جو خود کے لیے ناپسند ہیں ۴۳۰

انکار آخرت تمام جرائم کا سرچشمہ ہے ۴۳۱

اللہ جرم کی سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا ۴۳۲

قرآن رفع اختلاف کے لیے نازل ہوا ہے ۴۳۵

پانی سے زمین کی آبادکاری
میں اللہ کی تدبیری آیات ہیں ۴۳۵

مویشوں کے ذریعے دودھ کی فراہمی اور
میوہ جات میں بھی اللہ کی تدبیری نشانیاں ہیں ۴۳۶

شہد کی مکھی میں موجود شعور اللہ کی
تدبیری تخلیق اور تخلیقی تدبیر کی نشانی ہے ۴۳۸

جو قدرت دیتا ہے پھر سلب
کرتا ہے وہی معبود ہے ۴۴۲

آقا و غلام برابر نہیں ہو سکتے تو اللہ اور
اس کی مخلوق کیسے برابر ہو سکتی ہے؟ ۴۴۲

جس کے ہاتھ میں خلق و رزق ہے
وہ معبود ہے ۴۴۳

قیامت دفعۃً آئے گی ۴۴۶

انسان ناداں پیدا ہوتا ہے۔ پھر ارتقا پذیر ہے ۴۴۷

پرندوں کو پرواز کا سلیقہ دینے والا ہی رب ہے ۴۴۷

انسان کو رہائش و سامان زندگی
فراہم کرنے والا رب ہے ۴۴۸

اللہ کی طرف سے آسائشوں کی فراہمی کا ذکر ۴۵۰

قیامت کے دن ہر امت سے ایک
گواہ مبعوث ہوگا ۴۵۱

قیامت کے دن مشرکین کے
معبود بھی ان کی تکذیب کریں گے ۴۵۲

قیامت کے دن ہر امت سے ایک گواہ اٹھے گا
اور رسولؐ ان سب پر گواہ ہوں گے ۴۵۳

قرآن میں رسولؐ کے لیے
ہر چیز کا بیان ہے ۴۵۵

اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے ۴۵۶

عہد کو پورا کرنے کا حکم ۴۵۸

اگر اللہ چاہتا تو سب بالجبر
ایک امت بنا دیتا ۴۶۱

اسلام کی بدنامی کا سبب نہ بنو ۴۶۲

جو اجر اللہ کے پاس ہوگا
وہ ختم ہونے والا نہیں ہے ۴۶۳

عمل صالح سے پاکیزہ حیات مل جاتی ہے ___ ۴۶۳
قرآن پڑھنے سے پہلے
شیطان سے پناہ مانگو ___ ۴۶۵
ایمان اور توکل والوں پر
شیطان کا تسلط نہیں ہوتا ___ ۴۶۵
نسخ احکام میں موجود حکمت کا بیان ___ ۴۶۶
نبیؐ نے کسی انسان سے
تعلیم حاصل نہیں کی ___ ۴۶۷
ایمان پر قائم رہ کر دشمن سے
بچنے کے لیے تقیہ کرنے کا حکم ___ ۴۶۸
آزمائش میں کامیاب اور
ہجرت کرنے والو کا اجر ___ ۴۷۰
قیامت کے دن ہر شخص اپنی
صفائی پیش کرنے کی سعی کرے گا ___ ۴۷۱
کفران نعمت کی صورت میں
نعمت سلب ہو جاتی ہے ___ ۴۷۲
حرام چیزوں کا ذکر ___ ۴۷۳
قانون سازی میں مداخلت اللہ کی
حاکمیت اعلا میں مداخلت ہے ___ ۴۷۴
اللہ تعالیٰ غفلت میں سرزد ہونے
والے گناہوں کو معاف فرماتا ہے ___ ۴۷۵
مقام و منزلت ابراہیمی کا ذکر ___ ۴۷۶
اللہ کی طرف دعوت دینے کے تین اسلوب
حکمت، موعظہ اور مجادلۂ احسن کا ذکر ___ ۴۷۸
اگر دعوت کے جواب میں بدلہ لینے کی
نوبت آئے تو مقابلہ بالمثل جائز ہے ___ ۴۸۰
راہ دعوت میں صبر سے کام لینے کی تلقین ___ ۴۸۱

سورۃ بنی اسرائیل

تعارف سورۃ ___ ۴۸۵
معراج کی حکمت ___ ۴۸۷
معراج کی حقیقت ___ ۴۸۹
توریت کا ذکر ___ ۴۹۰
بنی اسرائیل کی طرف سے دوبار فساد کا ذکر ___ ۴۹۰
قرآن مؤمنین کے لیے
ہدایت و بشارت ہے ___ ۴۹۴
شب و روز کی تخلیق کی حکمت ___ ۴۹۶
انسان کا عمل اس کے گلے کا طوق ہے ___ ۴۹۷
ہر شخص اپنے عمل کا ذمے دار ہے ___ ۴۹۹
ہر معاشرے کا مراعات یافتہ طبقہ
فساد کا سرچشمہ ہے ___
اللہ دنیا پرست کو دنیا دے گا ___
دنیا سے مؤمن اور کافر یکساں فائدہ
اٹھا سکتے ہیں ___ ۵۰۳
صرف اللہ کی بندگی کے بعد والدین
پر احسان کا حکم ___ ۵۰۸
بوڑھے والدین کو اف تک نہ کہنے کا حکم ___ ۵۰۵
قریبی رشتوں کا حق دینے، فضول خرچی نہ
کرنے کا حکم ___ ۵۰۷
صالح افراد کی کوتاہی قابل عفو ہے ___ ۵۰۷
تبذیر کا المیہ ___ ۵۰۹
ذا القربیٰ کون ہیں ___ ۵۱۰
سائل کو شائستہ طریقہ سے جواب دو ___ ۵۱۰
رزق میں کشادگی و تنگی تابع
مشیت الٰہی ہے ___ ۵۱۱

آبادی کے اضافے سے غربت نہیں بڑھتی
اللہ سب کو روزی دیتا ہے ________ ۵۱۲
زنا، نسل انسانی کا اختلاط ہے جو انسانی
قدروں کی پامالی ہے ________ ۵۱۳
ناحق قتل بڑا جرم ہے ________ ۵۱۴
ناحق قتل کا قصاص ہے ________ ۵۱۴
یتیم کے مال کے نزدیک
جانے سے ممانعت ________ ۵۱۵
ناپ تول میں انصاف سے
کام لینے کا حکم ________ ۵۱۵
علم کے بغیر کسی قسم کے اقدام کی ممانعت ____ ۵۱۶
اپنی چال کو معتدل رکھنے اور تکبر
نہ کرنے کا حکم ________ ۵۱۷
قرآن نے ہر اسلوب کلام اختیار کیا ہے ____ ۵۲۰
اللہ کے مقابلے میں کوئی اور رب ہوتا تو وہ
اللہ کی تدبیر کے مقابلے اپنی تدبیر لے آتا ____ ۵۲۱
کائنات کی ہر چیز تسبیح کرتی ہے
لیکن انسان سمجھ نہیں سکتے ________ ۵۲۱
جن کے دلوں پر پردہ پڑا ہو
ان پر قرآن کا اثر نہیں ہوتا ________ ۵۲۲
اللہ اعادۂ حیات پر اسی طرح قادر ہے
جس طرح ایجاد حیات پر قادر ہے ________ ۵۲۵
گفتار کو شائستہ رکھنے کا حکم ________ ۵۲۷
محتاج وسیلہ کو وسیلہ نہیں بنایا جا سکتا ________ ۵۲۹
قیامت سے پہلے تمام آبادیاں
تباہ ہو جائیں گی ________ ۵۳۰
کفار کی تجویز پر معجزہ دینے سے
لوگ ایمان نہیں لاتے ________ ۵۳۱
رسول اللہؐ کا خواب اور
شجرۂ معلونہ (بنی امیہ) کا ذکر ________ ۵۳۳
فرشتوں کے لیے برائے
آدم سجدہ کرنے کا حکم ________ ۵۳۷
ابلیس کی طرف سے سجدہ سے انکار اور انسان کو
گمراہ کرنے کے لیے
ہر حربہ استعمال کرنے کا عندیہ ________ ۵۳۹
خاصان خدا پر ابلیس کا تسلط نہ ہوگا ________ ۵۴۰
اولاد آدم کو اللہ نے عزت و تکریم
سے نوازا ہے ________ ۵۴۳
احترام آدمیت ________ ۵۴۴
قیامت کے دن ہر شخص اپنے راہنما کے
ساتھ مبعوث ہوگا ________ ۵۴۶
مشرکین کی یہ سازش ناکام ہوگئی جو رسول ﷺ
کو وحی سے منحرف کرنے کے لیے کر رہے تھے _ ۵۴۸
رسولؐ کو ہجرت مجبور کرنے کے بعد اہل مکہ
کو سکون نصیب نہ ہوگا ________ ۵۴۹
پانچ نمازوں کے لیے تین اوقات کا ذکر ____ ۵۵۰
جمع بین الصلوتین کا جواز ________ ۵۵۱
ارسال الیدین کا مسئلہ ________ ۵۵۲
بیان احکام میں اختلاف کیسے ہوتا ہے؟ ____ ۵۵۳
نماز میں ہاتھ باندھنا کب اور کہاں شروع ہوا _ ۵۵۵
نماز تہجد کا حکم ________ ۵۵۷
اللہ کی طرف سے دعا کی تلقین ________ ۵۵۸
حق کی فتح اور باطل کی نابودی کی نوید ____ ۵۵۹
قرآن میں مؤمنین کے لیے شفا

اور ظالموں کے لیے گھاٹے کا سامان ______ ۵۶۰
نعمتوں کی فراوانی سے
انسان سرکش ہو جاتا ہے ______ ۵۶۱
ہر شخص اپنے مزاج وطبیعت
کے مطابق عمل کرتا ہے ______ ۵۶۳
رسولؐ سے روح کے بارے میں سوال ______ ۵۶۴
روح کا تعلق عالم امری سے ہے ______ ۵۶۵
استقلال روح ______ ۵۶۶
روح کے مادی ہونے پر دلائل ______ ۵۶۷
روح اور بدن کا تعلق ______ ۵۶۸
قرآن ایک مرتبہ پھر چیلنج کرتا ہے ______ ۵۶۹
کفار کی طرف سے ایمان لانے کے لیے
چند ایک معجزات کا مطالبہ ______ ۵۷۰
انسان کے لیے انسان رسول آسکتے ہیں ______ ۵۷۲
ہدایت صرف اللہ کی طرف سے اہل کو ملتی ہے ______ ۵۷۴
کائنات کا خالق انسان کو دوبارہ
حیات دے سکتا ہے ______ ۵۷۵
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے نو معجزات کا ذکر ______ ۵۷۷
فرعون کے غرق ہونے کے بعد
بنی اسرائیل کو بسانے کا ذکر ______ ۵۷۸
قرآن کے تدریجی نزول کی حکمت کا بیان ______ ۵۸۰
قرآن ایمان لانے والے موجود ہیں انکار کرنے
والے انکار کریں یا نہ کریں فرق نہیں کرتا ______ ۵۸۱
اللہ اور رحمٰن اللہ کے اسمائے خاص ہیں ______ ۵۸۲
اللہ کی حمد کس طرح کرنی چاہیے ______ ۵۸۳